ایمانی صفات
جلد اول
حق پاسبان
تالیف
حضرت مفتی سید مختار الدین شاہ صاحب
خلیفہ مجاز
برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ

اخلاق کا بیان

حُسنِ اَخلاق دین کا دوسرا نام ہے

حُسنِ خُلق، اچھے اور کریمانہ اَخلاق دینِ اسلام کا دوسرا نام ہے۔ دینِ اسلام کی ہر تعلیم اور ہر حکم کی بنیاد اخلاق پر ہوتی ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار اور شرک سے بیزاری کا اظہار کرنا ایک کریمانہ خُلق اور شکر ہے۔ پھر جس طرح توحیدِ الٰہی کا عقیدہ رکھنا ایک حقیقت کو ماننا ہے، اسی طرح اس حقیقت کو تسلیم کرنا اور ماننا ایک اخلاقی امر بھی ہے، اس سے انکار کرنا حقیقت سے انکار اور بد اخلاقی ہے، نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اس حقیقت کو مانیں اور اس پر یقین رکھیں کہ خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں بے مثل اور یکتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ اللہ تعالیٰ کے اس حق کو ادا کر کے شکر گزاری کا بھی مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص توحید کا منکر ہے وہ حقیقت سے اعراض کر کے ناشکری اور بد خلقی میں مبتلا ہے۔ نیز وہ اللہ تعالیٰ کے اس حق کے اعتبار سے، جو بندہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتا ہے، حق تلفی کا ارتکاب کر کے بے وفائی اور ناشکری جیسی بد اخلاقیوں میں مبتلا ہے۔

یہی حال دوسری تعلیمات وہدایات، اسلامی عقائد، فرائض، واجبات اور احکامات کا بھی ہے کہ ان کو بجالانے والا اپنے خالق کے ساتھ وفاداری، اس کی شکر گزاری اور فرمانبرداری کا ثبوت فراہم کر کے کریمانہ اخلاق پر فائز ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی تعلیمات وہدایات سے منہ موڑ لیتا ہے تو وہ گناہ گار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے خالق ومالک سے بے وفائی، اس کی ناشکری اور نافرمانی جیسی بد اخلاقیوں کے جرم میں مبتلا ہے، لہٰذا جو شخص جس قدر اچھے اخلاق کا مالک ہو گا وہ اسی قدر دینِ اسلام کی تعلیمات پر سختی سے عمل کرتا ہو گا، اور وہ دینِ اسلام میں اسی قدر بلند ہو گا۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ

"بلاشبہ آپ عظیم الشان اَخلاقِ کریمانہ پر ہیں۔" (سورۃ القلم: آیت ۴)

آپ ﷺ نے فرمایا:

(اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ)

"میں تو اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اَخلاقِ حسَنہ کی تکمیل کروں۔" (السنن الکبریٰ للبیہقی)

بہر حال حسنِ اخلاق دین کا دوسرا نام ہے۔ اس کو تین بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ حقوق: یعنی ہر شخص پر اللہ تعالیٰ کے اور اس کی مخلوق یعنی انسانوں، حیوانوں بلکہ بے جان چیزوں کے جو حقوق و فرائض عائد ہوتے ہیں، ان کو پورا کرنا۔ پھر یہی حقوق ہیں جو حقوق اللہ اور حقوق العباد بہت سی قسموں، مثلاً: عقائد، عبادات اور معاملات وغیرہ پر منقسم ہیں۔

۲۔ آداب: کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے کرنا، اس کو آداب کہتے ہیں، جیسے اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، پہننے، چلنے پھرنے وغیرہ کے آداب۔

۳۔ اخلاق: انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی کو فضائل الاخلاق کہتے ہیں اور اس کے مقابل کو رذائل یا برے اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی وہ قسم ہے جس کو عام اصطلاح میں اخلاق کہتے ہیں۔

حُسنِ خلق کسے کہتے ہیں؟

حُسنِ خُلق انسان کے اندر اس مادہ اور قوتِ راسخہ کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اعمالِ صالحہ اور عمدہ کام مسلسل آسانی اور سہولت کے ساتھ کر سکتا ہے، یا یوں کہیں کہ جس کی وجہ سے افعالِ جمیلہ اور اچھے وعمدہ کام مسلسل خود بخود بلا تکلف اس سے صادر ہوتے ہیں۔

حسنِ خُلق کی اس تعریف سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اگر کسی سے اچھے کام کا صدور مسلسل اور بار بار نہیں ہوتا، بلکہ کبھی کبھار اچھے عمل کا صدور ہو جاتا ہے تو یہ حُسنِ خُلق نہیں کہلایا جاسکتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اچھے اور عمدہ کام تنگ دلی سے بار بار اور مسلسل کرتا ہو تو اس کو بھی اس وقت تک حُسنِ خلق نہیں کہا جائے گا جب تک وہ اس کی طبیعتِ ثانیہ نہ بن جائے اور خود بخود بلا تکلف اس سے صادر نہ ہونے لگیں۔

حُسنِ خُلق کی مذکورہ بالا تعریف سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ کسی اچھے فعل کا کرنا الگ چیز ہے اور کسی اخلاقی مادہ اور جذبہ سے اس کا سرزد ہونا دوسری چیز ہے۔ اگرچہ برے افعال برے اخلاق سے

پھوٹتے ہیں جبکہ اعمالِ صالحہ، افعالِ حمیدہ خوب سیرتی اور اچھے اخلاق کے نتائج اور ثمرات ہوتے ہیں، لیکن ظاہری افعال اخلاق نہیں، بلکہ اخلاق وہ باطنی استعداد، تحریکی مادے اور قوتیں ہیں جن سے افعال اور اعمال پھوٹتے ہیں، مثلاً: انسان کے اندر قوتِ باصرہ ہے جو دیکھنے کا جوہر عطا کرتی ہے، البتہ اس جوہر کی دستیابی کے باوجود کبھی کبھار آنکھ کے کسی عارضے کی وجہ سے نظر کام نہیں کرتی اور آدمی نابینا یا کم بینا ہو جاتا ہے۔ پھر جوں ہی وہ عارضہ دور ہوتا ہے تو بینائی واپس آجاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ بنیادی جوہر کا چراغ ہی بجھ جائے تو آنکھ اپنی خوبصورتی اور ظاہری آب و تاب کے باوجود ہمیشہ کے لیے دیکھنے سے محروم رہ جائے گی۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ برقی قوت سے پنکھے چلتے ہیں، بلب روشن ہوتے ہیں، ہیٹر گرم ہو کر آگ کا کام دیتے ہیں، فریج میں برف بنتی ہے، لیکن بلب کا روشن ہونا، پنکھے کا چلنا، آگ اور برف، بجلی یعنی برقی قوت نہیں۔ اگر بلب میں کوئی خرابی ہے تو بجلی کی موجودگی کے باجود وہ روشن نہیں ہوگا، فریج میں خرابی ہے تو اس میں برف نہیں بنے گی، غرض برقی قوت موجود ہے لیکن بلب، پنکھے اور مشینیں وغیرہ اس لیے نہیں چلتی کہ ان میں نقص ہے، یا وہ سرے سے موجود ہی نہیں، اور اگر بجلی اور برقی قوت ہی نہیں تو پنکھے، مشینیں وغیرہ صحیح ہونے کے باوجود نہیں چلیں گی۔ یہ اور بات ہے کہ ان چیزوں کو برقی قوت کے علاوہ دوسری قوتوں سے حاصل کیا جائے، مثلاً روشنی گیس سے حاصل کی، لیکن ایسی صورت میں اس روشنی کے وجود کو برقی قوت کی وجہ سے نہیں مانا جائے گا۔

اسی طرح اخلاق بھی اس تخم اور استعداد کا نام ہے جس سے ہر بھلائی پھوٹتی ہے۔ صرف بھلا کام کرنا خوش خُلقی نہیں، مثلاً: مادۂ سخاوت سے دینے اور دوسروں کے کام آنے کا عمل پھوٹتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ کوئی کسی کو کوئی چیز دے تو وہ سخی بھی ہوگا۔ اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سخاوت کا ایک عمل کیا، لیکن ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ عمل مادۂ سخاوت کے بجائے کسی دوسری قوت کے زیرِ اثر کیا ہو، مثلاً: اُس کی منشا لالچ ہو کہ اس شخص کو کچھ دوں گا یا اس کے بچوں کو کچھ دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلے اس سے زیادہ دے گا، یا اس کا یہ عمل حُبِّ جاہ سے پھوٹا ہو۔

کبھی ایسا ہو گا کہ مادۂ سخاوت تو موجود ہو گا، لیکن اس مادہ اور تخم کے ظاہر ہونے کے اسباب مہیا نہ ہوں گے، مثلاً: خرچ کرنے کا موقع ہے، لیکن اس کے پاس مال نہیں ہے، یا مثلاً: صبر ایک خُلق ہے جس سے ضبطِ نفس کے افعال تسلیم و رضا ظاہر ہوتے ہیں، لیکن کسی جگہ ضبطِ نفس سے خلقِ صبر پر حکم نہیں لگایا جاسکتا، غرض اگر افعال کا کوئی تحریکی مادہ نہ ہو تو فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ افعال کا سرچشمہ در حقیقت دل ہے۔ صبر، شکر، شجاعت، مروّت، حیا، غنا وغیرہ نیک خلقی کے مادے ہیں جن کا تعلق دل سے ہے اور افعال ان کے آثار اور نتائج ہیں۔

اسی طرح بُرے افعال برے اخلاق کے نتائج ضرور ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بظاہر ہر بُرا کام بداخلاقی ہو گی۔ مثلاً: ظلم ایک برا تخم ہے جس سے قتل، لوٹ کھسوٹ اور چوری وغیرہ جیسے بُرے افعال پھوٹتے ہیں۔ اب ایک آدمی کسی کا مال چراتا ہے یا لوٹ لیتا ہے تو یہ ظلم کا اثر اور نتیجہ ضرور ہے، لیکن ایسے بھی ہو سکتا ہے کہ شخص چوری اور لوٹ مار بھی کرے، اور اس کے اس عمل کا منشا ظلم کے بجائے عدل ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ کوئی ظالم شخص کسی کا مال چرا کر یا ڈاکہ ڈال کر لے جائے اور اس مظلوم کو علم ہو جائے کہ میرا مال اس ظالم نے فلاں جگہ چھپا رکھا ہے، تو مظلوم شخص جاکر صرف اپنا ہی مال چرا کر یا لوٹ کر گھر لے آئے۔ ظاہر ہے یہاں چوری یا لوٹ کا فعل تو پایا گیا لیکن ظلم نہ پایا گیا، تو یہ بد خلقی نہیں۔

یہی حال قتل کا ہے۔ ایک ظالم بھی قتل کرتا ہے اور ایک عادل شخص بھی اس ظالم کو قصاص میں قتل کر دیتا ہے۔ چوں کہ پہلے شخص کے قتل کا منشا ظلم ہے تو وہ ظالم ہے، لیکن دوسرے شخص کا قتل کرنا قصاص اور عدل کی وجہ سے ہے، اس لیے یہ دوسرا قتل بد خلقی میں شمار نہیں۔ لہٰذا قتل، چوری، لوٹ کھسوٹ، ڈاکہ زنی وغیرہ جیسے برے افعال بداخلاقی کے، اور عفو درگزر کا معاملہ کرنا، مال و دولت کو نیکی کی جگہوں پر خرچ کرنا وغیرہ جیسے اچھے افعال خوش اخلاقی کے آثار ضرور ہیں لیکن کوئی اچھا یا برا فعل خوش خُلقی یا بد خُلقی نہیں۔

دراصل اخلاق تو ان اصولوں (اور تخم) کو کہتے ہیں جو انسان کے دل میں ہو اور اخلاقی اعمال ان سے خود بخود پھوٹتے ہوں۔ اچھے اعمال بھی صرف وہی ہوتے ہیں جو نیک مادہ، نیک منشا اور منبع سے پھوٹتے ہیں اور یہی وہ اعمال ہوتے ہیں جو تھوڑا ہونے کے باوجود بہت زیادہ اجر و ثواب رکھتے ہیں۔

حُسنِ خلق کے آثار اور ثمرات

خلاصہ یہ ہوا کہ "حُسنِ خُلق" انسان کی ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو باطنی امور کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، لیکن کسی انسان میں اس خصلت کا وجود اس کے آثار و ثمرات ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتا ہے، اور باطن کی اس روشنی کا عکس اس کی ظاہری علامات ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً: جس شخص کے دل میں رحم ہے تو اس کی مہربانی کسی وقت اور کسی شخص کے ساتھ مخصوص نہ ہوگی، بلکہ ہر قابلِ رحم اور قابلِ شفقت مخلوق کو دیکھ کر خود بخود بلا تکلف اس سے رحم اور شفقت کا عمل ظہور پذیر ہو جائے گا، اور اگر کوئی شخص اتفاقاً عطا و بخشش اور مہربانی کا کام کرتا ہے اور وہ اس کا خوگر نہیں تو اس وقت عطا و بخشش اور مہربانی کا کام، اگر نیک نیتی سے ہو تو قابلِ تحسین اور ثواب کا عمل تو ہے، لیکن اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ شخص رحم دل، سخی اور کریم النفس ہے۔

اخلاق کی فضیلت اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے! کہ اس کو ظاہری اور قانونی احکامات، حقوق پر برتری حاصل ہے، کیوں کہ اخلاق سے ہمارے عقائد، عبادات کی کیفیت اور ظاہری اعمال کی داخلی صورت متعین ہوتی ہے اور اس پر ہی آخرت میں فیصلہ ہو گا نہ کہ ظاہر پر۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص منافق ہونے کے باوجود اس دنیا میں مسلمانوں بلکہ بزرگوں میں شمار ہو سکتا ہے، مگر قیامت میں باطن پر فیصلہ ہونے کی وجہ سے جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں جائے گا۔ اعاذنا اللہ

اخلاق کے فضائل

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ انسان کے اعمال اس وقت صالح اور پاکیزہ ہوتے ہیں جب اس کے اخلاق بھی نیک اور پاکیزہ ہوں۔ اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ اور نیک جذبات کے پھل پھول اور شاخیں ہیں، اور جس شخص کے اخلاق جس قدر پاکیزہ ہوں گے اُسی قدر اُس کے اعمال وزنی اور پاکیزہ ہوں گے، چناں چہ:

۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بلاشبہ ایک بندہ باوجود عبادت میں کمزور ہونے کے اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے آخرت کے بلند درجات کو پالیتا ہے (اور منازلِ عُلیا کو حاصل کرلیتا ہے) اور ایک بندہ عابد ہونے کے باوجود بد خُلقی کی وجہ

سے جہنم میں جاتا ہے۔" (مجمع الزوائد: ۸/۲۵)

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(اِنَّ مِنْ خِیَارِکُمْ أَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا)

"تم میں سے سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔"

(بخاری و مسلم)

۳۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے بندوں میں کون زیادہ محبوب ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَحْسَنُھُمْ اَخْلَاقًا "کہ جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔" (طبرانی)

۴۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ:

"ایمان والوں میں زیادہ ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اخلاق میں زیادہ اچھے ہیں۔" (ابو داؤد)

۵۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمان اپنے اچھے اخلاق کے باعث اس شخص کا درجہ حاصل کرلیتا ہے جو ہمیشہ رات کو عبادت میں جاگتا ہے اور دن بھر روزہ رکھتا ہے۔" (ابو داؤد)

۶۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیامت کے روز مومن کے میزان میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی اور کوئی چیز نہیں ہو گی اور اللہ تعالیٰ فحش بات کرنے والے بدزبان سے بغض رکھتا ہے۔" (ابو داؤد، ترمذی، مشکوٰۃ)

۷۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ:

قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَاخَیْرُ مَا اُعْطِیَ النَّاسُ قَالَ خُلُقٌ حَسَنٌ

"لوگوں کو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) جو چیزیں عطا ہوئیں اُن میں سب سے بہتر چیز اچھے اخلاق ہیں۔"

(نسائی اور احمد وغیرہ)

۸۔ نیز اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جو دعا مانگتے تھے اُس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا۔

(وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِيْ لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ

وَاصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ)

"اور اے اللہ! تو میری بہتر سے بہتر اخلاق کی طرف رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہترین اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا، اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا مگر تو۔" (مسلم)

خلاصہ یہ ہوا کہ خوش خلقی کو دین میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی بدولت انسان زندگی میں قلبی سکون اور خوش گواری کے ساتھ رہے گا اور دوسرے لوگوں کے لیے اس کا وجود رحمت اور چین کا باعث ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح ونجات پائے گا۔ اس کے برعکس بداخلاقی انسان کی زندگی کو لطف ومسرت سے محروم کر دیتی ہے اور جن جن سے اس کا واسطہ اور تعلق ہوتا ہے ان کی زندگیاں بھی بدمزہ اور تلخ ہوں گی۔ دنیا کے بعد جس طرح خوش خلقی کا پھل اور انجام ارحم الراحمین کی رضا اور جنت ہے اسی طرح اس کے برعکس بداخلاقی کا انجام اور اس کی سزا احد قہار کا غضب اور جہنم کا سخت اور رسوا کن عذاب ہے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیم اور آج کل مسلمانوں کی غفلت

اس میں شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اخلاق کی تفصیلی تعلیم سے دنیا کو علماً و عملاً آشنا کیا۔ اخلاق کا علمی، عملی اور عرفانی نظام قائم کر کے عمل کی تدبیریں بتلائیں۔ دنیا کے مذاہب وملل اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتے، دینِ اسلام کے پاکیزہ اخلاق اور ان سے پیدا شدہ اعمال ایسے ہیں جن کا نمونہ بن کر رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور اپنے صحابہ کو تربیت دے کر ان کو ایسے حسین اخلاق سے آراستہ کیا جس کی وجہ سے جاہلیت اور بداخلاقی میں ڈوبے ہوئے سرکش عربوں میں اسلام کی روح دوڑ گئی۔ پھر یہ لوگ جہاں بھی گئے وہاں چند آدمیوں نے ملکوں اور قوموں کو اپنی اخلاقی تلوار سے فتح کر لیا۔ چین میں دس سے کم صحابہ تاجروں کی حیثیت سے گئے، مگر آج وہاں کروڑوں مسلمان موجود ہیں۔

دینِ اسلام میں اخلاق، صفائی معاملات اور حُسنِ معاشرت کی بہت بڑی اہمیت کے باوجود آج کا مسلمان اس سے غافل ہے، بلکہ مسلمانوں میں دین داروں کی اکثریت کا بھی یہ حال ہے کہ عبادات (روزہ، نماز وغیرہ) کی اہمیت تو کسی درجہ میں محسوس کرتے ہیں، مگر اخلاق، معاملات اور معاشرت کے

متعلق شریعت کے جو احکام ہیں، اُن کی اہمیت کو وہ محسوس نہیں کرتے۔ ان میں بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اخلاق، صفائی معاملات اور معاشرت کے بارے میں آنے والے احکامات کی پابندی صرف بزرگ اور کامل بننے کے لیے ضروری ہے، جبکہ نجات کے لیے تو صرف عبادات یعنی نماز، روزہ وغیرہ کافی ہیں حالاں کہ ایسا نہیں، بلکہ دوزخ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کے لیے جس طرح نماز روزہ ضروری ہیں، اسی طرح برے اخلاق سے بچنا اور اچھے اخلاق کا اپنانا بھی ضروری ہے۔

قرآن مجید اور احادیث میں جس طرح نماز، روزہ وغیرہ عبادات کی تاکید فرمائی گئی ہے، اسی طرح اچھے اخلاق کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے، اور جس طرح نماز روزہ وغیرہ میں سستی کرنے والوں کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے، اسی طرح برے اخلاق پر بھی عذابِ جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ مثلاً: بخل یعنی مال کی ایسی محبت اور دلی تعلق جو خرچ کے موقعوں پر خرچ کرنے میں رکاوٹ بنے، ایک اخلاقی برائی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

یعنی "اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو اپنے فضل سے نوازا (مال دولت وغیرہ سے) اور وہ اس میں بخل کرتے ہیں (یعنی جہاں خرچ کرنا چاہیے وہاں خرچ نہیں کرتے) وہ ہرگز اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ (بخل کرنا) ان کے حق میں کوئی اچھی چیز ہے، بلکہ یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے، قیامت کے دن اسی چیز کو، جس کے خرچ کرنے میں وہ بخل کرتے ہیں (عذاب بنا کر) ان کے گلے کا طوق بنایا جائے گا۔"

(سورۂ آل عمران: ۱۸۰)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے تکبر (جو اخلاقی برائی ہے) کے متعلق فرمایا ہے:

"جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جاسکے گا۔" (مسلم)

الغرض اخلاق کی اصلاح کا معاملہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ صرف بزرگ اور کامل بننے کے لیے اس کی ضرورت ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہونے اور دوزخ سے بچنے کے لیے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ کی ضرورت ہے اسی طرح برے اخلاق کو چھوڑنا اور اچھے اخلاق کو اپنانا بھی ضروری ہے۔

اچھے اخلاق کا سرچشمہ

اچھے اخلاق کا منبع دراصل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات ہیں۔ مخلوق میں جو بھی اخلاقِ حسنہ اور خوبیاں نظر آرہی ہیں وہ درحقیقت اللہ کی صفاتِ کمال کی تجلیاں اور کرشمے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ:

(حُسْنُ الْخُلُقِ خُلُقُ اللّٰهِ الْاَعْظَمِ)

"حسنِ خلق اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔" (المعجم الاوسط)

لہٰذا صرف وہی اخلاق اچھے اور کریمانہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے عکس اور تجلیاں ہیں، اور جو اخلاق اللہ تعالیٰ کی صفات کے منافی ہیں وہی رذائل اور برے اخلاق ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات ایسی بھی ہیں جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ اس کا بے مثل، واحد و یکتا اور خالق ہونا، نیز اللہ تعالیٰ کی بعض ایسی جلالی صفات بھی ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہیں جیسا کہ اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ۔ اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ ان کے مقابل صفتیں بندہ میں پیدا ہوں۔ مثلاً کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں تواضع اور خاکساری پیدا ہو۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اچھے اخلاق دراصل اللہ کی صفاتِ کمال کی تجلیاں ہیں تو اب یہاں یہ بھی سمجھیے کہ انسان ان کو نائب ہونے کی حیثیت سے اپنی استعداد کے مطابق حاصل کرسکتا ہے، مثلاً: رحم ایک خُلق ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے۔ اس وجہ سے وہ رحمٰن ورحیم ہے۔ لیکن بندہ کو بھی اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر اسی صفت رحم کو اپنی استعداد کے مطابق پیدا کرنے کی کوشش کرے اور ہر قابلِ رحم مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کرے۔ خطا و قصور کو معاف کرکے درگزر کرنا اور دوسروں کے عیوب کو چھپانا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندہ کو بھی حکم ہے کہ وہ اپنے اندر یہ صفت پیدا کرے۔ علیٰ ہذا القیاس، حِلم، جُود و کرم، سخاوت، حاجت مندوں کی مدد کرنا، عدل وانصاف کرنا، یہ سب اچھے اخلاق اللہ کی ذاتی صفات ہیں اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بندے ہونے کی حیثیت سے اپنی استعداد کے مطابق ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

اخلاقِ الٰہی کو اپنے اندر پیدا کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان مقامِ الوہیت پر فائز ہو جائے۔ یہ چیز نہ مطلوب ہے نہ ممکن، مقصود یہ ہے کہ انسان حیوانیت کی سطح سے بلند ہو جائے اور حضرتِ حق کے مبدأ فیض سے اخذ و استفادہ کی مسلسل کوشش کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے، انسان کو بھی چاہیے کہ علم و حکمت کے موتیوں سے اپنے دامن کو بھرنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ رؤف ور حیم ہے، انسان بھی اپنے اندر جذبہ رأفت ورحمت پیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ غنی و کریم ہیں، انسان بھی اپنی طاقت کے مطابق غنٰی و کرم کے اوصاف سے متصف ہو۔ اللہ تعالیٰ صَبور و حلیم ہیں، انسان بھی مقدور بھر حِلم و صبر سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ جبار و متکبر ہیں تو انسان پر اس کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ وہ عام طور پر متواضع اور منکسر المزاج ہو، البتہ وہ طاغوتی طاقتوں کے مقابلے میں کمزور اور کم ہمت ثابت نہ ہو اور بد اخلاق و بد عمل قسم کے لوگوں سے مرعوب و متاثر نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی صفت یہ ہے کہ وہ بڑا زبردست اور انتہائی سخت گیر ہے، انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں بڑھا ہوا ہو اور اس کی نافرمانی نہ کرے، نیز یہ کہ وہ بھی کفار و مشرکین کے لیے بڑا شدید اور مفسدین کی راہ روکنے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ شکر کی قدر کرنے والا اور خطاکاروں کو معاف کرنے والا ہے، انسان کا کام بھی یہ ہونا چاہیے کہ وہ حسن سلوک کرنے والوں کا قدردان ہو اور معذرت چاہنے والوں سے درگزر کرے۔ اللہ تعالیٰ کبھی راہِ راست سے انحراف نہیں فرماتے، انسان کا بھی فرض ہے کہ وہ ہمیشہ راہِ حق پر قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت شانِ کمال رکھتی ہے اور وہ ذات ہر عیب سے پاک اور ہر نقص سے منزہ ہے، لہٰذا انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ بھی اپنی استطاعت اور اپنے دائرہ کے اندر زندگی کو نقائص اور عیوب سے پاک کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

انسان ہی خلافتِ الٰہی کی اہلیت رکھتا ہے

چونکہ انسان ہی اللہ تعالیٰ کی ایسی مخلوق ہے جس کے لیے دنیا بنائی اور سجائی گئی ہے، پس یہی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہو سکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً

"میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔" (سورۃ البقرۃ:۳۰)

اور اللہ تعالیٰ نے انسان ہی کو اس قابل بنایا ہے اور اسی کو یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کی تجلی کو قبول کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ

"بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین انداز پر پیدا کیا۔" (سورۃ التین:۴)

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

فَإِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔"

(صحیح البخاری: کتاب الاستیذان والمسلم: کتاب البر والصلۃ)

اسی طرح متعدد احادیث میں اس بات کی تعلیم موجود ہے کہ کسی بندے کو چہرہ پر نہ مارو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ (دیکھئے بخاری: کتاب العتق وصحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ)

ان احادیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ العیاذ باللہ اللہ تعالیٰ کی کوئی جسمانی شکل وصورت ہے اور انسان اس کی تصویر یا نقل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تو شان یہ ہے کہ: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ "کوئی چیز اس کی مثل نہیں" بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک دکھائی دے رہی ہے جیسا کہ علم، ارادہ، قدرت واختیار، سماعت وبصارت، رحم وسخاوت وغیرہ انسان سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ پھر چوں کہ انسان کے تمام اعضا میں اس کے چہرہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس سے اس کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے، نیز محاسن کا مجموعہ ہے اور اکثر حواس ظاہری اسی میں سے دکھائی دے رہے ہیں جیسا کہ دیکھنا، سننا، سونگھنا وغیرہ۔ اسی طرح دوسری خوبیاں یعنی حسن وغیرہ بھی اسی میں سے ظاہر ہو رہی ہیں۔

غرض یہ کہ یہاں صورت سے مراد جسمانی صورت نہیں، بلکہ اس سے مراد معنوی صورت ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صفاتِ کاملہ کا مظہر بنایا ہے اور اس میں نائب ہونے کی حیثیت سے یہ استعداد اور صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی خداداد صلاحیت اور ظرف کے مطابق قبول کر کے اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرے۔ اور جس شخص میں اس کی محنت اور کوشش اور

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جس قدر صفاتِ کمال یا یوں کہیں کہ اچھے اخلاق زیادہ اور قوت کے ساتھ ظاہر ہو رہے ہوں تو وہ اتنا ہی نیابت اور خلافتِ الٰہی کے منصب کا زیادہ مستحق ہے۔ دینِ فطرت کا یہی وہ رنگ ہے کہ جس پر جس قدر یہ چڑھ جائے وہ اسی قدر اللہ تعالیٰ کی صفات کے رنگ میں رنگ جائے گا اور وہ اسی قدر دنیاو آخرت میں فلاح و بہبود پائے گا۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ

"اللہ تعالیٰ کا رنگ، اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم تو اسی (ایک اللہ) کی بندگی کرتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ:۱۳۸)

قرآن مجید کی اسی آیتِ کریمہ کا مضمون کسی نے یوں ادا کیا ہے کہ:

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ

"اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرو۔"

اور ترمذی کی ایک حدیث میں ان صفات اور اخلاق کے سرچشموں کا کچھ بیان آیا ہے۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ننانوے نام ہیں، جس نے ان کو ضبط کیا اور محفوظ کیا وہ جنت میں جائے گا۔ پھر اس کے بعد اسی حدیث شریف میں ننانوے صفات کا ذکر کیا ہے۔ قرآن مجید نے ان کو اسمائے حسنیٰ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہی وہ پاکیزہ اخلاقِ خداوندی ہیں جنہیں حاصل کرنے کا حضور اقدس ﷺ نے امت کو حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرو۔

غرض یہی صفاتِ کاملہ وہ اخلاق ہیں جن کے ذریعہ سے مخلوق کی اخلاقی تکمیل کے لیے خاتم الانبیا محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور یہی وہ اخلاق ہیں جن سے انسان سعادت اور مرتبۂ خلافت پر پہنچتا ہے، کیوں کہ منیب کے اوصاف جب نائب میں جڑ پکڑ لیتے ہیں تب ہی نائب منیب کا نمائندہ اور اس کی طرف سے کار فرما بنتا ہے۔ مثلاً: انجینئر کی نیابت انجینئر، مدرّس اور معلّم کی نیابت مدرّس اور معلّم، ترکھان کی نیابت ترکھان ہی کرے گا ورنہ اپنے علم و ہنر سے بیگانے اور جاہل کو کون اپنا خلیفہ بناتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ نیک اخلاق کا منبع اور سرچشمہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتی صفات ہیں جو بندوں کے حق میں عارضی اور عکس کی حیثیت رکھتی ہیں اور جو بندوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف انابت و رجوع اور اللہ تعالیٰ

کے فیضان اور فضل و کرم سے اُن کے اندر اُن کی خداداد استعداد کے بقدر پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جو شخص جس قدر اللہ تعالیٰ کی طرف انابت اور رجوع کرے گا، اُسی قدر اس کے ظرف اور استعداد کے مطابق اس کی طرف اخلاقی کمالات بہہ پڑیں گے، اور جس قدر کوئی خواہشاتِ نفس میں پڑ کر اللہ تعالیٰ سے دور رہے گا اُسی قدر اخلاقِ حسنہ سے محروم رہے گا۔

اچھے اخلاق

جس طرح انسان کے جسم کی ترکیب اور اس کے اعضا (ہاتھ، پاؤں اور گوشت پوست وغیرہ) میں اعتدال اور توازن سے اس کی ظاہری صورت اچھی اور حسین ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس کی اندرونی قوتوں جیسے قوتِ شہوت اور قوتِ غضب وغیرہ کے اعتدال و توازن سے وہ خوش اخلاق اور نیک سیرت بنتا ہے۔ جس قدر اندرونی قوتوں میں اعتدال و توازن ہو گا، اسی قدر اخلاق اچھے پیدا ہوں گے۔ پس جس طرح ظاہری صورتیں اور شکلیں ہیں، کوئی زیادہ خوبصورت ہے تو کوئی کم خوبصورت، اسی طرح اندرونی قوتوں کے اعتدال میں کمی و بیشی کی وجہ سے لوگوں کی سیرتیں متفاوت ہیں، کوئی زیادہ نیک سیرت ہے کوئی کم۔

تمام دنیا کے اولین و آخرین میں سب سے زیادہ بااخلاق اور خوب سیرت خاتم الانبیا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

یعنی "آپ عظیم الشان اخلاق پر پیدا ہوئے۔"

اس کے بعد جس شخص کو حضور اقدس ﷺ کے اخلاق سے جس قدر مناسبت ہو گی اس کو اسی قدر خوب سیرت اور خوش اخلاق کہیں گے اور جس مسلمان کو جس قدر اخلاق میں کمال حاصل ہو گا، اسی قدر اس کو دنیا و آخرت کی سعادت حاصل ہو گی۔ اب رہی یہ بات کہ اچھی عادات کیسے پیدا ہوں گی؟ تو اس کے متعلق چند باتیں عرض کی جاتی ہیں:

اچھے اخلاق کیسے پیدا ہوں گے؟

۱۔ اول یہ کہ اخلاق کا علم حاصل کیا جائے، کیوں کہ بغیر علم کے انسان اِفراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے، مثلاً: صبر ایک خُلق ہے جس کے دو کنارے ہیں، ایک کنارہ انتہائی بے صبری اور دوسرا کنارہ سخت دلی اور بے فکری ہے۔ تو جس طرح مصیبت کے وقت گریبان پھاڑنے اور بال نوچنے والے کو صابر نہیں بلکہ بے صبر کہا جاتا ہے، اسی طرح اگر کسی پر بہت سی مصیبتیں آئیں اور اُس پر غم کا اثر ہی نہ ہو، مثلاً: کوئی رشتہ دار فوت ہو جائے اور اُس کی آنکھ سے آنسو ہی نہ نکلیں، نہ اس کی طبیعت پر اثر ہو اور نہ دل میں غم پیدا ہو، تو ایسے شخص کو بھی صابر نہیں کہا جاتا، بلکہ ایسے شخص کو سخت دل، بے رحم، سرد مہر اور ظالم کہا جاتا ہے۔ جس طرح وہ صبر نہیں، اسی طرح یہ بھی صبر نہیں۔ صبر درمیان میں ہے کہ اثر تو لے، مگر حدود کے اندر رہے، آپے سے باہر نہ ہو، اسے صابر کہیں گے اور حدود جب تک معلوم نہ ہوں تو صبر نہیں کر سکے گا۔

اسی طرح تواضع ایک اچھا خلق ہے۔ اس کا ایک کنارہ تکبر ہے کہ آدمی بڑا بول بولے، اکڑ کر چلے وغیرہ اور دوسرا کنارہ ذلتِ نفس ہے کہ ہر کس وناکس کے آگے جھکتا پھرے، تو یہ بھی تواضع نہیں اور وہ بھی تواضع نہیں، دونوں کنارے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ درمیان میں تواضع ہے کہ وقار بھی رہے اور تکبر بھی نہ ہو مثلاً: اللہ تعالیٰ کے لیے اللہ کے سامنے جھکنا، کسی ولی اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کرنا۔ اگر کوئی کسی کی تعظیم اس کی خوشامد کے لیے کرتا ہے تو وہ تواضع نہیں ہو گی بلکہ تملُّق اور چاپلوسی ہو گی۔ اب کسی ولی اللہ کی تعظیم کرنے کی حدود کیا ہیں، اس کے لیے بھی تعلیم کی ضرورت ہے کہ کہیں تعظیم اور احترام میں شرعی حدود سے نکل نہ جائے۔ تو یہاں نہ تکبر جائز ہے نہ ذِلت نفس اور نہ شعائر اللہ کی تعظیم میں مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرنا۔ جب تک یہ ساری حدود معلوم نہ ہوں اس وقت تک ایک آدمی خلقِ تواضع کو صحیح طور پر نہیں اپنا سکتا۔

اسی طرح عفوودرگزر ایک خُلق ہے۔ اس کا ایک کنارہ تو یہ ہے کہ کسی کا قصور معاف ہی نہ کرے اور دوسرا کنارہ یہ ہے کہ کوئی حاکم، عادی مجرم اور ظلم پیشہ بدمعاش (جو سختی اور سزا کا مستحق ہے اور سزا و سختی کے بغیر اس کا علاج نہیں ہو سکتا، اُس) کے ساتھ بھی نرمی کرے اور اس کو معاف کرتا رہے، تو یہ

اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی اور مداہنت ہوگی نہ کہ خوش خُلقی، بلکہ یہی عفوودرگزر جب اپنی حدبندی کے خط سے آگے بڑھ جاتا ہے، توعفوودرگزر نہیں رہتا بلکہ بزدلی اور بے ہمتی بن جاتا ہے۔

اسی طرح شجاعت انسانی سیرت کا سب سے بڑا وصف ہے، لیکن یہی وصف جب اپنی حد سے گزر جائے تو نہ صرف اس کا حکم بدل جاتا ہے بلکہ وہ شجاعت کے بجائے قہر وغضب اور ظلم وتشدد بن جاتا ہے۔

غرض یہ کہ اخلاق کے لیے پہلی ضرورت اس کی تعلیم ہے تا کہ اس کی شرعی حدود معلوم کی جائیں، اور پھر ان کو اپنے اندر پیدا کرنے کی مشق کی جائے۔

۲۔ اپنے برے اخلاق کو دوسروں سے معلوم کریں، کیوں کہ انسان کو اپنے نفس کی حالت میں اکثر دھوکا ہو جاتا ہے کہ بد خلق شخص بھی اپنے آپ کو خوش اخلاق اور خوب سیرت سمجھنے لگتا ہے، چناں چہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ انسان کو غصہ آجاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے واسطے غصہ آیا جو خوش خلقی کا ثمرہ ہے ، یا مثلاً اپنی عبادات اور حالات لوگوں پر ظاہر کرتا رہتا ہے اور نفس یہ دھوکا دے کر مطمئن کر دیتا ہے کہ تم نے تو اس غرض سے اس کا اظہار کیا کہ اور لوگوں کو بھی اس نیک کام کے کرنے میں رغبت ہو جائے۔ اسی طرح یہ نفس بڑے بڑے دھوکے دیا کرتا ہے اور اپنی بد اخلاقیوں کو نیک اخلاق کے رنگوں میں پیش کر کے بد اخلاقیوں میں مبتلا رکھتا ہے۔

اپنی بد اخلاقیوں کی خبر گیری کے چار طریقے ہیں۔ وہ یہ کہ:

ا۔ کسی مُرشد کی خدمت میں بیٹھا کریں، تا کہ وہ آپ کو آپ کی بد اخلاقیوں پر خبر دار کر کے ان کا علاج بھی بتلایا کرے۔

ب۔ کسی مہربان اور صاف گو دوست کو اپنے اوپر نگہبان بنائیں جو ٹھیک ٹھیک آپ کے عیوب بلا کم وکاست بیان کر سکے۔

ج۔ اپنے حق میں دشمن کی بات سنیں، کیوں کہ دشمن کی نظر ہمیشہ عیب پر جاتی ہے۔ اگر چہ وہ دشمنی کی وجہ سے آپ کے کسی عیب میں مبالغہ تو کر سکتا ہے، لیکن اس میں آپ اپنے عیوب تلاش کر سکتے ہیں۔

د۔ جب کسی دوسرے شخص میں کوئی عیب نظر آئے تو اس کام سے خود بچیں اور اپنے اوپر یہ گمان کریں کہ ایسا میں بھی ہوں، اور پھر اس کا علاج شروع کریں۔

۳۔ اچھے اخلاق پیدا کرنے کا ایک طریقہ اپنے نفس کی مخالفت (اور ضد) ہے۔ غصہ کا علاج بتکلف بردباری کو اختیار کرنا اور بخل کا علاج بتکلف خرچ کرنا ہے۔ اسی طرح جو شخص بتکلف نیک کاموں کی عادت ڈالے گا اس میں اچھے اخلاق پیدا ہو جائیں گے، اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جب کوئی شخص تکلُّف سے کسی چیز کی عادت ڈالتا ہے تو وہ بالآخر اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ مثلاً: ابتداءً لڑکا تعلیم اور مکتب سے بھاگتا ہے لیکن والدین زبردستی اس کو بھیجتے ہیں، پھر مکتب جانا اس کی عادت بن جاتی ہے حتیٰ کہ بڑا ہو کر اسے علم میں مزا آنے لگتا ہے اور پھر وہ اس سے چھوٹ نہیں سکتا، یا مثلاً: اگر کوئی لکھنا سیکھتا ہے تو ابتداءً خوب غور و فکر کے ساتھ، محنت و مشقت سے لکھتا ہے، غلط سلط لکیریں کھینچتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے کہ پھر وہ بلا تکلف لکھتا ہے اور صاف ستھرا بھی لکھتا ہے۔

غرض یہ کہ تکلُّف سے نیک کام کرتے رہیں ((ایسے بتکلف نیک اعمال اور خوش خلقی کرنے کی وجہ سے اجر بھی ملے گا جبکہ نیت اللہ تعالیٰ کی رضا کی ہو، بلکہ ایک حدیث کی رو سے مشقت اٹھا کر عمل پر دوگنا اجر ملتا ہے)، حتیٰ کہ نیک اعمال کی عادت پڑ جائے۔ مثلاً دل نہ چاہے، پھر بھی فقرا پر مال خرچ کرتے رہیں، اس طرح کرنے سے بالآخر دل میں اچھے اخلاق جڑ پکڑ جائیں گے اور پھر بلا تکلف اچھے اور نیک افعال بدن سے نکلنے شروع ہو جائیں گے۔

۴۔ روزانہ نفس کا محاسبہ کر لیا کریں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ عشا کی نماز کے بعد سونے سے قبل دس پندرہ منٹ یا کم و بیش وقت مقرر کر لیں اور اس میں یہ سوچا کریں کہ آج میں نے کتنی بھلائیاں کی ہیں اور کتنی برائیاں، آج کس کس کو فائدہ پہنچایا اور کس غرض سے پہنچایا، اللہ کی رضا مقصود تھی یا ریا و شہرت۔ آج کتنی سخاوت کی، کس کس کی غیبت کی اور کس کی چغلی کھائی۔ غرض جو بھی کہا ہے اور جو بھی عمل کیا ہے اس کو یاد کریں، پھر جتنی نیکیاں ہوں ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اے اللہ! میں نیکی کرنے کے قابل اور اہل نہیں تھا، یہ تو تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو نے مجھ سے نیکی کرا دی، تو نے ہی میرے دل میں نیکی کرنے کا ارادہ پیدا فرمایا اور تو نے ہی نیکی کرنے کی توفیق دی، اور جتنی برائیاں کی ہیں خواہ ظاہری ہوں (جیسے

غیبت، چغلی، جھوٹ، چوری وغیرہ) یا باطنی ہوں (جیسے بدنیتی، حسد، ریا وغیرہ) ان پر دل سے نادم ہو کر توبہ کریں اور ان لوگوں سے معافی مانگ لیں جن کی غیبت کی ہے۔ اور جن جن کا حق مارا ہے اُن کو اُن کا حق واپس کر دیں یا ان سے معاف کر والیں۔

۵۔ کبھی بھی قصداً کسی گناہ کو معمولی سمجھ کر اختیار نہ کریں اور نہ کبھی کسی نیکی کو معمولی سمجھ کر چھوڑیں، کیوں کہ خیر اور شر کے جدا جدا دو سلسلے ہیں اور ان دونوں میں ایک کڑی اپنی دوسری کڑی سے متصل ہے۔ پہلے پہل انسان کے ہاتھ خیر یا شر کی ادنیٰ اور معمولی سی کڑی آتی ہے، پھر اس کی وجہ سے بعد والی کڑی کی استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بتدریج انسان خیر یا شر کے اعلیٰ اور انتہائی درجہ پر پہنچ کر جنت یا دوزخ کا مستحق بن جاتا ہے، لہٰذا کسی خیر یا شر کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے، جیسے چھوٹی چنگاری سے بھی بچتے ہیں اور بڑی سے بھی، اسی طرح تھوڑا نفع بھی نہیں چھوڑتے اور زیادہ بھی، اور جب کوئی معمولی سی غلطی ہو جائے تو فوراً توبہ کر کے اپنے دامن سے گناہ کے داغ کو دھولینا چاہیے، اور کسی کارِ خیر کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، اس سے آپ کو اعلیٰ سے اعلیٰ خیر کی طرف توفیق ملتی رہے گی۔

۶۔ صحبت بھی اثر رکھتی ہے۔ اچھی صحبت سے اچھے اخلاق پیدا ہو سکتے ہیں، کیوں کہ انسان جس ماحول اور معاشرہ میں رہتا ہے اور جس کے ساتھ محبت واُلفت کا تعلق رکھتا ہے اس کی نقل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کے حالات سے آپ بے خبر ہیں تو جن لوگوں کے ساتھ وہ شخص اٹھتا بیٹھتا ہے اور جن کے ساتھ وہ خوش رہتا ہے ان کے حالات معلوم کریں تو اس شخص کو تقریباً اسی طرح پائیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ صحبت سے اخلاق پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ بہادروں کی صحبت بزدلوں کے دلوں میں شجاعت پیدا کر سکتی ہے، سخی کی صحبت سے سخاوت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی حال دوسری صفات کا ہے کہ صحبت اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔“

(سورۃ التوبہ: آیت ۱۱۹)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ والسُّوْءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ وَنَافِخِ الْكِيْرِ فَحَامِلُ الْمِسْكِ إِمَّا اَنْ يُّحْذِيَكَ وَإِمَّا اَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ وَإِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيحاً طَيِّبَةً وَنَافِخُ الكِيْرِ إِمَّا اَنْ يُّحْرِقَ ثِيَابَكَ وَإِمَّا اَنْ تَجِدَ رِيحاً خَبِيثَةً)

"صالح (نیک) ہم نشیں کی مثال مشک رکھنے والے (عطار) اور برے (ہم نشیں کی مثال) بھٹی دھونکنے والے (لوہار) کی سی ہے۔ پس مشک رکھنے والا یا تمہیں مشک (مفت) دے دے گا یا تم اس سے خرید لوگے اور یا (اگر مشک کسی صورت میں آپ کے ہاتھ نہیں لگتا تو کم از کم) اس کی خوشبو (تو ضرور) تمہیں حاصل ہو جائے گی، اور دھونکنے والا بھٹی کا یا تو تمہارے کپڑے جلادے گا یا (کم از کم) تمہیں اس سے (دھواں اور گرم ہوا اور) بدبو تو ملے گی۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

غرض یہ کہ صحبت اور محبت بہت زود اثر ہوا کرتی ہے، ان کی اہمیت قرآن وسنت کی رو سے بھی بالکل واضح ہے اور عقل کی رو سے بھی۔ جب صحبت کی اہمیت معلوم ہو گئی تو یاد رکھیں! تحریر و تقریر، ریڈیو، ٹیلی ویژن حتیٰ کہ مختلف جانوروں سے محبت، ان کو پالنے اور ان پر سواری کرنے کے مختلف اثرات ہوا کرتے ہیں۔

یہاں یہ بھی یاد رکھیے کہ تحریر و تقریر کے حسن اور رنگِ بیان کو نہیں دیکھا جائے گا، بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اس تحریر و تقریر والے کے جذبات اور اخلاق کیسے ہیں، کیوں کہ تحریر اور تقریر کنندہ کے جذبات، اخلاق اور اس کے میلانات اس کی تحریر و تقریر میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا نیک، صالح لوگوں کی کتابوں، ان کی باتوں، ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ان کی ذات سے محبت رکھنے سے اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

دین اور اچھے اخلاق کو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ صحبت ہے، کیوں کہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، اس لیے جب نیک اخلاق والے کی صحبت میسر ہو، خواہ کسی عالم ربانی کی صحبت ہو یا کسی سچے اہل اللہ کی صحبت ہو، اس کی صحبت میں رہا کریں، بلکہ سب سے سہل اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ تصوف کو اختیار کر لیا جائے۔ تصوف اخلاق کی اقسام، ان کے درجات و مراتب، ان کے آثار اور ان کے حاصل کرنے کے ذرائع و اسباب، غرض اس اخلاقی نظام کی تفصیل کا مستقل فن ہے جسے "تزکیہ نفس" اور "تزکیہ

اخلاق“ بھی کہا جاتا ہے۔ اس فن کے ماہرین اور حاملین وہ ہیں جو اخلاق اور روحانی بیماریوں کی ترکیب، مقدار اور تفصیل کو اچھی طرح جانتے ہیں، ایسے لوگوں کو صوفیا کہتے ہیں۔

اگر کوئی آدمی اخلاق کا اعلیٰ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی باشرع صوفی اور شیخ کامل کے سپرد کر دے، پھر وہ جو طریقہ اِصلاحِ اخلاق کے لیے بتایا کرے اس پر عمل کیا کرے تو ان شاء اللہ تعالیٰ آسانی سے اخلاق درست ہو جائیں گے، اس کا ذاتی کردار باکمال ہو جائے گا اور وہ ایسا ہی بن جائے گا جیسا کہ ایک مومن کی شایان شان ہے۔ چناں چہ وہ پاکباز، نیک چلن، دیانت دار، امانت دار، سخی، شجاع، عادل، رحم دل، صابر، سچا، سچائی کی تصدیق کرنے والا، متوکل، برداشت کرنے والا، عفو و درگزر کرنے والا اور اسی طرح دوسرے اخلاقِ حمیدہ کا حامل ہو جائے گا۔ وہ بے جا غیظ و غضب اور دوسری نفسانی خواہشات کو ضبط میں رکھنے پر قادر ہو گا، تکبر سے پاک ہو گا، فساد، عیب جوئی، بدامنی اور کسی کا مذاق اڑانے اور توہین وغیرہ جیسی برائیوں سے بے نیاز ہو گا۔

اس کے ظاہری اعمال بھی خوب صورت ہوں گے اور اس کا باطن اس سے بھی زیادہ خوش جمال اور باعث زینت ہو گا۔ نیز وہ ایسا بھی ہو گا کہ اس کے باطن میں کسی طرح یہ خیال نہیں آئے گا کہ وہ صاحبِ تقویٰ اور بزرگ ہے، کیوں کہ اگر یہ خیال کسی کو آتا ہے تو یہی خیال و دعویٰ، تقویٰ کا لباس تار تار کرکے اس کو تکبر کے خارزار میں برہنہ چھوڑ دیتا ہے۔

تصوف کیا ہے؟

پہلے ذکر ہوا کہ دین اور اچھے اخلاق کو حاصل کرنے کا سب سے سہل اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ تصوف کو اختیار کر لیا جائے۔ تصوف وہ علم اور طریقہ ہے جس کے ذریعے انسان کا اللہ تعالیٰ سے صحیح اور مضبوط تعلق بن جاتا ہے اور جس کی وجہ سے انسان سے رذائل (برے اخلاق) دور ہو جاتے ہیں اور وہ ایمانی صفات اور اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہو جاتا ہے، اس لیے اس علم کو علم الاخلاق بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا قرآنی نام ”تزکیۂ نفس“ ہے اور اس کو حدیث میں ”احسان“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تصوف کے متعلق غلط فہمیاں

صرف عوام ہی نہیں بلکہ بعض خواص بھی تصوف اور بیعت کی غرض اور اس کا مقصد سمجھنے میں بہت دھوکہ کھا جاتے ہیں اور اس باب میں طرح طرح کے مغالطوں اور غلط فہمیوں کے شکار ہو جاتے ہیں، اور بہت سی غیر ضروری اور غیر متعلقہ چیزوں کو تصوف کے اجزا بنا لیتے ہیں، مثلاً: کوئی کشف و کرامات اور تصرّفات کو تصوف کے لیے لازم قرار دیتا ہے، کوئی تعویذات، گنڈوں اور جھاڑ پھونک کا نام تصوف رکھ لیتا ہے، کوئی خاص خاص رسموں اور عادتوں کو تصوف سمجھ بیٹھتا ہے، کوئی فلسفی یا فلسفی مزاج، تصوّف سے مراد "وحدۃ الوجود" یا "وحدۃ الشہود" کے نظریات لیتا ہے، کوئی تصوّف کی راہ کو اس لیے اختیار کر لیتا ہے کہ بیعت کے بعد قیامت میں شیخ (پیر) اس کے بخشوانے کا ذمہ دار ہے اور کوئی اس راہ کو دنیاوی ترقیات مثلاً روزگار، منصب اور عزت میں ترقی حاصل کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ کوئی اس کو صرف اس لیے اختیار کرتا ہے کہ اس سے باطنی کیفیات اور کشف و کرامات حاصل ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام چیزیں نہ تو تصوف کے جزو ہیں، نہ اس کے لیے ضروری ہیں اور نہ ہی یہ اس میں شامل ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں تو قطعاً باطل اور تصوف سے بالکل الگ ہیں، بلکہ بعض نے تو تصوف کو ایک ایسا راز بنا رکھا ہے جو صرف سینہ بسینہ چلا آرہا ہے اور وہ اس کو شریعت کے مد مقابل اور ضد گمان کر لیتے ہیں، حالاں کہ یہ بھی سراسر غلط اور باطل ہے۔

شریعت و طریقت

اب سوال یہ ہے کہ تصوف و طریقت کیا ہے اور اس کی غرض وغایت کیا ہے؟ اس کا جواب قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے تمام احکام، طریقے اور ہدایات جن کا انسان مکلف ہے، خواہ وہ ظاہری اعمال سے تعلق رکھتے ہوں یا باطنی اعمال سے، دین اور شریعت کہلاتے ہیں، اور متقدمین (اسلام کے پہلے بزرگوں) کی اصطلاح میں "فقہ" کا لفظ بھی انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چناں چہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے فقہ کی یہ تعریف منقول ہے:

مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالَهَا وَمَاعَلَيْهَا

"یعنی نفس کا اپنے متعلق نفع و نقصان کی چیزوں کو پہچاننا۔"

مطلب یہ ہے کہ نفس کا اپنے متعلق ان احکامات اور ہدایات کو پہچاننا خواہ وہ اس کے ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن سے متعلق ہوں، جو اس کے لیے باعثِ ثواب ہیں یا باعثِ عذاب۔ پھر متاخرین یعنی اسلام کے پہلے بزرگوں کے بعد آنے والے بزرگانِ دین نے اس فقہ اور شریعت کو ہماری آسانی کے لیے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ دین اور فقہ کے جن اعمال کا تعلق ظاہر سے ہے اس کا نام فقہ اور شریعت رکھا اور دین و شریعت یا فقہ کے باطنی جز کا نام تصوف پڑ گیا اور باطنی اعمال کے طریقوں کو طریقت کہا گیا۔ قرآن مجید اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں دین و شریعت کی دونوں اقسام کے لیے ہدایات و تعلیمات موجود ہیں۔ ظاہری اعضا سے تعلق رکھنے والی تعلیمات و احکامات بھی اور باطن سے تعلق رکھنے والے احکامات و تعلیمات بھی۔

تصوف و طریقت قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ظاہری اعمال کا حکم فرمایا ہے کہ:

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃ

"اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔" (سورۃ البقرہ: آیت ۴۳)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے صبر و شکر کا حکم بھی فرمایا:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا

"اے ایمان والو! صبر کرو۔" (سورۃ آل عمران: آیت ۲۰۰)

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ

"پس تم مجھے یاد رکھو میں تم کو یاد رکھوں گا، اور تم میرا شکر کرو (اور احسان مانو) اور میری (نعمتوں کی ناقدری اور) ناشکری مت کرو۔" (سورۃ البقرہ: آیت ۱۵۱)

غرض یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، حلال کمائی، حلال کھانے اور ہر حق دار کا حق ادا کرنے کا حکم فرمایا اور شر کے افعال یعنی زنا، چوری، سود، سٹہ، رشوت، جھوٹ، غیبت وغیرہ سے منع فرمایا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے عقائدِ حقہ اختیار کرنے، نماز میں خشوع، اچھے کام میں اخلاص وللّٰہیت، رحم، امانت داری، صداقت، صبر، شکر، توکل، رضاء بالقضا، اللہ تعالیٰ اور اس

کے رسول ﷺ سے محبت وغیرہ جیسے باطنی امور کا بھی حکم فرمایا ہے اور عقائدِ باطلہ، اور بے صبری، ناشکری، ریا، تکبر، عجب، حسد، خیانت وغیرہ سے منع فرمایا ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

”اور جو ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والے ہیں۔“

(سورۃ البقرہ: آیت ۱۶۵)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۞

”کہہ دیجیے! اگر تمہارے باپ، اور تمہارے بیٹے (بیٹیاں وغیرہ)، اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں، اور تمہارے خاندان، اور وہ مال جو تم نے (اپنے ہاتھوں سے) کمائے ہیں، اور وہ تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہوں، اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہوں، (یہ سب) تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں، تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (عذاب) بھیج دے، اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو راستہ نہیں دکھاتا۔“ (سورۃ التوبہ: آیت ۲۴)

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ شدید محبت کا حکم ہے اور جو لوگ ایسی محبت سے خالی ہوں ان کے لیے عذاب کی دھمکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نجات یافتہ لوگوں کے بیان میں فرماتے ہیں کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ

”بے شک جو لوگ اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں۔“

(سورۃ المؤمنون: آیت ۵۷)

اس آیتِ کریمہ میں خوف اور خشیتِ الٰہی کو نجات کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے، نیز اللہ تعالیٰ مؤمنین کی صفات میں فرماتے ہیں کہ:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ

"سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں۔" (سورۃ الانفال: آیت ۲)

اس آیتِ کریمہ میں خوف وخشیتِ الٰہی سے دل کا لرز جانا اور دہل جانا ایمان کا ثمرہ اور صفتِ لازمہ بتایا گیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا

"بے شک کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو (پاک صاف کر کے) سنوارا، اور ناکام ونامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔" (سورۃ الشمس: آیت ۹۔۱۰)

اس آیتِ کریمہ میں فلاح اور کامیابی کو نفس کو برے اخلاق سے پاک کرنے اور اچھے اخلاق سے آراستہ کرنے پر منحصر کر دیا گیا اور بتایا گیا کہ جس نے اپنے نفس کو برے اخلاق اور گناہوں سے آلودہ کیا وہ ناکام ونامراد ہوا۔ نیز قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر تزکیۂ نفس پر زور دیا گیا ہے اور اس کو منصبِ رسالت کا اہم مقصد قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ

اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

"اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کا تزکیہ (یعنی ان کو برے عقائد اور برے اخلاق سے پاک کر کے نیک اخلاق سے آراستہ) کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" (سورۃ آل عمران: آیت ۱۶۴)

اس آیت پر غور فرمایئے! کہ "تزکیہ" انبیا علیہم السلام اور خاص کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اہم کام اور مقصدِ نبوت تھا، جبکہ اس کی وضاحت خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں یوں فرمائی ہے کہ:

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ

"میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔"

(السنن الکبریٰ للبیہقی)

نبی کریم ﷺ کے اخلاق کیسے تھے، اس کی وضاحت قرآن مجید نے ان الفاظ میں کی ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

"اور بے شک آپ عظیم الشان اخلاق (کریمانہ) پر ہیں۔" (سورۃالقلم: آیت ۴)

نیز تقویٰ جو پورے دین کا جوہر اور خلاصہ ہے، اس کا تعلق بھی دراصل باطن ہی سے ہے جیسا کہ اس کا مفصل بیان تقویٰ کے باب میں آئے گا، یہاں صرف اس کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ایک ارشاد نقل کرتا ہوں، وہ یہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا وَيُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ

"تقویٰ یہاں ہے، اور آپ ﷺ نے سینے کی طرف اشارہ فرمایا۔" (مسلم)

تقویٰ اور تزکیہ کب حاصل ہوتا ہے؟

حقیقی معنوں میں تقویٰ اور تزکیۂ نفس اس وقت نصیب ہوتا ہے جب انسان کے پاس علم دین بھی ہو اور اُس کا دل بھی درست ہو، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ

وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ

"سن لو! بے شک آدمی کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے (اور اس سے خود بخود درست اعمال صادر ہونے لگتے ہیں) اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن فاسد اور برباد ہو جاتا ہے، سن لو! وہ دل ہے۔" (بخاری و مسلم)

یہی درست دل ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ

"جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، مگر وہ جو اللہ تعالیٰ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آئے۔"

(سورۂ شعراء: آیت ۸۸- ۸۹)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل قیمت قلبِ سلیم کی ہے قلبِ سلیم سے مراد صحیح اور پاک دل ہے جو شرک، نفاق، کبر، حسد اور بغض وغیرہ جیسے رذیل جذبات سے پاک اور نیک اخلاق سے آراستہ ہو۔

دل صحیح معنوں میں کب درست ہوتا ہے؟

دل اس وقت صحیح معنوں میں درست ہوتا ہے جب اس کو یقین، محبت اور اللہ تعالیٰ کا صحیح اور قوی تعلق نصیب ہو جائے جیسا کہ اس کی وضاحت حدیثِ جبریل علیہ السلام میں موجود ہے۔ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کے متعلق دریافت کیا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ

”احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔“ (بخاری و مسلم و مشکوٰۃ)

اس حدیث میں ایمان، اسلام اور احسان کے بارے میں سوال کیا گیا ہے جس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ عقائدِ ضروریہ اور اعمالِ ظاہرہ کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہے جس کا نام احسان ہے، اور یہی چیز عقائد اور اعمال کے لیے بمنزلہ روح کے ہے۔ حدیث کے اس ٹکڑے کا مطلب یہی ہے کہ مقامِ احسان یہ ہے کہ بندہ کی یہ حالت ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی اس طرح کرے اور اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا ایسا ادب اور لحاظ رکھے اور اس سے ایسا ڈرے کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کی نظروں کے سامنے ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے، کیوں کہ بندہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو واقعۃً نہیں دیکھ سکتا، لیکن اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے اور بندہ کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے، لہٰذا بندہ کو ہر وقت اور اپنے ہر کام میں اس کا ایسا ادب و لحاظ کرنا چاہیے کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کی نگاہ کے سامنے ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب بندہ کو اس حقیقت کا یقین اور اللہ تعالیٰ کی سچی محبت اور اس کا صحیح و قوی تعلق نصیب ہو جائے اور وہ اس کے دل پر اس طرح چھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی گویا ہر وقت اس کے سامنے رہتی ہے۔ یاد رہے کہ عبادت سے مراد صرف نماز ہی نہیں، بلکہ اس کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے، کیوں کہ حدیث میں تَعْبُدَ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی مطلق عبادت اور بندگی کے ہیں اور اسی حدیث کی ایک روایت میں تَعْبُدَ کی جگہ تخشی کا لفظ بھی آیا ہے۔ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ "احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو"، اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ كَاَنَّكَ تَرَاهُ "احسان یہ ہے کہ تم ہر کام اللہ تعالیٰ کے لیے اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو"۔

غرض یہ کہ احسان کا تعلق صرف نماز سے نہیں، بلکہ انسان کی پوری زندگی سے ہے، اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر عبادت و بندگی، اس کے ہر حکم و ہدایت کی اطاعت و فرمانبرداری اس طرح کی جائے اور اس کی گرفت سے اس طرح ڈرا جائے کہ گویا وہ ہمارے سامنے ہے اور وہ ہمارے ہر ارادے، ہر خیال اور ہماری ہر حرکت و سکون اور ہر قول و فعل کو دیکھ رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دل اور اخلاق اس وقت درست ہو سکتے ہیں جب بندے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت کے علاوہ صحیح و مضبوط تعلق بھی پیدا ہو۔

تزکیہ و احسان کا دوسرا نام تصوف ہے

مذکورہ بالا بیان تصوف کی ضرورت کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "تزکیہ و احسان" اور "تصفیۃ الاخلاق" کا نام ہی تصوف ہے۔ یہ دین کا بہت ہی اہم اور ضروری شعبہ ہے اور یہ ظاہری اعمال کے لیے بمنزلہ روح کے ہے۔ اس کے بارے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

"تصوف میرے اکابر کا اہم ترین مشغلہ ہے۔ وہ

؎ در کفِ جام شریعت در کفِ سندانِ عشق ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

کے سچے مصداق تھے۔ یہ حضرات ایک جانب فقہ اور علومِ ظاہریہ میں اگر ائمہ مجتہدین اور ائمہ حدیث کے حقیقی جانشین اور سچے متبع تھے تو دوسری جانب تصوف کے آئمہ جنید رحمہ اللہ و شبلی رحمہ اللہ کے قدم بقدم۔ ان اکابر نے تصوف کو فقہ و حدیث کے ماتحت چلایا اور اپنے قول و فعل سے بتلایا کہ یہ مبارک فن حقیقت میں قرآن و حدیث ہی کا ایک شعبہ ہے، اور جو رسوم و بدعات اس مبارک فن میں بُعدِ زمانہ سے پیدا ہو گئی تھیں اُن کو چھانٹ دیا۔

تصوف کو بعض ناواقفوں نے ظاہر شریعت کا مخالف نہیں تو علیٰحدہ ضرور بنا دیا، یہ غلو ہے یا جہل۔ حقیقی تصوف، جس کا دوسرا نام احسان ہے، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی حقیقت لوگوں کے سامنے دریافت کر کے یہ واضح کر دیا کہ یہ شریعت کی روح اور مغز ہے، اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سوال پر کہ احسان کیا چیز ہے؟ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاک ارشاد نے :

اَنْ تَعْبُدَاللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ

”تو اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسی کرے گویا تو اُس کو دیکھ رہا ہے۔“

احسان کے معنی اور تصوف کی حقیقت واضح کر دی۔ عنوانات تو اس کے جو بھی اختیار کیے جائیں لیکن مرجع سب کا یہی حقیقت ہے۔ (اکابر کا سلوک و احسان: ص ۱۷ تا ۱۸)

حضرت شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

غرض تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی جس کی تعریف علمائے تصوف نے یہ فرمائی ہے کہ:

”وہ ایسا علم ہے کہ جس کے ذریعہ سے نفوس کا تزکیہ، اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال پہچانے جاتے ہیں، جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے۔“

اب آپ خود غور فرمایئے کہ ان میں سے کون سی چیز غلط ہے؟ نفس کا تزکیہ غلط ہے یا اخلاق کا تصفیہ برا ہے؟ ظاہر و باطن کی تعمیر لغو ہے یا سعادتِ ابدیہ کی تحصیل بے کار ہے؟ اسی طرح تقویم اخلاق، تہذیبِ نفس، نیز نفس کو اعمالِ دین کا خوگر بنانا اور شریعت کو نفس کے حق میں وجدان بنالینا؛ ان امور میں کونسی شے مقاصدِ شرع کے خلاف ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک شے کتاب و سنت کے عین مطابق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کو پورا کرنے والی ہے۔

غرض جس تصوف کے اثبات کے ہم قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو اصطلاح شرع میں "احسان" کہتے ہیں، یا جس کو "علم الاُخلاق" کہا جاتا ہے، یا تعمیرِ ظاہر و باطن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ایک منظم اور بااصول چیز ہے۔ اس میں مریدین کے لیے بھی شرائط ہیں اور شیخ کے لیے بھی اصول وآداب ہیں، جن کی رعایت کرنے کے بعد اس کو شریعت کا مغز اور دین کا لُبِ لباب کہنا بجا ہے، اور جب ان شرائط وآداب کا لحاظ نہ کیا جائے، بلکہ غیر تصوف کو تصوف قرار دیا جائے تو پھر یہ وہ طریق ہی نہیں جو ہمارا موضوع بحث ہے، اس لیے ان کی خرابیوں اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے سالک میں جو خرابیاں پیدا ہوں اس کا ذمہ دار کسی طرح حقیقی تصوف اور اصل طریق کو نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اب اگر آپ کو تصوف سے محض اس بنا پر چڑ اور انکار ہے کہ اس کا نام محدَث اور نیا ہے تو آپ اس کو احسان سے تعبیر کر لیجیے، علم الاخلاق اس کا نام رکھ لیجیے، اور جو شخص کہ اس سے متصف ہو اُس کو محسن اور مقُرب، متقی اور مخلص کہہ لیجیے اور احسان و محسن اور متقی و مخلص کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر آیا ہوا ہے۔ (اکابر کا سلوک واحسان: ص ۲۱ تا ۲۲)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ "تفہیماتِ الٰہیہ" میں فرماتے ہیں کہ (اصل کتاب میں صرف عربی عبارت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے):

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کی دعوت دی اُن میں سب سے مہتم بالشان اُمور تین ہیں۔

۱۔ تصحیحِ عقائد جس کا ذمہ علمائے اُمت کے اہلِ اُصول نے اُٹھایا ہے۔ اللہ جل شانہ ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔

۲۔ دوسری چیز اعمال کا صحیح طور پر ادا کرنا اور سنت کے موافق ان سب کو ادا کرنا۔ اس فن کو اُمت کے فقہانے اپنے ذمہ لیا جن کی کوششوں سے اللہ جل شانہ نے بہت سے لوگوں کو ہدایت فرمائی اور گمراہ فرقوں کے اعمال کو راہِ راست پر لائے۔

۳۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے احسان کا بیان فرمایا ہے اور آیات واحادیث سے اس کو مُبَرہَن فرمایا ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں کہ تصحیح اخلاص واحسان کی، جو اس دین کی اصل ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے آیات اور احادیثِ اخلاص واحسان کو تحریر فرما کر تحریر فرمایا کہ:

"قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ تیسرا جزو شریعت کے مقاصد کا سب سے وقیع فن ہے اور بہت گہرا ہے جملہ شرائع کے مقابلہ میں، جو بمنزلہ روح کے ہے بدن کے مقابلہ میں، اور اس فن کا تکفل صوفیا نے کیا ہے کہ انہوں نے خود ہدایت پائی اور دوسروں کو ہدایت فرمائی، خود سیر اب ہوئے اور دوسروں کو سیر اب کیا اور انتہائی سعادت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔"

(اکابر کا سلوک واحسان: ص ۱۳ تا ۲۲)

تصوف کی اصطلاح اور غلط فہمیوں کا ازالہ

تصوف کے باب میں جو نزاع پیدا ہوا ہے اس پر بحث کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

مذاہب، اخلاقیات، تعلیم و تربیت، اصلاح و تجدید اور علوم و فنون سب کی تاریخ میں دو مرحلے بڑے سخت پیش آتے ہیں اور ان سے ان میں سے کسی کو بھی مفر نہیں۔

ایک جب کہ وسائل مقاصد بن جاتے ہیں، دوسرے جب اصطلاحات حقائق کے لیے حجاب ہو جاتی ہیں۔ وسائل اور اصطلاحات دونوں نہایت ضروری اور بالکل قدرتی اور طبعی چیزیں ہیں جن کے بغیر ان مقاصدِ عالیہ کی تبلیغ و توسیع اور تشریح و تفہیم عام طور پر ممکن نہیں ہوتی، لیکن وسائل ہوں یا اصطلاحات، مقاصد و حقائق کے لیے ان کا درجہ خادم و معاون کا ہے۔ ان کو وقتی طور پر ایک ضرورت کی تکمیل کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اور بعض اوقات ان پر مقاصد و حقائق ہی کی طرح زور دیا جاتا ہے اور ان کا مطالبہ کیا جاتا ہے، لیکن ان میں سے ہر فن کا مجتہد جب ضروری سمجھتا ہے ان سے نہ صرف استغنا اختیار کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات بطورِ علاج ان کے ترک کا بھی حکم دیتا ہے۔ وہ ان کا محکوم ہونے کے بجائے ان کا حاکم ہوتا ہے۔ وہ اس کا بھی لحاظ رکھتا ہے کہ وہ اس تناسب سے آگے نہ بڑھنے پائیں کہ بجائے مفید ہونے کے مضر اور موصل الی المطلوب ہونے کے بجائے سدِّ راہ اور طریق کے راہزن ثابت ہوں۔

لیکن اس تاریخی حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ان مقاصدِ عالیہ کو یہ ابتلا بار بار پیش آیا ہے کہ وسائل مقاصد بن گئے اور اصطلاحات نے حقائق پر ایسے دبیز پردے ڈال دیئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ

نگاہوں سے اوجھل ہوگئے، بلکہ ان سے ان تلخ تجربوں اور غلطیوں کی بنا پر، جو ان اصطلاحات کے علمبرداروں سے سرزد ہوئیں، ایسی شدید غلط فہمیاں پیدا ہوئیں کہ حق گو اور سلیم الفطرت انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو ان مقاصد اور حقائق ہی سے ایسی وحشت اور بیزاری پیدا ہوگئی کہ اُن کو اِن مقاصد کے حصول اور ان حقائق کی قدر واعتراف پر آمادہ کرنا ایک نہایت دشوار کام بن گیا۔

جب ان کے سامنے ان مقاصد کی تحصیل کی ضرورت پر تقریر کی جاتی یا ان کو ان کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تو وسائل کے وہ پہاڑ ان کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے جن کے بارے میں خام اور غیر محقق داعیوں نے سخت مبالغہ اور غلو سے کام لیا تھا اور ہر شخص سے ان کے بارے میں بے جا اصرار کیا تھا اور وہ انہیں میں اس طرح الجھ کر رہ گئے تھے کہ مقصد ہی بالکل فراموش اور نظر انداز ہو گیا تھا۔ اسی طرح جب ان حقائق کی دعوت دی گئی جن کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں اور جو بدیہیات میں داخل ہیں تو وہ اصطلاحات ان کے لیے حجاب بن گئے جن کے بارے میں نہ صرف یہ کہ اختلاف کی گنجائش تھی بلکہ وہ خاص ماحول، مخصوص حالات اور عام طور پر بہت بعد کے زمانہ میں ان حقائق کو ذہن کے قریب کرنے کے لیے اور خاص مصالح کے ماتحت وضع کیے گئے تھے۔

ان حقائق کے ابتدائی علمبردار اور جن کی زندگی ان حقائق کی سچی تصویر تھی، ان اصطلاحات سے ناآشنا تھے۔ انہوں نے ان حقائق کو سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کے لیے دوسرے ہی الفاظ، طریقے اور اسالیب استعمال کیے تھے۔ صرف ونحو، قواعدِ زبان، علوم وبلاغت سے لے کر حقیقت ومعرفت، اصلاحِ باطن، تزکیۂ نفس تک جس کی تاریخ دیکھی جائے اور اس فن کے متقدمین اور متاخرین کا مقابلہ کیا جائے یہ حقیقت سب جگہ نظر آئے گی کہ متقدمین وسائل پر حاکم، متأخرین ان کے محکوم، محققین حقائق کے داعی ومبلّغ اور غیر محقق پیرو اصطلاحات کے پرستار اور ان کے اسیر وگرفتار ہیں۔ یہ مقاصدِ عالیہ دینیات، اخلاقیات اور علوم وفنون کا ایک ایسا المیہ اور ان کے طالبین کے لیے امتحان وآزمائش کا ایسا مرحلہ ہے جو ہر دور میں پیش آیا ہے۔

تصوف کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ جہاں تک اس کے مقصد وحقیقت کا تعلق ہے تو وہ ایک متفق علیہ اور بدیہی حقیقت ہے، لیکن اس کو انہیں دو چیزوں نے نقصان پہنچایا۔ ایک وسائل کے بارے

میں غلو اور افراط سے کام لینا، دوسرے اصطلاح پر غیر ضروری حد تک زور دینا اور اس پر بے جا اصرار کرنا۔
اگر کسی سے پوچھا جائے کہ اخلاص و اخلاق ضروری ہیں یا نہیں؟ یقین کا پیدا ہونا مطلوب ہے یا نہیں؟ فضائل سے آراستہ ہونا اور رذائل سے پاک ہونا، حسد، کبر، ریا، بغض، کینہ، حب مال، حب جاہ اور دوسرے اخلاقِ ذمیمہ سے نجات پانا، نفسِ امارہ کی شدید گرفت سے خلاصی پانا کسی درجہ میں ضروری یا مستحسن ہے یا نہیں؟ نماز میں خشوع و خضوع، دُعا میں تضرع و ابتہال کی کیفیت، محاسبہ نفس کی عادت اور سب سے بڑھ کر اللہ و رسول ﷺ کی محبت، حسی حلاوت و لذت کا حصول یا کم سے کم اس پر شوق و اہتمام، صفائی معاملات، صدق و امانت اور حقوق العباد کی اہمیت اور فکر، نفس پر قابو رکھنا، غصہ میں آپے سے باہر نہ ہونا کسی درجہ میں مطلوب ہے یا نہیں؟ تو ہر سلیم الفطرت انسان اور خاص طور پر وہ مسلمان جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے، یہی جواب دے گا کہ یہ چیزیں نہ صرف مستحسن بلکہ شرعاً مطلوب ہیں اور سارا قرآن اور حدیث کے دفتر اس کی ترغیب و تاکید سے بھرے ہوئے ہیں، لیکن اگر کہا جائے کہ انہی صفات کے حصول کا ذریعہ وہ طریقِ عمل ہے جس کو بعد کی صدیوں میں "تصوف" کے نام سے پکارا جانے لگا تو اس کے سنتے ہی بعض لوگوں کی پیشانی پر شکن پڑ جائیں گے، اس لیے کہ اس اصطلاح سے اُن کو وحشت اور اس کے بعض بر خود غلط علمبر داروں اور دعوے داروں کے متعلق ان کے تجربات نہایت تلخ ہیں، ان کے حافظہ میں اس وقت وہ واقعات اُبھر آتے ہیں جو ان کو معاملہ کرنے پر یا اُن کو قریب سے دیکھنے پر اُن کے ساتھ پیش آئے۔ لیکن یہ صرف تصوف ہی نہیں، ہر علم و فن، ہر اصلاحی دعوت اور ہر نیک مقصد کا حال ہے کہ اُس کے حاملین و عاملین میں اور اُس کے داعیوں اور دعوے داروں میں اصلی و مصنوعی، محقق و غیر محقق، پختہ و خام، یہاں تک کہ صادق و منافق پائے جاتے ہیں اور ان دونوں نمونوں کی موجودگی سے کوئی حقیقت پسند انسان بھی اس ضرورت کا منکر اور سرے سے اس فن کا مخالف نہیں بن جاتا۔

دنیوی شعبوں کا حال بھی یہی ہے کہ تجارت ہو یا زراعت، صنعت ہو یا ہنر، ہر ایک میں کامل و ناقص اور رہبر و رہزن دونوں پائے جاتے ہیں، لیکن دین و دنیا کا نظام اسی طرح چل رہا ہے کہ آدمی اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور ناقصوں یا مدعیوں کی وجہ سے اس دولت سے محرومی اور اس مقصد سے دست

برداری اختیار نہیں کرتا اور کسی اصطلاح سے عدم اتفاق کی وجہ سے وہ اصل حقیقت کو نہیں ٹھکراتا۔ شاعر نے صحیح کہا ہے:

؎ الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا غوّاص کو مطلب ہے گہر سے کہ صدف سے

تصوف کے سلسلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو تمام اجزا کو علیٰحدہ علیٰحدہ تسلیم کرتا ہے، لیکن جب اس کے مجموعہ کو کوئی نام دے دیا جاتا ہے تو وہ اس سے انکار کر دیتا ہے۔ ہم نے اوپر جن مقاصد وصفات کا ذکر کیا ہے وہ تقریباً سب لوگوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ تسلیم ہیں لیکن جب کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے (کسی وجہ سے) اس کے مجموعہ کا نام "تصوف" رکھ دیا ہے تو فوراً تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں اور وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہم تصوف کو نہیں مانتے اور تصوف نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ اگر کوئی اسی حقیقت کا نام بدل کر پیش کرے اُس کو قبول کرلیتا ہے، مثلاً: کہا جائے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کا نام "تزکیہ"، حدیث کی اصطلاح میں "احسان" اور بعض علما کی اصطلاح میں "فقہ باطن" ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں اور یہ سب چیزیں منصوص ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک لکھی ہوئی ساری کتابوں میں نہ ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ زبانِ خلق کو، جو نقارہ خدا کہی گئی ہے، روکا جا سکتا ہے۔ ورنہ اگر ہمارے اختیار کی بات ہوتی تو ہم اس کو تزکیہ واحسان کے لفظ سے یاد کرتے اور تصوف کا لفظ ہی استعمال نہ کرتے، لیکن اب اس کا معروف نام یہی پڑ گیا ہے اور یہ کسی فن کی خصوصیت نہیں، علوم وفنون کی ساری تاریخ اسی طرح کی مروّجہ اصطلاحات سے پُر ہے۔ محققینِ فن نے ہمیشہ مقاصد پر زور دیا اور وسائل کو وسائل ہی کی حد تک رکھا۔ اسی طرح انہوں نے بڑی جرأت اور بلند آہنگی سے ان چیزوں کا انکار کیا جو اس کے روح ومغز اور اصل مقاصد سے نہ صرف خارج بلکہ ان کے منافی اور اکثر اوقات ان کے لیے مضر ثابت ہوتی ہیں۔ تاریخ اسلام میں کوئی ایسا دور نہیں گزرا کہ اس فن کے داعیوں، معلموں اور اہلِ تحقیق نے مغز وپوست، حقائق واشکال اور مقاصد ورسوم میں فرق نہ کیا ہو۔

پیرانِ پیر شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ اور شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ سے لے کر مجدد الف ثانی رحمہ اللہ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ، حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سب نے قشر ولباب، مقصود وغیر مقصود میں پوری وضاحت کے ساتھ امتیاز پر زور دیا اور ان رسوم وعادات کی اس شدت سے تردید کی جو غیر مسلموں کے اختلاط یا صوفیائے خام کے اثر سے داخل ہو گئی تھیں اور ان کو تصوف اور طریقت کا جز سمجھ لیا گیا تھا۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کی "فتوح الغیب" ہو یا "غنیۃ الطالبین"، شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ کی "عوارف المعارف" ہو یا حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کی "صراط مستقیم"، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی "مکتوبات" ہوں یا مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی "تربیت السالک" و "قصد السبیل"، ہر جگہ یہ مضامین بکثرت ملیں گے کہ انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا۔ (اکابر کا سلوک واحسان: ص۷ تا ۱۲)

اصطلاحات سے حقیقت اور وسائل سے مقصد کی طرف

حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ اپنی کتاب "تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک" میں فرماتے ہیں کہ:

"اصطلاحات اور مروجہ الفاظ وعنوانات نے بعض اوقات حقائق کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے اور ان کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ دنیا کے ہر علم وفن، زبان وادب اور دین ومذہب میں اس زیادتی کی ایک طویل روداد ہے۔ ان اصطلاحات سے بسا اوقات ایک نیا تصور پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق نئے نئے قسم کے سوالات اور اعتراضات پیدا ہو گئے، اختلاف وتنازعہ کا ایک لامتناہی سلسلہ اٹھ کھڑا ہوا، مختلف مذاہب اور مکتب خیال وجود میں آئے، دلائل اور منطق کی محفلیں آراستہ ہوئیں، افکار وخیالات میں تضاد ہوا اور لوگ مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئے۔

اگر ہم ان نئی اصطلاحات اور عرفی ناموں کو ترک کر کے عہد ماضی کی طرف واپس ہوں، جب ان حقائق کے لیے بہت سادہ اور عام فہم الفاظ مستعمل تھے اور بڑی سہولت کے ساتھ ان کیفیات اور معانی کی ترجمانی کی جاتی تھی، اور ان الفاظ کو اختیار کر لیں جو ہمارے اسلاف کے یہاں رائج تھے، تو یہ مسئلہ اسی

وقت حل ہو جائے گا اور تمام جماعتوں میں صلح ہو جائے گی۔ انہیں اصطلاحات میں ایک اصطلاح "تصوف" ہے جو لوگوں میں بہت رائج ہے، اس سلسلہ میں طرح طرح کے سوالات کھڑے ہوئے اور بحثوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا، سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس لفظ کی حقیقت و مراد کیا ہے؟ اس کا مأخذ و منبع کیا ہے؟ آیا وہ "صوف" سے ماخوذ ہے یا "صفاء" سے، "صفو" سے نکلا ہے یا "صفہ" سے؟ یا وہ ایک یونانی لفظ "صوفیا" سے لیا گیا ہے جس کے معنی حکمت بتائے جاتے ہیں۔

آخر یہ لفظ کہاں سے بر آمد کیا گیا اور کس طرح اِس کا رواج ہوا، جبکہ نہ قرآن و حدیث میں اس کا وجود ملتا ہے، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اقوال میں اور نہ خیر القرون میں اس کا سراغ ملتا ہے، اور ہر ایسی چیز جس کا حال اور جس کی یہ تاریخ ہو بدعت کہلانے کی مستحق ہے۔ غرض کہ اس طرح تصوف کے حامیوں اور مخالفوں میں ایک قلمی اور لسانی معرکہ برپا ہو گیا اور اس کے نتیجے میں ایک مستقل کتب خانہ وجود میں آیا جس کا سرسری جائزہ لینا بھی مشکل ہے۔

اگر ہم اس اصطلاح کو ترک کر کے (جس سے ہم دوسری صدی میں روشناس ہوئے ہیں) قرآن وحدیث اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین کی طرف رجوع کریں اور کتاب و سنت کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں تو ہمیں نظر آئے گا کہ قرآن، دین کے ایک شعبہ اور نبوت کے ایک اہم رکن کی طرف خصوصیت سے توجہ دلاتا ہے اور اس کو "تزکیہ" سے تعبیر کرتا ہے، اور ان چار ارکان میں اس کو شامل کرتا ہے جن کی تکمیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت سے متعلق اور مقاصدِ بعثت میں شامل تھی۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ

وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ

"وہی ہے جس نے اٹھایا اُمیوں میں ایک رسول انہیں میں سے، پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے، اور سکھلاتا ہے کتاب اور دانائی اور اس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں۔"

(سورہ جمعہ: آیت ۲)

تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ انسانی نفوس کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ اور رذائل سے پاک وصاف کیا جائے، مختصر الفاظ میں تزکیہ کی وہ شکل جس کے شاندار نمونے اور مثالیں ہم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی

زندگی میں نظر آتی ہیں اور ان کے اخلاص اور اخلاق کی آئینہ دار ہیں، وہ تزکیہ جس کے نتیجے میں ایسا صالح، پاکیزہ اور مثالی معاشرہ وجود میں آیا جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے اور ایسی معدلت شعار اور حق پرست حکومت قائم ہوئی جس کی مثال روئے زمین پر کہیں اور نہ مل سکی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زبانِ نبوت اسلام وایمان کے ساتھ ایک خاص درجہ اور مرتبہ کا ذکر کرتی ہے اور اس کو احسان سے تعبیر کرتی ہے، جس سے مراد یقین واستحضار کی وہ کیفیت ہے جس کے لیے ہر صاحبِ ایمان کو کوشاں ہونا چاہیے اور جس کا شوق ہر مردِ مومن کے دل میں موجزن ہونا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

(بخاری ومسلم)

جب ہم شریعتِ اسلامی اور رسول اللہ ﷺ کے اقوال واحوال پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو حصوں پر منقسم تھے۔ ایک کا تعلق افعال وحرکات اور امورِ محسوسہ سے تھا، مثلاً: قیام وقعود، رکوع وسجود، تلاوت وتسبیح، اذکار وادعیہ، احکام ومناسک۔ فنِ حدیث نے اس کی روایت اور تدوین کی خدمت انجام دی، علم فقہ نے اس سے مسائل وجزئیات استخراج کرنے کا بیڑا اٹھایا اور محدثین اور فقہائے اُمت نے (اللہ تعالیٰ ان کو اس کارِ عظیم کا بہترین صلہ عطا فرمائے) دین کو اس طرح محفوظ کر دیا کہ امت کے لیے اس پر عمل پیرا ہونا آسان ہو گیا۔

دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق ان باطنی کیفیات سے ہے جو ان افعال وحرکات کے ساتھ لازم وملزوم ہیں اور جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں قیام وقعود، رکوع وسجود، ذکر ودعا، وعظ ونصیحت، گھر کے ماحول، میدانِ جہاد، غرض ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان کیفیات کی تعبیر ہم اخلاص واحتساب، صبر وتوکل، زہد واستغناء، ایثار وسخاوت، ادب وحیا، خشوع وخضوع، انابت وتضرع، دعا کے وقت دل شکستگی، دنیا پر آخرت کو ترجیح، رضائے الٰہی اور دیدار کا شوق اور اس طرح کی اور دوسری باطنی کیفیات اور ایمانی اخلاق سے کرسکتے ہیں، جن کی حیثیت جسمِ انسانی میں روح کی اور ظاہر میں باطن کی ہے۔ پھر ان عنوانات کے تحت اور بہت سی جزئیات اور آداب واحکام ہیں جنہوں نے اس کو ایک مستقل علم اور علیحدہ

فقہ کا درجہ دے دیا ہے۔ چناں چہ اگر اس علم کو، جو اول الذکر کی شرح و تفسیر سے متعلق ہے، فقہ ظاہر کہا جاسکتا ہے، تو وہ علم جو ان کیفیات کی تشریح کرتا اور ان کے حصول کے لیے رہنمائی کرتا ہے "فقہ باطن" قرار دیا جاسکتا ہے۔

زیادہ مناسب تو یہ تھا کہ ہم اس علم کو، جس کا کام تزکیۂ نفوس اور تہذیبِ اخلاق ہے اور جو نفسِ انسانی کو فضائلِ شرعیہ سے آراستہ اور نفسانی و اخلاقی رذائل سے پاک وصاف کرتا ہے، اور کمال ایمان و درجہ احسان، اخلاق نبوی کی پیروی، روحانی و باطنی کیفیات میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع و تقلید کی دعوت دیتا ہے، تزکیہ یا احسان ہی کے نام سے یاد کرتے یا کم از کم فقہ باطن ہی کہتے، اگر ایسا ہوتا تو شاید اختلاف و نزاع کی نوبت ہی نہ آتی اور سارا جھگڑا ختم ہو جاتا اور دونوں فریق جن کو محض اصطلاح نے ایک دوسرے سے برسرِ نزاع کر رکھا ہے، مصالحت پر آمادہ ہو جاتے۔

احسان اور فقہ باطن سب علمی و شرعی حقائق اور دین کے مسلمہ اصول ہیں، جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں۔ اگر اہلِ تصوف اس مقصد کے حصول کے لیے (جس کو ہم تزکیہ و احسان سے تعبیر کرتے ہیں) کسی خاص اور متعین راستے یا شکل پر اصرار نہ کرتے (اس لیے کہ زمان و مکان اور نسلوں کے مزاج و ماحول کے ساتھ اصلاح و تربیت کے طریقے اور ان کے نصاب بھی بدلتے رہتے ہیں) اور وسیلہ کے بجائے مقصد پر زور دیتے تو اس مسئلہ میں آج سب یک زبان ہوتے اور اختلاف کا سرے سے رشتہ ہی باقی نہ رہتا، سب دین کے اس شعبہ اور اسلام کے اس رکن کا جس کو ہم تزکیہ یا احسان یا فقہ باطن کہتے ہیں، صاف اقرار کرتے اور اس بات کو بلا تأمل قبول کرتے کہ وہ شریعت کی روح، دین کا لُبِ لُباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت ہے اور یہ کہ جب تک اس شعبہ کی طرف کماحقہ توجہ نہ کی جائے، اس وقت تک کمالِ دین حاصل نہیں ہو سکتا اور اجتماعی زندگی کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی اور نہ صحیح معنٰی میں زندگی کا لطف آسکتا ہے۔

اس صورت حال سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس اصطلاح "تصوف" نے دین کی کتنی عظیم، کتنی روشن اور کتنی اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے اور بہت سے لوگوں کی راہ میں اس حقیقت کے حصول میں مانع بن گیا ہے، بلکہ بہت سے لوگ تو ہمت ہی ہار بیٹھے اور اس کا خیال ہی ترک کر دیا، لیکن اس کی بہت سے

وجوہ اور تاریخی اسباب ہیں، جن کا ذکر اس موقع پر کرنا مشکل ہے، بہر حال واقعات ہمیشہ انسان کی خواہش کے تابع نہیں ہوتے، اب ہم کو فراخ دلی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے اور قیود و اصطلاحات اور خواہشات و تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ ہم ایک دینی حقیقت سے (جو شریعت کے مسلّمات میں سے ہے اور کتاب و سنت اس کی دعوت دیتی ہے اور انسانی معاشرہ کو بھی اس کی شدید احتیاج ہے) محض ایک نئی اصطلاح اور ایک مروّج نام کی وجہ سے گریز کرنے لگیں۔

اس کے علاوہ دوسری چیز، جس نے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کر دیا، وہ پیشہ ور، جاہ طلب، حقیقت فروش، الحاد شعار اور فاسد عقیدہ نام نہاد صوفی ہیں جنہوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی و بے قیدی کی تبلیغ کرنے کے لیے تصوف کو آلہ کار بنایا اور اس کے محافظ اور علمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل غیرت اور اہل حمیّت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے بد ظن ہو گئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبہ کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے نا آشنا تھے، وہ مقصد اور وسیلہ میں تمیز نہ کر سکے۔ بعض اوقات انہوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا اور مقاصد کو نظر انداز کر دیا اور اس شعبہ یا اس فن میں ایسی چیزیں داخل کیں جن کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا، اور اس کو فن کی روح اور فن کا کمال قرار دیا بلکہ مقصود و مطلوب سمجھ بیٹھے۔

غرض کہ اس طرح انہوں نے مسئلہ کو اور پیچیدہ بنا دیا اور نزاع کو مختصر کرنے کے بجائے اور طول دے دیا۔ انہوں نے ان چیزوں کو، جن کا مکلف ہر مسلمان ہے اور جو دین کی روح اور زندگی کی ضرورت ہیں، معمہ، فلسفہ اور رہبانیت بنا کر پیش کیا، جن کی ہمت صرف وہی شخص کر سکتا تھا جو ترکِ دنیا اور مادی اسباب سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر چکا ہو اور دنیا کی ساری نعمتوں سے دستبردار ہونا چاہتا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں بہت کم ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ نہ دین کا مطالبہ تھا، نہ رسول ﷺ کی سنت اور نہ تخلیقِ انسانی کی حکمت۔

اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر ملک میں ایسے لوگ بھی پیدا کیے جو دین کو مبالغہ کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کی غلط بیانیوں اور جاہلوں کی تاویلات سے پاک وصاف اور عجمیت اور

فلسفہ سے محفوظ کرتے رہے، بغیر کسی تاویل یا تحریف کے خالص تزکیہ کی دعوت دیتے رہے، جس کا نام احسان اور فقہ باطن ہے۔ انہوں نے ہر زمانہ میں اس "طبِ نبوی ﷺ" کی تجدید کا فرض انجام دیا، وہ امتِ اسلامیہ میں نئی روح اور نیا ایمان پیدا کرتے رہے، بندوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ، معاشرہ کا تعلق اخلاق کے ساتھ، علما کا تعلق للّٰہیت اور اخلاص کے ساتھ استوار کرتے رہے۔ ایک طرف وہ عوام میں خواہشِ نفس، دنیا پرستی اور مال واولاد کے فتنہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرتے رہے، دوسری طرف انہوں نے خواص میں وہ ایمان ویقین اور روحانی قوت پیدا کی جس نے بادشاہوں کے انعامات اور تازیانے دونوں کا مقابلہ کیا اور ان کے وعدوں اور ان کی تعزیروں کا مقابلہ کرنے، جابر بادشاہوں اور حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے، امرا اور بادشاہوں کا احتساب کرنے اور مادی مظاہر کی بے وقعتی اور کفاف پر قناعت کی طاقت وصلاحیت پیدا کرتے رہے۔

ہر زمانہ میں ایسی طاقت ور شخصیتوں اور جامع کمالات داعیوں کی ضرورت رہی ہے جو مسلمانوں میں تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفوس کا کام کریں۔ وہ انقطاع نبوت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا فرض انجام دیں اور اُمتِ اسلامیہ کا رشتہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جوڑیں اور اس میثاق وعہد کی تجدید کریں جو کلمہ اور ایمان کے ذریعہ ہر مسلمان نے کیا ہے اور اطاعت وفرمانبرداری، نفس اور شیطان کی مخالفت، اپنے معاملات میں خدا اور رسول کی عدالت سے فیصلہ کرانے، طاغوت کے انکار اور اللہ کی راہ میں مجاہدہ اور اس عہد کی تجدید کو اپنا شعار بنائیں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا۔

(تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک: ص ۱۳ تا ۲۰)

تزکیہ یا تصوف کی ضرورت واہمیت پر زور دیتے ہوئے اس مضمون کے آخر میں فرماتے ہیں کہ:

ذرا ان ملکوں کی طرف نظر ڈالیے جہاں دعوت الی اللہ، روحانیت اور سچی خدا پرستی اور تزکیۂ نفوس کا کام عرصہ سے بند ہے، اور ایسے داعی اور علما کی تعداد (جو انسانوں کا رشتہ خدائے تعالیٰ سے استوار کریں اور ان کی اصلاح باطن کی طرف متوجہ ہوں) مغربی تہذیب کے اثر یا مغرب کے قُرب یا اور

دوسرے اسباب کی بنا پر بہت کم ہو گئی ہے، وہاں آپ ایک ایسا خلا پائیں گے، ایک مہیب اور طویل خلا، جس کو نہ وسعت علم اور تبحر علمی سے پُر کیا جا سکتا ہے، نہ ذہانت اور عالی دماغی سے، نہ ادب عالیہ سے، نہ عربی زبان وادب سے گہرے ربط اور نسبی تعلق سے اور نہ آزادی و حریت سے، یہ ایک ایسا روحانی واخلاقی مسئلہ ہے جس کا کوئی حل نہیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ اور عوام تیز اور ہمہ گیر مادیت، دولت کی اندھی محبت اور دوسرے اجتماعی اور اخلاقی امراض کا شکار ہیں، تعلیم یافتہ اور ذہین لوگ، (مذہبی تعلیم وثقافت ہو یا مادی) عہدہ ومنصب، حسد اور بخل، تکبر اور انانیت، شہرت کی خواہش، نفاق اور مداہنت، مادہ اور طاقت سے مرعوبیت جیسے باطنی امراض میں گرفتار ہیں۔ جہاں تک اجتماعی وسیاسی تحریکات کا سوال ہے، ان کو خود غرضی، تربیت کے فقدان اور لیڈروں کی کمزوری نے خراب کر دیا ہے۔ رہ گئے ادارے تو ان کو اختلافات، احساس ذمہ داری کی کمی، دنیا طلبی اور تنخواہوں میں اضافہ کے عشق نے بے کار کر دیا ہے اور وہ صرف اسی کام کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

جہاں تک علما کا تعلق ہے، ان کے وقار اور عزت کو مظاہر پرستی اور ظاہر داری، فقر سے ضرورت سے زائد اور بیجا خوف، آرام طلبی اور عیش پسندی نے بگاڑ دیا اور ان سب چیزوں کا علاج اس تزکیہ نبوی کے علاوہ جس کا ذکر قرآن میں ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہے اور اس "ربانیت" میں جو علما سے مطلوب ہے اور کہیں نہیں وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۞ میں تزکیہ کی کسی خاص لگی بندھی اور متعین شکل پر زور نہیں جس کا رواج عام ہوا اور جس کا نام آخری دور میں تصوف پڑا، نہ میں تصوف کے حاملین میں سے سب کو ہر طرح کی غلط روی وغلط فہمی سے بری سمجھتا ہوں، اور نہ ان کو معصوم قرار دیتا ہوں، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس خلا کو، جو ہماری زندگی اور ہمارے معاشرہ میں واقع ہو گیا ہے، جلد پُر کیا جائے اور تزکیہ واحسان اور فقہ باطن کو پھر سے تازہ کیا جائے، جس طرح ہمارے اسلاف نے اس کو اپنے اپنے زمانہ میں تازہ کیا تھا اور یہ سب منہاج نبوت اور کتاب اور سنت کی روشنی میں ہو۔ بہر حال ہر دور میں اور ہر جگہ جہاں مسلمان بستے ہوں، یہ کام ضروری ہے، اس لیے کہ حقیقت میں یہ خلا ایک عظیم خلا ہے اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کے

اثرات اور نتائج بہت دور رس ہیں۔ اپنے اپنے دور میں اس ذمہ داری کو ادا کرنے والوں اور اس خدمت کے انجام دینے والوں پر تنقید کرنے والوں سے ایک عربی شاعر کی زبان میں کہنا چاہتا ہوں۔

اقلّوا علیهم لا أبا لأبیکم　　　من اللوم أوسُدّوا المکان الذی سدُّوا

"ان اللہ کے بندوں پر ملامت بہت ہو چکی، مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان کی جگہ لینے والا اور درد کا مداوا کرنے والا کوئی ہے۔" (تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک: ص ۲۳ تا ۲۵)

تصوف اور حق پرست

جن لوگوں کی فطرت مسخ نہ ہوئی ہو اور وہ حق کے متلاشی ہوں، انہوں نے جب بھی دین کے اس شعبے کا غور وفکر سے مطالعہ کیا تو وہ نہ صرف اس کے قائل ہوئے بلکہ انہوں نے اس کو اپنایا اور اختیار کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کی داستان اور بیان کو پڑھ لیجیے۔ وہ اپنی داستان یوں لکھتے ہیں:

تصوف پر ابتدائی غور اور تجربہ

۱۳۶۱ھ کے اواخر یا ۱۳۶۲ھ کے اوائل میں بعض ایسے حالات سے میں دوچار ہوا کہ چند دن کسی ایسی جگہ رہنے کی میں نے ضرورت محسوس کی، جہاں دل ودماغ افکار ومکروہات سے محفوظ رہیں اور قلب کو کچھ سکون واطمینان حاصل ہو۔ اس مقصد کے لیے میری نظر انتخاب اس زمانے کے ایک صاحبِ ارشاد بزرگ کی خانقاہ پر پڑی جو آبادی اور آبادیوں کے شور وشغب سے الگ تھلگ جنگل میں واقع ہے اور منظر بھی سرسبز وشاداب ہے۔ بہرحال میں وہاں پہنچ گیا۔

غالباً پہلا ہی دن تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ محترم بزرگ خانقاہ کے صحن میں ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے، ازراہِ شفقت وکرم مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھالیا تھا۔ یاد آتا ہے کوئی تیسرا شخص اُس وقت وہاں نہیں تھا۔ قریب ہی خانقاہ کی سہ دری میں چند ذاکر "نفی اثبات" کا اور بعض اُن میں سے "اِسم ذات" کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور مشائخ سلوک کے تجویز کیے ہوئے خاص طریقوں سے قلب پر ضرب لگاتے تھے۔ اللہ کے ذکر میں جہر وضرب کا یہ طریقہ اُس

وقت میرے لیے صرف نامانوس ہی نہ تھا بلکہ کسی درجہ میں گویا ناقابلِ برداشت تھا، چناں چہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ادب واحترام کے ساتھ عرض کیا:

"حضرت! ساری عمر دین کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں دیکھا ہے اُس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین صرف وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے اور جس کی تعلیم آپ ﷺ نے صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم کو دی اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بعد والوں نے سیکھا اور صحیح نقل وروایت کے ذریعے جو اُن سے ہم تک پہنچا۔ اور یہ حضرات ذاکرین جس طرح جہری اور ضربی ذکر کر رہے ہیں، جہاں تک اپنا علم ہے، نہ تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ تعلیم فرمایا تھا، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تابعین سے اس طریقے پر ذکر کرایا اور نہ تابعین نے اپنے بعد والوں کو ہی یہ طریقہ بتلایا تھا۔ اس لیے ذکر کے اس طریقے کے بارے میں مجھے خلجان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر میرا یہ خلجان کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہے تو اس کی تصحیح ہو جائے۔"

اُن بزرگ نے توقع کے خلاف میرے اس سوال کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں فرمایا:

"مولوی صاحب! یہ بے چارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں، یہ کسی اور کام کے نہیں ہوتے۔ بس اسی کام کے ہوتے ہیں اور اسی کے واسطے آتے ہیں، اس لیے میں اُن کو یہ ہی بتلا دیتا ہوں، آپ جو کام کرتے ہیں (یعنی تقریر وتحریر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے، آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس چکر میں نہ پڑیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا۔ لیکن اُن بزرگ نے میری بات کے جواب میں اتنا ہی فرمایا اور مجھے کچھ اور عرض کرنے اور اپنے اصل سوال کی طرف مکرّر توجہ دلانے کی مہلت دیے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور اُن کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرما دیا جو میرے لیے بھی دلچسپ تھا۔ اُن کا یہ رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کو اُٹھانا میں نے بھی مناسب نہ سمجھا اور عشا کے قریب یہ مجلس ختم ہوگئی۔

اگلے دن مغرب کے بعد پھر یہی ہوا کہ ذاکرین نے اسی دھن کے ساتھ اپنا اپنا ذکر شروع کیا۔ مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور میں نے کل کا اپنا سوال پھر یاد دلایا۔ لیکن آج بھی اُن بزرگ نے وہی کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظر انداز فرما کر ہندوستانی مسلمانوں کی غالباً ماضی اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ شروع فرما دیا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔ اُن بزرگ کے اس رویہ سے الحمدللہ میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا کہ چوں کہ میرے سوال کا کوئی جواب ان کے پاس ہے نہیں، اس لیے یہ اس سے پہلو تہی کر رہے ہیں، بلکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ غالباً میرے سوال کو ایک اہل اور طالبِ صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا ہے۔ بلکہ ایک مبتلائے زعم و کبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظر انداز فرمایا جارہا ہے۔ ① اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت اس سوال سے اپنی تشفی (جہاں تک اب یاد ہے) مقصود بھی نہ تھی، بلکہ نیت کچھ اور ہی تھی۔ خانقاہ کے جس حجرے میں میرے سونے کا انتظام تھا، نمازِ عشا وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اُس میں جا کر لیٹ گیا اور تصوف کے اس قسم کے اعمال واشغال پر بطورِ خود ہی غور کرنے لگا۔ اس غور و فکر میں میں خود ہی سائل تھا اور خود ہی مجیب۔ یاد آتا ہے کہ اس ذہنی بحث مباحثہ میں دیر تک نیند نہیں آئی۔ میں چاہتا تھا کہ ذہن اس مسئلہ میں بالکل یکسو ہو جائے، اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے تو اس کی تصحیح ہو جائے اور اگر میں ٹھیک طور پر سمجھ رہا ہوں تو پھر اس بارے میں مجھے ایسا یقین واطمینان حاصل ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا رد و انکار کروں اور ان باتوں کے غلط ہونے پر ایک سچے حق پرست کی طرح اصرار کروں۔

اسی غور و خوض میں دیر کے بعد میرا ذہن ایک دفعہ اس طرف منتقل ہوا کہ تصوف کے ان خاص اعمال واشغال کو (مثلاً ذکر و مراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو مشائخ کے تجویز کیے ہوئے ہیں، اپنی قیود کے ساتھ سنت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت اور نادرست سمجھنا اگر صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ، حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ اور حضرت شاہ اسماعیل

---

① صوفیوں کو ان کے ایک بڑے اُستاد (حافظ شیرازی رحمہ اللہ) کا مشورہ بھی یہی ہے:

بامدعی مگوئید اسرارِ عشق و مستی　　بگذرید تا بمیر د در رنج خود پرستی

شہید رحمہ اللہ اور ان سے بھی پہلے ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں، بلکہ بدعات کا حامی اور بدعات کو رواج دینے والا ماننا پڑے گا۔ کیوں کہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضے سے ان چیزوں کے بارے میں تسامح اور تساہل ہی برتا ہو، بلکہ ان کی تعلیم سے اُن کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انہوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر و شغل کرا کے ان کا سلوک طے کرایا ہے، بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے اُن کی کتابوں کے پڑھنے والے اور حالات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں ہے

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دل نے یہ فیصلہ تو جلد ہی کر لیا کہ مجھ جیسے کم فہم اور ناقص العلم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا زیادہ ممکن اور زیادہ قرین قیاس ہے، بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ و شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ جیسے اکابرِ علم و دین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے۔ اور وہ بھی ایک ایسے فن سے متعلق مسئلہ میں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری ہے اور ان حضرات کا عمر بھر اس کے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔

دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لیے کر لیا کہ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور ان کے شخصی حالات اور اصلاحی و تجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین اور عند اللہ مقبولیت کا میں پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا کہ یہ سب حضرات (اپنے اپنے زمانہ میں اسرار دین کے عارف اور اُمت کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قُربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر اُن میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے رہے۔ بے شک مجدد نبی کی طرح معصوم اور صاحبِ وحی تو نہیں ہوتا لیکن وہ بدعات کا داعی اور مروّج بھی نہیں ہو سکتا۔ خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دوسرے سب شعبوں سے زیادہ انہماک ہو اور وہ اس کا خاص داعی ہو اور اسی کے ذریعہ اصلاح و تجدید کا کام کر رہا ہو، اس میں اگر وہ بدعت وغیرہ میں امتیاز نہ کر سکے گا تو یقیناً وہ اصلاح سے زیادہ فساد کا اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہو گا۔

بہر حال یہ چند خیالی نکتے تھے جن پر پہنچ کر میرے ذہن کی الجھن کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے۔ اب مجھے اپنی غلطی ہی کو پکڑنے اور پالینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر میں نے اس غور وفکر کا سلسلہ اس وقت ختم کر کے سو جانے کا ارادہ کر لیا اور سو گیا۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قصہ ہے اُن کا معمول ہے کہ روزانہ نماز فجر کے بعد چند میل ٹہلتے ہیں۔ اُس دن یہ عاجز بھی ساتھ ہو لیا اور رات کے اپنے ذہنی بحث ومباحثہ اور اُس کے نتیجہ کا ذکر کیا اور عرض کیا:

"میرے دل ودماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تصوف کے ان اعمال واشغال کے بارے میں جواب تک میں نے سمجھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہو رہی ہے، لیکن ابھی تک میں اُس غلطی کو پکڑ نہیں سکا ہوں، چوں کہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لیے چاہتا ہوں کہ یہ گرہ بھی کھل جائے اور جو خلش باقی ہے وہ بھی نکل جائے۔"

موصوف میری یہ بات سن کر مسکرائے اور فرمایا:

"مولوی صاحب! آپ کو یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں؟ یہ بتلایئے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا: بدعت کی تعریف تو علمائے کرام نے کئی طرح سے کی ہے، لیکن جو زیادہ منقح اور محقق معلوم ہوتی ہے وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ جس کے لیے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔

فرمایا: ہاں ٹھیک ہے، لیکن یہ بتلایئے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ ورسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اُس طریقے سے حاصل نہ کی جاسکتی ہو جس طریقے سے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی، بلکہ اُس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقے کے استعمال کو بھی آپ "دین میں اضافہ" اور "بدعت" کہیں گے؟ (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے فرمایا) مثلاً: دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے۔ اور دین میں اس کا نہایت ہی تاکیدی

حکم ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اس کے لیے صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی، تعلیم کے لیے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا۔ نہ مدرسے تھے نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ صحبت اس مقصد کے لیے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی، تو اللہ تعالیٰ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کیے اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم و تعلّم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا اور اب تک اسی سے قائم ہے۔ تو کیا تعلیم و تعلّم کے طریقے میں اس تبدیلی کو بھی "دین میں اضافہ" اور بدعت کہا جائے گا؟

میں نے عرض کیا: نہیں! دین میں اضافہ جب ہوتا ہے، جبکہ مقصود اور اَمر شرعی بنا کر کیا جائے۔ لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے قدیمی طریقے کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس کو "دین میں اضافہ" نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہو گا۔ "

فرمایا: بس سلوک کے جن اعمال واشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے، اُن سب کی نوعیت بھی یہی ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ یہ سب نفس کے تزکیہ اور تحلیہ کے لیے کرایا جاتا ہے، جو دین میں مقصود اور مامور بہ ہے۔ مثلاً: یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ہر وقت اُس کا اور اُس کی رضا کا دھیان، فکر رہنا اور اس کی طرف سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن وحدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا۔ (کتاب وسنت کی جن نصوص سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اُن میں سے چند آئندہ اوراق میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔) لیکن رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دین کے لیے تعلیم وتربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں اور حضور ﷺ کے فیضان صحبت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی۔ لیکن بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لیے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کے لیے صحبت کے ساتھ "ذکر وفکر کی کثرت" کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے اُن کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لیے اُن کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کیے۔ اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لیے اور طبیعت میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لیے ضرب کا طریقہ نکالا ہے، تو اُن میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مامور بہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے اور اسی لیے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑا دی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ طریق اپنے اپنے زمانے کے حالات اور اپنے اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں ردوبدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لیے ان کے خاص حالات اور ان کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال اور اشغال تجویز کر دیتا ہے اور بعض ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنہیں اس طرح کوئی ذکر شغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی نصیب فرما دیتا ہے۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرور تاً کیا اور کرایا جاتا ہے۔

ان بزرگ کی اس تقریر اور توضیح سے میرا وہ ذہنی خلجان تو دور ہو گیا لیکن ایک نئی پیاس یہ پیدا ہو گئی کہ یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کو خود آزما کے دیکھا جائے اور اپنے ذاتی تجربے سے قلبی اطمینان اور مزید یقین حاصل کیا جائے۔ لیکن میرے حالات اور مشاغل میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تجربے کے لیے میں کوئی بڑا اور مستقل وقت دے سکوں۔ اس لیے میں نے بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا:

"اگر یہ ذکر و شغل ان مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر تو میں بھی اس کا محتاج ہوں، لیکن میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا، کیوں کہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق کر رکھا ہے اُن کو بھی میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

فرمایا: "مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے اور جان پڑتی ہے، لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ کی مشیت ہے، جن کو اللہ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے وہ اب ادھر توجہ ہی نہیں کرتے، حالاں کہ اگر تھوڑی سی توجہ بھی وہ ادھر دے دیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحب رحمہ اللہ نے، باوا صاحب نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اور حضرت سید صاحب

رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں اور جو کچھ کر دکھایا (جن کا سوواں اور ہزارواں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کر سکیں) اُس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اُس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوف کے راستہ سے پیدا کی گئی تھی، لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بے چارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں۔ ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔"

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا:

"خدا معلوم لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں، تصوف تو بس صرف اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے، وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا، تو دراصل تصوف ضروری نہیں ہے، بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہو جائے تو مبارک ہے، وہ اسی راستے سے حاصل کرلے اور ہم کو بھی بتلادے، ہم تو اسی راستہ کو جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سینکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے، جن میں سینکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور صاحبِ الہام بھی تھے۔" (تصوف کیا ہے؟: ص ۱۱ تا ۲۴)

آگے چل کر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق لکھتے ہیں:

تصوف اور اس کے اعمال واشغال کے متعلق میرے چند یقین

۱۔ تصوف کا مقصد اور اس کی حقیقت

الحمدللہ کہ اب اس باب میں کسی طرح کا کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ تصوف اور اُس کے اعمال واشغال کا اصل مقصد دین کی تکمیل اور خصوصاً ان کیفیات اور ملکات کی تحصیل کے سوا کچھ نہیں ہے جن کو کتاب وسنت ہی میں کمال ایمان واسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا ہے۔ چوں کہ اس بارے میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں الجھنیں ہیں، اس لیے جو کچھ اس سلسلہ میں، میں نے سمجھا ہے اس کو ذرا

تفصیل سے عرض کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی تکمیل کے لیے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ انسان کے قلب اور باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً محبت کے بارے میں سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں ارشاد ہے: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ "اور جو ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۶۵)

اور حدیث صحیح میں ہے۔

ثَلٰثٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ وَجَدَ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ۔۔۔۔۔۔۔

یعنی "ایمان کی حلاوت اس کو حاصل ہوگی جس میں تین چیزیں موجود ہوں، اُن میں سے اول یہ کہ اللہ ورسول ﷺ کی محبت اُس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ اگر کسی آدمی سے اُس کو محبت ہو تو وہ بھی اللہ ہی کے واسطے ہو اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا اُس کے لیے اتنا ناگوار اور تکلیف دہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا۔"

اور سورۂ انفال کے پہلے رکوع میں ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝

"سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا یہ حال ہے کہ جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو اور جب اُن کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو اُن کے نورِ ایمان میں زیادتی ہو اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں۔"

(سورۂ انفال: آیت ۲)

اور سورۂ مومنون میں اللہ کے اچھے اور کامیاب بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ ھُمْ مِّنْ خَشْیَۃِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِرَبِّھِمْ لَا یُشْرِکُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ

قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝

"بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے ہیں اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ہیں اور وہ جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتے وقت (اور اسی طرح دوسرے نیک کاموں میں) ان کے دل خائف رہتے ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور میں لوٹ کے جانا ہے (نہ معلوم ان کے یہ اعمال قبول ہوں یا نہ ہوں)، وہی لوگ بھلائیوں کی طرف تیز گامی کرتے ہیں اور وہی ان کے لیے دوڑ کر بڑھنے والے ہیں۔"

(سورۃ المؤمنون: ۵۷ تا ۶۱)

اور سورۂ زمر میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ

"اس سے ان لوگوں کے بدن کانپنے لگتے ہیں اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور پھر ان کا ظاہر و باطن نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک جاتا ہے۔" (سورۂ زمر: ۲۳)

اور سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ

"وہ لوگ جن کا یہ حال ہے کہ اللہ کو (ہر وقت اور ہر حالت میں) یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں، کھڑے، بیٹھے اور بستروں پر لیٹے ہوئے بھی۔" (سورۃ آل عمران: ۱۹۱)

اور سورۂ مزمل میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝

"اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے یکسو ہو کر اسی کی طرف متوجہ رہو۔"

(سورۂ مزمل: ۸)

ان آیتوں میں جن اوصاف و کیفیات کو اہلِ ایمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کا ان

سے مطالبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں :

۱۔ ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔

۲۔ اُن کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف اور لرزش کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

۳۔ اُن کے سامنے جب آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی جائے تو اُن کے نورِ ایمان میں اضافہ ہو۔

۴۔ اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہو۔

۵۔ وہ ہر دم اللہ کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے ہوں۔

۶۔ اللہ کا خوف اُن پر اتنا غالب ہو کہ نیکی کرتے وقت بھی ان کے دل ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی قابلِ قبول بھی ہو گی یا نہیں۔

۷۔ قرآن مجید کی تلاوت یا اُس کی آیتیں سننے سے اُن کے جسم کانپ جاتے ہوں اور اُن کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی طرف اور اُس کی یاد کی طرف جھک جاتا ہو۔

۸۔ وہ ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔

(۹) ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ان کا حال ہو۔

قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم کے احوال و کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے :

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ

”جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کے لیے محبت رکھے (جس سے محبت رکھے) اور اللہ ہی کے لیے بغض رکھے (جس سے بغض رکھے) اور اللہ ہی کے لیے دے (جس کو جو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ

دینے سے اللہ کی رضا ہی کے لیے روکے (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے) تو اُس نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔ (مشکوٰۃ شریف)

اسی طرح مشہور حدیث جبرئیل میں ایمان اور اسلام کی تکمیل کا نام احسان بتلایا گیا ہے اور اس کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے :

اَنْ تَعْبُدَاللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ

وفی روایۃٍ اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ

"احسان کا مقام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اور بندگی اس طرح کرو یا اس سے ہر دم اس طرح ڈرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیوں کہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو، پر وہ تم کو (ہر جگہ اور ہر آن) دیکھتا ہے۔ (فتح الباری)

پہلی حدیث میں "اخلاص" کا ذکر ہے اور دوسری حدیث میں "احسان" کا، اور یہ دونوں ان ہی احوال وکیفیات میں سے ہیں جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

دین میں ان احوال وکیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے حصول اور ان میں ترقی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرماتے تھے۔ اس سلسلہ کی یہ چند دعائیں اس عاجز کے نزدیک خاص طور سے غور اور توجہ کے لائق ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنْ نَّفْسِي وَاَهْلِيْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ

"اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ تیری محبت مجھے اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال سے اور (سخت پیاس کے وقت) ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔"

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْيَآءِ اِلَيَّ كُلِّهَا وَخَشْيَتَكَ اَخْوَفَ الْاَشْيَاءِ عِنْدِيْ وَاقْطَعْ عَنِّيْ حَاجَاتِ الدُّنْيَا بِالشَّوْقِ اِلٰى لِقَاءِكَ وَاِذَا اَقْرَرْتَ اَعْيُنَ اَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ دُنْيَاهُمْ فَاَقْرِرْ عَيْنِيْ مِنْ عِبَادَتِكَ

"اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ ہر قابلِ محبت چیز سے زیادہ تیری محبت مجھے محبوب ہو اور ڈرنے

کی ہر چیز سے زیادہ مجھے تیرا ڈر اور خوف ہو اور ملاقات کا شوق میرے دل پر ایسا غالب کر کہ دنیا کی ساری حاجتیں مجھ سے کٹ جائیں اور جس دن دنیا والوں کو ان کی چاہتی دنیا دے کر اُن کی آنکھیں ٹھنڈی کرے تو میری آنکھیں اپنی عبادت سے ٹھنڈی کر اور اپنی عبادت کے ذریعہ دل میں سکون اور ٹھنڈک پیدا کر۔ "

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ اَخْشَاكَ كَاَنِّیْ اَرَاكَ اَبَدًا حَتّٰی اَلْقَاكَ....

"اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ میں اس طرح تجھ سے ڈروں گویا ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہوں یہاں تک کہ اسی حال میں تجھ سے جا ملوں"۔....

(اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ اِیْمَانًا یُّبَاشِرُ قَلْبِیْ وَیَقِیْناً صَادِقاً حَتّٰی اَعْلَمَ اَنَّهٗ لَا یُصِیْبُنِیْ اِلَّا مَا كَتَبْتَ لِیْ وَرِضاً مِّنَ الْمَعِیْشَةِ بِمَا قَسَمْتَ لِیْ)

"اے اللہ! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں پیوست ہو جائے اور وہ سچا یقین مانگتا ہوں جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقین اور قطعی علم حاصل ہو جائے کہ مجھ پر صرف وہی حالت آسکتی ہے اور آئے گی جو تو نے میرے لیے لکھ دی ہے (یعنی یہ علم میرے دل کا حال ہو جائے) اور اس دنیا میں جس قسم کا گزارہ تو نے میرے لیے مقرر اور مقدر کر دیا ہے میں اس پر اپنے دل کی رضا تجھ سے مانگتا ہوں۔ "

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ التَّوْفِیْقَ لِمَحَابِّكَ مِنَ الْاَعْمَالِ
وَصِدْقَ التَّوَكُّلِ عَلَیْكَ وَحُسْنَ ظَنٍّ بِكَ

"اے اللہ! جو اعمال تجھے پسند ہیں میں ان کی توفیق تجھ سے مانگتا ہوں اور سچے توکل کا تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے ساتھ حسنِ ظن کی تجھ سے ہی استدعا کرتا ہوں"۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ نَفْسًا بِكَ مُطْمَئِنَّةً تُؤْمِنُ
بِلِقَائِكَ وَتَرْضٰی بِقَضَائِكَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ

"اے اللہ! میں تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں جس کو تجھ ہی سے اطمینان اور اُنس حاصل ہو، جسے تیری ملاقات پر سچا ایمان اور یقین نصیب ہو، جو تیری قضا و قدر پر راضی ہو اور جو تیرے دین (عطا) پر قانع ہو۔ "

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ مَسَامِعَ قَلْبِیْ لِذِکْرِكَ

"اے اللہ! میرے دل کے کان اپنے ذکر کے لیے کھول دے۔"

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ قُلُوْبًا اَوَّاھَۃً مُّخْبِتَۃً مُّنِیْبَۃً فِیْ سَبِیْلِكَ

"اے اللہ! میں تجھ سے ایسے قلوب کا سوال کرتا ہوں جو درد آشنا ہوں، ٹوٹے ہوئے ہوں اور تیری طرف رجوع کرنے والے ہوں۔"

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ وَسَاوِسَ قَلْبِیْ خَشْیَتَكَ وَذِکْرَكَ

وَاجْعَلْ هِمَّتِیْ وَهَوَایَ فِیْمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

"اے اللہ! میرے دل میں خطرے اور خیالات بھی بس تیرے خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر توجہ اور چاہت اُن ہی چیزوں کی طرف ہو جو تجھے محبوب ہوں اور جن سے تو راضی ہو۔"

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّاَعْطِنِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ نُوْرًا

"اے اللہ! میرے قلب میں نور بھر دے اور مجھے نور عطا فرمادے اور مجھے سراپا نور بنادے۔"

یہ سب دعائیں (اور اس قسم کی بیسیوں دعائیں) کتبِ حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں۔ آپ خود بھی یہ دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتے تھے اور امت کو ان دعاؤں کی تعلیم و تلقین بھی فرماتے تھے۔

ان دعاؤں میں جن چیزوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے، وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں۔ مثلاً: ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف، اللہ سے شوقِ ملاقات کا ایسا غلبہ کہ دنیا کی ضروریات اور خواہشات فراموش یا فنا ہو جائیں۔ عبادت میں آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ تعالیٰ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا وہ اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے، یقین صادق، رضا بالقضا، توکل علی اللہ، حسن ظن باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن اور مانوس ہونا اور اُس کی عطا پر قانع ہونا، ذکر اللہ سے قلب کا اثر لینا، اُس کا درد آشنا اور ٹوٹا ہوا اور جھکا ہوا ہونا، اللہ سے قلب کا تعلق اس درجہ ہو جانا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کا خوف وساوس اور خطرات کی

جگہ بھی لے لے اور بندہ کا جی صرف انہی چیزوں کو چاہے جو اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہیں، نور سے قلب کا معمور ہو جانا۔

ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے نہ اعمال کے باب سے، بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں ان کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

پس تصوف دراصل اس قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہے اور اس کے خاص اعمال واشغال (مثلاً: صحبتِ شیخ اور کثرتِ ذکر و فکر) کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیریں ہیں۔ ایسی تدبیریں جن کی تصدیق تجربہ کرتا ہے اور صاف ذہن رکھنے والے لوگوں کے لیے اُن کی نفسیاتی اور عقلی توجیہ بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔(عقلی توجیہ کے لیے "صراطِ مستقیم" (مرتبہ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ) کے چند ابتدائی اوراق کا مطالعہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ کسی درجہ میں کافی ہو گا۔)

یہاں یہ عرض کر دینا بھی غالباً ناظرین کے لیے مفید ہو گا کہ مندرجہ بالا آیات واحادیث اور دعاؤں سے جن قلبی کیفیات کا دین میں مطلوب ومقصود ہونا معلوم ہو چکا ہے، اُن میں سے چند کیفیات، مثلاً: عشق، یقین، قلب کی رقت اور سوز و گداز، یہ تو اصل و بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں اور باقی زیادہ تر کیفیات اُن کے نتائج اور لوازم ہیں۔ اس لیے تصوف کے ان اعمال واشغال کے ذریعہ براہِ راست صرف ان بنیادی کیفیات ہی کو قلب میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے بعد باقی چیزیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ اصولی نظریہ جس پر تصوف کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر اس کو دین کا تکمیلی شعبہ بھی سمجھا جاتا ہے۔

یہ عاجز بلا کسی انکسار کے عرض کرتا ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لااُبالی پن اور کچھ خاص حالات کی وجہ سے چوں کہ میں اس سلسلہ کے تجربہ کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکا، اس لیے خود تو ان کیفیات سے خالی اور محروم ہی ہوں، لیکن جو تھوڑی سی اور برائے نام توجہ کی جا سکی اور اس راہ کے بعض اکابرین کی خدمت میں کبھی کبھی حاضری کی جو توفیق اس سلسلے میں ملتی رہی اسی سے الحمدللہ یہ یقین اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ:

۱۔ تصوف اور اس کے اعمال واشغال کی غرض وغایت اور اُن کی حقیقت کے متعلق اُن بزرگ نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ صحیح ہے۔

۲۔ دل ودماغ نے یہ بھی مان لیا کہ تصوف کے ذریعہ جن قلبی کیفیات اور ملکات کی تحصیل کی کوشش کی جاتی ہے، دین کی تکمیل اور ایمانی حلاوت کا حصول ان پر موقوف ہے۔

۳۔ اس کا بھی یقین حاصل ہوا کہ تصوف ایمان واسلام کی تکمیل کے علاوہ ایک خاص قسم کی روح اور طاقت پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے اور اگر صلاحیت اور طبیعت کو مناسبت ہو تو یقین اور اعتماد، ہمت وعزیمت، صبر وتوکل اور ماسویٰ اللہ سے بے خوفی جیسے اوصاف (جو طاقت کا سرچشمہ ہیں) تصوف کے ذریعے ان کو پیدا کیا جا سکتا ہے اور اُبھارا جا سکتا ہے۔ اسی لیے تصوف کو اپنانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا سب سے بڑا حق میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اُن بندوں کو ہے جو بے دینی کی اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے طرز اور طریقے پر کسی بڑی اصلاحی تبدیلی کے لیے مصروف جدوجہد ہیں اور مادہ پرستی کی فضا کو خدا پرستی کی فضا سے بدلنا چاہتے ہیں۔

۴۔ تصوف سے دوری اور بے خبری کے دور میں میری یہ رائے تھی کہ تصوف کا قالب ہم کو بدل دینا چاہیے اور اُس کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے ایک نئے سانچے میں اس کو ڈھال دینا چاہیے، لیکن بعد میں جب تصوف اور اُس کے حاملین سے کچھ قُرب پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ صورت اور قالب میں ترمیم اور تبدیلی کا عمل برابر جاری ہے اور خود ہماری اس صدی میں بھی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ وغیرہ نے اپنے تجربہ اور اجتہاد سے اس میں بہت کچھ تجدید وترمیم کی ہے اور زمانہ حاضر کے تقاضے کے مطابق اس کو بہت مختصر اور سائنٹیفک کر دیا ہے اور اب بھی یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور بلاشبہ سلوک میں تجدید کے اس سلسلہ کو برابر جاری رہنا چاہیے، لیکن اس کا اب پورا پورا یقین ہو گیا کہ یہ کام صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو اس فن کے امام اور خود اس سمندر کے شناور ہوں، ورنہ اگر اس خدمت کی ذمہ داری میرے جیسے حضرات نے لے لی جنہوں نے نہ اس شعبہ کی تکمیل کی ہے اور نہ اس کے ساتھ اُن کا گہرا عملی تعلق رہا ہے تو اس کا بڑا امکان ہے کہ اخلاص اور ذہانت کے باوجود تصوف میں ان کی اصلاح وترمیم اسی قسم کی ہو جیسی کسی روایتی بڑھیا نے شاہی باز کی مرمت کی تھی۔

۵۔ تصوف اور اہلِ تصوف سے قریب ہونے کے بعد جن چند باتوں کا یقین ہوا اُن میں سے ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی پڑھالکھا اور کیسا ہی ذہین فطین ہو، تصوف سے صحیح واقفیت حاصل کرنے اور اس کے مَالہٗ وَمَاعَلَیہ کو علیٰ وجہ البصیرت جاننے کے لیے اس کو بھی اس کی ضرورت ہے کہ تصوف کی حامل کسی شخصیت کی صحبت اور خدمت میں اس کا کچھ وقت گزرے اور اس شعبہ کا عملی تجربہ حاصل کرنے پر بھی وہ زندگی کے کچھ دن صرف کرے، اس کے بغیر تصوف کو پوری طرح سمجھا اور جانا نہیں جاسکتا۔

جن صاحبِ ارشاد بزرگ کی خانقاہ میں اپنی حاضری کا ذکر گزشتہ صفحات میں رقم کر چکا ہوں، ایک موقع پر میرے ہی ایک سوال کے جواب میں موصوف نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں ادا فرمایا تھا:

"گھر کے اندر کی چیزوں کا پورا علم تو گھر میں داخل ہو کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔"

الغرض تھوڑے سے ہی تجربے سے اربابِ تصوف وسلوک کے اس مشہور مقولہ کی تصدیق حاصل ہوگئی کہ: من لم یذق لم یدر "جس نے نہ چکھا اُس نے نہ جانا"۔

یعنی "لذت ایں مے نہ شناسی بخدا تانہ چشی"۔ (خدا کی قسم! اس شراب کی لذت نہیں پہچان سکتے ہو جب تک کہ چکھ نہ لو)۔

کچھ دن ہوئے ایک بڑے اچھے، ذی علم اور ذہین صاحبِ قلم دوست کی ایک تحریر کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تھا جس میں انہوں نے تصوف پر اظہار خیال کیا تھا۔ کم از کم ناچیز کو تو ایسا کچھ محسوس ہوا کہ کوئی بڑا ذہین بچہ کسی ایسے موضوع پر اظہار خیال کر رہا ہے جس کے مبادی سے بھی واقفیت حاصل کرنے کا اس کو موقع نہیں ملا ہے، مگر پھر بھی اس کی ذہانت قابلِ داد ہے۔

۶۔ تصوف اور اُس کے بعض حلقوں کے اس چند روزہ قُرب و تعلق ہی سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ جس طرح دین کے دوسرے شعبوں کی طرف اچھی صلاحیتیں رکھنے والے افراد فی زمانہ بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً: دیکھا جارہا ہے کہ علم دین کے طالبوں اور علیٰ ہذا دین کی دعوت وخدمت کی طرف توجہ کرنے والوں میں بہت بڑی تعداد آج کل اُن ہی بے چاروں کی ہوتی ہے جو صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت ادنیٰ اور

پست درجہ کے ہوتے ہیں۔ بالکل یہی، بلکہ شاید دین کے دوسرے شعبوں سے زیادہ افسوسناک اور ابتر حال اس لحاظ سے دین کے اس شعبہ (تصوف) کا بھی ہے۔

اس وقت اُن "خانقاہوں" سے بحث نہیں، جو دراصل دھوکا فریب کی دکانیں ہیں اور جہاں اولیا اللہ کے نام پر شرک وبدعت کا کاروبار ہوتا ہے، اور نہ یہاں اُن نااہل موروثی سجادہ نشینوں اور پیشہ ور پیروں، صوفیوں کا ذکر ہے جو تصوف کے نام اور بزرگوں سے نسبت کی تجارت کرتے ہیں، بلکہ جو واقعی مشائخ حق اور صاحبِ ارشاد ہیں اُن کے پاس بھی جو طالب بن کر اب آتے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ (شاذ ونادر مثالوں کو مستثنیٰ کرکے) دل ودماغ کی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ بے چارے عموماً نیچی ہی سطح کے ہوتے ہیں اور اگرچہ اپنے اخلاص اور اپنی صادق طلب اور محنت سے ان میں سے بھی بہت سے اس شعبہ کی کچھ برکتیں ضرور حاصل کرلیتے ہیں، لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ بے چارے خانقاہی فیضان وتربیت کا ایسا نمونہ تو نہیں بن سکتے ہیں جن کا حال اور قال خانقاہیت کی بدنامی اور تصوف وروحانیت بیزاری کے اس دور میں دین کے اس شعبہ کی اہمیت اور افادیت تسلیم کرنے پر لوگوں کو مجبور کردے۔

اصولی بات ہے کہ جو کام جتنا زیادہ بلند اور لطیف ونازک ہو اُس کے کرنے والے بھی اُسی درجہ کے ہونے چاہیے۔ موجودہ دور میں تصوف کی ناکامی اور بدنامی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جو اس کے اہل ہیں وہ توجہ نہیں کرتے اور جو بے چارے توجہ کرتے ہیں عموماً ان کی صلاحیتیں معمولی ہوتی ہیں لیکن دنیا اُن ہی کو پھل سمجھ کر اصل درخت کے متعلق رائے قائم کرتی ہے۔

۷۔ اس موقع پر ایک چیز خود مشائخ کرام کے متعلق بھی ناظرین سے بلا تکلف عرض کرنا ضروری ہے:

جس طرح دنیا میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کامیاب وکیل ہو وہ اچھا ڈاکٹر بھی ہو اور جو بالغ النظر فلسفی ہو وہ سیاسیات یا معاشیات کا ماہر بھی ہو، اور جو ماہر انجینئر ہو وہ اچھا ادیب اور شاعر بھی ہو۔ بعینہٖ یہی حال دین کے مختلف شعبوں کا بھی ہے۔ بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو شخص وسیع النظر عالم اور بلند پایہ محدث یا فقیہ ہو وہ تصوف میں بھی خاص دستگاہ رکھتا ہو یا جو صاحبِ قلب صوفی اور عارف ہو وہ اسلامی قانون کا ماہر بھی ہو اور عہدِ حاضر کے اہم مسائل کے بارہ میں دینی نقطۂ نظر سے صحیح رائے قائم کرنے والی مجتہدانہ فکر وبصیرت بھی رکھتا ہو۔ بلکہ حقائق اور واقعات کی اس دنیا میں پہلے بھی

اکثر ایسا ہی ہوا ہے اور ہمارے اس زمانہ میں تو تقریباً ۹۵،۹۰ فیصد ایسا ہی ہے کہ جو کسی ایک شعبہ میں ماہر اور کامل ہوتا ہے وہ دوسرے شعبوں میں اکثر خام ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اس زمانہ میں ایسے لوگ اکثر مایوس اور محروم ہی رہتے ہیں جو صرف کسی ایسے ہی شخص سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں جو اُن کے مفروضہ معیار کے مطابق ہر جہت سے کامل مکمل ہو۔

یاد آتا ہے راقم سطور نے اپنے ایک محترم دوست سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک دفعہ عرض کیا تھا:

”آپ ماضی اور حال کے متعدد ایسے حضرات سے یقیناً واقف ہیں جن کی زندگی آپ کی نظر میں دین اور تقویٰ کا کوئی اچھا اور قابلِ تقلید نمونہ نہیں ہے اور بالخصوص اخلاص واحسان اور توکل و تسلیم جیسی اعلیٰ ایمانی صفات و کیفیات میں آپ کے نزدیک ان حضرات کا کوئی بھی خاص یا عام مقام نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اُن کا علم و فکر اور ان کی خداداد ذہانت اور بصیرت آپ کے خیال میں قابلِ استفادہ ہے اور ہم آپ ان کی چیزوں سے برابر استفادہ کرتے ہیں اور اُن لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں جو صرف اُن کی علمی اور تحقیقی کوششوں سے اس لیے فائدہ نہیں اُٹھاتے کہ وہ اُن کی نیک خواہش کے مطابق کوئی بڑے بزرگ اور صوفی قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ اسی طرح ہم اللہ کے کچھ بندوں کو ایسا پاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں تصوف اور سلوک پر زیادہ توجہ دی اور کسی شیخ کامل کی رہنمائی اور نگرانی میں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کا بڑا حصہ اس شعبہ کی تحصیل اور تکمیل پر صرف کیا اور اس لیے اس میں انہیں اختصاص اور امتیاز کا مقام حاصل ہو گیا۔ لیکن کسی دوسرے شعبے میں، مثلاً علم و فکر ہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں کوئی خاص بلندی حاصل نہیں ہے اور اس لیے دین کی بعض ضرورتوں کو، جن کو ہم بہت اہم سمجھتے ہیں، وہ اچھی طرح محسوس بھی نہیں کرتے اور ملت کے مشکل اور اہم اجتماعی مسائل میں وہ بہتر رہنمائی نہیں کر سکتے، یا فرض کیجیے کہ مطالعہ یا غور و توجہ کی کمی کی وجہ سے وہ وقت کے بہت سے اہم معاملات کو صحیح طور پر سمجھتے بھی نہیں تو ان خامیوں کو دیکھ کر اُن کے اس کمال کی بھی نفی کرنا جو واقع میں اُن کو حاصل ہے اور اپنی احتیاج کے باوجود اس شعبہ میں بھی اُن سے ہمارا استفادہ نہ کرنا اُن ہی لوگوں کی جیسی عامیانہ غلطی ہے جن کو تنگ نظری اور تاریک خیالی کا مریض سمجھا جاتا ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ جی تو اپنا بھی یہی چاہتا ہے اور ہر اچھا بھلا آدمی یہی چاہے گا کہ جو شیخ خانقاہ اور عارف حق آگاہ ہو وہ بلند پایہ مفسر و محدث اور بالغ النظر فقیہ و مجتہد بھی ہو، بلکہ ساتھ ہی ملت کی قیادت اور امامت کبریٰ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی بھی پوری صلاحیتیں رکھتا ہو اور اسی طرح جو اچھی نظر و فکر رکھنے والا عالم دین ہو وہ اسلامی شریعت و قانون میں مہارت رکھنے کے علاوہ اُمت کی قیادت اور حکومت کے نظام کو چلانے کی اعلیٰ صلاحیت بھی رکھتا ہو اور مزید براں اپنے قلب و باطن کے لحاظ سے اپنے دور کا جنید و بایزید بھی ہو۔ لیکن یہ تو صرف ہمارے جی کی چاہت اور ایک خوشگوار تمنا ہوئی، اور یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں وہ خیالات اور تمناؤں کی دنیا نہیں ہے بلکہ حقائق و واقعات کی دنیا ہے اور عملی آدمی کو اپنا طرزِ عمل واقعات ہی کی اس دنیا کو سامنے رکھ کر متعین کرنا چاہیے۔

جن صاحبِ خانقاہ بزرگ کی خدمت میں اپنی حاضری کا ذکر راقم سطور نے گزشتہ صفحات میں کیا ہے، اُن ہی کی زبان سے کئی بار یہ حکیمانہ ارشاد سنا ہے :

"یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ کسی ایک ہی دکان پر سب سودے اچھے مل سکیں، اس لیے جو سودا جس دکان پر اچھا ملے اس کے لیے آدمی کو اسی دکان پر جانا چاہیے۔"

یہاں تک جو کچھ عرض کیا اُس میں راقم کا روئے سخن تصوف کے مخلص ناقدین اور منکرین کی طرف تھا۔ اب اپنے تجربہ ہی کے چند نتیجے اور چند تاثرات تصوف کے حاملوں اور حامیوں سے بھی عرض کرنے ہیں۔

۸۔ تصوف کے مقصد اور اس کی حیثیت کے متعلق جو کچھ پہلے عرض کیا ہے اگرچہ خود اپنے کو بحمد اللہ اس میں شک نہیں رہا ہے کہ اصلیت وہی ہے۔ لیکن بعض مشائخ حق اور اُن کی خانقاہوں سے طلب اور عقیدت کا تعلق رکھنے والوں میں بھی بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جن کا ذہن اس بارے میں صاف نہیں ہوتا اور وہ طرح طرح کی غلط خیالیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً: تصوف کے جن اعمال و اشغال کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بعض کیفیات پیدا کرنے کا وہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ خانقاہی حلقوں میں بکثرت ایسے لوگ ملتے ہیں جو ان اعمال و اشغال ہی کو گویا اصل سلوک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ان اعمال و اشغال اور اذکار کے بعض وہ آثار جن کے متعلق تمام مشائخ محققین یہ فرماتے ہیں:

"ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح کے اوہام وخیالات ہیں۔"

تصوف کے ہمارے حلقوں میں تعلق رکھنے والے بہت سے حضرات ان ہی کی طلب میں اُلجھے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سی غلطیاں اور اُلجھنیں ہیں جن میں خانقاہی طالبین بکثرت مبتلا ہیں۔ غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بعض بزرگ ذہنوں کی صفائی کی طرف پوری توجہ نہیں فرماتے، حالاں کہ یہ بڑے اہم درجے کی ضرورت ہے اور اس ناچیز کا خیال ہے کہ سلوک وطریقت کے جن حلقوں میں پہلے کبھی گمراہیوں نے جگہ پائی ہے، وہ بعض ایسے بزرگوں کی اسی قسم کی بے توجہی کا نتیجہ ہے جو خود ہمارے نزدیک ان گمراہیوں میں مبتلا نہ تھے۔ تصوف کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ مشائخ اگر پوری طرح چوکنے نہ رہیں اور اپنے طالبین اور معتقدین کے ذہنوں کی صفائی اور خیالات کی اصلاح کی فکر نہ رکھیں تو شیطان کی گمراہ کرنے والی کوششیں اس حلقے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہوسکتی ہیں۔ بہر حال ہمارے بزرگوں کو اس خطرے سے غفلت نہیں برتنی چاہیے اور اذہان وخیالات کی صفائی اور اصلاح کو ذکر وشغل سے بھی مقدم سمجھنا چاہیے۔

(۹) ائمہ تصوف، امام ربانی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ وغیرہ نے اس پر بڑا زور دیا ہے کہ طالب کو پہلے ضروری عقائد کی تصحیح اور بقدرِ ضرورت علمِ دین حاصل کرنا چاہیے اور اس کو شیخ کے فرائض میں گردانا ہے کہ وہ اگر طالب اور مرید میں یہ کمی دیکھے تو اُس کو اس طرف متوجہ کرے۔ لیکن بعض مشائخ کے یہاں اس ذمہ داری کا احساس اور اس کے عملی اہتمام میں بہت کمی دیکھنے میں آئی۔ بہت سے بیچارے سیدھے سادے ایسے بندے ان کی خدمت میں بیعت کے لیے آتے ہیں جن کی باتوں سے اور جن کے ظاہری حال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان بے چاروں کو دین کی وہ ضروری اور بنیادی باتیں بھی معلوم نہیں جو ہر مسلمان کو معلوم ہونا چاہئیں اور بہت واضح اندازہ اس بات کا ہوتا ہے کہ غالبًا ان کو صحیح نماز پڑھنا بھی نہ آتا ہوگا، لیکن کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ ایسوں کو بھی مشائخ کے عام طریقے پر تجدیدِ ایمان اور توبہ کرا کے بس بیعت کر لیا گیا اور پڑھنے کے لیے کوئی تسبیح اُن کو بتادی گئی اور بقدرِ ضرورت دین سیکھنے کی طرف نہ کوئی توجہ دلائی گئی اور نہ اس کا کوئی انتظام فرمایا گیا۔ حالاں کہ ان حضرات کے لیے یہ بہت آسان ہے کہ ایسے جو لوگ بھی اُن کے پاس آئیں اُن کو دو، چار دن کے لیے روک کر اُن کی ضروری تعلیم (عقائد

اور نماز کی تصحیح وغیرہ) کسی خادم کے سپرد کردی جائے۔ جیسا کہ نئے آنے والوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا۔

ممکن ہے کہ ان بزرگوں کی اس بے توجہی کا سبب یہ ہو کہ ان آنے والوں کی اس درجہ جہالت اور دین کی بنیادی چیزوں سے بھی اتنی ناواقفیت کا ان حضرات کو اندازہ نہ ہوتا ہو، لیکن عرض یہی کرنا ہے کہ اس طرف ان حضرات کی توجہ کا مبذول نہ ہونا اور اس پہلو پر نظر نہ کرنا ان کے ذمہ دارانہ منصب کے شایانِ شان نہیں۔

۱۰۔ تصوف کی تاریخ پر جن حضرات کی نظر ہے اُن سے یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ مختلف زمانوں میں اس راہ سے کیسی کیسی گمراہیاں اُمت میں داخل ہوئی ہیں اور آج بھی اپنے آپ کو تصوف وصوفیا کی طرف منسوب کرنے والوں میں کتنی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے تصورات اور اعمال، اسلام اور توحید کی نسبت کفر اور شرک سے زیادہ قریب ہیں۔ اللہ نے جنہیں واقفیت اور بصیرت دی ہے وہ جانتے ہیں کہ خانقاہی حلقوں میں اس قسم کی گمراہیاں زیادہ تر بزرگوں کے ساتھ عقیدت اور خوش اعتقادی میں غلو اور تعظیم میں افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے شریعت وسنت کے حامل اور اپنی دینی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والے مشائخ حق کا یہ خاص الخاص فریضہ ہے کہ وہ اپنے سے تعلق ومحبت رکھنے والوں کو اعتقادی اور عملی غلو اور افراط کی اس بیماری سے محفوظ رکھنے کی طرف ہمیشہ پوری بیداری کے ساتھ متوجہ رہیں اور اس معاملہ میں ہرگز تساہل سے کام نہ لیں۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہمارے بزرگوں کے سامنے رہنا چاہیے۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ کسی صحابی کی زبان سے نکل گیا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ (یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) حضور ﷺ نے اُن کو سخت تنبیہ کی اور فرمایا:

جَعَلْتَنِي لِلّٰهِ نِدًّا بَلْ مَاشَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ

"تونے مجھے اللہ کے برابر بنادیا، بلکہ یہ کہو کہ "جو تنہا خدا چاہے۔"

ایسے ہی ایک اور موقع پر بعض صحابہ کو تنبیہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا يَسْتَهْوِيَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ. عَبْدُ اللّٰهِ

وَرَسُوْلُهٗ مَا اَحَبُّ اَنْ تَرْفَعُوْنِیْ فَوْقَ مَنْزِلَتِیَ الَّتِیْ اَنْزَلَنِیَ اللّٰهُ

"لوگو! تمہیں شیطان گمراہ نہ کرے اور تم اس کے بہکائے بہک نہ جاؤ، میں عبد اللہ کا بیٹا محمد ہوں، اللہ کا بندہ اور بس اُس کا رسول ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اس درجہ سے اوپر اُٹھاؤ جہاں خدا نے مجھے رکھا ہے۔"

اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی نظر کتنی باریک بین تھی اور آپ کس قدر محتاط تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے جو صحاح میں مروی ہے کہ جس روز آپ ﷺ کے صاحبزادے "ابراہیم" (علی ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی وفات ہوئی۔ اتفاق سے اُسی روز سورج گرہن ہو گیا اور آپ کو شبہ ہوا کہ لوگ کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ سورج کو یہ گہن بیت نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے اس حادثہ کی وجہ سے لگا ہے، تو آپ ﷺ نے اسی وقت اعلان کرا کے لوگوں کو مسجد میں جمع کرایا اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد اعلان فرمایا:

(اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰیَتَانِ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ لَا
یَنْکَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَّلَا لِحَیَاتِهٖ....)

"چاند اور سورج اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت و حیات سے اُن کو گرہن نہیں لگتا (بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حساب کے مطابق اور اُس کے حکم سے ایسا ہوتا ہے)۔۔۔"

چوں کہ اُمت کے تمام طبقوں میں صرف مشائخ ہی کا طبقہ ایسا ہے جن کے ساتھ عقیدت میں لوگوں کو اس قسم کا غلو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، اس لیے ان حضرات کا یہ خاص الخاص فریضہ ہے کہ اس بارے میں اپنی ذمہ داری اور مسؤلیت ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

تصوف اور اُس کے اعمال واشغال کے متعلق بعض شبہات

مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ آگے لکھتے ہیں:

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے جب "الفرقان" کے صفحات میں یہ شائع ہوا تو بعض دوستوں کی طرف سے کچھ سوالات اس سلسلہ میں کیے گئے اور "الفرقان" ہی میں اس عاجز نے اُن کے جوابات دیے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن جوابات کو بھی اس کتابچہ کا جزو بنادیا جائے۔"

۱۔ ایک صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"تصوف کی جو اہمیت آپ کے اس مقالہ سے ظاہر ہوتی ہے اگر واقعۃً اس کی اتنی ہی اہمیت ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق اور اس کے اعمال واشغال سے متعلق صریح احکام کیوں نہیں دیے؟ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی چیز دین میں اس قدر ضروری ہو کہ ایمان واسلام کی تکمیل اُس پر موقوف ہو اور رسول اللہ ﷺ نے اُمت کو اس کی تعلیم نہ دی ہو۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحب نے میرے مقالہ کو بالکل غور سے نہیں پڑھا۔ میں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا تو حاصل ہی یہ ہے کہ تصوف کا جو مقصود ہے اور جو اس کی غایت اور غرض ہے (یعنی اللہ کی محبت وخشیت اور یقین واستحضار اور اخلاص واحسان جیسی کیفیات کا حاصل کرنا) سو اس کو تو دین میں اہمیت ہے اور یقیناً ایمان واسلام کی تکمیل اس پر موقوف ہے اور بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اُمت کو اس کی تعلیم اور ترغیب دی ہے۔ کتاب وسنت کے جو نصوص اس سلسلہ میں پہلے لکھے جاچکے ہیں وہ اس کے ثبوت کے لیے کافی سے زائد ہیں۔ رہے اس کے خاص اعمال واشغال (مثلاً اذکار ومراقبات وغیرہ) تو میں یہ صراحت سے لکھ چکا ہوں کہ یہ اس کے صرف وسائل اور ذرائع ہیں اور اس قسم کے ذرائع اور وسائل کے متعلق نبوی طریقِ تعلیم اور اصولِ تشریع کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی تصریح اور تعیین نہ کی جائے، تاکہ ہر زمانہ کے حالات کے مطابق جو جائز ذرائع اور وسائل مناسب سمجھے جائیں انہیں اختیار کیا جاسکے اور اس میں تصوف کو کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ دین کے دوسرے شعبوں کا حال بھی یہی ہے۔

غور فرمایا جائے کہ دین کا سیکھنا سکھانا دین کے بنیادی فرائض میں سے ہے، لیکن کتاب وسنت میں اس کے طریقے کی بھی کوئی تعیین نہیں کی گئی۔

اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت اور اشاعت اُمت کا کتنا اہم فریضہ ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق بھی یہ نہیں بتلایا کہ تم اس کے لیے فلاں فلاں طریقے اختیار کرنا، حتیٰ کہ جب عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ میں یمامہ کی جنگ میں چار سو حافظ قرآن صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے تو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال ہوا کہ سینوں میں محفوظ کرنے کے علاوہ ہمیں قرآن کو سفینوں میں محفوظ کرنے کا بھی انتظام کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں خاص اہتمام اور ذمہ داری سے ایک سرکاری نسخہ بھی تیار ہونا چاہیے۔ چناں چہ انہوں نے اپنی یہ تجویز حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کی۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو ابتداءً اس کے ماننے میں تامل ہوا اور انہوں نے یہی فرمایا کہ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے نہ تو خود کیا اور نہ ہمیں اس کا حکم دیا اس کو ہم کیوں کریں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دلائل سے بالآخر وہ مطمئن ہوگئے اور پھر ان ہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی خاص نگرانی میں یہ کام انجام پایا۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں ایک اور قدم اُٹھایا کہ اپنے خاص اہتمام سے اور اپنی نگرانی میں اس مصحف کی نقلیں کرا کر تمام بلادِ اسلامیہ میں روانہ کیں اور اُس وقت سے لے کر اب تک قرآن مجید کی حفاظت واشاعت، تعلیم وتبلیغ اور ترجمہ وتفسیر کے سلسلہ میں خدمتِ قرآن کے کتنے ہی نئے نئے قدم اُٹھائے جاچکے ہیں۔

پس یہ خیال کہ جو چیز دین میں اہم ہو اس کے ذرائع اور وسائل کی تصریح اور تعیین بھی کتاب وسنت میں ہونی چاہیے اور اُمت کی قیامت تک کی دینی ضروریات کے متعلق تفصیلی اور جزئی ہدایات ہمیں تصریح اور تعیین کے ساتھ کتاب وسنت میں ملنی چاہئیں، بہت ہی سطحی قسم کا مغالطہ ہے اور انبیا علیہم السلام کے طریقِ تعلیم اور اصولِ تشریع سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

۲۔ ایک صاحب نے دریافت کیا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ کی محبت وخشیت اور اخلاص واحسان وغیرہ ایمانی کیفیات پیدا کرنے کے لیے تصوف میں جن اعمال و اشغال (مثلاً صحبتِ شیخ اور اذکار ومراقبات وغیرہ) پر زور دیا جاتا ہے، کیا کتاب وسنت

میں کہیں اس کا اشارہ ملتا ہے کہ ان چیزوں سے یہ کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں؟ "

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگرچہ واقعہ یہی ہے کہ اس عاجز کے نزدیک صحبت اور ذکر و فکر کا قلب پر اثر انداز ہونا کتاب وسنت سے اشارۃً ہی نہیں بلکہ صراحۃً بھی معلوم اور ثابت ہے۔ [1]

لیکن اگر بالفرض کتاب وسنت میں اس کا کوئی اشارہ نہ بھی ہو تب بھی اصل مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جب اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں اللہ کے لاکھوں صالح بندے اپنا یہ تجربہ بیان کر رہے ہیں کہ ان اعمالِ صالحہ سے یہ کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تو ان کی اس تاثیر اور افادیت کو ہمیں مان لینا چاہیے۔ میرے جن دوست نے یہ سوال کیا ہے وہ "صالح لٹریچر" کے ذریعہ اصلاح پر بہت یقین رکھتے ہیں (مجھے بھی اس سے انکار نہیں ہے) لیکن وہ سوچیں، کیا کبھی اُن کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ اُن کے "صالح لٹریچر" کی اس تاثیر کے متعلق کوئی اشارہ کتاب وسنت میں موجود ہے؟ میرا خیال ہے کہ اُن کے دل میں کبھی بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا ہو گا، کیوں کہ وہ اپنے ذاتی علم و تجربے سے اور اپنے جیسے بہت سے لوگوں کے تجربے سے اس بارے میں مطمئن ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اپنی چیزوں اور اپنے تجربوں کے ساتھ تو ہمارا طرزِ عمل یہ ہے، لیکن حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ، سری سقطی رحمہ اللہ، شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ، خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ، خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ، مجدد الف ثانی رحمہ اللہ، شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ، شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ، سید احمد شہید رحمہ اللہ جیسے ہزاروں بندگانِ خدا کا اجماعی واتفاقی تجربہ بھی ہمارے لیے موجبِ اطمینان نہیں۔

---

[1] حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہ صحابی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنا حال یہ پاتے جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور مجلس میں رہتے، دل کی یہ کیفیت رہتی کہ ایک لمحہ کے لیے بھی غفلت نہ ہوتی اور عیب گویا معلوم ہو جاتا، لیکن جب اپنے گھروں پر ہوتے یہ کیفیت نہ ہوتی اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں دفن کر کے ہم نے مٹی سے ہاتھ جھاڑے ہی تھے کہ ہمیں اپنے قلوب بدلے ہوئے نظر آئے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عالم سے عالم برزخ میں منتقل ہو جانے سے ہمارے قلوب کی حالت میں فرق محسوس ہوا۔ ان دونوں روایتوں سے صحبت کا قلبی کیفیات میں موثر ہونا صاف طور سے معلوم ہوتا ہے اور ذکر کی تاثیر کے لیے قرآن مجید کی آیت ﴿ولذکر اللہ اکبر﴾ صریح شاہد ہے۔ جس سیاق میں یہ آیت وارد ہے اس پر غور فرمایا جائے اور فکر و مراقبہ بھی ذکر ہی کی ایک خاص اور زیادہ گہری شکل ہے۔

س۔ ایک صاحب نے ذکر میں جہر اور ضرب سے اپنا سخت طبعی انقباض ظاہر کیا ہے اور یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ:

"اس میں ریاکاری کا شبہ ہوتا ہے اور آج کل کے اکثر سنجیدہ حضرات اس کو ریاکاری ہی سمجھتے ہیں۔"

جہری اور ضربی ذکر سے طبعی انقباض تو ایک ذوقی اور طبعی چیز ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طبیعتیں اور اُن کے ذوق بہت مختلف بنائے ہیں، بعض طبیعتیں وہ بھی ہیں جنہیں جہری اور ضربی ذکر سے ہی انس اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے مشائخ محققین طبیعتوں کے رخ اور اُن کی مناسبتوں کو دیکھ کر جہری یا سری ذکر اور دوسرے اشغال اُن کے لیے تجویز کرتے ہیں، لیکن ذکر بالجہر کے بارے میں ریاکاری کا جو شبہ ظاہر کیا گیا ہے یہ میرے نزدیک بالکل بے سوچی سمجھی بات ہے۔ اس زمانے میں جبکہ بقول انہی صاحب کے سنجیدہ آدمی ذکر بالجہر کو ریاکاری سمجھتے ہیں، اپنا اندازہ یہی ہے کہ کسی کو بالجہر ذکر کرتا دیکھ کر لوگ اس کے معتقد نہیں ہوتے، بلکہ بہت سے آدمی تو اس کو کم عقل یا مکار اور ریاکار سمجھتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں جہری ذکر میں ریاکاری کا امکان فی زمانہ بہت کم ہے۔ بلکہ اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ آج کل کے ماحول میں ذکر بالجہر اکثر ریا شکنی کا ذریعہ ہو جاتا ہے اور دفع خطرات و وساوس میں ذکر بالجہر کی تاثیر اہلِ تجربہ کے نزدیک بالکل مسلّم ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات یہاں اور قابلِ ذکر ہے کہ ذکر میں جہر اور ضرب کے جو طریقے تصوف کے بعض سلاسل میں معمول ہیں، فنِ طب اور علم النفس کی روشنی میں اُن کی افادیت اور تاثیر بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ عاجز تو تصوف کے اکثر اشغال کے متعلق یہی سمجھتا ہے کہ بعض کیفیات اور تاثرات اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے یہ سب ایک طرح کی طبی اور نفسیاتی تدبیریں ہیں، اور اس لیے ان کو اہمیت دینا نہ صرف یہ کہ غیر صحیح ہے بلکہ اصل مقصد کے لیے مضر بھی ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ان چیزوں میں ہر ایک کا ادراک یکساں ہی ہو، بلکہ بعض اکابر سے سنا کہ اللہ کے بہت سے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو سلوک کی راہ میں اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے بہت تیزی سے ترقی کرتے ہیں اور سلوک و تصوف کا جو اصل مقصد ہے وہ اُن کو بفضلہ تعالیٰ نصیب ہو جاتا ہے اور آخر تک انہیں کسی لطیفہ اور کسی مقام کا بھی ادراک اور احساس نہیں ہوتا۔

اس عاجز کو اس دور کے جن اکابرِ سلوک سے شرف نیاز حاصل ہوا اُن سب کو اس پر متفق پایا کہ خاص کر اس زمانے کے لیے یہی اجمالی سلوک زیادہ مناسب ہے اور محققین نے تصریح فرمائی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سلوک بھی اجمالی ہی تھا۔

۴۔ ایک صاحب نے فرمایا:

''ہم بہت سے آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ برسوں خانقاہوں میں رہنے اور وہاں ذکر شغل کرنے کے باوجود اُن میں وہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں جن کے لیے تصوف اور خانقاہیت کی ضرورت بتلائی جاتی ہے۔ ''

بلاشبہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن انصاف فرمایا جائے یہ حال اب صرف خانقاہوں ہی کا نہیں ہے، بلکہ ہمارے دینی مدرسوں اور دوسرے تمام دینی واصلاحی سلسلوں کا حال بھی اس وقت یہی ہے کہ سینکڑوں میں دس بیس مشکل سے نکلتے ہیں، تو کیا ان سب کو غلط اور فضول قرار دے کر ایک دم ختم کر دینا صحیح طرزِ عمل ہو سکتا ہے؟ صحیح طریقِ کار ان حالات میں یہ ہے کہ ہر سلسلہ اور ہر ادارہ کو زیادہ مفید اور کار آمد بنانے کی ہر ممکن کوشش اور تدبیر کی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جائے۔ لیکن نتائج میں کمی اور نقص دیکھ کر اس کو سرے سے ختم کر دینے اور فضول قرار دینے کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ جن ناساز گار حالات میں اور جس انتہائی درجہ کے فاسد اور سخت مادہ پرستانہ ماحول میں ہمارے ان دینی اداروں کو کام کرنا پڑ رہا ہے اُن میں دس پانچ فیصد کامیابی بھی ہر گز ناکامی نہیں ہے۔

۵۔ ایک صاحب نے فرمایا:

''صوفیوں کے طرزِ عمل سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ تصوف دراصل ''رہبانیت'' اور گوشہ نشینی کا نام ہے اور اس کی تائید کرنا دراصل اسلام میں رہبانیت کو داخل کرنا ہے۔ ''

میرے نزدیک یہ بھی اُن ہی باتوں میں سے ہے جو اس سلسلہ میں بے سوچے سمجھے کی جاتی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں دراصل خود ان کے دل میں تصوف کے غلط معنی بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ اپنی اسی غلط فہمی کی بنا پر صوفی صرف اُن ہی لوگوں کو سمجھتے ہیں جو رہبانیت پسند اور گوشہ گیر ہیں، اور پھر اپنے اسی تصور کی بنیاد پر وہ یہ کہتے ہیں کہ تصوف رہبانیت کا نام ہے اور ہر صوفی ''راہب'' ہی ہوتا ہے۔

اگر یہ حضرات خود اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے اور تصوف کے لیے رہبانیت اور گوشہ گیری کو ضروری نہ سمجھتے تو اس دور میں بھی ایسے بہت سے بندگانِ خدا دیکھ سکتے تھے جو بحمد اللہ سچے صوفی بھی ہیں اور مردِ میدان بھی۔ مگر بات وہی ہے کہ جو گوشہ گیر نہ ہو، یہ بے چارے اپنی کم نگاہی سے اُس کو صوفی مان ہی نہیں سکتے۔ اس کا علاج تو خود اپنے علم اور تصور کی تصحیح سے ہی ہو سکتا ہے۔

(تصوف کیا ہے؟: ص۴۳تا۵۹)

تصوف اور اس کے اعمال واشغال کے متعلق بعض شکوک وشبہات کے جوابات حضرت مولانا محمد ادریس صاحب ندوی نے بھی دیئے ہیں ان کو بھی پڑھ لیجیے۔

تصوف اور اُس کے اعمال واشغال کے متعلق بعض شکوک وشبہات کا جواب

تصوف اور اُس کے اعمال واشغال کے متعلق جو شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں اُن کی حسب ذیل دو بڑی قسمیں بیان کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ پہلی قسم ان شکوک وشبہات کی ہے جو رسمی خانقاہوں اور رسمی سجادہ نشینوں کو دیکھ کر یا اُن کے ہفوات سُن کر پیدا ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ جس شخص کو کتاب وسنت کی ادنیٰ واقفیت بھی ہے وہ معمولی غور وفکر کے بعد سمجھ لے گا کہ یہ سب فریب ہے اور حقیقت اس سے بہت دور ہے۔

۲۔ دوسری قسم ان شکوک وشبہات کی ہے جو علمی طور پر پیش آتے ہیں۔ اس قسم کے شبہات زیادہ تر اُن لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں جن کو نہ محققین صوفیا کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا ہے اور نہ اپنے زمانہ کے محققین سے سابقہ پڑا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف فلسفہ اشراق، جدید افلاطونی الٰہیات اور ہندو جوگ سے ماخوذ ہے حالاں کہ امر واقع یہ نہیں ہے۔

فلسفہ اشراق اور ہندو جوگ چند ریاضتوں اور مجاہدوں کے سوا کیا ہے؟ وہ انہی مجاہدوں اور محنتوں کو مقصودِ حقیقی جانتے ہیں اور اس کے برعکس ہمارے صوفیا اُن ریاضتوں اور مجاہدوں کو، جن کے ساتھ اتباعِ شریعت نہ ہو، کوئی وقعت نہیں دیتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

”وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو تقلیدِ سنت سے الگ ہو کر اختیار کیے جائیں، معتبر نہیں ہیں، اس لیے کہ جوگی اور ہندوستان کے براہمہ اور یونان کے فلاسفہ بھی ان کو اختیار کرتے ہیں اور یہ ریاضتیں ان کی گمراہی میں اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں کرتی ہیں۔“ (جلد اول، مکتوب دو صد وبست وکیم:۲۷۱)

مرشد العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ کے ”ایک کرامت“ نام کے چند الفاظ غور سے سننے کے قابل ہیں :

”اور بعض جُہلا جو کہہ دیتے ہیں کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور ہے، محض اُن کی کم فہمی ہے۔ طریقت بے شریعت خدا کے گھر مقبول نہیں، صفائی قلب کفار کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ قلب کا حال مثل آئینہ کے ہے، آئینہ زنگ آلودہ ہے تو پیشاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے اور گلاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے، لیکن فرق نجاست اور طہارت کا ہے۔ ولی اللہ کو پہچاننے کے لیے اتباعِ سنت کسوٹی ہے، جو متبعِ سنت ہے وہ اللہ کا دوست ہے اور اگر مبتدع ہے تو محض بے ہودہ ہے، خرقِ عادات تو دجال سے بھی ہوں گے۔“ (رجوم المذنبین:۱۲۹)

تصوف کی مشہور ومتداول کتابیں سامنے رکھیے، مثلاً: ”کتاب اللمع“، ”تعرف رسالہ قشیریہ“، ”عوارف“، ”فتوح الغیب“، ”احیاء العلوم“، ”مدارج السالکین“، ان کتابوں کے صرف ابواب پر نظر ڈال لیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ ان کتابوں میں توحید اور اُس کے احوال، اتباعِ سنت، عبادات کی خشوع وخضوع کے ساتھ ادائیگی، معاملات کی صفائی اور تصفیہ اخلاق کے سوا کیا ہے؟

بلاشبہ تصوف کی بعض کتابوں میں کچھ ایسے مضامین بھی آئے ہیں جن سے بعض طبائع کو وحشت ہو سکتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ مضامین تصوف کے اصول ومقاصد سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اگر کسی کا فہم اُن کو نہیں قبول کرتا ہے تو اُن کو چھوڑ دے، اسی طرح اگر خلافِ شریعت کوئی بات نظر آئے تو اُن کی وہی حیثیت سمجھیے جو کتبِ تفسیر میں اسرائیلیات یا کتبِ احادیث میں موضوعات کی ہے۔ اب اسرائیلیات یا موضوعات کی وجہ سے کتبِ تفسیر واحادیث سے تو قطع نظر نہیں کی جا سکتی ہے۔ جس طرح محققین کتبِ تفسیر وحدیث میں اغلاط کی تصحیح کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح محققین صوفیا بھی اپنے فن میں

صحیح کو سقیم سے اور درست کو غلط سے الگ کرتے رہے ہیں۔ کوئی وسیع النظر اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔

مثال کے طور پر مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی ”صراط مستقیم“ ہی کو دیکھیے کہ اس میں اسی قسم کی بدعات پر متنبہ کرنے کے لیے پورا ایک باب موجود ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے مکتوبات جلد سوم میں شیخ روز بہان بقلی کی کتاب ” تبیین غلطات المتصوّفہ “ کا ذکر موجود ہے جو اسی عنوان پر ہے۔ (مکتوب ہشتادونہم)

تصوف اور اُس کے اعمال واشغال کے متعلق شکوک وشبہات کے حل کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خود محققین صوفیا سے تصوف اور اس کے اعمال واشغال کی حقیقت اور مقصد کو سن لیا جائے اور پھر غور کیا جائے کہ شریعت تصوف کے مقصد سے کیا کچھ سوا چاہتی ہے؟ اور کیا تصوف شریعت پر اخلاص کے ساتھ عمل کے سوا اور کوئی چیز ہے؟

تصوف کی مستند اور مشہور کتاب احیاء العلوم کی شرح ”اتحاف السادۃ المتقین“ (ص۳۹) میں ہے:

”بس تصوف کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ ریاضتوں مجاہدوں سے علم ویقین تک پہنچا جائے۔“

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ حاجی محمد لاہوری کو تحریر فرماتے ہیں:

شریعت کے تین حصے ہیں: علم، عمل، اخلاص، جب تک یہ تینوں اجزا متحقق نہ ہوں، شریعت متحقق نہیں ہوتی۔ جب شریعت متحقق ہو جاتی ہے، حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے جو کہ تمام دنیاوی اور اُخروی سعادتوں سے بالاتر ہے۔ طریقت وحقیقت جس سے کہ صوفیا ممتاز ہوئے ہیں، دونوں (شریعت کے تیسرے حصے یعنی) اخلاص کی تکمیل میں شریعت کے خادم ہیں۔ پس ان دونوں (یعنی طریقت وحقیقت) کی تحصیل صرف شریعت کی تکمیل کے لیے کی جاتی ہے۔ احوال ومواجید اور علوم ومعارف جو اثناءِ راہ میں حاصل ہوتے ہیں، وہ مقاصد میں سے نہیں ہیں۔ ان سب سے گزر کر مقام رضا تک پہنچنا چاہیے جو کہ سلوک کا آخری مقام ہے۔ اس لیے طریقت وحقیقت کی منزلوں کو طے کرنے کا مقصد تحصیل اخلاص کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اخلاص ہی سے مقام رضا حاصل ہوتا ہے، کوتاہ اندیش، احوال ومواجید کو مقصود اور

مشاہدات و تجلیات کو مطلوب جانتے ہیں اور کمالاتِ شریعت سے محروم ہیں۔ بلاشبہ مقامِ اخلاص کا حصول اور مرتبہ رضا تک وصول ان احوال و مواجید کو طے کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی حیثیت مقصودِ حقیقی کے معاون کی ہے۔ یہ بات اس فقیر پر بہ صدقۂ حبیبِ خدا ﷺ اس راہ میں دس برس گزارنے کے بعد واضح ہوئی ہے۔ (جلد اول: مکتوب سہ و ششم)

مکتوب چہلم میں صراحت سے ارشاد فرماتے ہیں :

مخدوما! منازلِ سلوک طے کرنے اور مقاماتِ جذب قطع کرنے کے بعد یہی معلوم ہوا کہ اس سیر و سلوک کا مقصد مقامِ اخلاص کی تحصیل ہے۔ (جلد اول)

مقصود دو صد و ہفتم (جلد اول) میں ارشاد ہے:

"طریقِ صوفیا کے سلوک کا مقصد صرف یہ ہے کہ معتقداتِ شرعیہ کا یقین بڑھے، نیز احکامِ فقہیہ کے اداء میں آسانی ہو۔"

"انتباہ فی سلاسل اولیا اللہ" میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اور مقصود صوفیا کے طریقۂ علیہ کا مشاہدۂ حق کا حصول ہے۔ كَاَنَّكَ تَرَاهُ اور اس حضور کا نام انہوں نے مشاہدہ بالقلب رکھا ہے۔" (انتباہ فی سلاسل اولیا اللہ: ۴۹)

"القول الجمیل" میں ہے :

"مشائخ کے تمام طریقوں کا مرجع یہ ہے کہ ایک ہیئتِ نفسانیہ حاصل ہو جائے جس کو وہ نسبت کہتے ہیں، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارتباط و انتساب ہے اور اس کو سکینہ اور نور بھی کہتے ہیں۔"

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

"جب بندہ طاعات، طہارات اور اذکار پر مداومت کرتا ہے تو نفس ناطقہ میں ایک صفت قائم ہو جاتی ہے اور اس توجہ کا ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے"۔ (القول الجمیل)

حضرت شاہ اسماعیل صاحب شہید رحمہ اللہ "صراط مستقیم" میں تحریر فرماتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ اولیا اللہ کے ہر طریقہ میں مجاہدات، ریاضات، اذکار، اشغال اور مراقبات مقرر ہیں۔ ان امور میں سے ہر ایک طالب کے اندر ایک اثر پیدا کرتا ہے جس کے سبب سے طالب کو عالم قدس سے ربط پیدا ہو جاتا ہے، اسی کو صوفیا کی اصطلاح میں نسبت کہتے ہیں۔" (صراط مستقیم: ص ۱۶۵)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ کی جامع کمالات ہستی ابھی قریبی زمانے میں گزری ہے، اُن کے ارشادات عالیہ بھی سن لیجیے۔ وہ فرماتے ہیں :

"پس ہستی مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر و موجود جان کر حیا و شرم کے ساتھ بندہ (کا) مطیع رہنا مقصدِ اصلی ہے اور یہی احسان ہے باقی زوائد۔" (مکاتیب رشیدیہ: ص ۲۰)

"سنو کہ سلوک صحابہ و تابعین میں تحصیلِ احسان اور اپنا بندۂ ناچیز و بے اختیار ہونا اور من کل الوجوہ ذاتِ غنی کا محتاج اور اس کردگارِ بے نیاز محسنِ عباد کا حضور ہوتا تھا، بندگی در بندگی، عجز در عجز، توکل در توکل، ہمتِ اطاعت و جان و مال بازی فی رضا المولیٰ اس کا ثمرہ تھا۔"

(مکاتیب رشیدیہ: ص ۲۰)

"اصل الاصول اور اصل مقصود و مامور سلوکِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہے۔ اس میں بحث بندگی سے اور ایمان بالغیب کے کَالْمُشَاهَد ہو جانے سے اور حسن اخلاق سے ہے۔"

(مکاتیب رشیدیہ: ص ۳۲)

"مقصد جملہ اشغالات و مطلب و منتہیٰ جملہ مراقبات کا وہ حضورِ قلب بے کیف ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو نصیب فرمایا، نسبتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہی حضور تھا۔" (مکاتیب رشیدیہ: ص ۴۵)

"برادر! یہ تمام شریعت کا علم اور طریقت کا طریقہ نورِ یقین کی تحصیل کے واسطے ہے اور انجام و منتہیٰ سب کا یہی تو ہے کہ جس کا مسلمان سرسری طور سے علم رکھتے ہیں وہ یقین حق یقین، مثل مشاہدہ کے ہو جائے، یہ سب طرق کی انتہا ہے۔" (مکاتیب رشیدیہ: ص ۸۰)

"اور وہ کیفیت کہ اپنے آپ کو روبرو مالک معبود کے جانے اور شرم و حیا طاری ہو جائے، اس کا نام حضور اور یادداشت ہے، اس کو لسانِ شرع میں احسان کہتے ہیں اور یہی نسبت معتبرہ ہے کہ مسلسل چلی آتی ہے۔" (مکاتیب رشیدیہ: ص ۹۵)

سطور بالا میں محققین صوفیا کے چند اشارات پیش کیے گئے ہیں، ورنہ اس مفہوم کے دفتر کے دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ چیز تو ظاہر ہو گئی کہ تصوف تحصیلِ اخلاص و یقین کے سوا اور دوسری کوئی چیز نہیں ہے اور اخلاص و یقین کے مطالبہ سے قرآن مجید اور احادیث نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے دفاتر

بھرے پڑے ہیں۔

اب تصوف کے اعمال واشغال یعنی اس اخلاص ویقین کی تحصیل کے ذرائع ووسائل کا مسئلہ باقی رہا، تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت کی وجہ سے ان وسائل وذرائع کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی جو بعد کے لوگوں کو پیش آئی۔ وہاں نبوت کا آفتاب عالم تاب موجود تھا، وہ شمع وفانوس کی فکر میں کیوں پڑتے؟

حضرت مجدد رحمہ اللہ نے خوب ارشاد فرمایا:

"بدن کے قُرب کا دلوں کے قُرب پر بڑا اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی ولی صحابی رضی اللہ عنہ کے مرتبے کو نہیں پہنچتا ہے۔" (مکتوبات: جلد اول ص ۲۰۵)

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ "ارشاد الطالبین" میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اس بات پر اجماع ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم غیر صحابہ سے افضل ہیں، حالاں کہ علم وعمل میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور غیر صحابہ مشارکت رکھتے ہیں (یعنی جن عقائد واعمال کے مخاطب ومکلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، انہی کے مخاطب ومکلف ہم بھی ہیں، ایسا نہیں ہے کہ اُن کے لیے دوسرے اعمال وعقائد تھے اور ہمارے لیے دوسرے، نیز دین کی جن حقیقتوں کا علم ان کو تھا، بعد والوں کو بھی ان کا علم ہوا اور نماز روزہ وغیرہ جو عمل وہ کرتے تھے، بعد والوں نے بھی وہ کیے۔) اس کے باوجود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے راہِ خدا تعالیٰ میں جو نصف صاع جَو خرچ فرمایا ہے اگر دوسرا اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو دونوں برابر نہیں۔ یہ فرق ان باطنی کمالات کی بنا پر ہے جو اُن کو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے حاصل ہوئے تھے۔ (ص ۴)

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کے سوا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے طریقوں سے بھی اس نورِ اخلاص ویقین کو حاصل فرماتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ "القول الجمیل" میں فرماتے ہیں:

" میرا گمان غالب ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نسبت کو اور طریقوں سے بھی حاصل فرماتے تھے۔ مثلاً: نماز و تسبیحات پر اُن کے شرائط کے ساتھ مواظبت، طہارت اور یادِ موت اور عذاب وثواب کے خیال

پر مداومت، ان چیزوں سے مادی لذتوں سے بے تعلقی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ حضرات قرآن کی تلاوت، اس میں تدبر، وعظ اور زہد ورقاق کی احادیث کے سننے پر مواظبت فرماتے تھے اور اس سے اُن کو ایک ملکۂ راسخہ اور ہیئتِ نفسانیہ حاصل ہوتی تھی۔" (القول الجمیل)

اس سلسلے میں ایک اہم معاملہ کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے جس پر حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ اور مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمہ اللہ نے متنبہ فرمایا ہے، اس کی تشریح و تفصیل کا موقع نہیں ہے تاہم ممکن ہے کہ اہلِ ذوق اس سے مطمئن ہوں۔ حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا:

"فنافی اللہ اور بقاباللہ اور جذب و سلوک کے تمام مقامات کے طے کرنے کے بعد جو قُربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحبت کی بنا پر تمام اولیائے اُمت سے افضل قرار پائے، کیا اُن کو محض اسلام قبول کرنے سے یہ سیر و سلوک فیضِ صحبت سے حاصل ہو گیا تھا؟ اُن حضرات کو علم جذب و سلوک حاصل تھا یا نہیں؟ اگر حاصل تھا تو اُس کا کیا نام تھا؟ اور اگر نہیں حاصل تھا، تو کیا اُس کو بدعتِ حسنہ کہہ سکتے ہیں؟"

اب مجدد صاحب رحمہ اللہ کا جواب سنیے:

"اس اشکال کا حل صحبت سے تعلق رکھتا ہے، وہ بات جو اس مدت میں کسی نے نہیں کی، ایک مرتبہ لکھنے سے کیسے سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن جب دریافت کیا گیا تو اب جواب سے چارہ نہیں اس لیے مختصر طور سے لکھا جاتا ہے:

وہ قُربِ خداوندی جس کا تعلق فنا و بقا اور سلوک و جذب سے ہے، قُربِ ولایت ہے، اولیائے اُمت اس سے مشرف ہوئے ہیں اور جو قُرب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاصل ہوا وہ قُربِ نبوت ہے، اس قُرب میں نہ فنا ہے نہ بقا، نہ جذب ہے نہ سلوک اور یہ قُرب، قُربِ ولایت سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ قُربِ حقیقی ہے اور وہ قُربِ ظلّی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے، مگر ہر شخص کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی ہے، خواص بھی اس موقع پر عوام کے مشابہ ہیں۔

گر بو علی نوائے قلندر نواختے

صوفی بدے ہر آنکہ بہ عالم قلندر است

کمالات قُربِ نبوت اگر قُربِ ولایت کے راستے سے طے ہوتے ہیں تو فنا و بقا اور جذب و سلوک سے چارہ نہیں اور اگر اس راستے سے کمالات قُربِ نبوت نہ حاصل کیے جائیں تو فنا و بقا اور جذب و سلوک کی ضرورت نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قُرب نبوت کے راستے سے منزل طے کی ہے، جذب و سلوک اور فنا و بقا سے ان کو کام نہ تھا۔" (مکتوبات، جلد اول، مکتوب سہ صد و سیز دہم)

حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ "صراطِ مستقیم" میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ایک باریک نکتہ جس سے اہلِ زمانہ ناواقف ہیں حبِ نفسانی اور حبِ عقلی کے درمیان تمیز کرنا ہے۔ حبِ نفسانی مبادیٔ سلوک کے واردات میں سے ہے اور حبِ عقلی کمالاتِ انبیائے کرام علیہم السلام اور مقاماتِ اولیائے عظام میں سے ہے (حبِ نفسانی کا تعلق سلوک راہِ ولایت سے اور حبِ عقلی کا تعلق سلوک راہِ نبوت سے ہے، جیسا کہ "صراط مستقیم" میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے)۔ اکثر عوام صوفیا نے حبِ نفسانی کو حبِ عقلی کی جگہ دے رکھی ہے اور اس کو اشاراتِ شرعیہ کا مشارٌ الیہ جانتے ہوئے حضرات انبیا و اولیا کے سلوک کو اہلِ عشق و مواجید کے احوال سے تطبیق دینا چاہتے ہیں اور لاحاصل تشویشات میں پڑتے ہیں۔" (ص ۴)

اصل مقصود یہی سلوک راہِ نبوت ہے، مگر چوں کہ سلوک راہِ ولایت سے سلوک راہِ نبوت آسان ہو جاتا ہے اس لیے سلوک راہِ ولایت کو اختیار کیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "حصول نسبت ولایت سلوک راہِ نبوت کو آسان کر دیتا ہے، اور جس کو نسبتِ ولایت حاصل ہوتی ہے وہ نسبتِ نبوت کو تھوڑی محنت میں حاصل کر لیتا ہے۔" (صراط مستقیم: ص ۸)

اب تصوف کے اُن اعمال و اشغال کا مسئلہ باقی رہا، جن کی ضرورت عہدِ نبوت سے دوری اور ماحول کی ناسازگاری کے باعث متاخرین کو پیش آئی۔ اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ ان اعمال و اشغال میں ذکر و فکر یہ دو چیزیں بنیادی ہیں اور یہ دونوں چیزیں ماموراتِ شرعیہ میں سے ہیں۔ بحث جو کچھ ہے وہ ذکر و فکر کے طریقوں، وضعوں اور قیود میں ہے، تو خوب سمجھ لیجیے کہ ذکر و فکر کے یہ قیود، طرق اور اوضاع صرف تدبیر و معالجہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''ایضاح الحق الصریح''میں مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صوفیا کے نفع بخش اشغال کی حیثیت دوا و معالجہ کی ہے کہ بہ وقت ضرورت ان سے کام لے اور بعد میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو۔'' (ص۷۸)

معالجے کے یہ طریقے حالات کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ ''صراط مستقیم''میں ہے:

''ہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جدا ہوتے ہیں اس لیے ہر طریق کے محققین تجدیدِ اشغال کی کوشش فرماتے رہتے ہیں۔'' (ص۷)

اسی لیے محققین نے تصریح فرمادی ہے کہ: ''یہ ہر گز خیال نہ کرنا کہ نسبت بجز ان اشغال کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتی ہے۔'' (القول الجمیل)

بلکہ اگر ان طرق واوضاع اور اعمال واشغال کو کوئی مقصود جانتا ہے تو یہ حضرات اس پر سخت انکار فرماتے ہیں۔ ''ایضاح الحق الصریح''میں ارشاد ہے :

''وظائف واذکار، ریاضات، خلوت، چلہ کو مقرر کرنا، ذکر جہری اور ذکر خفی کی وضعوں کو مقرر کرنا، ضرب عدد اور مراقبہ برزخیہ کا مقرر کرنا، اگر طالب ان سب کو اصل کمال شرعی یا مکملات میں سے جانتا ہے تو یہ سب بدعت حقیقیہ ہیں، لیکن خواص جو اس کو صرف وسائل وذرائع جان کر رواج دیتے ہیں، اُن کے حق میں بدعتِ حکمیہ ہیں، اور اخص الخواص جو ان چیزوں سے بہ وقت ضرورت کام لیتے ہیں اور پھر کام نکلنے کے بعد چھڑا دیتے ہیں اُن کے حق میں یہ بدعت نہیں ہے۔''

(ص۳۷)

محققین صوفیا ان اشغال واعمال سے کس طرح کام لیتے ہیں اور پھر کس طرح ان سے الگ کر کے اصل مقصود میں لگادیتے ہیں، اس کو جاننے کے لیے صرف مکاتیب رشیدیہ میں سے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے چند ارشادات نقل کیے جاتے ہیں :

''ذکر کے نور کا ملاحظہ جو ابتداء میں تلقین ہوتا ہے، وہ مقصد اصلی نہیں بلکہ تمہید ہوتا ہے۔''

(ص۱۵)

''پاس انفاس وغیرہ سب حِیَل اس کے ہیں کہ ذکر مخیلہ میں قائم ہو جائے ورنہ اصل مقصود نہیں،

جب خیال ذکر ذات قائم ہو جائے تو زبان اور انفاس کسی کی ضرورت نہیں۔" (ص۱۶)

"ذکر جہری کی اب کچھ حاجت نہیں، ذکر اصل میں تذکر قلب ہے، سو جب ذکرِ قلبی حاصل ہوا، اب زبان کی کچھ ضرورت نہیں۔"① (ص۱۷) سب اذکار و مراقبات تحصیلِ نسبت کے واسطے ہیں جب نسبتِ یادداشت حاصل ہو چکی اب مراقبات کی درخواست عجیب بات ہے اب تمہارا سب ذکر لسانی قرآن وصلوٰۃ وذکر مسنون مراقبہ ہے سب میں یاداشت ہے کہ ثمرۂ مراقبہ یہی ہے اب کسی مراقبہ کی حاجت نہیں اذکار مسنونہ پڑھو، قرآن ونوافل صلواتِ مسنونہ ادا کرو اور بس۔

"ضرورت تعین شغل کی بلندی کے واسطے ہوتی ہے، منتہی اپنے اختیار میں ہوتا ہے، جس امر سے مطلب بر آمد ہو وہی کرے، نہ اُس کو قید ذکر زبانی کی ہے، کوئی ذکر ہو، نہ کسی تصور خیال کی غرض کام سے ہے۔" (ص۲۸)

"الحاصل اگر چہ یہ قوتِ تاثیر اور توجہ وکشف اور تصرف دنیا میں بہت ہے، مگر یہ نورِ یقین مثل کیمیا کے نادرالوجود ہے۔ اگرچہ عالم خالی نہیں، اشغال سب اس کے مقدمات تھے، اب خود مقصود ہو گئے۔ اے کاش کہ اس یقین کا شائبہ ہوا بھی اس محروم کو لگ جائے کہ سارا مدار اس پر ہی ہے، اس نسبت کا نام نسبتِ احسان ہے کہ بعثت جناب فخر رسل علیہ السلام کی اس کے ہی واسطے تھی اور صحابہ جملہ اسی نسبت کے حامل تھے۔ علیٰ حسب مراتبہم، پھر اولیائے اُمت نے دوسرے طریقے سے پیدا کیا کہ ہر ایک نے اشغال اپنے اپنے طریقے کے وضع کیے، سو یہ سب مقدمات اس کے ہیں اور بس! اس کا کوئی طریق معین نہیں، ہر شخص کا طرز جداگانہ ہے۔" (ص۸۱)

تصوف کا مقصد اور اس کے اعمال واشغال کی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد عرض ہے کہ اگر کوئی خوش نصیب ایسا ہے کہ اس کو کسی ریاضت ومجاہدہ کے بغیر اخلاص واحسان کا مرتبہ حاصل

---

① مطلب یہ ہے کہ قلب میں اللہ کے ذکر اور یاد کی کیفیت کو راسخ اور مستقل کرنے کے لیے جو جہری ذکر سالکین کو کرایا جاتا ہے، جب اللہ تعالیٰ وہ کیفیت پیدا فرمادیں اور رسوخ حاصل ہو جائے تو پھر اس کے جاری رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ قلب میں اس کیفیت کے پیدا ہو جانے کے بعد ذکر باللسان کیا ہی نہ جائے۔ ذکر جو خود مقصود اور مامور ہے وہ تو تادم آخر جاری رہتا ہے۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے: (لایزال لسانک رطباً من ذکر اللہ) مکاتیب رشیدیہ کے اقتباسات سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے۔

ہو گیا ہے تو وہ بہت ہی مبارک ہے ورنہ قاعدہ یہ ہے کہ آدمی کو جس چیز سے خود نفع ہوتا ہے اُسی کو وہ دوسروں کو بتلاتا ہے۔ اہل اللہ کی بڑی جماعت (جن کے صدق واخلاص پر سب کو اتفاق ہے) خبر دیتی ہے کہ ذکر و فکر ہی کی راہ سے اُن کو اخلاص ویقین کی دولت حاصل ہوئی۔ ؎

من نہ تنہا دریں میخانہ مستم　　　جنیدؒ و شبلیؒ و عطارؒ ہم مست

اس لیے اگر کسی کو ان کیفیاتِ مطلوبہ کی ضرورت وتلاش ہے تو وہ اس راہ کو اختیار کرے۔

؎ عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد　　　اے خواجہ درد نیست و گرنہ طبیب ہست

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ راہ بحث و نظر کی نہیں، بلکہ جد وجہد اور عمل کی ہے۔ راقم سطور نے کئی برس ہوئے ایک جلیل القدر شیخ وقت (جو بحمد اللہ اب بھی اپنے فیوض وبرکات کے ساتھ موجود ہیں) کی خدمت میں عرض کیا کہ:

"تصوف پر پڑھنے کے لیے کوئی کتاب تجویز فرمادی جائے۔"

جواب میں ارشاد فرمایا کہ : یہ راہ مطالعہ سے نہیں، بلکہ مجاھدہ سے طے ہوتی ہے، پھر ارشاد فرمایا کہ:

"اگر پڑھنا ہی ہے تو شاہ اسمٰعیل شہید صاحب رحمہ اللہ کی ''صراط مستقیم'' پڑھیے۔

بہر حال گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر دل میں جستجو ہے تو کسی صاحبِ کمال کے مشورہ سے کچھ کیجیے۔

قال را بگذار و مرد حال شو!　　　پیش مردے کاملے پامال شو

کسی اور مقصد سے نہیں، تو تجربہ کر کے دیکھیے۔ اگر کسی صاحبِ کمال کی صحبت، یا اُس کے بتلائے ہوئے طریقے پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ کا تعلق بڑھتا ہوا محسوس ہو، ایمان میں تازگی کے آثار پائے جائیں تو فبہا، ورنہ جہاں زندگی میں اچھے اور برے بہت تجربے ہوتے ہیں، اس کو بھی ایک ناکام تجربہ سمجھ کر چھوڑ دیجیے گا۔

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی　　　تا راہ بین نہ باشی کے راہ بر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق　　　ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

یقین اور اُس کے ثمرات

تصوف کے بارے میں پیدا ہونے والے بعض شکوک وشبہات سے متعلق جو مضمون مختصر سا گزشتہ صفحات میں ناظرینِ کرام نے ملاحظہ فرمایا، اُس میں ایک جگہ عرض کیا تھا: ”تصوف کا اصل مقصد مرتبہ یقین کی تحصیل ہے۔ “

اس یقین کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہر وردی رحمہ اللہ ”عوارف“ میں ارشاد فرماتے ہیں :

”بشری حجابات اُٹھ جانے کے بعد دل میں جو نور حقیقت ظاہر ہوتا ہے، اُس کا نام یقین ہے، جس سے ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے۔ اس سے وہ یقین مراد نہیں جو محض دلائل سے حاصل ہو۔ “

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ ''ازالۃ الخفاء''میں فرماتے ہیں :

”یہاں یقین سے مراد وہ یقین خاص ہے جو بطریق موہبت صالحین اُمت کو نصیب ہوتا ہے، اس کو صوفیا کی اصطلاح میں یادداشت کہتے ہیں، نہ کہ وہ یقین جو استدلال یا تقلید سے پیدا ہو۔“

(مقصد دوم: ص ۱۴۲)

یہ یقین عبد اور معبود کے رشتہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اسلامی زندگی کی جان ہے، جس طرح قالب روح کے بغیر اور آنکھیں بغیر نور کے بے لطف ہیں، اسی طرح مرتبۂ یقین کے بغیر اعمال بے کیف ہیں۔ صحیح روایت میں ہے کہ :

”اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور امتوں نے گویا فجر سے ظہر تک کام کیا۔ بعضوں نے ظہر سے عصر تک کام کیا اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر سے مغرب تک کام کیا۔ لیکن اجر وثواب اس امت کو اوروں کے مقابلے میں دوگناہ دیا جائے گا۔ “

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ :

”یہ فرق قوتِ یقین ہی کی بنا پر ہے۔“ (کتاب الایمان: ص ۱۷۸ مطبع انصاری دہلی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ :

”مجھ کو پوری اُمت کے مقابلے میں وزن کیا گیا تو میرا پلہ بھاری رہا، پھر اس میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کو رکھا تو وہ بھاری رہے۔ اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کو تولا گیا، تو وہ بھی سب سے وزنی رہے۔“

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ :

”یہ سب قوتِ ایمانی کا کرشمہ ہے۔“ (کتاب الایمان: ص۱۷۸)

یہی وہ یقین ہے کہ جس کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

”جب نور دل میں آتا ہے تو اس میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔“

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: ”یارسول اللہ! اس کی نشانی کیا ہے؟“

ارشاد ہوا کہ: ”آخرت کی رغبت، دنیا سے نفرت، موت سے پہلے اس کی تیاری۔“

(مشکوٰۃ: کتاب الرقاق، ص۱۲)

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات، ان کے وعدوں وعیدوں کو کون نہیں جانتا مانتا، لیکن ان کا یقین ہم کو کہاں تک حاصل ہے، ہماری عملی زندگی خود اس کی شاہد ہے۔

ہم سب جانتے اور مانتے ہیں کہ حق تعالیٰ حاضر وناظر ہیں، ہمارے ساتھ ہیں، رزاق ہیں، سمیع وبصیر ہیں، رؤف ورحیم ہیں، شفا انہی کے ہاتھ میں ہے، موت وحیات اور نفع وضرر کے وہی مالک ہیں، الغرض تمام صفاتِ کمالیہ انہی کے لیے مخصوص ہیں۔ نیز یہ کہ طاعات اُن کی رضا اور معاصی اُن کے غضب کا باعث ہیں۔ لیکن اس جاننے اور ماننے سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اگر ہم کو ان امور کا یقین کامل بھی حاصل ہو تو کیا عالم ہو اور ہماری زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب آجائے۔

کیا اپنی حاجات کو حق تعالیٰ کے سوا پھر ہم کسی اور کے سامنے بالاستقلال پیش کرسکتے ہیں؟ کسی معاملے میں ہمارے دلوں میں ان سے شکوہ پیدا ہو سکتا ہے؟ رنج وراحت کے مواقع پر ہم حدود سے بڑھ سکتے ہیں؟ کیا ہم بالقصد ان کی طاعات کو چھوڑ سکتے ہیں اور گناہوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟ ان سے ایک لمحہ بھی غفلت ہو سکتی ہے؟ اور کیا پھر خضوع وخشوع کے بغیر نمازیں ممکن ہیں؟ ان کی معیت کا احساس کیا ہم کو انہیں کانہ بنادے گا۔

آمد سحر آں دلبر خونیں جگراں   گفتارِ تو بر خاطر من بار گراں

شرمت بادا کہ من بہ سویت نگراں   باشم تو نہی چشم بہ روئے دگراں

یہ یقین جب دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو احکام شرعیہ سے تعلق بڑھ جاتا ہے، رذائل دب جاتے ہیں اور فضائل کے چشمے اُبل پڑتے ہیں

ے   بلے ہر جا شود مہر آشکارا   سہارا جز نہاں بودن چہ یارا

حضرت خواجہ محمد معصوم رحمہ اللہ ملا نعمت اللہ کو تحریر فرماتے ہیں :

"یہ نسبت عارف پر جب غالب ہو جائے گی تو اس کو احکام شرعیہ سے زیادہ ربط ہو گا۔"

(مکتوبات: ص ۲۲۴)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ "ازالۃ الخفاء" میں تصوف کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کی تین اصل ہیں :

اصل اول: اعمال خیر مثلاً نماز، روزہ، ذکر، تلاوت وغیرہ کے ذریعہ سے یقین پیدا کرنا، یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ سب مسلمان بقدر استعداد نیکی کرتے ہیں، مگر ان کو مرتبہ یقین حاصل نہیں ہوتا ہے۔ استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال کے ساتھ تین باتیں اور ملائی جائیں تو یقین پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو اعمال میں اخلاص، دوسرے اعمال خیر کی زیادتی، تیسرے ان اعمال کی کیفیت خاصہ یعنی خشوع وغیرہ۔

اصل دوم: یقین سے مقامات پیدا ہوتے ہیں جو شیخ ابو طالب مکی کے حسب تحریر دس ہیں۔ توبہ، زہد، صبر، شکر، رجا، خوف، توکل، رضا، فقر، محبت۔ جب یقین دل پر قبضہ کرتا ہے تو خوف ورجا سب خدا سے متعلق ہو جاتا ہے اور اعتماد اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر ہوتا ہے۔ یہ نہ جاننا کہ مقامات دس ہی ہیں، بلکہ اس کے سوا بھی ہیں، البتہ بنیادی اور اساسی مقامات یہی ہیں۔

اصل سوم: جب یقین کسی پر طاری ہوتا ہے تو وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے، یقین سے کہتا اور کرتا ہے۔ مقامات عالیہ اُس کے سینے میں پیدا ہوتے ہیں اور دو امور ظاہر ہوتے ہیں، کرامات خارقہ اور تربیت مریداں۔ (مقصد دوم: ص ۱۴۲، ۱۴۳)

شاہ صاحب رحمہ اللہ موصوف "حجة الله البالغه" میں ارشاد فرماتے ہیں :

"مقامات واحوال کی بنیاد یقین پر ہے، یقین ہی سے توحید، اخلاص، توکل، شکر، انس، ہیبت، تفرید، صدیقیت اور محدثیت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ:

"یقین ایمان ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

"مجھ کو ایسا یقین نصیب فرما کہ دنیا کی مصیبتیں آسان ہو جائیں۔" (مطبوعہ بریلی: ص ۲۸۱)

مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جب دل رذائل سے صاف ہو جاتا ہے تو فضائل، مثلاً شجاعت، قناعت، سخاوت، عفت، صبر وشکر، رضا اور توکل خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔" (صراط مستقیم: ص ۲۸)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:

"طالبِ حق کو چاہیے کہ اللہ سبحانہ کے ذکر میں ایسا مشغول ہو جائے کہ غیر اللہ اور خود کو مطلقاً بھول جائے، کیوں کہ وصول الی اللہ بغیر نفی غیر اللہ کے حاصل نہیں ہوتا ہے۔ طالب حق جب اس درجہ کو پہنچے گا، زہد، تقویٰ، توکل، عزلت، صبر، تسلیم، رضا سب بے قصد حاصل ہو جائیں گے۔"
(ضیاء القلوب: ص ۱۳)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اخلاقِ ذمیمہ کے دو علاج ہیں، ایک جزئی یعنی خاص، وہ یہ کہ ہر خلق کا جدا جدا علاج کیا جائے، جیسا احیاء العلوم وغیرہ میں لکھا ہے، اس کو طریق سلوک کہتے ہیں۔ دوسرا کلی یعنی عام، وہ یہ کہ ذکر و شغل سے یا جس طرح شیخ کامل تجویز کرے، حق سبحانہ کی محبت قلب میں پیدا کی جائے۔ جب اس کا غلبہ ہو گا، اپنی ہستی، خودی مضمحل ہونا شروع ہو گی اور سب اخلاقِ ذمیمہ جو کہ اس خودی و دعویٰ ہستی سے پیدا ہوتے ہیں زائل ہو جائیں گے، اس کو طریقِ جذب کہتے ہیں۔" (کلید مثنوی: دفتر اول، ص ۹)

اسی سلسلے میں پیر رومی کے یہ پرجوش اشعار بھی پڑھ لیے جائیں:

ے ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد | او از حرص و عیب کلی پاک شد

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلے میں ایک عالمِ ربانی (اللہ اُن کی برکات سے عرصہ تک استفادہ کا موقع نصیب فرمائے) کے گرامی نامہ کے چند الفاظ بھی نظر سے گزر جائیں۔ ارشاد فرمایا:

''ضرورت اس کی بہت زیادہ ہے کہ اذکار میں پوری جدوجہد کی جائے، تاآں کہ ذکر طبیعتِ ثانیہ بن کر نسبت مع اللہ پیدا کرتا ہوا، احسان جو کہ خلاصہ اور ثمرہ عبادت ہے، پیدا ہو جائے۔''

یہ ہے وہ یقین اور اس یقین کے ثمرات جس کی تحصیل کا ذریعہ تصوف ہے، اب اگر یہ امور کسی درجہ میں مطلوب ہیں تو تصوف بھی اسی درجہ میں مطلوب ہے۔

والعلم عند اللّٰہ ولاحول ولاقوۃ الاباللّٰہ

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ سطور بالا میں یقین کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس سے کم درجہ کا یقین کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ حاشا و کلّا ایسا نہیں ہے۔ یہاں تو بحث صرف کمال یقین کی تھی ورنہ خدا اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے متعلق کوئی شخص یقین کا کمزور درجہ بھی اگر رکھتا ہے تو ان شاء اللہ آخرت میں وہ بے کار نہ ہو گا۔ گو اہل ایمان کی شان یہی ہونا چاہیے کہ وہ ایمان و اسلام کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوں۔

حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ:

''جو شخص ان احوال و مقامات سے متصف ہو، اُس کو چاہیے کہ ان لوگوں کی تعظیم میں کوتاہی نہ کرے جو ان امور سے بے خبر ہیں، اس لیے کہ ہر مسلمان حق تعالیٰ کا نام لیتا ہے۔ پس اول تو مسلمان کی تعظیم اس نامِ پاک کی عظمت کی وجہ سے ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ آدمی خود اپنے آغاز و انجام کو دیکھے۔ تیسرے حق تعالیٰ کے لیے دشوار نہیں کہ کسی کو ایک لحہ میں قطب الاقطاب بنادیں۔''

(صراط مستقیم: ص۱۰۱)

شاہ صاحب رحمہ اللہ ہی کا ارشاد ہے کہ:

''اصلاحِ اعمال و عادات اور فضائل اخلاق کا جو ذکر ہوا تو رضائے حق کے لیے اور بارگاہِ خداوندی

میں مقبولیت، عزت اور اعتبار کے لیے ہے، ورنہ مدارِ نجات تو صرف اسی کلمہ پر ہے جو صدق دل سے ادا ہو۔" (صراط مستقیم)

تصوف اور شیخین

"تصوف کے انکار اور اس کی تنقید کے سلسلے میں بعض حلقوں کی طرف سے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور امام ابن القیم رحمہ اللہ کا نام بھی کثرت سے لیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ مولانا محمد اویس صاحب کا یہ مختصر مقالہ اس سلسلہ میں اہل انصاف کے لیے تشفی بخش ہو گا۔" (نعمانی غفرلہ)

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ، حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ اور حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رحمہ اللہ کا نام لے کر اگر آج ہندوستان میں تصوف صحیح کی مخالفت کی جائے تو اہلِ علم مخالف کے مبلغ علم کے متعلق اچھی رائے نہ قائم کر سکیں گے۔

اسی طرح اگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا حوالہ دے کر حقیقی تصوف پر ناروا تنقید کی جائے تو جن لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کی کتابوں کو پڑھا ہے اور جن کو ان بزرگوں (خصوصاً حافظ ابن قیم رحمہ اللہ) کے تصوف واحسان میں مرتبہ کا کسی قدر کتابی علم ہے، وہ ان ناقدین کے متعلق زیادہ بہتر خیال ظاہر نہ کر سکیں گے۔

ہم امکان کی حد تک حسنِ ظن سے کام لینا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان ناقدین نے شیخین کی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں فرمایا ہے، ورنہ شیخین کا نام لے کر وہ تصوف کی اس بے باکی کے ساتھ مخالفت نہ کرتے۔ ①

---

① یہاں ایک واقعہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے، ایک مرتبہ راقم سطور نے اپنے استاد علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کی خدمت میں عرض کیا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کے یہاں چونکہ تفلسف نہیں ہے اس لیے اُن کی کتابوں میں بے حد جی لگتا ہے۔ سید صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابھی آپ نے ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم کو نہیں پڑھا ہے جو فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں، اس وقت تک عاجز نے شیخین کے فلسفیانہ اور متکلمانہ مباحث کو نہیں پڑھا تھا، پھر جب سید صاحب کی راہنمائی میں شرح عقیدہ اصفہانیہ کا مطالعہ کیا تو سید صاحب نے فرمایا: "جب علم کلام کی سیر کا جی چاہے تو ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ہاتھ پکڑ کر سیر کر لیا کیجئے گا، بہت پرامن راستہ ہے۔" اسی طرح یہ کہنے کا جی چاہتا ہے کہ لوگوں نے ابھی ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ کو بہت کم پڑھا ہے، جو تصوف کے مباحث میں عالمانہ کلام کرتے ہیں، ورنہ تصوف کے متعلق نقطۂ نظر دوسرا ہوتا۔

بلاشبہ شیخین کی کتابوں میں تصوف کے بعض مسائل پر سخت تنقید ملتی ہے، اسی طرح متصوفین پر وہ سخت دار و گیر بھی کرتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تنقید کن صوفیا پر اور کس تصوف پر ہے؟ کیا اُس تصوف پر جو کتاب وسنت کا اصل مقصد ہے؟ جس کا منتہیٰ رجائے حق ہے؟ جس میں قدم قدم پر کتاب وسنت کے اتباع کی تاکید ہے؟ جس کی تعلیم حسن بصری، ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، معروف کرخی، بشر حافی، شقیق بلخی، جنید، سہل تستری، ابوطالب مکی اور شیخ عبد القادر جیلانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے دی ہے؟ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"یہ اسلام کے مشائخ ہیں، ائمہ ہدایت ہیں، خدا نے اُن کے حق میں امت کے اندر "لسان صدق" رکھ دی ہے۔" (جلاء العینین: ص ۵۹)

انہی ابراہیم بن ادھم، فضیل بن عیاض، معروف کرخی، ابو سلیمان دارانی، احمد بن الحواری، اور سری سقطی رحمہم اللہ تعالیٰ کے متعلق ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

واکابر شیوخ الصالحین (فی السماع والرقص)

ایک موقع پر فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادھم، ابو سلیمان دارانی، معروف کرخی، جنید بن محمد، سہل بن عبد اللہ تستری رحمہم اللہ تعالیٰ اور انہی کے مثل لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"یہ کتاب وسنت کے مشائخ ہیں۔"

پھر کہتے ہیں:

رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین

تصوف اور اتباعِ سنت

حقیقی تصوف کی مخالفت تو در کنار، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تو دلائل و شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ:

"طریق، کتاب وسنت میں مقید ہے۔"

شیوخ عارفین کا اجماع نقل فرماتے ہیں کہ:

"تصوف، کتاب وسنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔"

اور بطورِ سند کے حسب ذیل بزرگوں کے اقوال نقل فرماتے ہیں :

سید الطائفہ جنید رحمہ اللہ، ابو حفص رحمہ اللہ، ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ، سہل بن عبد اللہ رحمہ اللہ، سری رحمہ اللہ، ابویزید رحمہ اللہ، احمد بن ابی الحواری رحمہ اللہ، ابو عثمان نیشاپوری رحمہ اللہ، ابوالحسن نوری رحمہ اللہ، محمد بن الفضل، عمرو بن عثمان مکی، ابو سعید خراز، ابن عطا، ابو حمزہ بغدادی (ان کو امام احمد بن حنبل صوفی کہہ کر پکارا کرتے تھے)، ابو اسحق رقی، ابو یعقوب تہر جوری، ابوالقاسم نصر باذی، ابو بکر مستانی، ابو عمرو بن نجید رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

حافظ صاحب موصوف فرماتے ہیں :

"اس راستہ سے جو صوفیا الگ ہیں وہ طریق کے رہزن اور ابلیس کے کارندے ہیں۔"

(مدارج السالکین: ج۲، ص۲۴۷)

ایک جگہ تصوف کے متعلق بحث فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ :

"تصوف سنت ہی پر عمل کا نام ہے۔"

اس موقع پر حسب ذیل ''اهل الاستقامة ائمة الطريق اور علمائے طائفه'' کے اقوال سے استشہاد کرتے ہیں۔

سری، سید الطائفہ جنید، ابراہیم بن محمد نصر آبادی، اسمٰعیل بن نجید، احمد بن ابی الحواری، شبلی، ابویزید بسطامی، سہل بن عبد اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ (مدارج السالکین: ج۳، ص۶۴)

''اغاثة اللهفان'' میں فرماتے ہیں :

"اہلِ استقامت صحیح راستہ پر ہیں اور کتاب و سنت کے بغیر وہ خواطر، ہوا جس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔" (ص۶۸)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ :

"کتاب و سنت کا ہر معاملہ اولیاء اللہ کے نزدیک متفق علیہ ہے اور مشائخ کے اقوال میں بہ کثرت اُس کی ہدایات موجود ہیں۔" (الفرقان: ص۳۱)

فنِ تصوف کی اہمیت

شیخ الاسلام ہروی صفا کی بحث میں لکھتے ہیں کہ :

"اس کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ اس علم کا ہے جو سلوک طریق کے لیے انسان کو سنوارتا ہے۔"

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ :

"جس علم صافی کی طرف اشارہ کیا ہے یہ وہی علم ہے جس کی قوم (یعنی صوفیا اصحابِ طریقت) نے وصیت کی ہے اور اس کی مفارقت سے ڈرایا ہے اور جس نے اس علم کو چھوڑا اس کو بالکلیہ اہلِ طریق میں سے نکال دیا ہے اور یہی وہ علم ہے جس کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تھے۔"

حضرت جنید رحمہ اللہ ہمیشہ فرماتے تھے :

"ہمارا یہ علم کتاب و سنت میں مقید ہے، پس جو کتاب و سنت سے الگ ہو اس کی پیروی نہ کی جائے۔ یہی وہ علم صافی ہے جو مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہے، یہ اس علم والے کو طریقِ عبودیت پر چلنے کے لیے سنوار دیتا ہے۔" (مدارج السالکین:۲ / ۸۹)

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

"تصوف سلوک حقیقی کا ایک گوشہ ہے اور اس کا کام نفس کی تہذیب اور اس کا تزکیہ ہے، تا کہ اس کو رفیق اعلیٰ کی صحبت کی سیر کے لیے تیار کر دے۔" (مدارج السالکین:۲/۱۷۷)

حضرت جنید کے قول: إذا أراد اللّٰهُ بالمريد خيرًا اوقعه على الفقراء منعه صحبة القراء "اللہ تعالیٰ جب مرید کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو فقرا کی صحبت میں ڈال دیتا ہے اور قرا کی صحبت سے رد کر دیتا ہے" کی شرح میں لکھتے ہیں:

"قاری سے مراد ان لوگوں کے نزدیک وہ شخص ہے کہ جس کا رجحان عبادات کے ظاہر کی طرف ہو اور اہلِ تصوف، اربابِ قلوب اور اہلِ معارف کے پاس جو ارواح معارف، حقائق ایمان، روح محبت اور اعمالِ قلوب ہیں ان کو اس کی خبر نہیں ہے۔ پس جنید کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی پر خدا کا فضل

ہوتا ہے اس کو صوفیا کے پاس جانے کی توفیق ملتی ہے جو اس کے اخلاق کی تہذیب کرتے ہیں۔ ذمائم اخلاق کا ازالہ کرتے ہیں، منازلِ طریق کی خبر دیتے ہیں اور قرا صرف ظاہری عبادات پر لگاتے ہیں اور اعمال کی چاشنی نہیں سکھاتے ہیں۔"

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اس سلسلہ میں اپنا مشورہ دیتے ہیں کہ:

"ہوش مند کا کام یہ ہے کہ ہر جگہ سے وہ اپنا حصہ لے اور ہر جماعت سے بہتر معاملہ کرے، یہ طریقہ صادقین کا ہے۔" (مدارج السالکین:۲/۲۰۶)

حقیقی تصوف اور صحیح صوفیا کے متعلق شیخین کی تصریحاتِ بالا کے بعد کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ حضرات تصوف کے مخالف تھے۔

اصل یہ ہے کہ ناقدین کو غلط فہمی ہے، ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ کی تنقید تصوف اور اہل حق صوفیا پر نہیں ہے، بلکہ ان کو فلسفیانہ تصوف سے اختلاف ہے۔ فلسفیانہ تصوف کسے کہتے ہیں؟ اس کو حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کی زبان سے سنیے:

"فلسفیانہ تصوف سے مقصود الٰہیات کے متعلق حکیمانہ خیالات رکھنا اور فلاسفہ کی طرح خشک زندگی اختیار کر کے ان کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔ اس فلسفیانہ تصوف کا ماخذ یونان کا اشراقی اور اسکندریہ کا افلاطونی اسکول ہونا بعض قدیم مسلمان حکماء کے نزدیک بھی مسلّم تھا۔"

مشہور حکیم ابوریحان البیرونی کہتا ہے کہ:

"سوف یونانی میں حکمت کو کہتے ہیں اور اسی سے فلیسوف کو یونانی میں "پیلا سوپا" کہتے ہیں، یعنی حکمت کا عاشق، چوں کہ اسلام میں بعض لوگ ان کے قریب گئے اس لیے وہ بھی اسی نام (صوفیا) سے پکارے گئے۔"

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنے رسالہ فی السماع والرقص میں لکھتے ہیں:

"اور ابن سینا نے ایک فلسفہ پیدا کیا جس کو اس نے پہلے یونانی فلاسفہ اور (مسلمانوں میں سے) بدعتی متکلمین جہمیہ وغیرہ کے خیالات سے ملا کر بنایا تھا اور بہت سی علمی اور عملی باتوں میں وہ اسماعیلی ملحدوں کے راستے پر چلا اور کچھ باتیں اس میں صوفیا کی ملادیں جو حقیقت میں اس کے ہم خیال اور اسماعیلی

قرامطہ باطنیہ کے خیالات سے ماخوذ تھیں، کیوں کہ ابن سینا کے اہل خاندان مصر کے حاکم بامر اللہ (فاطمی اسماعیلی) کے پیروؤں میں سے تھے۔ یہ لوگ اسی زمانہ میں تھے اور ان کا مذہب رسائل اخوان الصفا والوں کا مذہب تھا۔ "

حاجی خلیفہ چلپی کشف الظنون میں تصوف کے ضمن میں لکھتا ہے کہ:

"اور جاننا چاہیے کہ حکمائے الٰہیات میں سے اشراقی، مشرب اور اصطلاح میں صوفیوں کے مانند ہیں خصوصاً اُن میں سے پچھلے (اشراقی) لیکن فرق صرف ان مسائل میں ہے جن میں اشراقیہ کا مذہب اسلام کے مخالف ہے اور یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ یہ اصطلاح (تصوف) انہی کی اصطلاح (سوف) سے ماخوذ ہو، جیسا کہ اس شخص سے چھپا نہیں ہے، جس نے اشراقی فلسفہ کی کتابیں دیکھی ہیں۔ "

ان حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ فلسفیانہ تصوف، فلسفۂ اشراق، جدید افلاطونی الٰہیات اور اخوان الصفا کی تاویلات ایک ہی سرچشمہ کی دھاریں ہیں۔ (خیام مختصراً)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کو اسی فلسفیانہ تصوف سے اختلاف تھا اور اسی تصوف سے پیدا شدہ مسائل پر وہ کڑی تنقید کرتے تھے۔ خود ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"ان لوگوں نے تصوف میں گفتگو کی لیکن مسلمانوں کے طریق پر نہیں، بلکہ فلاسفہ کے طریق پر۔" (جلاء العینین: ص ۲۴)

رسالہ علم الظاهر والباطن میں باطنیہ اور قرامطہ کی تلبیسات کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اور اسی قسم کی بہت سی باتیں متکلمین صوفیا کے کلام میں راہ پا گئیں۔"

(مجموعہ رسائل نیریہ: اول)

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ زنادقہ صوفیا کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طریق کے رہزن زنادقہ صوفیا اور ملاحدہ وہ ہیں جو پیغمبر کی پیروی کو طریق میں ضروری نہیں جانتے ہیں۔" (مدارج السالکین)

شیخین بلکہ تمام علمائے حق کی مخالفت اسی طبقہ صوفیا سے ہے ورنہ جہاں تک صحیح تصوف اور اہلِ حق صوفیا کا معاملہ ہے، شیخین ان کا اعتراف اور پورا احترام کرتے ہیں۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ:

”صوفیا میں بعض متکلمین کے طریق پر ہیں اور بعض اہلِ فلسفہ کے طریق پر اور ایک جماعت وہ ہے جو اہل حق کے مسلک پر اور سنت پر ہے۔ جیسے فضیل اور تمام وہ لوگ جن کا (امام قشیری نے) رسالہ میں ذکر کیا ہے۔“ (جلاء العینین: ص ۳۵)

رسالہ قشیریہ بڑی آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے، اس میں تر اسی اکابر صوفیا کا ذکر ہے، ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان کو مسلک اہل السنۃ پر مانتے ہیں اور یہی وہ حضرات ہیں کہ محققین صوفیا آج بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنے رسالہ فی السماع والرقص میں خالی متصوفین کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

”یہ لوگ محققین صوفیا اور اُن کے ائمہ کے برعکس ہیں۔“

معلوم ہوا کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو محققین صوفیا سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے مدارج السالکین میں صوفیا کی چار قسمیں اُن کے احوال کے اعتبار سے بیان کی ہیں اور ان کی مدح فرمائی ہے۔ (مدارج السالکین: ۳/ ۸۱)

ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ:

”حضرات صحابہ کرام اور امت کے دوسرے کاملین، علم اور حال دونوں کے جامع تھے۔ جب اہلِ علم اور اہلِ حال میں تفریق ہو گئی، اسی وقت سے نقص اور خلل پیدا ہو گیا۔“

(مدارج السالکین: ۳/ ۸۴)

ابو العباس بن الغریف نے اپنی کتاب محاسن المجالس میں محبت اور شوق پر گفتگو کی ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اس پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہم ان کے کلام کو ذکر کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو مضامین منکشف فرمائے ہیں اُن کو بھی نفع کی اُمید پر لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر احسان فرمائے اور اُس کو علم سے حال کی طرف

اور وصف سے اتصاف کی طرف لے جائے (یعنی اُس کے علم کو اُن کا حال بنادے) اور ان اوصاف کا متصف بنادے۔" (طریق الہجرتین:۳۸۰)

باب الذوق میں فرماتے ہیں کہ:

"جن لوگوں نے ایمان کا دعویٰ کیا لیکن وہ صاحبانِ ذوق نہ تھے، حق تعالیٰ نے اُن سے فرمایا کہ اپنے کو مومن نہ کہو، مسلم کہو: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔

پس یہ لوگ مسلمان ہیں، مؤمن نہیں، اس لیے کہ ایمان اُن کے دل کے اندر رچا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صاحبِ ذوق نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، یا اُن کے اعمال کے اجر میں کمی ہوگی (البتہ صاحبِ ذوق کا معاملہ ہی دوسرا ہے)۔ ذوق ایک باطنی امر ہے اور عمل اس کا نشان ہے۔ پس اعمال علوم وعقائد کے ثمرات ہیں اور یقین سے جہاد اور احسان کے مقامات پیدا ہوتے ہیں۔"
(مدارج السالکین:۳/۵۸)

ذرا غور کیجیے کہ یہ جلیل القدر شیخ اذواقِ صحیحہ اور احوالِ صالحہ (جو کہ ثمراتِ مجاہدات میں سے ہیں) کا کیسا مداح ہے؟

"مدارج السالکین" میں امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ:

"میں نے صوفیا کی صحبت اختیار کی اور ان کی دو باتوں سے بڑا نفع اُٹھایا: ایک یہ کہ وقت ایک تلوار ہے، اگر تم اس کو نہ کاٹو گے تو وہ تم کو کاٹ دے گا اور دوسری بات یہ کہ اگر تم اپنے نفس کو حق میں مشغول نہ کرو گے تو وہ تم کو باطل میں مشغول کردے گا۔"

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

"یہ کتنے قیمتی فقرے ہیں اور اپنے قائل کے علوہمت پر دلالت کرتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کی یہ منقبت اس طبقہ (صوفیا) کی جلالت شان کے لیے کافی ہے۔" (مدارج السالکین:۳/۸۰)

شیخین کو صوفیا کے جس مسئلہ سے زیادہ تر اختلاف تھا وہ وحدت الوجود کا مسئلہ تھا۔
(القول الجلی بر حاشیہ جلاء العینین: ص۲۷)

جس وحدت الوجود سے ان کو اختلاف تھا اس کی حقیقت بھی انہی کی زبان سے سن لیجیے۔

''اس وحدت الوجود کی غایت یہ ہے کہ اس کے ماننے والے عبد اور معبود، خالق اور مخلوق ، آمر اور مامور، طاعت اور معصیت میں فرق نہیں کرتے۔'' (طریق الہجرتین: ص ۳۴۳)

ملاحدہ اہل وحدت الوجود کے نزدیک غیر حق، عین حق میں گم ہو جاتا ہے، بلکہ غیر حق کا وجود نفس حق کا وجود ہوتا ہے، حِس دونوں وجودوں میں فرق کرتا ہے لیکن جب حِس غائب ہوتی ہے تو کھل جاتا ہے کہ غیر حق کا وجود عین حق ہے۔'' (مدارج السالکین: ج۳، ص ۸۷)

اس وحدت الوجود کے متعلق خود محققین صوفیا کا مسلک کیا ہے؟ ذرا اس کو بھی گوش ہوش سے سنیے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:

''عینیت کے یہ معنی نہیں کہ دونوں ایک ہوگئے، یہ تو صریح کفر ہے۔''

(تعلیم الدین: ج ا، ص ۹۵)

اب اس مسئلہ کی اصل حقیقت بھی مولانا رحمہ اللہ سے سمجھ لیجیے :

''گو ممکنات موجود ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وجود دیا ہے۔ موجود کیوں نہ ہوتے مگر وجود حق کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص، ضعیف و حقیر ہے، اس لیے وجودِ ممکن کو وجودِ حق کے روبرو گو عدم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور کہیں گے۔ جب یہ کالعدم ہوا تو وجود معتدبہ ایک ہی رہ گیا۔ یہی معنی ہیں وحدت الوجود کے، کیوں کہ اس کا لفظی ترجمہ ہے کہ ایک ہونا وجود کا۔ سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا اگر ہے سہی مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں، مگر اس کو ادعاء وحدت الوجود کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیقِ علمی میں توحید کہتے ہیں جس کی تحصیل کوئی کمال نہیں، اور جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبہ میں فنا کہلاتا ہے، یہ البتہ مطلوب و مقصود ہے، اور یہی حاصل ہے وحدۃ الشہود کا جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے، کیوں کہ اس کا ترجمہ ہے ایک ہونا شہود کا، کہ واقع میں تو ہستی متعدد ہیں، مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں۔ پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے۔ کما قال مرشدی، مگر چوں کہ وحدۃ الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہوگیے تھے اس لیے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا۔ ''

(کلید مثنوی: ”شرح از شعر“

ے جملہ معشوق است و عاشق پردۂ زندہ معشوق است و عاشق مردۂ)

مسئلہ کی اس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر دیکھیں کہ شیخین کے ارشادات اس سلسلہ میں کیا ہیں؟

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی ایک تقریر کا مفہوم حسب ذیل ہے :

”جس طرح انوارِ مخلوقہ نورِ حق کے سامنے اور علمِ خلق علم حق کے سامنے اور مخلوق کی قدرت خدا کی قدرت کے سامنے مضمحل ہے، اسی طرح زمان، دہر اور وقت دوامِ الٰہی کے سامنے مضمحل ہے۔ جب سالک پر یہ استغراق طاری ہوتا ہے، قوت تمیز کمزور ہوتی ہے اور حال غالب ہوتا ہے تو اہلِ استقامت کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ مافی الوجود الا اللّٰہ۔ ماثم موجود علی الحقیقۃِ الا اللّٰہ ھنالك یفنی من لم یکن ویبقی من لم یزل بلاشبہ وجود حق اور جب اُس کا دوام ماسویٰ پر غالب آتا ہے تو ہر چیز ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے اور یہیں سے وحدۃ الوجود کے قائلوں کو غلط فہمی ہوگئی کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے، اور اس قسم کے مشتبہ کلمات کو (جو اہلِ استقامۃ کی زبان سے نکل گئے) انہوں نے اپنے کفر کا سنگِ بنیاد قرار دے دیا۔“

(مدارج السالکین:۳ / ۸۶، طریق الہجرتین: ص ۳۳۴)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فنا کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں: پہلی فنا انبیا اور کاملین اولیا کا حصہ ہے۔ دوسری قسم قاصدین اولیا و صالحین کو نصیب ہوتی ہے، اس دوسری قسم کی ضمن میں شیخ فرماتے ہیں :

”دوسری قسم ماسوا کے شہود سے فنا ہے اور یہ اکثر سالکین کو پیش آتی ہے۔ خدا کی محبت، عبادت اور یاد کی طرف انجذاب سے یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔ محبوب و مطلوب کا استغراق غیر کا شعور نہیں باقی رہنے دیتا ہے۔ پس موجود کا وجود، مشہود کا شہود اور مذکور کا ذکر اس سے غائب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ مخلوق (اس کی نگاہ میں) فنا ہو جاتی ہے اور صرف خدا باقی رہ جاتا ہے۔ (چوں کہ پہلی قسم کی فنا سے اس فنا کا درجہ کم ہے، اس لیے) انبیا اور اکابر اولیاء اللہ مثلاً: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور سابقین اول کو یہ فنا پیش نہیں آئی۔ ان امور کی ابتدا تابعین کے عہد سے ہوئی ہے اور شیوخ صوفیا سے مثلاً: ابویزید، ابوالحسن نوری، ابوبکر شبلی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کو یہ حالات پیش آئے اور ان کے سوا ابو سلیمان درانی،

معروف کرخی، فضیل بن عیاض، بلکہ جنید رحمہم اللہ تعالیٰ کو بھی یہ صورت پیش نہیں آئی۔" (العبودیۃ:۹۸)

غور کیجیے کہ محققین صوفیا کے وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود میں اور شیخین کی بیان کردہ اس فنا میں کیا فرق ہے؟

کوئی شبہ نہیں کہ فنا کے اس مرتبہ کو شیخین وہ اہمیت نہیں دیتے ہیں جو فنا کی پہلی قسم کو اُن کے نزدیک حاصل ہے، مگر اس مرتبہ کو نہ صرف یہ کہ وہ گمراہی نہیں قرار دیتے ہیں بلکہ اقرار کرتے ہیں کہ حضرات تابعین کے وقت سے یہ کیفیات پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی وسعتِ خیال کا تو یہ عالم ہے کہ اگر سالک غلبہ حال میں سبحانی یامافی الجبۃ الااللہ کہہ دے تو وہ اس کو بھی معذور اور معافی کے لائق جانتے ہیں۔ (مدارج السالکین:۱/۸۴ وطریق الہجرتین)

اگر فلسفیانہ تصوف کے سوا صحیح تصوف میں بھی کسی موقع پر انہوں نے اختلاف رائے ظاہر کیا ہے تو اس پر غور کیجیے کہ یہ اختلاف تصوف کے اصول و مقاصد سے ہے یا فروع میں۔ آپ یقین کریں کہ ان دونوں بزرگوں کو تصوف کے اصول اور مقصد سے مخالف کہیں نہ پائیں گے، باقی فروع میں اختلاف کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ نیز یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ باایں ہمہ جلالتِ قدر و رفعتِ شان بہرحال غیر معصوم انسان تھے، جس طرح دوسروں کی رائے غلط ہو سکتی ہے اسی طرح وہ بھی غلطی کر سکتے ہیں اور ان کا اختلاف مسئلہ کے سقم کی نشانی نہیں ہے، اور اگر ان کا اختلاف صحیح بھی ہے تو کسی مسئلہ میں اختلاف کے یہ کب معنی ہیں کہ پورے فن کے مخالف تھے۔ بہتر ہو کہ ہمارے ناقدین خود حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی رائے کو قبول کر لیں جو انہوں نے شطحیات صوفیا کے ضمن میں ظاہر کی ہے فرماتے ہیں:

"ان شطحیات سے دو مصیبتیں پیدا ہوئیں، ایک یہ کہ ان شطحیات کی وجہ سے ایک جماعت ان بزرگوں سے بدظن ہو گئی اور ان کی پاکیزگی نفس، صدق معاملہ اور محاسن ان سے چھپ گئے اور ان حضرات کا مطلقاً انکار کر دیا گیا۔ لوگ اُن سے بدگمان ہو گیے، حالاں کہ یہ صریح زیادتی ہے، کیوں کہ جس شخص سے کوئی غلطی ہو جائے اگر اس کے تمام محاسن کا انکار کر دیا جائے تو تمام علوم اور صناعات بے کار ہو جائیں اور اُن کے نشانات مٹ جائیں۔ دوسری مصیبت یہ کہ بعض بزرگوں نے ان بزرگوں کے محاسن،

صفاء قلب اور حسن معاملہ کو دیکھ کر اُن کے شطحیات کو بھی قبول کر لیا۔ ان سب میں صحیح تر وہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو اپنے مرتبہ میں رکھتے ہیں۔ صحیح کو قبول کرتے اور غلط کو رد کرتے ہیں۔"

(مدارج السالکین: ج۲، ص۳۰)

یہی حافظ ابن قیم رحمہ اللہ مدارج السالکین میں ایک موقع پر شیخ الاسلام ہروی سے اختلاف کرتے ہیں، مگر فوراً ناظرین کو متنبہ کرتے ہیں کہ:

"یہ غلطی شیخ الاسلام رحمہ اللہ سے بدظن نہ کر دے اور ان کے محاسن کو نظر سے گرا نہ دے، اس لیے کہ علم، امامت، معرفت اور سلوک میں ان کا جو مرتبہ ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔"

(مدارج السالکین: ۱/ ۱۰۸)

حافظ موصوف کی یہی انصاف پسندی ہے کہ شیخ الاسلام حبیبٌ الینا والحق احب الینا منہ (مدارج السالکین: ۲ / ۱۹) کے پیش نظر وہ ہروی سے جابجا اختلاف بھی کرتے ہیں لیکن اُن کے محاسن اور رسوخِ علم کے اعتراف میں بھی پیش پیش ہیں۔ ایک موقع پر کہتے ہیں: استشهاده بهذه الاية في هذا الباب يدل على رسوخه في العلم والمعرفة والقرآن

(مدارج السالکین: ج۳، ص۱۲۲)

اور انجام کار یہی حافظ ابن قیم انہیں صوفی شیخ الاسلام ہروی رحمہ اللہ کے متعلق کہتے ہیں:

"اللہ شیخ الاسلام کی سعی کو مشکور فرمائے، اُن کے درجے بلند فرمائے، اُن کو بہترین جزا دے اور اُن کے محل کرامت میں ہم کو اور اُن کو جمع فرمائے۔" (مدارج السالکین: ۲/ ۲۷)

اب خاتمۂ سخن پر خاکسار کو یہ عرض کرنا ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا حوالہ دے کر تصوفِ صحیح کی مخالفت کرنا ہر گز قرینِ انصاف نہیں ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی کتابوں[1] کو پڑھا جائے، دیکھا جائے کہ یہ مسائلِ تصوف پر کیسی عالمانہ بحث فرماتے ہیں۔ مشائخ کے

---

[1] (فن تصوف پر حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی سب سے مفصل کتاب مدارج السالکین ہے جو تین جلدوں میں علامہ رشید رضا مصری مرحوم کے اہتمام میں چھپی ہے، اس کے ٹائٹل پیج پر درج ہے:) (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

"یہ وہ کتاب ہے جس میں تصوف اور معارفِ الٰہیہ کے حقائق کتاب و سنت اور سلف صالحین کے مطابق بیان کیے گئے ہیں۔ مصر کے ایک مشہور عالم شیخ حامد فقی (جو شیخین کے خاص محبین میں سے ہیں اور ان کے علوم کی نشر و اشاعت کا بہت شوق رکھتے ہیں) کو بڑا غم ہے

اقوال نقل کرتے ہیں، صحیح و سقیم میں امتیاز کرتے ہیں، راجح و مرجوح میں فرق فرماتے ہیں، صوفیا کے درمیان مختلف فیہ مباحث میں محاکمہ کرتے ہیں۔ اگر یہ اس راہِ حق کے رہبر اور بحرِ معرفت کے شناور نہ ہوتے تو اس فن میں یہ مرتبہ پانا ممکن نہ تھا۔ اقوال کے سوا خود اُن کے احوال کو ملاحظہ کیجیے۔ ذکرِ الٰہی کی کثرت، عبادات میں خشوع و خضوع اور تبتل الی اللہ کا کیا عالم تھا؟ اگر طول مبحث کا خوف نہ ہوتا تو میں اُن احوال کو نقل کرتا جو حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے "مدارج السالکین" میں ابوابِ تصوف کے ماتحت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے متعلق نقل فرمائے ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے صراحۃً فرمایا ہے کہ: "جو شخص منازل السائرین کی شرح (مدارج السالکین) کو دیکھے گا اُس پر واضح ہو جائے گا کہ یہ دونوں حضرات (ابن تیمیہ رحمہ اللہ و ابن قیم رحمہ اللہ) نہ صرف یہ کہ اہل سنت والجماعت میں سے ہیں، بلکہ اس اُمت کے اولیا میں سے ہیں۔" (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ: ۴/۲۲۷)

حافظ ابن رجب حنبلی کہتے ہیں:

"ابن قیم رحمہ اللہ کو تصوف میں بڑا مرتبہ حاصل تھا اور ان کو اذواق و مواجیدِ صحیحہ کا بڑا حصہ ملا تھا، جس پر ان کی کتابیں شاہد ہیں۔" (جلاء العینین: ص ۲۰)

ان حقائق کے انکشاف کے بعد ہمارے ناقدین اور معترضین شیخین کی کتابوں کو پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ ان بزرگوں کو کس تصوف سے اختلاف تھا؟

کہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس کتاب میں شیوخ صوفیا سے بکثرت نقل کیوں کیا ہے اور ان کے کلام کو اسلامی کیسے قرار دے دیا ہے؟ (حاشیہ العبودیۃ: ص ۲۹)

شیخ حامد کو یہی شکایت ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے بھی ہے کہ انہوں نے مشائخ صوفیا کی تعریف کیوں کی ہے؟ (حواشی العبودیۃ) اللہ اکبر! یہ الناس اعداء لماجھلوا کی کیسی دردناک صورت حال ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ کی ہر رائے بہتر اور قابل ترجیح، لیکن جب وہ کوئی ایسی چیز بیان کریں جس کو اپنا نفس نہ قبول کرے تو وہ کسی دلیل کے بغیر رد کر دی جائے؟

علامہ رشید رضا مصری نے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھا ہے۔ انہوں نے بھی تصوف کے متعلق عام خیال بہتر نہیں ظاہر کیا ہے مگر مجبوراً یہ اقرار کرتے ہیں کہ: "بلاشبہ صوفیا کے حقائق ہیں جن کے سامنے فقہاء و متکلمین کی گردنیں جھک گئی ہیں، اور یہ در حقیقت علماء حکماء ہیں۔" اسی دیباچہ میں کہتے ہیں کہ: "صالح صوفیا نے اسرارِ شریعت کے بیان اور تربیتِ اخلاق کے ذریعہ سے اسلام کی خدمت کی ہے۔"

جن لوگوں کو ابن تیمیہ رحمہ اللہ، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ، حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ سے حسنِ ظن ہے، ان کو علمائے حق میں سے جانتے ہیں، یا تو وہ یہ فیصلہ کرلیں کہ یہ سب حضرات باایں ہمہ اتباعِ سنت ایک غلط چیز کو قبول کرنے پر متفق ہوگئے تھے اور ان سب نے عمداً یا جہلاً اُمت کو نادرست چیز کی تعلیم و تلقین کی، اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود اپنے متعلق غور کریں کہ کہیں اس باب میں انہی سے تو غلطی نہیں ہو رہی ہے؟

ناچیز راقم کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہمارے یہ معترضین وناقدین اتنے اعتراض و تنقید کے وقت اس مروجہ تصوف کو پیش نظر رکھتے ہیں جس کی بارگاہ میں گستاخی کے مجرم ہم نیاز مند بھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم جس طرح اسرائیلیات کی بنا پر تفسیر کو، موضوعات کی بنا پر فن حدیث کو اور مرجوع مسائل کی بنا پر دفاترِ فقہ کو رد نہیں کرتے ہیں، اسی طرح تصوف کے نام پر آج بہت سی خانقاہوں اور مزاروں پر جو کچھ ہوتا ہے، اس کی بنا پر نفس تصوف کو ہم رد نہیں کرتے۔ بلکہ بحمد للہ اصل اور نقل کے امتیاز کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ (دیکھیے تصوف کیا ہے؟:۶۱ تا ۱۱۰)

اب آخر میں راہِ تزکیہ واخلاص کے طالبوں کے لیے چند ابتدائی مفید مشورے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کے قلم سے پیش کرتے ہیں۔

تصوف واحسان کے طالبوں کو چند ابتدائی مشورے

"اس کتاب کے ابتدائی پانچ مقالات جب باقساط الفرقان میں شائع ہوئے تو بعض حضرات نے ان کو پڑھ کر اصرار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے جن بندوں کے دلوں میں ان کے مطالعہ سے دین کے اس شعبہ کی ضرورت کا احساس اور اس کی تحصیل کی چاہت پیدا ہو ان کو کچھ ایسے ابتدائی مشورے دینا بھی ضروری ہیں جن کی روشنی اور راہنمائی میں وہ اگر چاہیں تو بلا تاخیر اپنا سفر شروع کرسکیں، کیوں کہ تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے احساسات پر اگر جلدی عملی قدم نہ اُٹھایا جائے تو بالآخر وہ مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے چند ابتدائی مشورے عرض کردینا بھی مناسب معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان سے فائدہ پہنچائے۔"

اللہ کے جن بندوں کے دل میں دین کے اس تکمیلی شعبہ کی طلب اور اس کی تحصیل کا داعیہ پیدا ہو اُن کو چاہیے کہ :

سب سے پہلے تو اپنی نیت صحیح کریں۔ یعنی اپنے نفس کی اصلاح اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی عبدیت کے تعلق کی درستی اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کو مقصود بنائیں۔ کشف و کرامات کی طلب یا بزرگی اور بڑائی حاصل کرنے کی ہوس ایک طرح کا شرک ہے۔ اس لیے اس طرح کا کوئی مقصد دل کے کسی گوشہ میں بھی باقی نہ رہنے دیں۔

پھر نیت اور ارادہ کی اس تصحیح کے بعد اس راستہ کی راہنمائی اور رہبری کے لیے اللہ کے کسی ایسے صالح اور صاحبِ ارشاد بندے کی طرف رجوع کریں جو اس کے اہل ہوں اور طبیعت کو بھی جن کے ساتھ مناسبت ہو اور جن کی خدمت میں پہنچنا اور صحبت سے فیض یاب ہونا زیادہ مشکل نہ ہو۔

اگر ایسے حضرات سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے خود فیصلہ اور انتخاب مشکل ہو تو بہتر یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ اور دین میں بصیرت رکھنے والے نیک صالح لوگوں سے مشورہ لیں اور اپنے زمانہ کے جن جن بزرگوں کے متعلق وہ رائے دیں ان کی خدمت میں جائیں اور چند چند دنوں ٹھہر کر خود دیکھیں اور جہاں طبیعت کی مناسبت محسوس ہو اور دل میں جن کی عظمت اور محبت زیادہ پیدا ہو اور جن سے اپنے کو نفع کی زیادہ امید ہو، ان ہی کو اپنے لیے منتخب کرلیں، اور اگر مخلص اور اہل مشیروں کے مشورے ہی سے کسی بزرگ کی طرف رجوع کرنے کے لیے اپنی رائے قائم ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اُن ہی کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کرلیا جائے۔ لیکن آخری فیصلہ کرنے اور اپنی طلب اور ارادت کا اُن سے اظہار کرنے سے پہلے بطریقِ مسنون استخارہ بہر حال کرلیا جائے جس کا طریقہ حدیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ :

”پہلے اہتمام سے وضو کیا جائے، اس کے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھی جائے اور سلام کے بعد دل کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا کی جائے۔“

(اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْاَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ اَللّٰھُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاقْدُرْہُ لِیْ وَیَسِّرْہُ لِیْ ثُمَّ بَارِكْ

لِيْ فِيْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِيْ فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ وَاصْرِفْنِيْ عَنْهُ وَاقْدِرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِيْ بِهٖ۔ (دعائے استخارہ کے یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں، اس کے راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو استخارہ کی یہ دعا ایسے اہتمام سے سکھاتے تھے جیسے اہتمام سے قرآن مجید کی سورتیں سکھاتے تھے۔)

(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری شریف)

''اے اللہ! میں تیرے علم محیط سے اپنی بہتری چاہتا ہوں (تو ہی اپنے محیط علم سے بہتری کی طرف میری رہنمائی فرما) اور تیری قدرتِ کاملہ سے (اپنی بہتری پر) قدرت مانگتا ہوں، اور تیرے فضل عظیم سے سوال کرتا ہوں، کیوں کہ تو قادر ہے اور میں عاجز ہوں اور تو سب کچھ جانتا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا اور تو تو سب غیبوں کا بھی جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر یہ کام (جس کے بارے میں میں استخارہ کر رہا ہوں، یہاں اس کام اور اس مقصد کا تصور کرنا چاہیے جس کے بارے میں استخارہ کرنا ہو، مثلاً کسی شیخ کی طرف رجوع کرنے کے سلسلے میں استخارہ کرنا ہو تو اسی مقصد کا دل میں تصور کیا جائے۔) تیرے علم میں میرے لیے، میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت کے لیے بہتر ہے اور اس میں میرے لیے خیر ہے تو اس کو میرے واسطے مقدر فرمادے اور اس کا حاصل کرنا میرے لیے آسان کر دے، پھر اس کو باعث خیر وبرکت بھی بنادے، اور اگر تیرے علم میں اس کام کا انجام میرے لیے، میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت کے لیے برا ہے تو اس کو میری طرف سے پھیر دے اور میرے دل کو اس کی طرف سے پھیر دے اور جہاں کہیں میرے لیے بہتری ہو اس کو میرے واسطے مقدر کر دے۔ پھر میرے دل کو اس پر راضی اور مطمئن بھی کر دے۔''

استخارہ کے بعد اگر دل کا وہ رجحان ویسا ہی رہے یا اور ترقی کر جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر اور برکت کی امید کرتے ہوئے بنامِ خدا ان ہی بزرگ کی طرف رجوع کرنے اور ان سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کا فیصلہ کر لیں، اور اگر استخارہ کے بعد دل اُدھر سے ہٹ جائے تو پھر کسی اور کے متعلق سوچیں۔

بہر حال استخارہ کے بعد دل کا جو رجحان ہو (خواہ کسی خواب وغیرہ کی رہنمائی سے ہو یا آپ سے آپ ہو) اسی کو استخارہ کا نتیجہ سمجھ کر اس کے مطابق عمل در آمد کرنا چاہیے۔ ایک دفعہ کے استخارہ کے بعد کوئی رجحان ضرور پیدا ہو جائے گا اور طبیعت اس طرف مائل کر دی جائے گی جس میں بہتری ہو گی۔

بہر حال استخارہ کے بعد جب دل کا رجحان کسی بزرگ کی طرف ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے خیر اور سعادت کی دعا کرتے ہوئے اپنا مقصد ان سے عرض کریں اور اپنی رہنمائی میں لینے کی اُن سے درخواست کریں۔ بیعت کا مقصد اور ارادت کی اصل حقیقت بس یہی ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ بیعت تربیت جس کا یہاں ذکر ہے، اسی لیے کی جاتی ہے۔ بیعت برکت اور بیعت توبہ کا ذکر یہاں نہیں ہے۔)

پھر وہ بزرگ جو کچھ ہدایات اور تعلیم فرمائیں اور جو مشورے دیں ان کی اس سے زیادہ اہتمام سے تعمیل اور پابندی کریں جتنے اہتمام سے جسمانی مریض اپنے معالج، حکیم یا ڈاکٹر کے طبی مشوروں کی پابندی کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ ضروری ہے کہ اس راہ کی رہنمائی کے لیے جن کو منتخب کیا جائے ان میں پہلے ہی یہ چند چیزیں ضرور دیکھ لی جائیں تاکہ تعلق کی بنیاد پورے اطمینان اور اعتماد پر ہو:

(الف) وہ دین اور شریعت سے واقف ہوں اور ان کے یہاں شریعت و سنت کے اتباع کا پورا اہتمام ہو۔

(ب) ان کے احوال سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں اور ان کی طلب اور رغبت کا رخ دنیا اور اس کے جاہ و مال کی طرف نہیں، بلکہ اللہ اور آخرت کی طرف ہے۔

(ج) سلوک میں اتنی بصیرت رکھتے ہوں کہ طالب کے حالات کی رعایت رکھتے ہوئے اس کی رہنمائی اور رہبری کر سکیں۔

(د) ان کے طرزِ عمل سے اس کا اندازہ ہو کہ طالبوں اور تعلق رکھنے والوں سے وہ شفقت رکھتے ہیں اور خیر خواہی اور نفع رسانی کی فکر اور کوشش کرتے ہیں۔

(ہ) دین کے اس شعبہ (سلوک) کی تحصیل انہوں نے کسی شیخ کامل کی رہنمائی اور نگرانی میں کی ہو اور اُن کی صحبت اُٹھائی ہو اور انہوں نے ان کو ارشاد و تربیت کا اہل قرار دیا ہو۔

(و) جو لوگ ان سے تعلق رکھتے ہوں اور دین کے سلسلے میں اُن کے پاس آتے جاتے ہوں، اُن کو دینی نفع ہوتا ہو، اور آخرت کی فکر ان میں بڑھتی ہو۔

اگر ان چیزوں کو دیکھ بھال کر اور اپنے دل کا اطمینان کر کے اللہ کے کسی بندہ کے ساتھ راہِ سلوک میں استفادہ کا تعلق قائم کیا جائے گا اور اپنے کو ان کی رہنمائی میں دے دیا جائے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہر گز محرومی نہ رہے گی۔ (تصوف کیا ہے؟: ص ۱۳۰ تا ۱۳۶)

تصوف، طریقت و سلوک سے متعلق ضروری بحث آپ کے سامنے آ گئی جس سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ حقیقت میں تصوف و طریقت دینِ اسلام کے اس شعبہ کا نام ہے جس کو قرآن مجید کی اصطلاح میں "تزکیہ" اور حدیث کی اصطلاح میں "احسان" کہا جاتا ہے۔ یہ انہی لوگوں سے سیکھا جاتا ہے جو متقی اور پرہیز گار ہوں، جن کے دل رذائل سے پاک اور اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس راہ کے پیچ و خم اور انسانی نفسیات سے بھی ایک حد تک واقفیت رکھتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نیک، صالح، متقی لوگوں کے ساتھ وابستہ رکھے۔ " آمین "

☆......☆......☆

توبہ واستغفار کا بیان

اللہ تعالیٰ نے انسان کے خمیر اور اس کی فطرت میں تقویٰ کی چنگاری اور نیکی اور برائی کا شعور رکھ دیا ہے۔ اس لیے وہ برائی و بدی کو برا اور نیکی و تقویٰ کو محبوب رکھتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَلْهَمَهَافُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ”پس ہم نے اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور اس کی نیکی۔“ (سورۃ الشمس: آیت ۸)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کرنے کی صلاحیت اور طاقت بھی رکھ دی ہے اور اس کے اندر نیکی اور بدی کا وجدانی شعور بھی رکھ دیا ہے۔ اسی میں انسان کا امتحان ہوتا ہے۔

انسان گناہ کا ارتکاب کیوں کرتا ہے؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کو تقویٰ اور نیکی محبوب اور پسند ہے اور وہ بدی کو برا سمجھتا ہے، تو پھر وہ بدی اور برائی کا ارتکاب کیوں کرتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ برائی کو برائی جانتا ہے لیکن جذبات سے مغلوب ہو کر برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا جسم مادی ہے اور اس کی نشو و نما، بقا، اس کی راحت اور لذت وغیرہ کا سامان بھی انہی مادی چیزوں سے وابستہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ان چیزوں کے حاصل کرنے کی صلاحیت، تقاضے اور خواہش بھی پیدا فرمائی ہے تاکہ اس کی وجہ سے وہ اپنے بدن کی حفاظت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو وہ چیزیں محبوب ہو جاتی ہیں جن سے اس کی خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو دنیا کے مال و متاع اور عزت و شہرت سے محبت ہوا کرتی ہے۔

اس نفسانی خواہش کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابلیس (شیطان) کو بھی پیدا فرمایا ہے جو ہر وقت اسے نفسانی خواہشات، لذات اور مال و جاہ حاصل کرنے کے حرام و ناجائز طور طریقے سکھاتا ہے، فحاشی و بدکاری اور جرائم کے سبز باغ دکھاتا ہے اور گناہ کے کام کو اس کے سامنے مزیّن کر کے، حسین بنا کر پیش کرتا رہتا ہے۔ اس کی انتہائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح بندے کو ناشکری، نافرمانی اور گناہوں

میں مبتلا کر کے اپنے پروردگار اللہ رب العالمین سے دور کرے۔ جب انسان پر نفس وشیطان کا داؤ چل جاتا ہے تو وہ جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ اور جرم کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔

گناہ کے ارتکاب کے بعد ہر اس شخص کو اس گناہ کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس پر نادم اور پشیمان ہوتا ہے جس کے اندر تقویٰ کی یہ صلاحیت اور شعور کسی نہ کسی درجے میں باقی ہو۔ گناہ کا یہ احساس اور اس پر ندامت اس بات کی دلیل ہے کہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا، بلکہ نفسانی خواہشات اور جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

بُرے لوگ بھی گناہ کو بُرا سمجھتے ہیں

اگرچہ بعض لوگ گناہوں سے اپنے نفس کو اس قدر زنگ آلود کر لیتے ہیں کہ وہ پھر اپنے کیے ہوئے گناہوں کے لیے دلائل اور اعذار تلاش کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ اپنی برائیوں کو خوب جانتے ہیں۔ اس حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۞ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۞ "بلکہ انسان خود اپنے اوپر شاہد (گواہ) ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی معذرتیں (اور بہانے پیش) کرے"۔

(سورۃ القیامۃ: آیت ۱۴، ۱۵)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر انسان اپنی اندرونی حالت اور برائیوں کو خوب جانتا ہے۔ اگرچہ وہ زبان سے اپنے حق میں بہت سے دلائل اور اعذار تراش لے، لیکن خود اس کا ضمیر اس کو ٹوکتا رہتا ہے۔ چناں چہ ایک گمراہ آدمی ہزار دلائل پیش کر کے لوگوں کو تو یہ باور کرا سکتا ہے کہ وہ جس گمراہی پر جما ہوا ہے وہ درحقیقت اس گمراہی کو صحیح اور درست سمجھتا ہے، لیکن اس کو خود معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس گمراہی پر کیوں ڈٹا ہوا ہے اور اسے حق کو حق تسلیم کرنے سے کون سے جذبات روک رہے ہیں۔ اسی طرح ایک چور، ایک منافق، ایک جھوٹا، ایک خائن، ایک حرام خور اور ایک ظالم آدمی اپنی بد اعمالیوں کے لیے ہزارہا دلیلیں پیش کر کے لوگوں کو تو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ صادق، سچا، امانت دار، حلال خور اور حق پر ہے، لیکن وہ خود اپنے جھوٹ و نفاق، چوری و بے ایمانی اور ظلم کو خوب جانتا ہے، بلکہ اگر کوئی خود اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے اپنی برائیوں کے لیے ہزار اعذار اور دلائل پیش کر کے اپنے ضمیر کو اطمینان

دلانے کی کوشش کرے، تب بھی وہ ان برائیوں کو برائیاں ہی سمجھے گا۔ اگر کوئی دوسرا اس کے ساتھ وہی برائی کر بیٹھے جو وہ دوسروں کے ساتھ کرتا ہے، مثلاً: کوئی دوسرا اُس پر وہی ظلم کرے جو وہ دوسروں پر روا رکھتا تھا، یا اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ جھوٹ اور غداری کا معاملہ کرلے تو پھر یہی شخص اس برائی کو گناہ اور بدی کا کام ہی ٹھہراتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے اور اس کا بس چلے تو اس پر اُس کو سزا بھی دیتا ہے ورنہ حکومت وغیرہ سے سزا دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کا شعور رکھ دیا گیا ہے۔ وہ نیکی اور بدی، حق و باطل اور صحیح و غلط میں تمیز کرسکتا ہے۔ وہ فطرتاً نیکی کو محبوب رکھتا ہے اور بدی کو ناپسند کرتا ہے اور نیکی و تقویٰ کا عزت و احترام کرتا ہے، اگرچہ خود اس کا عمل اس کے خلاف ہو۔ اگرچہ وہ ان نیکوکاروں سے دشمنی بھی رکھتا ہو جو اس کو اُس کی برائی اور غلطی پر ٹوکتے رہتے ہیں، لیکن بس وہ بدی کو بدی ہی جانتا ہے اور نیکی کو نیکی۔ وہ اپنی فطرت کے تحت یہی چاہتا ہے کہ برائی کرنے والے کو سزا ملنی چاہیے اور نیکی کرنے والے کو انعام، البتہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ اور جرم بھی کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس سزا سے بری بھی کرنا چاہتا ہے۔

انسان کے اندر بدی کا میلان اور قوت کیوں رکھی گئی ہے؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کے اندر یہ بدی کا میلان اور بدی کی قوت کیوں رکھی گئی ہے اور اس پر شیطان کیوں مسلط کر دیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی قوت، میلان اور شیطان سے ٹکر لینے کی وجہ سے تو انسان برابر ترقی کرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا مقرب بن جاتا ہے۔ اگر یہ قوت نہ ہوتی تو انسان ذرہ برابر ترقی بھی نہ کرتا۔

اللہ تعالیٰ کا قُرب اور روحانی ترقی خواہشات کی قربانی سے حاصل ہوتی ہے؟

فرشتے اللہ تعالیٰ کی وہ پاکیزہ اور فرمانبردار مخلوق ہے جن سے نافرمانی اور گناہ کا ہونا محال ہے، لیکن وہ اپنے مقام سے ذرہ برابر بھی ترقی نہیں کرسکتے اور نہ ان کے اندر خلافت کی اہلیت اور صلاحیت ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے اندر گناہ اور بدی کا میلان اور قوت ہی نہیں ہے۔ جب ان کے اندر نفسانی خواہشات اور جذبات ہی نہیں ہیں تو ان کی اطاعت، فرمانبرداری اور بے گناہی میں ان کی کسی قسم کی قربانی

کا دخل نہیں، اور ترقی کا راز تو نفس کے ساتھ کشمکش اور اللہ تعالیٰ کے لیے نفسانی خواہشات کی قربانی اور انہیں کچل دینے میں پوشیدہ ہے۔ یہی خواہشات اور جذبات ہی تو ہیں جن کی قربانی دینے اور جن کو کچل دینے سے انسان فرشتوں سے بھی بازی لے جاتا ہے اور انہی خواہشات وجذبات کے ایندھن کو جلا جلا کر قُربِ الٰہی اور روحانی پرواز کے لیے بے پناہ قوت (اور سٹیم) تیار کرتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ جنت کی دائمی، حقیقی لذتوں، راحتوں اور خواہشوں کا مستحق بن جاتا ہے۔ اگر انسان کے اندر یہ قوت نہ ہوتی تو وہ کسی انعام واکرام کا مستحق بھی نہ ہوتا۔

جنت کی لذتیں، راحتیں قربانی پر ملتی ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ فرشتے بھی جنت میں ہوں گے، لیکن جس طرح وہ دنیا کی لذتوں سے کوئی لذت حاصل نہیں کرسکتے اسی طرح وہ جنت کی لذتوں سے بھی ناآشنا ہوں گے۔ جنت کی لذتیں اور راحتیں تو صرف انسان کے لیے ہیں اور یہ خوشیاں اور کامیابیاں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر خواہشات اور جذبات کی قربانی پر ملتی ہیں۔

دنیا وآخرت کی بربادیوں اور پریشانیوں کی وجہ

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسان کی ترقی وکامیابی اور حقیقی راحتوں، لذتوں اور عزت کا راز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے نفسانی خواہشات کے کچلنے میں ہے تو اس سے یہ بات خود بخود معلوم ہوگئی کہ انسان کے تنزل، ذلت، بربادیوں اور پریشانیوں کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو شُتر بے مہار کی طرح چھوڑ دے اور جائز، ناجائز کی پرواہ کیے بغیر اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کرے۔ اس کی وجہ سے انسان فوری اور عارضی طور پر دنیا کی لذت، راحت یا عزت تو حاصل کر سکتا ہے، لیکن اس کا انجام ذلت اور بربادی ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ یرقان اور شوگر کا مریض بدپرہیزی کی وجہ سے عارضی لذت تو حاصل کرلیتا ہے، لیکن اس کا انجام اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنا ہوتا ہے۔

یہی حال گناہ گارانہ اور مجرمانہ زندگی کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں بھی انسان پر آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اور اگر کوئی باز نہ آئے تو بالآخر دنیا اور آخرت دونوں تباہ وبرباد ہوجاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ

كَثِيرٍ ۝ وَمَآاَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَالَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَانَصِيْرٍ ۝

"اور جو کچھ مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے کرتوتوں کی بدولت ہی پہنچتی ہے (اور ہر گناہ پر نہیں پہنچتی بلکہ) بہت سے قصوروں کو وہ معاف بھی کر دیتا ہے، اور تم زمین میں (کسی جگہ بھی پناہ لے کر) اللہ تعالیٰ کے قابو سے نکل نہیں سکتے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا نہ تمہارا کوئی ساز گار (کام بنانے والا) ہے اور نہ کوئی مدد گار ہے۔" (سورۃ الشوریٰ: آیت ۳۰-۳۱)

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ "بحر و بر (خشکی و تری ہر جگہ) میں لوگوں کے اعمال کی بدولت فساد پھیل گیا ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ وہ (اپنے برے اعمال سے) باز آجائیں"۔ (سورۃ الروم: آیت ۴۱)

مذکورہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جب لوگ دینِ فطرت اور نیکی کی راہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور ظاہری اور باطنی برائیوں کو اختیار کر لیتے ہیں تو ان برائیوں کی وجہ سے ان پر طرح طرح کے مصائب اور آفتیں نازل ہوتی ہیں، اور انہی بد اعمالیوں کی وجہ سے خشکی اور تری ہر جگہ فساد چھا جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان کا ظاہری اور باطنی اطمینان و سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ لوگوں کی گمراہی اور ان کی بد اعمالیوں کا انجام تو موت کے بعد ان کے سامنے لایا جائے گا، لیکن دنیا میں بھی اُن کو اُن کی بد اعمالیاں بے چینی، بیماری اور مصائب میں گرفتار کر لیتی ہیں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں وقتی طور پر ان کے کرتوتوں کا مزہ چکھا دیتا ہے، اور اس سزا سے مقصود لوگوں کو تنبیہ کرنی ہوتی ہے، تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اپنی برائیوں اور گمراہیوں سے باز آکر راہِ راست پر آجائیں، اور ایمان و تقویٰ کی سیدھی شاہراہ کو اپنا کر فلاح پا سکیں۔ اور جو لوگ ان سزاؤں سے عبرت حاصل نہ کریں اور جن کی فطرت اس قدر مسخ ہو چکی ہو کہ وہ ان تازیانوں سے بھی بیدار نہ ہوں تو یہی سزائیں ان پر حجت تمام کر دیتی ہیں اور بالآخر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دائمی عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ برائی کا انجام دنیا اور آخرت دونوں کے لحاظ سے تباہ کن ہے، لہٰذا انسان کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ ایمان و تقویٰ کی راہ پر جما رہے۔

مصائب اور پریشانیوں کا علاج

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور برائیوں کی وجہ سے انسان بے چینی اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سے خود بخود مصائب اور پریشانیوں کا علاج بھی معلوم ہوا۔ وہ یہ کہ انسان ظاہری اور باطنی گناہوں سے پرہیز کرے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے اور اس کے دین کو پوری طرح اختیار کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۞ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۞ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۞

" اور جو شخص میری یاد دہانی (اور نصیحت) سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے تنگی کی زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو (دنیا میں) بینا تھا۔ (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: اسی طرح (دنیا میں) ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تُو نے ان کو بُھلا دیا (یعنی ان کو نظر انداز کر دیا) تو اسی طرح آج تجھے بھلا دیا جائے گا (یعنی نظر انداز کیا جائے گا)"۔ (سورۂ طٰہٰ: آیت ۱۲۴ - ۱۲۶)

تنگ زندگی وہ ہوتی ہے جو سکون و طمانیت اور شرح صدر کی نعمت سے محروم ہوتی ہے۔ جو شخص ایمان و تقویٰ کی دولت سے محروم ہوتا ہے وہ اپنی زندگی میں غیر مطمئن، بے چین، مضطرب، ڈانواں ڈول، پریشان حال اور اندرونی خلفشار میں مبتلا رہتا ہے، اگرچہ وہ دنیا کے ظاہری اسباب، مال و دولت اور اپنی نمائشوں سے اس پر کتنا ہی پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ جو لوگ ایمان کی دولت سے محروم ہیں ان کے ظاہری مال و دولت، اقتدار اور ٹھاٹ باٹ سے دھوکہ نہ کھائیں۔ اگر آپ ان کے سینوں میں جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر کس قدر بے چینی کی آگ بھڑکتی ہے اور وہ کس قدر ذہنی پریشانیوں،

الجھنوں اور مصائب میں مبتلا ہیں، اور موت کے بعد اور قیامت میں ان کا جو حشر ہو گا وہ تو بہت ہی ہولناک ہو گا۔ ایسے لوگ قیامت کے دن اندھے اٹھائے جائیں گے اور ان کو دائمی عذاب میں گرفتار کیا جائے گا، کیوں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں، آنکھوں، کانوں اور دل و دماغ کی سخت ناشکری اور ناقدری کی تھی کہ انہوں نے ان سے کام نہیں لیا۔

وہ قیامت کے دن فریاد کریں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم تو آنکھیں رکھنے والے تھے، تُو نے ہم کو اندھا بنا کر کیوں اٹھایا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان سے کہا جائے گا کہ ہم نے تمہارے پاس اپنی کتاب بھیجی تھی جس کی آیات نے ایک ایک حقیقت تم پر پوری طرح واضح کر دی، لیکن تم نے ان کو نظر انداز کر دیا اور ان کا کچھ خیال نہ کیا۔ اس وقت تم نے اپنی آنکھ، کان اور دل و دماغ سے کوئی کام نہیں لیا، دنیا کے نشے میں اندھے، بہرے بنے رہے، اس لیے اب تمہاری یہ آہ و زاری اور فریاد بے سود ہے۔ جس طرح تم نے ہماری آیات کو نظر انداز کر دیا تھا اسی طرح تم کو عذاب میں گرفتار کر کے نظر انداز کر دیا جائے گا، اور تمہاری فریاد پر کوئی توجہ نہیں دی جائے گی۔

اس سے بھی یہی بات معلوم ہوئی کہ دنیا کی پریشانیوں اور مصائب کا واحد حل اور علاج گناہوں سے پرہیز کرنا، اللہ تعالیٰ، رسالت اور آخرت پر حقیقی معنوں میں ایمان لانا اور تقویٰ کو اختیار کرنا ہے۔ اسی حقیقت کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ دوسرے انداز میں یوں فرمائی ہے کہ:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ
وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞

” جو کوئی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو ایک پاکیزہ اور اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور جو کچھ (نیک اعمال) وہ کرتے رہے ہم ان کو (آخرت میں ان کا) بہترین بدلہ دیں گے “۔ (سورۃ النحل: آیت ۹۷)

پاکیزہ اور اچھی زندگی کا یہ وعدہ دین اور دنیا دونوں اعتبار سے ہے۔ جو لوگ صحیح معنوں میں ایمان و تقویٰ کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں ان کو آزمائشیں پیش آتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے صبر و

استقامت کا امتحان لیتا ہے اور ان کی صلاحیتوں اور نورِ ایمان کو پروان چڑھاتا ہے، اوران کے ایمان و تقویٰ کے سبب ان کو قلبی سکون، طمانیت اور شرح صدر کی نعمتوں سے نواز دیتا ہے، جن کی وجہ سے ان کی پوری زندگی دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے بہت ہی اچھی، پر سکون اور پاکیزہ گزرتی ہے۔ اس کا پورا بیان بابِ تقویٰ میں آئے گا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ پریشانیوں کا واحد حل اور علاج گناہوں سے پرہیز میں ہے۔

نیک اعمال کے باوجود پریشانی

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو نماز، روزہ، تہجد اور ذکر وغیرہ عبادات کا خوب اہتمام کرنے والے ہوتے ہیں اور دوسرے نیک اعمال بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ بے چین اور پریشان حال ہوتے ہیں، ؟اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں گناہوں کو نہیں چھوڑتے۔ وہ نماز، روزہ، ذکر وغیرہ کی پابندی تو کرتے ہیں لیکن ان کی کمائی ناجائز اور حرام کی ہوتی ہے یا وہ جھوٹ، غیبت، بدزبانی، بدگمانی، حسد، بدنظری، بندوں کے حقوق مارنے اوران کی ایذارسانی جیسے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں ان کی زندگی اطمینان والی کیسے ہوسکتی ہے۔

ایک شخص اگر ایسے کمرے میں ایئر کنڈیشنر لگائے جس کے چاروں طرف بڑی بڑی کھڑکیاں اور دروازے ہوں اور وہ ان تمام دروازوں اور کھڑکیوں کو کھلا رکھے تو ایئر کنڈیشنر اس کمرے کو ٹھنڈا نہیں کرسکے گا۔ اسی طرح جو شخص اپنے دل و دماغ اور اپنی آنکھوں، کان، زبان اور ہاتھ پاؤں وغیرہ تمام دروازوں کو گناہ کے لیے کھلا رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ذکر و عبادات کی پابندی کرتا رہتا ہے تو یہ ذکر و عبادت اس کے دل کے کمرے کو حقیقی معنوں میں ٹھنڈا اور پر سکون نہیں کرسکتے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص صرف فرض، واجب اور لازمی عبادات کو اختیار کرتا ہے لیکن وہ ہر قسم کی نافرمانیوں اور گناہوں کی کھڑکیوں کو بند کردیتا ہے، اگرچہ وہ مستحب اعمال و عبادات نہ بھی کرے تو بھی ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی زندگی پر سکون گزرے گی۔

گناہ کیا ہے؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گناہ اور نافرمانی کیا ہوتی ہے؟ تاکہ اس سے بچا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن چیزوں کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم فرمایا ہے، ان کو حضور ﷺ کے طریقے کے مطابق ادا کرنا اور جن کاموں اور باتوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے اس سے اپنے آپ کو بچانا اور پرہیز کرنا فرمانبرداری ہے اور اس کے خلاف عمل کرنا گناہ اور نافرمانی ہے۔

گناہوں اور نافرمانیوں کی تفصیل

گناہوں اور نافرمانیوں کی ضروری تفصیل یہ ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو کسی طرح سے شریک ٹھہرانا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے ثابت شدہ عقائد، حقائق، احکامات اور ہدایات میں سے کسی عقیدے اور حقیقت، یا کسی حکم اور ہدایت کا انکار کرنا، یا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات واحکامات پر دوسروں کے قوانین واحکامات کو ترجیح دینا۔ رسول اللہ ﷺ، شعائر اللہ اور اللہ تعالیٰ کے نام منسوب کردہ چیزوں کی توہین اور بے ادبی کرنا۔

۳۔ دین کے نام پر ایسے کاموں کو اختیار کرنا اور پھیلانا جن کی دینِ اسلام میں کوئی اصل اور بنیاد نہ ہو، اس کا نام بدعت ہے۔

۴۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور عبادات میں کوتاہی و سستی کرنا۔

۵۔ جھوٹ، غیبت، چغلی، گالی گلوچ، کسی کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچانا، کسی پر طعن کرنا، کسی کا مذاق اڑانا، امانت میں خیانت، دھوکہ، غداری، سخت مجبوری کے بغیر لوگوں سے سوال کرنا، ناحق قتل کرنا، زنا، نشہ۔

۶۔ چوری، ڈاکہ، کسی کے مال یا زمین کو غصب کرنا۔

۷۔ امرد (بے ریش) لڑکوں، حسین لڑکوں اور اجنبی عورتوں کو لالچ کی نظر سے دیکھنا اور بلاشرعی ضرورت کے ان کی طرف دیکھنا، ان سے گلے ملنا وغیرہ، اور گانوں، بینڈ باجوں وغیرہ کو اختیار کرنا یا گانے سننا یا ان کو فلموں، کیسٹوں وغیرہ کے ذریعے پھیلانا۔

۸۔ اجنبی عورتوں سے خلوت اور تنہائی میں ملنا۔

۹۔ اجنبی عورتوں کے ساتھ اختلاط۔

۱۰۔ سود، سٹہ، جوا، لوگوں پر ظلم کرنا۔

۱۱۔ جائز امور میں والدین کی نافرمانی کرنا، ماں، باپ اور اپنے بڑوں کا ادب واحترام نہ کرنا اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرنا، ان کے حقوق کی ادائیگی میں سستی اور کوتاہی کرنا۔

۱۲۔ یتیموں، محتاجوں، بے کسوں اور مظلوموں کے ساتھ حسنِ سلوک نہ کرنا اور ان سے بے رخی کا رویہ رکھنا یا ان پر احسان جتلانا یا ان کی خدمت اور مدد کر کے ان کو لوگوں میں رسوا کرنا۔

۱۳۔ دشمنانِ اسلام کو راز دار دوست بنانا، مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی حمایت کرنا اور اسلامی معاشرت اور ہیئت کے مقابلے میں ان کا طرزِ زندگی اور لباس وغیرہ اپنانا۔

۱۴۔ طاقت کے باوجود مسلمانوں کی مدد سے ہاتھ روکنا اور ان کو ظلم وبربریت کے لیے تنہا چھوڑنا۔

۱۵۔ کسی مسلمان کو اپنے قول یا اپنے عمل سے کسی طرح کی تکلیف پہنچانا۔

۱۶۔ عورتوں کا مردوں کی طرح اور مردوں کا عورتوں کی طرح لباس، چال ڈھال اور گفتار وغیرہ اختیار کرنا۔

۱۷۔ ضرورت اور وسعت کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑنا اور برائیوں کو روکنے کی طاقت رکھنے کے باوجود لوگوں کو گناہوں سے نہ روکنا۔

۱۸۔ جس وقت جہاد کا عام حکم ہو اس وقت بلاشرعی ضرورت کے جہاد سے جی چرانا یا بلاشرعی مجبوری کے میدانِ جنگ سے صرف اپنے ذاتی مفادات کی خاطر بھاگ کر واپس آجانا اور اسلامی لشکر کے حوصلوں کو کمزور کرنا۔

۱۹۔ کبر، غرور، فخر، ریاکاری، بخل، بے رحمی، بے صبری اور ناشکری وغیرہ جیسے گناہوں میں مبتلا ہونا اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنا اور ان کے علاج سے غافل ہونا۔

۲۰۔ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے اور آخرت کے بجائے دنیا کی عزت، لذت، مال اور شہرت کو مقصود بنانا۔

گناہوں اور نافرمانیوں سے متعلق اجمالاً چند ضروری باتوں کو ذکر کیا گیا ہے، تاکہ گناہوں کی چند صورتیں سامنے آجائیں اور ہم ان کے بارے میں چوکنے رہیں اور ان سے اور ان کی مختلف صورتوں سے اپنی حفاظت کر سکیں۔

گناہ کا ارادہ بھی گناہ ہے

یہاں اس بات کو بھی یادرکھیں کہ جس طرح نیکی کا ارادہ نیکی ہے، اسی طرح گناہ کا ارادہ بھی گناہ ہے۔ گناہ کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی گناہ کا ارادہ کرے، مثلاً: چوری یا کسی کو ناحق قتل کرنے کا ارادہ کرلے کہ اب یہ کام میں کروں گا اور پھر اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ کوشش بھی کرتا ہے لیکن اپنے ارادے کی تکمیل میں ناکام ہو جاتا ہے۔ مثلاً: اس لیے چوری نہ کر سکا کہ چوکیدار کو دیکھا کہ وہ جاگا ہوا ہے یا جس کو قتل کرنے کا ارادہ تھا اُس کے قتل کرنے پر قدرت حاصل نہ ہوئی تو ایسی صورت میں جبکہ وہ اپنے اس غلط ارادے پر پشیمان نہ ہوا، یہ ارادہ بھی گناہ ہے، اگرچہ اس کو عمر بھر چوری یا قتل کرنے کا موقع نہ ملے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ

”جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے (خواہ) تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ (بہر حال) اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے گا“۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۲۸۴)

دل کی چھپی ہوئی باتوں کا حساب لینے سے مراد گناہ کے وہ خیالات نہیں ہیں جو بطورِ وسوسہ آدمی کے دل میں آتے ہیں، بلکہ اس سے مراد صرف وہ عزائم اور مضبوط ارادے ہیں جو دل میں موجود ہیں لیکن کسی مجبوری یا مزاحمت کے سبب سے وہ عمل میں نہ آسکے۔

دل میں گناہ کی تدبیر کرنا اور خیال سے سوچنا بھی گناہ ہے

انسان کے دل میں گناہ کے جو خیالات خود بخود آتے ہیں اور بندے کو وہ خیالات ناگوار گزرتے ہیں، ان میں تو کوئی حرج نہیں، جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آجائے گا۔ لیکن دل ہی دل میں گناہوں کی تدابیر اور منصوبے بنانا، اپنے خیال سے گناہ کرنا اور اس سے لذت لینا بھی ناجائز اور گناہ ہے۔

چناں چہ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ "اور بے حیائی کی باتوں کے نزدیک بھی نہ جاؤ، جو ظاہر ہوں ان میں سے اور جو چھپی ہوئی ہوں"۔ (سورۃ الانعام: آیت ۱۵۱)

ایک دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ

"(اے نبی! لوگوں سے) کہہ دو: میرے رب نے تو بس بے حیائیوں کو حرام ٹھہرایا ہے، جو ظاہر ہوں ان میں سے یا پوشیدہ"۔ (سورۃ الاعراف: آیت ۳۳)

فَوَاحِش فحش کی جمع ہے اور فحش کھلی بے حیائی اور حد درجہ قبیح باتوں کو کہتے ہیں۔ یہاں فواحش کا لفظ ذکر کر کے ہر قسم کی بے حیائیوں سے منع کیا گیا ہے، اس لیے اس میں زنا، چوری، ڈاکہ وغیرہ تمام کھلی بے حیائیاں اور برائیاں شامل ہیں۔ پھر یہاں صرف یہ نہیں فرمایا کہ فواحش سے اپنے آپ کو بچاؤ، بلکہ یہ فرمایا کہ فواحش کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمام وہ چیزیں جو دل میں فحش کی تحریک پیدا کرتی ہیں، مثلاً فحش گانے، تصویریں، بد نظری، کسی کو بری نیت سے چھونا وغیرہ ،سب چیزوں سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اپنی نظر، کان، زبان اور دل کی پوری حفاظت کرو۔

مَاظَهَرَ میں علانیہ طور پر گناہ کرنا اور بے حیائی کو عملی جامہ پہنانا دونوں شامل ہیں اور مَابطن میں پوشیدہ طور پر گناہ کا ارتکاب اور حسد، کینہ اور دل ہی دل میں گناہ کے منصوبے بنانا، تدبیریں کرنا اور بے حیائی کے کاموں سے لذت لینا سب شامل ہیں۔

اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ نیکیوں اور بدیوں کا اصل سرچشمہ انسان کا باطن اور دل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے واقعی نیکی اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک دل کے اندر نیکی کی جڑ مضبوط نہ ہو۔ اسی طرح کوئی برائی انسان سے اس وقت تک دور نہیں ہوسکتی جب تک اس برائی کی جڑ کو دل کے اندر سے نہ اکھاڑ دیا جائے۔ اگر کوئی برائی دل کے اندر موجود ہے تو وہ کان، آنکھ، زبان اور خیال کی راہ سے برابر اپنی خوراک حاصل کر کے موٹی ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ روح کے لیے ناسور بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسا شخص بستر پر لیٹے لیٹے گناہوں اور بے حیائی کے خیالات و تصورات سے لذت لیتا رہتا ہے۔ اگرچہ

اس شخص کو زندگی بھر اس بُرے کام کے کرنے کا موقع نہ ملے تاہم یہی باطل خیالات، جن کو وہ اپنے اختیار سے اپنے اندر لا رہا ہے اور ان کو برابر پال رہا ہے، بالآخر بسا اوقات اس کی اخلاقی اور ایمانی موت کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ظاہری اور باطنی ہر قسم کے فواحش، بے حیائیوں اور برائیوں سے دور رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بس انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اختیار اور خوشی سے دل میں کبھی بھی غلط اور باطل خیالات نہ لائے اور نہ غلط کام کا ارادہ کرے، اور جو غلط ارادے کیے ہیں ان سے باز آجائے۔

غیر اختیاری خیالات پر گرفت نہیں

مذکورہ بالا بحث میں جن باطنی گناہوں کا ذکر ہوا، یہ وہ ارادے اور خیالات ہیں جو خود انسان کے اپنے فعل سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی رہے وہ خیالات جو خود بخود دل و دماغ میں آجاتے ہیں اور بندہ یہ نہیں چاہتا کہ یہ غلط خیال میرے دل میں آئے اور وہ اس خیال کو ناپسند کرتا ہے تو یہ نفس کی چاہت اور شیطان کی وسوسہ اندازی ہوتی ہے جس پر کوئی گرفت نہ ہوگی۔

جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ تعالٰی تَجَاوَزَ لِیْ عَنْ اُمَّتِیْ مَاوَسْوَسَتْ بِہٖ صُدُوْرُھَا مَالَمْ تَعْمَلْ اَوْتَکَلَّمْ

”بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان وسوسوں کو معاف کر دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، جب تک کہ وہ ان وسوسوں پر عمل نہ کریں اور ان کو زبان پر نہ لائیں“۔

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

وسوسہ کو برا سمجھنا ایمان کی علامت ہے

گناہوں کے خیالات اور ایمان و یقین کے منافی وساوس اگر بندے کے دل میں پیدا ہوتے ہوں اور وہ ان خیالات اور وساوس کو برا سمجھتا ہو تو یہ اس کے ایمان کی علامت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند صحابہ رضی اللہ عنہم حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں (یعنی خیالات) پاتے ہیں جن کا زبان پر لانا بھی ہم بہت برا سمجھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم واقعی ایسا پاتے ہو (کہ جب کوئی گناہ کا یا ایمان و یقین کے منافی

وسوسہ تمہارے اندر پیدا ہوتا ہے تو خود بخود تمہارے دل اس کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کو زبان پر لانا بھی تم برا جانتے ہوں)۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ذَاكَ صَرِيحُ الْإِيْمَانِ "یہ واضح اور کھلا ہوا ایمان ہے"۔ (مسلم، مشکوۃ)

بلاشبہ جب دل میں ایمان و یقین کے منافی اور گناہ گارانہ خیالات پیدا ہوں تو دل کا ان کو برا جاننا اوران سے دل کا تنگ ہو جانا ایمان کی واضح علامت اور نشانی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ آپ کے سامنے کسی شخص کے خلاف کوئی بات کہی جاتی ہے۔ اگر اس بات سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے اور اس شخص کے خلاف کسی بات کو آپ برداشت نہیں کرتے اور اس کے خلاف بات کرنے والوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو وہ شخص محبوب ہے اور آپ واقعی اس کے طرفدار ہیں۔ لیکن اگر آپ اس کے خلاف ہونے والی باتوں سے خوش ہوں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کے دل میں بھی اس شخص کی مخالفت موجود ہے۔ اسی طرح جس شخص کے دل و دماغ پر نفس و شیطان، اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کوئی گناہ کی بات پیش کر دیتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک کے خیالات پیدا کر دیتے ہیں اور یہ ان خیالات کو برا سمجھتا ہے اور ان کو ناپسند کر کے، ان سے مقابلہ کر کے ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ بندہ واقعی اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کو محبوب رکھتا ہے اور یہ بندہ حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کو ماننے والا ہے۔

وساوس کا علاج

انسان کے دل میں جب ایسے خیالات پیدا ہوں تو اس کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرے کہ یا اللہ ! میرے دل کو ان خیالات سے پاک کر دے اور اس کے مقابلے میں میرے دل میں تیری یاد، خوف اور عظمت کے خیالات پیدا ہوں۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنی زبان سے: اعوذ باالله من الشیطن الرجیم یالا حول ولاقوۃ الا باالله العلی العظیم کہے۔ تیسرا کام یہ کریں کہ یہ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ میرے خیالات کو خوب جانتا اور دیکھتا ہے اور وہ میری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِهٖ نَفۡسُهٗ وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ۝

"اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم (خوب) جانتے ہیں ان وسوسوں (اور خیالات) کو جو اس کے دل میں گزرتے ہیں اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی اس کے زیادہ قریب ہیں"۔ (سورۂ ق: آیت ۱۶)

گناہوں کے وسوسوں کو کشتہ بنایئے

شہوتوں، لذتوں اور گناہوں کے وسوسے سب کو آتے ہیں۔ یہی انسان کی ترقی یا تنزل کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ انسان کو بھوک پیاس بھی لگتی ہے اور اس کو قضائے حاجت وغیرہ کی مجبوریاں بھی پیش آتی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس شخص کو بھوک یا پیاس لگ گئی ہے اس کو کھانا کھانے یا پانی پینے کی خواہش بھی ہوگی، اور اس کو ان جگہوں کے خیالات بھی آئیں گے جہاں سے کھانا یا پانی ملنے کی امید ہو۔ البتہ اگر وہ نیک اور حلال خور شخص ہے تو وہ ناجائز جگہ سے کھانے پینے کی چیزیں لینے کا ارادہ بھی نہیں کرے گا، بلکہ اگر اس کے سامنے حرام اور ناجائز کھانا پینا رکھ بھی دیا جائے، تو بھی اس کا دل اس سے متنفر ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک نیک، صحت مند، غیر شادی شدہ نوجوان کے سامنے کوئی حسین و جمیل عورت آ جائے تو نفس و شیطان اس کو ابھاریں گے کہ وہ اس کی طرف دیکھے اور شیطان اس کے دل کے اندر وسوسہ اندازی کرے گا، لیکن وہ اس کی طرف دیکھنے کا ارادہ بھی نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے یہ اس نیک آدمی کے تقویٰ کی دلیل ہے۔

ایسی صورت میں وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے دل پر آرے چلاتا ہے اور اپنے نفس کو کچل دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی لذت اور شہوت کے وساوس کو جلا جلا کر اس سے اپنے اندر ایمانی، روحانی اور اخلاقی پرواز کی قوت پیدا کرتا رہتا ہے۔ تو حق کی خاطر مادی لذتوں کو قربان کرنے پر اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں ایمانی، روحانی اور اخلاقی لذتیں نصیب کرے گا جس کے سامنے مادی لذتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔

مثلاً حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا مِنۡ مُسۡلِمٍ یَنۡظُرُ اِلٰی مَحَاسِنِ امۡرَأَةٍ اَوَّلَ مَرَّةٍ ثُمَّ یَغُضُّ بَصَرَهٗ اِلَّا اَحۡدَثَ اللّٰهُ لَهٗ عِبَادَةً یَجِدُ حَلَاوَتَهَا "جس مسلمان کی پہلی مرتبہ (اچانک بلا قصد وارادہ کے) کسی عورت کے حسن وجمال کی طرف نظر اٹھ جائے اور پھر وہ (اللہ تعالیٰ کے خوف سے فوراً) اپنی نگاہ کو نیچے کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے

لیے ایک عبادت اور بندگی پیدا کر دے گا (یعنی اس کے اس نظر پھیر لینے اور نگاہ نیچے کرنے کو ایک ایسی عبادت اور بندگی میں تبدیل کرے گا) جس سے وہ شخص (اپنے دل کے اندر) لذت کو پائے گا"۔

(احمد، مشکوٰۃ: کتاب النکاح)

یہ قلبی اور روحانی لذت دراصل اس تلخی کا بدلہ ہوتا ہے جو اس نے اپنے نفس کی خواہش پر صبر و ضبط کرکے برداشت کی تھی۔ خلاصہ یہ کہ نفس کی خواہشات اور تقاضے ہر آدمی کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن جو لوگ ان تقاضوں پر عمل نہیں کرتے اور نہ ان تقاضوں کے سبب برے عمل کا ارادہ کرتے ہیں، یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمانی، روحانی، اخلاقی اور قُربِ الٰہی کے اعتبار سے ترقی پر ترقی کرتے رہتے ہیں، اور جو لوگ نفس کے تقاضوں پر شتر بے مہار بن کر عمل کرتے رہتے ہیں وہ بالآخر جانوروں اور درندوں کے مقام سے بھی نیچے گر جاتے ہیں۔

گناہوں کا تریاق توبہ واستغفار ہے

جب آپ کے سامنے ظاہری اور باطنی گناہوں کی تفصیل آئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا و آخرت کی بے چینی، مصائب، آفتوں، ہلاکتوں اور ذلت ورسوائی کا سبب گناہ اور نافرمانی ہی ہے تو اب یہ بھی جان لیں کہ اپنی زندگی میں سابقہ گناہوں کی نحوست اور انجام بد سے بچنے کا طریقہ اور علاج کیا ہے؟

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ گناہوں کے برے انجام اور اثرات سے بچنے کا طریقہ اور گناہوں کے چھوڑے ہوئے اثرات کا علاج وتریاق توبہ واستغفار ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں لوگوں پر جو ظاہری یا باطنی مصائب اور آفتیں آتی ہیں وہ زیادہ تر گناہوں کے نتائج ہوتے ہیں، لہٰذا انسان کو جب کوئی مصیبت پہنچے تو سب سے پہلا کام اس کو یہ کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ مانگے اور اس کی رحمت کی طرف بھاگے اور صرف اُسی کے پاس پناہ ڈھونڈے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس سبب سے وہ غم میں مبتلا ہوا تھا اُس کو چھوڑ دے، اور وہ سبب یہ تھا کہ بندے نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ٹکرایا تھا، یا یوں کہیے کہ وہ مقامِ بندگی سے ہٹ گیا تھا جس کی وجہ سے اس پر مصائب اور آفتیں نازل ہوئیں۔ تو اس کا حقیقی علاج یہی ہے کہ بندہ پلٹ کر پھر مقامِ بندگی کے اُسی نقطے پر آجائے جہاں سے وہ بھاگ کر مصیبت وغم میں مبتلا ہوا تھا۔ اسی ندامت، باطنی

گردش اور دل کے پلٹ جانے کا نام توبہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ گناہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ٹکرانے اور اللہ تعالیٰ کے حکم وہدایت سے بھاگنے کا نام ہے اور توبہ یہ ہے کہ بندہ اس ٹکر، بغاوت اور سرکشی سے پلٹ کر اپنے پروردگار اور اس کے حکم وہدایت کی طرف واپس آجائے، اس سے رحم ومغفرت کی درخواست کرے اور بدی کے بجائے نیکی کو اختیار کرے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ مصائب اور آفتوں کے اسباب گناہوں کے علاوہ اور بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً: بعض بلند ہمت پاک لوگ مصیبت زدہ انسانوں کی تسلی کے لیے قصداً ایسی تنگی اور فقروفاقہ میں رہتے ہیں جس کو ہم تنگی اور مصیبت کہتے ہیں، حالانکہ ان لوگوں کا یہ فقر اضطراری نہیں بلکہ اختیاری ہوتا ہے۔

کبھی اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے ایمان، یقین، صبر اور عشق ومحبت کے اعلیٰ جذبات کا مظاہرہ بھی ان مصائب کی روشنی میں کراتا ہے اور ان آزمائشوں کی وجہ سے ان کی صلاحیتوں اور قوتوں کو پروان بھی چڑھاتا ہے اور ان مصائب کی وجہ سے بندوں کے درجات کو بھی برابر بڑھاتا ہے۔ یہ وہ مصائب ہوتے ہیں جن میں ان لوگوں کی تذلیل نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے ان کی عزت کو اور بڑھاتا ہے، اور کبھی کبھی مصائب کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایک طرف اپنے بندوں کے اندر اچھی صفات واخلاق مستحکم اور مضبوط کر دیتا ہے اور دوسری طرف منافقوں کو ان کی جماعت سے جدا کر دیتا ہے۔

توبہ کے معنیٰ ومطلب

توبہ کے لغوی معنیٰ رجوع کرنے اور واپس ہو جانے کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں کسی گناہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے باز آنے کو توبہ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور حیا کی وجہ سے گناہ اور سرکشی کی راہ سے پلٹ کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو اپنائے۔

مثال اس کی یہ ہے کہ آپ لاہور سے راولپنڈی جانے کے لیے ایک سڑک پر ہو لیے۔ آگے چل کر راستے میں ایک کتبہ آیا جس پر لکھا تھا کہ پشاور تک اتنے کلومیٹر باقی ہے تو آپ کو فوراً احساس ہوگا کہ میں تو غلط جا رہا ہوں اور وہیں سے پلٹ کر راولپنڈی کی سڑک پر چلنے لگیں گے، اسی کو واپسی کہتے ہیں۔ اگر کوئی

شخص وہیں کے وہیں کھڑا رہے، راولپنڈی کی سڑک کو اختیار نہ کرے تو اس کو واپس ہونا نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنے گناہوں کا احساس ہے اور وہ اس پر شرمندہ بھی ہے، لیکن گناہوں کو چھوڑ کر سیدھی راہ کو اختیار نہیں کرتا بلکہ اسی طرح گناہوں کی راہ پر چل رہا ہے اور زبان سے توبہ توبہ کہتا جارہا ہے تو یہ "توبہ" نہیں، مثلاً آپ نے کسی شخص کا کوئی حق دبایا ہے اور کچھ عرصے کے بعد آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور آپ اس ظلم پر شرمندہ بھی ہوئے اور زبان سے توبہ توبہ بھی کی، لیکن اس حق دار کے حق کو بدستور دبایا ہوا ہے اور اس کو اس کا حق واپس نہیں کیا تو یہ "توبہ، توبہ" کہنا توبہ نہیں ہے۔

توبہ کی حقیقت

توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو گناہ اور نافرمانی یا نامناسب عمل بندے سے سرزد ہو جائے، اس کے برے انجام کے خوف سے اس پر ندامت اور دلی پشیمانی ہو اور آئندہ کے لیے اس سے دور رہنے اور بچنے کا اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا پختہ ارادہ اور عزم کرلے۔ توبہ کی اسی حقیقت کی طرف قرآن مجید نے مختلف انداز میں باربار اشارہ فرمایا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "مگر وہ لوگ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کی تو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے"۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۸۹)

وہ ان کے گناہوں کو بھی بخش دے گا اور ان پر مہربانی کر کے ان کو ترقیات سے بھی نوازے گا۔

ایک دوسری جگہ اس حقیقت کو ان الفاظ سے واضح کر دیا گیا ہے کہ: وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا "اور جو شخص توبہ کرلے اور نیک عمل (کی راہ کو اختیار) کرے تو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہا ہے"۔ (سورۃ الفرقان: آیت ۷۱)

ان دونوں آیتوں سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ توبہ اس وقت تک معتبر اور سچی توبہ نہیں جب تک آدمی اس غلطی کی اصلاح نہ کرلے جس میں وہ مبتلا ہے۔

توبہ کے صحیح ہونے کی شرائط

توبہ کے صحیح اور معتبر ہونے کی تین شرائط ہیں، یا یوں کہیے کہ توبہ تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر ان تین چیزوں میں سے ایک چیز بھی نہ ہوگی تو توبہ کامل نہ ہوگی۔

۱۔ جو گناہ سرزد ہوا، اس پر ندامت (یعنی شرمندگی اور پشیمانی) ہو۔

۲۔ جس گناہ میں مبتلا ہو، اس کو فی الفور چھوڑ دے اور اس کی تکمیل یہ ہے کہ جن گناہوں کی تلافی ممکن ہو، اپنی طاقت کے مطابق ان کی تلافی شروع کرے، مثلاً: فرض نماز یا روزہ فوت ہوا ہے تو اس کی قضا شروع کرلے۔ زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے تو پہلے جو زکوٰۃ ذمے رہ گئی ہے اس کو بھی یکمشت یا تدریجاً ادا کرے۔ اسی طرح جو شرعی فریضہ چھوڑا ہے اس کی قضا لانے میں لگ جائے۔ اگر کسی کا حق دبائے رکھا ہے تو اس کو اس کا حق واپس لوٹا دے۔ اگر کسی کا مال وغیرہ ناحق کھایا ہے یا اپنے پاس رکھا ہے تو اسے اس کا مال وغیرہ لوٹائے۔ اگر لوٹانے کی طاقت نہیں تو اس سے معاف کرائے اور اگر وہ زندہ نہیں تو اس کے ورثاء کو وہ مال لوٹائے یا ان سے معاف کرائے۔ اگر کوئی وارث بھی نہیں تو اس مال کو اسلامی حکومت کے بیت المال میں جمع کرائے۔ اگر بیت المال بھی نہیں یا اس کا انتظام درست نہیں تو جس میت کا مال ہے اس کی طرف سے صدقہ کردے۔ اگر کوئی غیر مالی حق ہے، مثلاً: غیبت کی ہے یا کسی کو ستایا ہے تو اسے جس طرح ممکن ہو راضی کرکے اس سے معافی حاصل کرے۔ اگر دنیا سے وہ رحلت کرچکا ہے تو اس کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہے اور یہ دعا کرے کہ یا اللہ ! اسے اپنی طرف سے دے۔

۳۔ آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے کہ آئندہ یہ گناہ یا کوئی بھی گناہ نہیں کروں گا۔

مایوسی نہ ہو

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی گناہ سے پورے صدقِ دل اور خلوص کے ساتھ توبہ کرتے ہیں اور آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا پختہ عزم بھی کرتے ہیں، لیکن پھر ان سے وہی گناہ صادر ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ پھر سے صدق وخلوص کے ساتھ توبہ کرنی چاہیے۔

اندیشۂ گناہ سے توبہ موئخر نہ کریں

آئندہ گناہ کے اندیشے کی وجہ سے توبہ کو قطعاً موئخر نہ کریں۔ بعض لوگ کسی گناہ سے توبہ اس لیے نہیں کرتے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے پھر یہ گناہ صادر ہو جائے اس طرح تو میری توبہ صحیح نہ ہوگی کیوں کہ توبہ میں تو یہ شرط ہے کہ آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم ہو۔ ان کو چاہیے کہ آئندہ گناہ کے اندیشے کی وجہ سے توبہ قطعاً موخر نہ کریں، بلکہ توبہ کر کے اپنی طرف سے آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیں۔ اب اگر یہ ارادہ کرتے وقت دل میں یہ اندیشہ موجود ہے کہ معلوم نہیں میں اس عزم پر ثابت قدم رہ سکوں گا یا نہیں، تو یہ اندیشہ عزم کے منافی نہیں، بلکہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائیں کہ یا اللہ! میں توبہ کر رہا ہوں اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر رہا ہوں لیکن میرا کیا عزم اور ارادہ ہو گا، میں تو بہت ہی کمزور ہوں تو ہی مجھے اس عزم پر ثابت قدم فرما اور تو ہی مجھے حق پر استقامت عطا فرما۔

استغفار کا معنی

استغفار کے معنی ہیں بخشش مانگنا۔ اصطلاح میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور قصوروں کی معافی اور بخشش مانگنے کو استغفار کہتے ہیں۔ جب بندے کو توبہ والی کیفیت نصیب ہو تو جو گناہ سرزد ہو چکے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ سے معافی اور بخشش کی دعا ضرور کرے تاکہ ان گناہوں کی سزا اور برے انجام سے بچ سکے، اور اللہ تعالیٰ کیے ہوئے گناہوں کی اس دنیا میں بھی ستاری فرمائے کہ کسی کو اس کے گناہ کا علم نہ ہو اور آخرت میں بھی اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کرے کہ دنیا و آخرت میں لوگوں کے سامنے رسوائی اور ذلت سے بچ جائے۔

استغفار توبہ کے مقابلے میں عام ہے

استغفار توبہ کے مقابلے میں عام ہے۔ توبہ میں استغفار تو ہوتا ہی ہے، لیکن بعض صورتوں میں استغفار ہو گا جبکہ توبہ کی شرائط اس میں نہ ہوں گی۔ مثلاً: جب دل میں کسی گناہ کا وسوسہ پیدا ہو جائے یا عبادت، مثلاً: نماز، روزہ میں بندہ کوتاہی محسوس کرے تو وہ فوراً استغفار کر لے۔ اسی طرح کسی اضطراری

کیفیت میں حرام روزگار میں مبتلا ہے، مثلاً بینک کی ملازمت کو اختیار کیا تھا، پھر بعد میں احساس ہوا کہ یہ کمائی جائز نہیں ہے، اب وہ اس پر شرمندہ ہے، پشیمان ہے لیکن دوسری طرف وہ عیال دار ہے، بیوی بچے ہیں، ان کے خرچ اخراجات اس کے ذمہ ہیں۔ اب اگر وہ فوراً ملازمت چھوڑ دیتا ہے تو اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں اس سے زیادہ حرام میں یا سخت تکلیف وپریشانی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اس لیے اس نے فی الحال تو بینک کی ملازمت اختیار کی ہوتی ہے، لیکن دوسرے روزگار کی تلاش میں اس طرح لگا ہوا ہے جس طرح ایک بے روزگار آدمی روزگار تلاش کرتا ہے۔ ایسا شخص استغفار کرے اور ندامت وپشیمانی کے ساتھ اپنے کیے پر معافی مانگے اور اس ناجائز روزگار سے جان چھڑانے کے لیے گڑگڑائے کہ یا اللہ ! یہ کام تو ناجائز اور گناہ ہے، میں اس پر شرمندہ ہوں، لیکن میں مجبور ہوں اس کو فی الحال چھوڑنے پر قادر نہیں ہوں، مجھے اپنی رحمت سے معاف فرما اور مجھے اس ناجائز کام سے نکال دے اور حلال وپاک روزگار نصیب فرما۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے گا، استغفار کرے گا اور ساتھ ساتھ دوسرے روزگار کے لیے دل سے بھاگ دوڑ کرے گا تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے معاف بھی فرمائے گا اور اس کو اس گناہ سے بھی نکال دے گا۔ اسی طرح کوئی شخص کسی سخت نشہ میں مبتلا ہے۔ اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے لیکن وہ نشہ ایسا ہے کہ اس کو فوراً چھوڑنے میں سخت بیماری کا اندیشہ ہے اور وہ طبیب (ڈاکٹر) کے مشورے سے تدریجاً چھوڑ رہا ہے، یا طبیب نے اس کے لیے کچھ وقت کے لیے پہلے سے ہلکا نشہ تجویز کر رکھا ہے اور اس طرح بتدریج وہ نشے کی عادت کو چھوڑ رہا ہے تو ایسی صورت میں بھی بندہ استغفار کرے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے کہ یا اللہ! میں آپ کے سامنے سخت شرمندہ ہوں لیکن کیا کروں، سخت مجبور ہوں، فوری طور پر نشہ چھوڑنے پر قادر بھی نہیں ہوں، آپ اپنی رحمت سے مجھے معاف فرمائیں اور مجھے اس گناہ سے جلد از جلد نکال دیجیے۔

اسی طرح جو شخص کسی سخت مجبوری کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہونے کے بعد اسی طرح استغفار کرے گا اور اس گناہ سے جان چھڑانے کے لیے بے تاب ہو گا اور کوشش کرے گا تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے معاف بھی فرمائے گا (اور اس کو ایسے لوگوں میں شمار نہیں فرمائے گا جو گناہوں پر مصر اور ڈٹے ہوئے ہیں) اور اس کو اس گناہ سے بھی نکال دے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث شریف میں اس

بات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، چناں چہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً "جو شخص (اپنے گناہ پر) استغفار کرلے اس نے گناہ پر اصرار نہیں کیا، اگر چہ وہ دن میں ستر بار گناہ کرلے"۔

(ترمذی، ابوداؤد، مشکوۃ)

گناہ پر اصرار اور ڈٹ جانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی گناہ پر دوام اختیار کیا جائے۔ اس حدیث کا مطلب بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔

اگر کوئی شخص سخت مجبوری کی وجہ سے کسی گناہ میں مبتلا ہو چکا ہے وہ اپنے اس گناہ پر شرمندہ ہے اور اس سے نکلنے کی پوری کوشش بھی کرتا ہے لیکن فی الحال چھوڑنے پر قادر نہیں، اس لیے وہ شرمندہ ہو کر اپنے گناہ پر استغفار کرتا ہے تو وہ گناہ پر اصرار کرنے والوں میں شمار نہ ہوگا۔ استغفار کے عام ہونے کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ گناہوں سے توبہ ہر آدمی خود کرے گا، دوسرا کسی کے حق میں توبہ نہیں کرسکتا۔ اس کے برعکس استغفار دوسروں کے لیے بھی ہو سکتا ہے، مثلاً: یہ کہنا کہ یااللہ! فلاں کے گناہوں اور قصور کو بخش دے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ استغفار توبہ کے مقابلے میں عام ہے۔ استغفار ہر حالت میں اور ہر مسلمان کے لیے کیا جاسکتا ہے، جبکہ توبہ کے لیے ضروری ہے کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا اور اپنی اصلاح کا عزم بھی ہو۔ نیز توبہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے جبکہ استغفار دوسرے مسلمانوں کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے کیوں کہ استغفار ایک خاص دعا ہے جو اپنے حق میں بھی کی جاسکتی ہے اور دوسرے مسلمانوں کے حق میں بھی، بلکہ فرشتے بھی مومنوں کے حق میں استغفار کرتے ہیں۔

(سورۂ مومن: آیت ۷، سورۂ شوریٰ: آیت ۵)

مرے ہوئے مسلمانوں کے لیے دُعائے مغفرت

احادیث میں مرے ہوئے مسلمانوں کے لیے بھی دعائے مغفرت کی ہدایت کی گئی ہے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قبر میں مدفون مردے کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو دریا میں ڈوب رہا ہو اور وہ مدد کے لیے چیخ وپکار کر رہا ہو، وہ انتظار کرتا ہے کہ ماں باپ یا بھائی یا کسی دوست آشنا کی طرف سے دعائے مغفرت و

رحمت کا تحفہ پہنچے۔ جس کسی کی طرف سے اس کو دعائے مغفرت پہنچتی ہے تو وہ اس کو دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوتی ہے، اور دنیا میں رہنے والوں کی دعاؤں کی وجہ سے قبر کے مردوں کو اتنا عظیم ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی جاسکتی ہے، اور مردوں کے لیے زندوں کی طرف سے بہترین تحفہ ان کے لیے استغفار یعنی دُعائے مغفرت ہے۔

(مشکوٰۃ)

اس حدیث میں ایک طرف مسلمانوں کو ترغیب ہے کہ وہ مسلمان رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے دعائے مغفرت کیا کریں اور دوسری طرف لوگوں کو یہ ترغیب ہے کہ وہ دنیا میں ایسے کام کریں اور لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ لوگ موت کے بعد بھی ان کے لیے دعائیں کریں۔ بلاشبہ نیکوکاروں کو زندوں کی دعائیں اور استغفار نفع پہنچاتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے استغفار کرنے کا ثواب

نیز حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”جو مسلمان بندہ عام مسلمان مردوں، عورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش مانگے گا، اس کے لیے ہر مسلمان مرد و عورت کے حساب سے ایک ایک نیکی لکھی جائے گی“۔

(طبرانی، دیکھیے معارف الحدیث: ج۵، ص۳۲۵)

نیز حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو بندہ عام مومنین و مومنات کے لیے ہر روز ستائیس دفعہ اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی دعا کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے ان مقبول بندوں میں سے ہو جائے گا جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور جن کی برکت سے دنیا والوں کو رزق ملتا ہے۔ (مجمع کبیر، طبرانی، دیکھیے معارف الحدیث: ج۵، ص۳۲۶)

خلاصہ یہ کہ استغفار مسلمان رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کے لیے بھی کیا جاتا ہے اور ان لوگوں سے ہمدردی اور حسنِ سلوک کا اس کو عظیم ثواب بھی ملے گا۔

گناہوں کا چھوڑنا فرضِ عین ہے

گناہوں کا چھوڑنا فرضِ عین ہے۔ جس بندے سے جو گناہ سرزد ہو چکا ہے یا جس گناہ میں مبتلا ہے اس سے توبہ و استغفار کرلے۔ اگر کسی کو اپنا ظاہری یا باطنی گناہ نظر نہ بھی آرہا ہو، تب بھی مسلمان کو چاہیے کہ وہ برابر توبہ واستغفار کرتا رہے، نیکی کے کسی مقام پر بھی قناعت نہ کرے، ہر وقت اپنے آپ میں اور اپنی عبادت وفرمانبرداری میں کمی محسوس کرے اور اس پر توبہ واستغفار کرے اور ادنیٰ حالت سے اعلیٰ اور بہتر سے بہترین حالت کی طرف بڑھنے کی کوشش کرے۔

توبہ اور استغفار کی اقسام

توبہ واستغفار کی چار اقسام ہیں:

۱۔ کفروشرک، گناہوں اور خطاؤں سے توبہ واستغفار۔

۲۔ عبادات، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں ہونے والی کوتاہیوں پر استغفار۔

۳۔ اس بات پر استغفار کہ اللہ تعالیٰ کا حقِ بندگی ادا نہیں کیا۔

۴۔ دوسرے مسلمانوں کے لیے استغفار، یعنی دوسرے مسلمانوں کے حق میں دعا کرے کہ یا اللہ! ان کو بخش دے اور ان کی مغفرت فرما۔

توبہ و استغفار کی اقسام میں غور کرنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ توبہ و استغفار صرف عاصیوں اور گناہ گاروں ہی کے لیے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے خاص و مقُرب بندے، یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام جو گناہوں سے محفوظ ومعصوم ہوتے ہیں، ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق بالکل ادا نہیں ہوسکا۔ اس لیے وہ برابر توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اپنے ہر عمل کو حتیٰ کہ اپنی نمازوں کو بھی قابلِ استغفار سمجھتے ہیں۔

پس توبہ و استغفار عاصیوں اور گناہ گاروں کے لیے مغفرت و رحمت کا ذریعہ ہے اور مقربین و معصومین کے لیے بلندیٔ درجات، قُرب و محبوبیتِ الٰہی میں بے انتہا ترقی کا وسیلہ ہے۔ اس لیے توبہ واستغفار سے کوئی بھی ایمان والا مستثنیٰ نہیں، بلکہ سب کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ توبہ واستغفار کریں۔

اس لیے ہر انسان کو چاہیے کہ وہ برابر اپنی اصلاح اور توبہ و استغفار میں لگا رہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ میں مومن کی پہلی صفت التَّآئِبُوْنَ (وہ توبہ کرنے والے ہیں) بیان فرمائی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جملہ انبیاء علیہم السلام کے استغفار کو نقل بھی فرمایا ہے اور انبیاء علیہم السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا حکم بھی فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ استغفار کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نیک، متقی بندوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ: كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۞ وَبِالْاَسْحَارِهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۞ "وہ رات میں تھوڑا سوتے تھے (یعنی رات میں قیام، رکوع و سجود اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہتے تھے) اور رات کے آخری وقت میں معافی اور بخشش مانگتے تھے"۔ (سورۃ الذاریات: آیت ۱۷تا۱۸)

مطلب یہ کہ وہ اپنی عبادات اور اطاعت پر نازاں نہیں ہوتے اور نہ عبادات و ریاضت سے ان کا مقصد کشف و کرامات وغیرہ کا حصول ہوتا ہے، بلکہ ان کی اس ساری جدوجہد کا مقصد اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنی عبادت پر بھی استغفار کرتے ہیں کہ عبادت کا جیسا حق تھا، ویسا حق ہم سے ادا نہ ہو سکا۔ بلاشبہ جس شخص کے دل پر جس قدر اللہ تعالیٰ کی عظمت چھائی ہوئی ہوگی اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ سے بخشش اور معافی مانگے گا اور اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی کی ہوئی عبادات اور اطاعت پر شرمندگی سے پانی پانی ہوگا۔

توبہ میں جلدی کریں

ہر آدمی کو چاہیے کہ توبہ میں تاخیر نہ کرے۔ جب بھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرلے۔ آج موقع ہے کہ توبہ کرکے اپنے آپ کو پاک صاف کریں، ورنہ جب موت سر پر کھڑی ہوگی تو اس وقت ہرگز توبہ قبول نہ ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ
قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۞
وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ
الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ

أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

"اللہ تعالیٰ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری تو بس ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت سے برائی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، پس یہی لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور بڑی حکمت والا ہے، اور ان لوگوں کے لیے توبہ (کا وعدہ) نہیں ہے جو برائیاں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب موت ان میں سے کسی کے سامنے آجائے تب کہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہیں، ان لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے"۔ (سورۃ النساء: آیت ۱۷ تا ۱۸)

ان دو آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ توبہ کا وعدہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو ایک تو جہالت کے سبب گناہ کر جاتے ہیں، دوسرا یہ کہ وہ گناہ کے بعد جلدی توبہ کر لیتے ہیں، ان آیات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں کی کوئی توبہ نہیں جو حالتِ کفر میں مر جاتے ہیں یا جو اس وقت توبہ کرتے ہیں جب موت ان کے سامنے آجائے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

ان آیات میں ایک بات یہ سامنے آئی کہ توبہ کا وعدہ ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے جہالت کی وجہ سے گناہ کیے۔ "جہالت" کے معنی نہ جاننے کے ہیں اور نہ جاننے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کسی چیز سے واقف نہ ہو، دوسری یہ کہ کسی چیز (کی اچھائی یا برائی) کا علم تو ہو، لیکن خواہشِ نفس، جذبات کا جوش اور بے صبری اُس کے علم کو چھپالے اور اس سے غفلت کے سبب کوئی نامناسب کام سرزد ہو جائے۔ اس لیے کہ اس لفظ کا غالب استعمال حلم کی ضد یعنی عدم برداشت اور بے صبری کے لیے ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھائیوں کے متعلق قرآن مجید میں ہے: قَالَ هَلْ عَلِمْتُم مَّا فَعَلْتُم بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنتُمْ جَاهِلُونَ "(حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے سوتیلے بھائیوں سے) کہا کہ کیا تم کو خبر ہے کہ تم نے یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی کے ساتھ جو سلوک کیا جبکہ تم نادان تھے"۔ (سورۂ یوسف: آیت ۸۹)

حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے بھائی کے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں وہ انھوں نے کسی خطا و نسیان کی وجہ سے نہیں کی تھیں، بلکہ قصد

اور ارادے سے کی تھیں۔ لیکن انہوں نے جو کچھ کیا تھا، وہ حسد کے جذبات سے مغلوب ہو کر کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ اپنے سچے بندوں کی صفات کا ذکر کر کے فرماتا ہے: اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا " جب جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں"۔

(سورۃ الفرقان: آیت ٦٣)

یہاں جاہلوں سے مراد وہی لوگ ہیں جو حسد، تعصب، تکبر اور ہٹ دھرمی کے جذبات کی وجہ سے مجادلہ اور مناظرہ کے درپے ہوتے ہیں، حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ "(یوسف علیہ السلام نے دعا کر کے) کہا: اے میرے رب! قید خانہ مجھے اس چیز سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ (عورتیں) مجھے بلا رہی ہیں اور اگر تو نے ان کے فریب کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا"۔

(سورۂ یوسف: آیت ٣٣)

یہاں بالکل واضح ہے کہ جہالت سے مراد جذبات سے مغلوب ہونا ہے جس کی وجہ سے انسان برائی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور انبیاء علیہم السلام کی معصومیت

اسی سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی فطرتِ سلیم اور ان کی معصومیت کا اندازہ لگائیے! کہ حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نوجوان ہیں اور مصر کی حسین و جمیل اونچے اونچے خاندانوں کی لڑکیوں نے ان کو اپنی طرف پورے عشق و محبت اور مکر و فریب کے ساتھ متوجہ کرنے کی کوشش کی اور ان کے لیے بار بار ایسی فضا بنائی کہ کسی طرح ان کو اپنی طرف مائل کریں اور ہر رکاوٹ کو دور کیا، لیکن ان پر اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت کا اس قدر غلبہ تھا اور وہ گناہ بلکہ گناہ کی طرف میلان سے بھی اس قدر متنفر تھے کہ کوئی مکر و فریب اور کوئی دوسری تدبیر ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ذرہ برابر کامیاب نہ ہو سکی۔

انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بڑی لجاجت کے ساتھ درخواست کی، کہ یا اللہ! یہ خواتین مجھے جیل بھجوانے کی دھمکیاں دے رہی ہیں، یا اللہ! جیل مجھے زیادہ پسند ہے اس چیز سے جس کی طرف یہ عورتیں

مجھے بلا رہی ہیں، تو ہی مجھے ان کے مکر وفریب سے بچائے رکھ۔ اگر تو نے ان کے مکر وفریب کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں جذبات سے مغلوب ہو کر ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔ دیکھیے! حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام اپنے اوپر اعتماد نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کی تواضع کو دیکھیے کہ اس قدر پاکیزگی کے باوجود ان کے کلام میں دعویٰ کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں جہالت سے مراد جذبات سے مغلوب ہونا ہے۔

خلاصہ یہ کہ "جہالت" کا غالب استعمال جذبات، شہوت اور غصہ وغیرہ سے مغلوب ہو کر کسی گناہ، ظلم یا نامناسب کام کر گزرنے میں ہوتا ہے۔

لہٰذا یہاں جہالت کی بنیاد پر گناہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ جب کسی کو کسی گناہ کے گناہ ہونے کا علم نہ ہو اور اس سے گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے لیے توبہ ہے اور دوسروں کے لیے نہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ بے خبری سے یا جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر گزرتا ہے لیکن پھر جب اس کو علم ہو جاتا ہے یا جذبات کی شدت ختم ہو جاتی ہے تو فوراً نادم وپشیمان ہو کر توبہ کر لیتا ہے، ایسے ہی لوگوں کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔

جلدی توبہ کر لینے کا مطلب

جلدی اور وقتِ قریب میں توبہ سے مراد یہ ہے کہ وہ جذبات جن سے مغلوب ہو کر اس نے یہ گناہ کیا ہے، مثلاً غصہ سے کسی کو گالی دی یا کوئی اور برائی کی، جب ان جذبات کی تیزی ختم ہو جائے تو فوراً نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ تائب ہو جائے۔

مذکورہ بالا بیان سے اتنی بات تو کھل کر سامنے آگئی کہ جو لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں، پھر فوراً تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لیتے ہیں، ان کے لیے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالیتے ہیں، لیکن جو لوگ گناہ کے بعد فوراً یا جلدی توبہ نہ کریں، مگر اتنی تاخیر بھی نہ کریں کہ موت سامنے آجائے تو ایسے لوگوں کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت رحم وکرم کرنے والا ہے۔ وہ ان لوگوں کی توبہ کو بھی قبول فرمالیتا ہے جو موت کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے توبہ کر لیں۔ متعدد آیات اور احادیث کے مضمون سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موت کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے توبہ قبول

ہو جاتی ہے۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ قریب اور جلدی توبہ سے مراد آثارِ موت سے قبل توبہ کرنا، بلکہ اس کے بارے میں خود نبی کریم ﷺ کی واضح حدیث بھی موجود ہے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ یَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَالَمْ یُغَرْغِرْ "بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک کہ غرغرہ کی کیفیت شروع نہ ہو جائے"۔

(ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

موت کے وقت جب بندے کی روح جسم سے نکلنے لگتی ہے تو حلق کی نالی میں ایک قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کو عربی میں "غرغرہ" کہتے ہیں۔ اس کے بعد زندگی کی کوئی امید نہیں رہتی۔ اس وقت آدمی کا رابطہ اور تعلق اس دنیا سے کٹ کر عالمِ برزخ کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ بہر حال غرغرہ انسانی زندگی کا وہ آخری وقت ہوتا ہے جب موت کے آثار سامنے آجائیں اور موت کا یقین ہو جائے۔

اس بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت میں یوں بیان فرمایا ہے: لیست التوبۃ..... ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہ ہوگی جو برابر برائیاں کرتے رہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت آجائے تو کہنے لگے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔

انسان کو چاہیے کہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ ابھی توبہ کی کیا جلدی ہے، موت سے پہلے توبہ کرلوں گا، کیا پتا اچانک ہی موت آجائے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ گناہوں کی نحوست بالآخر انسان کو توبہ کی توفیق سے مرتے وقت محروم کر دیتی ہے۔ اس لیے بندے کو چاہیے اور مناسب یہی ہے کہ وہ فوراً اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ تائب ہو کر اپنی اصلاح کا پختہ عزم کرلے اور اپنی اصلاح فوراً شروع کر دے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی آغوش میں ڈال دے۔

توبہ کا طریقہ

توبہ کے لیے کسی خاص مکان، زمان یا نماز وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ توبہ تو یہ ہے کہ انسان نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے۔ اس سے سابقہ گناہوں کی معافی مانگے اور آئندہ کے لیے گناہوں سے بچنے کا پختہ ارادہ کرکے اپنی اصلاح شروع کرے، اور جو حقوق اس کے ذمے رہ گئے ہیں، جس قدر

ممکن ہو سکے حسبِ طاقت ان کی تلافی اور ادائیگی شروع کرے اور حتی الوسع ہر ذی حق کو اس کا دبایا ہوا حق واپس کر دے۔

توبہ کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نفل توبہ کی نیت سے پڑھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں ندامت، شرمندگی، عاجزی، انکساری اور آہ و زاری کے ساتھ گڑگڑائے اور ایک ایک گناہ کو یاد کرے کہ یا اللہ! اب تک پچھلی زندگی میں مجھ سے جو گناہ سرزد ہوئے ہیں، چاہے وہ ظاہری گناہ ہوں یا باطنی، بڑے گناہ ہوں یا چھوٹے، قصداً کیے ہوں یا بھول چوک سے۔ یا اللہ! میں ان سب سے توبہ کرتا ہوں، آئندہ نہیں کروں گا، تو ہی مجھے توبہ پر استقامت نصیب فرما اور میری توبہ کو قبول فرما۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے خوب گڑگڑا کر اس سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگے، پھر جو گناہ ہیں، ان کی تلافی شروع کرے۔ چناں چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھ سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بالکل سچ فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کوئی برائی اور گناہ کرتا ہے، پھر اس پر ندامت اور شرمندگی ہونے کی وجہ سے اٹھ کر وضو کرتا ہے اور پھر نماز پڑھتا ہے اور اپنے رب سے اپنے گناہ کی معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کو معاف فرما دیتا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

گناہ گاروں کے لیے خوشخبری

گناہ گاروں کو قطعاً مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ جب تک موت سامنے نہ آئی ہو اس وقت تک بندوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ لہٰذا جتنے گناہ کیے ہیں اللہ تعالیٰ کی غفور الرحیم ذات، ندامت، شرمندگی اور پشیمانی کے ایک آنسو اور ایک توبہ کے ساتھ سارے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ گناہ گاروں کو خوشخبری دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۞ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۞

"(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو (کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) میرے وہ بندوں! جنہوں نے (گناہ کرکے) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو بخش دے گا، بے شک وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے اور (تم اس موقع کو غنیمت جانو اور فوراً جلدی جلدی) اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرمانبردار بن جاؤ، اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے، پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی"۔ (سورۃ الزمر: آیت ۵۳۔۵۴)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے، وہ توبہ کرنے اور معافی مانگنے پر بڑے بڑے گناہ اور قصور معاف فرما دیتا ہے اور بڑے بڑے مجرموں اور گناہ گاروں کو سچی توبہ کے سبب بخش دیتا ہے، اگرچہ اس کی قہر و جلال کی صفت بھی ہے، لیکن وہ انہی مجرموں کے لیے ہے جو جرائم اور گناہوں پر جمے اور قائم رہتے ہیں، جو کہ خالص شیاطین کا کام ہے اور ایسے لوگ سخت عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں۔

توبہ و استغفار کے فضائل و فوائد

توبہ و استغفار کے فضائل اور فوائد اس قدر کثرت سے بیان ہوئے ہیں کہ ان کے لیے مستقل کتاب کی ضرورت ہے، یہاں بطورِ نمونہ صرف چند فضائل اور فوائد بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

توبہ و استغفار ترقی کا زینہ ہے

جو شخص اپنے رب سے راضی رہتا ہے، اپنی نیکیوں پر قانع نہیں ہوتا اور اُس کے دل پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی چھائی رہتی ہے، وہ برابر توبہ و استغفار کرتا رہے گا اور روحانی و اخلاقی ترقی اور قُربِ الٰہی کی منازل طے کرتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی برابر توبہ و استغفار کرتے رہتے تھے، چناں چہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَاللّٰهِ اِنِّیۡ لَاَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡهِ فِی الۡيَوۡمِ اَكۡثَرَ مِنۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً "اللہ تعالیٰ کی قسم! میں دن میں ستر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں"۔ (بخاری و مشکوٰۃ)

بلاشبہ جو بندہ جس قدر بندگی کے اونچے مقام پر فائز ہوتا ہے وہ اپنے طور پر یہی سمجھتا ہے کہ شاید مجھ سے اللہ تعالیٰ کی بندگی میں کوئی قصور ہو گیا ہے اور میں اس طرح بندگی نہ کر سکا ہوں جو بے انتہا عظمت و کبریائی والے رب ذوالجلال والاکرام کی شان کے لائق ہے اور یہی وہ احساس ہوتا ہے جو بندے کو کسی

اونچے سے اونچے مقام پر قانع نہیں ہونے دیتا، بلکہ وہ برابر بندگی اور قربِ الٰہی کے زینے پر اونچے مقامات تک چڑھتا رہتا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یَا اَیُّھَا النَّاسُ تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ فَاِنِّیْ اَتُوْبُ فِی الْیَوْمِ اِلَیْہِ مِائَۃَ مَرَّۃٍ " اے لوگو! اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو (اور اس کی طرف رجوع کرو) کہ میں بھی روزانہ سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتا ہوں۔" (صحیح مسلم، مشکوۃ)

توبہ واستغفار صرف زبانی چیز نہیں

یہ بات پہلے بھی ذکر ہو چکی ہے کہ توبہ و استغفار دراصل دل کے پلٹنے، اپنے کیے پر ندامت اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا نام ہے۔ زبان صرف اس دلی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے، لہٰذا استغفار، معافی کے الفاظ کی تلاوت اور پڑھنے کو نہیں کہتے، بلکہ یہ دل سے نکلے ہوئے وہ الفاظ ہوتے ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جاتی ہے اور اس بات کو تو ہر کوئی جان سکتا ہے کہ صرف معافی کے الفاظ پڑھنے اور سچی معافی مانگنے میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

توبہ کرنے والے اللہ کے محبوب ہوتے ہیں

اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ "بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں کو محبوب اور (دوست) رکھتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو محبوب (اور دوست) رکھتا ہے"۔

(سورۃ البقرۃ: آیت ۲۲۲)

گناہوں پر نادم ہو کر یا اپنی عبادات وطاعت پر نادم ہو کر توبہ کرنا (کہ مجھ سے کما حقہ عبادت نہ ہو سکی) عبدیت اور بندگی کا سب سے اعلیٰ مظہر ہے، کیوں کہ توبہ کے وقت بندہ اپنی گناہ گاری، تقصیر اور کمی کے احساس کی وجہ سے انتہائی ندامت اور پستی کی حالت میں ہوتا ہے۔ وہ گناہ کی گندگی کی وجہ سے اپنے آپ کو پروردگار کو منہ دکھانے کے قابل نہیں سمجھتا، اپنے آپ کو مجرم اور خطاکار سمجھ کر معافی اور بخشش مانگتا ہے اور آئندہ کے لیے توبہ کرتا ہے۔ اس لیے بندگی، تذلل اور گناہ گاری کے احساس کی جو کیفیت

توبہ کے وقت ہوتی ہے، وہ کسی دوسری عبادت کے وقت نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے توبہ واستغفار بذاتِ خود ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اور ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت یہ ہوتی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ محبوب اور دوست رکھتا ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں اس محبت اور دوستی کو وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

نیز حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے: خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کی توبہ سے اس مسافر آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو کسی ایسی غیر آباد اور سنسان زمین میں ہو جو سامانِ حیات سے خالی اور اسبابِ ہلاکت سے بھری ہوئی ہو اور اس کے ساتھ بس ایک سواری کی اونٹنی ہو، اس پر اس کے کھانے پینے کا سامان ہو، پھر وہ (آرام کرنے کے لیے) سر رکھ کر سو جائے، پھر اسے نیند آجائے، پھر جب نیند سے بیدار ہو تو دیکھے کہ اونٹنی غائب ہے تو وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہو جائے، یہاں تک کہ گرمی اور پیاس وغیرہ کی شدت سے جب اس کی جان خطرے میں پڑ جائے تو سوچنے لگے کہ (میرے لیے یہی بہتر ہے) کہ میں اسی جگہ جاکر پڑ جاؤں (جہاں سویا تھا) یہاں تک کہ مجھے موت آجائے۔

وہ اسی ارادے سے وہاں آکر اپنے بازو پر سر رکھ کر مرنے کے لیے لیٹ جائے تو اس کی آنکھ کھلے تو وہ دیکھے کہ اس کی اونٹنی اس کے پاس موجود ہے اور اس پر کھانے پینے کا پورا سامان بھی لدا ہوا محفوظ ہے، تو جتنا خوش یہ مسافر اونٹنی کے ملنے سے ہوگا، اللہ کی قسم! مومن بندے کی توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

بلاشبہ اس حدیث شریف میں توبہ کرنے والے گناہ گاروں کو اللہ تعالیٰ کی جس خوشنودی کی بشارت سنائی گئی ہے وہ جنت اور اس کی ساری نعمتوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو نقل کر کے اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"ذرا تصور کیجیے! اس بدّو مسافر کا جو اکیلا اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اور راستہ بھر کے لیے کھانے پینے کا سامان اُسی پر لاد کر دور دراز کے سفر پر کسی ایسے راستہ سے چلا جس میں کہیں دانہ پانی ملنے کی امید نہیں، پھر اثنائے سفر میں وہ کسی دن دوپہر میں کہیں سایہ دیکھ کر اترا اور آرام کرنے کے ارادہ سے لیٹ گیا، اس

تھکے ماندے مسافر کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اونٹنی اپنے سارے سازوسامان کے ساتھ غائب ہے، وہ بیچارہ حیران وسراسیمہ ہوکر اس کی تلاش میں دوڑا بھاگا، یہاں تک کہ گرمی اور پیاس کی شدت نے اس کو لب دم کردیا۔ اب اس نے سوچا کہ شاید میری موت اسی طرح جنگل بیابان میں لکھی تھی اور اب بھوک پیاس میں ایڑیاں رگڑر گڑ کے مرنا ہی میرے لیے مقدر ہے، اس لیے وہ اسی سایہ کی جگہ مرنے کے لیے آکے پڑ گیا اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ اسی حالت میں اس کی آنکھ پھر جھپکی، اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اونٹنی اپنے سازوسامان کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی ہے۔

ذرا اندازہ کیجیے! کہ بھاگی ہوئی اور گم شدہ اونٹنی کو اس طرح اپنے پاس کھڑا دیکھ کے اُس بدو کو، جو مایوس ہوکر مرنے کے لیے پڑ گیا تھا، کس قدر خوشی ہوگی۔ صادق ومصدوق ﷺ نے اس حدیث پاک میں قسم کھاکے فرمایا کہ: خدا کی قسم! بندہ جب جرم وگناہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور سچے دل سے توبہ کرکے اس کی طرف آتا ہے تو اس رحیم وکریم رب کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی کہ اس بدّو کو اپنی بھاگی ہوئی اونٹنی کے ملنے سے ہوگی۔

قریب قریب یہی مضمون صحیحین میں حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی مروی ہے۔ اور صحیح مسلم میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت نعمان بنِ بشیر رضی اللہ عنہ اور حضرت براء بنِ عازب رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مضمون مروی ہے، بلکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اُس بدُو مسافر کی فرطِ مسرت کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: اونٹنی کے اس طرح مل جانے سے وہ اتنا خوش ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اس بے انتہا عنایت اور بندہ نوازی کے اعتراف کے طور پر وہ کہنا چاہتا تھا کہ: اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ وَاَنَا عَبْدُكَ (خداوند! بس تو ہی میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ) لیکن خوشی کی سرمستی میں اس کی زبان بہک گئی اور اُس نے کہا: اَللّٰھُمَّ اَنْتَ عَبْدِیْ وَاَنَا رَبُّكَ (میرے اللہ! بس تو میرا بندہ اور میں تیرا خدا)۔

آنحضرت ﷺ نے اُس کی اِس غلطی کی معذرت کرتے ہوئے فرمایا: اَخْطَاَ مِنْ شِدَّۃِ الْفَرَحِ (فرطِ مسرت اور بے حد خوشی کی وجہ سے اُس بے چارے بدُو کی زبان بہک گئی)۔ [1]

---

[1] علما و فقہا نے حضور ﷺ کے اس ارشاد سے سمجھا کہ اگر اس طرح کسی کی زبان بہک جائے اور اُس سے کفر کا کلمہ نکل جائے تو وہ کافر نہ ہوگا، فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں اِس کی تصریح ہے۔

بلاشبہ اس حدیث میں توبہ کرنے والے گناہ گاروں کو اللہ تعالیٰ کی جس خوشنودی کی بشارت سنائی گئی ہے، وہ جنت اور اُس کی ساری نعمتوں سے بھی فائق ہے۔

شیخ ابن القیم رحمہ اللہ نے مدارج السالکین میں توبہ واستغفار ہی کے بیان میں اِسی حدیث پر کلام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اِس خوشنودی کی وضاحت میں ایک عجیب وغریب مضمون لکھا ہے جس کو پڑھ کر ایمانی روح وجد میں آجاتی ہے۔ ذیل میں اس کا صرف حاصل وخلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کی ہوئی ساری کائنات میں انسان کو خاص شرف بخشا ہے کہ دنیا کی ساری چیزیں اُس کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور اُس کو اپنی معرفت اور اطاعت وعبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے، ساری مخلوقات کو اس کے لیے مسخر کیا اور اپنے فرشتوں تک کو اس کا خادم اور محافظ بنایا، پھر اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کتابیں نازل فرمائیں اور نبوت ورسالت کا سلسلہ جاری فرمایا، پھر اِن ہی میں سے کسی کو اپنا خلیل بنایا اور کسی کو شرفِ ہم کلامی بخشا اور بہت بڑی تعداد کو اپنی ولایت اور قُربِ خصوصی کی دولت سے نوازا، اور انسانوں ہی کے لیے دراصل جنّت ودوزخ کو بنایا۔ الغرض دنیا وآخرت میں اور عالمِ خلق وامر میں جو کچھ ہے اور ہوگا اُس سب کا اصل مرکز ومحور بنی نوع انسان ہی ہے، اُسی نے امانت کا بوجھ اٹھایا، اُسی کے لیے شریعت کا نزول ہوا اور ثواب وعذاب دراصل اُسی کے لیے ہے۔ پس اس پورے کارخانۂ عالم میں انسان ہی اصل مقصود ہے، اللہ نے اُس کو اپنے خاص دستِ قدرت سے بنایا، اُس میں اپنی روح ڈالی، اپنے فرشتوں سے اُس کو سجدہ کرایا اور ابلیس اس کو سجدہ نہ کرنے کے جرم میں مردودِ بارگاہ ہوا اور اللہ نے اُس کو اپنا دشمن قرار دیا۔

یہ سب اس لیے کہ اُس خالق نے انسان ہی میں اس کی صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ایک زمینی اور مادی مخلوق ہونے کے باوجود اپنے خالق وپروردگار کی (جو وراء الوراء اور غیب الغیب ہے) اعلیٰ درجہ کی معرفت حاصل کرکے ممکن حد تک اس کے اسرار اور اُس کی حکمتوں سے آشنا ہو، اُس سے محبت اور اُس کی اطاعت کرکے اُس کے لیے اپنے نفسانی مرغوبات اور اپنی ہر چیز کو قربان کرکے اور اس دنیا میں اس کی خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرکے اور پھر اس کی خاص الخاص عنایتوں اور بے حساب بخششوں کا مستحق ہو کر اس کی رحمت ورأفت، اس کے پیار ومحبت اور اس کے بے انتہا لطف وکرم کا مورد بنے۔ چونکہ وہ ربِ

کریم اپنی ذات سے رحیم ہے اور لطف و کرم اس کی ذاتی صفت ہے (جس طرح بلا تشبیہ مامتا ماں کی ذاتی صِفت ہے) اس لیے اپنے وفادار اور نیک کردار بندوں کو انعامات واحسانات سے نوازنا اور اپنے عطیات سے ان کی جھولیوں کو بھر دینا اُس کے لیے بلا تشبیہ اسی طرح بے انتہا خوشی کا باعث ہوتا ہے جس طرح اپنے بچے کو دُودھ پلانا اور نہلا دُھلا کر اچھے کپڑے پہنانا مامتا والی ماں کے لیے انتہائی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

اب اگر بندے نے بد بختی سے اپنے اُس خالق و پروردگار کی وفاداری اور فرمانبرداری کا راستہ چھوڑ کر بغاوت ونافرمانی کا طریقہ اختیار کر لیا اور اس کے دشمن اور باغی شیطان کے لشکر اور اس کے متبعین میں شامل ہو گیا اور ربِّ کریم کی ذاتی صفت رحمت ورأفت اور لطف و کرم کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے بجائے وہ اُس کے قہر و غضب کو بھڑکانے لگا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں (بلا تشبیہ) غصّہ اور ناراضی کی سی کیفیت پیدا ہو گی جو نالائق اور ناخلف بیٹے کی نافرمانی اور بد کرداری دیکھ کر مامتا والی ماں کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اگر اُس بندے کو کبھی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ محسوس کرے کہ میں نے اپنے مالک وپروردگار کو ناراض کر کے اپنے مستقبل کو برباد کر لیا اور اُس کے دامن رحم و کرم کے سوا میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے، پھر وہ اپنے کیے پر نادم وپشیمان ہو اور مغفرت ورحمت کا سائل بن کر اُس کی بارگاہِ کرم کی طرف رجوع کرے، سچّے دل سے توبہ کرے، روئے، گڑگڑائے اور معافی مانگے اور آئندہ کے لیے وفاداری اور فرمانبرداری کا عہد کرلے تو سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کے اس کریم رب کو، جس کی ذاتی صفت رحمت ورأفت ہے اور جس کا پیار ماں کے پیار سے بھی ہزاروں گنا زیادہ ہے اور جو بندوں پر نعمتوں کی بارش برسا کے اتنا خوش ہوتا ہے جتنا نعمتوں کو پاکر محتاج بندے خوش نہیں ہوتے، تو سمجھا جا سکتا ہے کہ ایسے کریم پروردگار کو اپنے اس بندے کی اس توبہ وانابت سے کتنی خوشی ہو گی۔“

شیخ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس سے بہت زیادہ وضاحت اور بسط کے ساتھ یہ مضمون لکھنے کے بعد آخر میں کسی عارف کا ایک واقعہ لکھا ہے جو شیطان یا نفسِ امارہ کے اغوا سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے اور سرکشی و نافرمانی کے جراثیم اس کی رُوح میں پیدا ہونے لگے تھے۔

وہ لکھتے ہیں کہ: ”وہ عارف ایک گلی سے گزر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک گھر کا دروازہ کھلا اور ایک بچہ روتا چلّاتا ہوا اُس میں سے نکلا، اُس کی ماں اس کو گھر سے دھکّے دے دے کے نکال رہی

تھی۔ جب وہ دروازہ سے باہر ہو گیا تو ماں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ بچہ اسی طرح روتا چلاتا، بکتا بڑبڑاتا دور تک گیا، پھر ایک جگہ پہنچ کے کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر کے سوا کہاں جا سکتا ہوں اور کون مجھے اپنے پاس رکھ سکتا ہے؟ یہ سوچ کر ٹوٹے دل کے ساتھ وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ پڑا۔ دروازہ پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے تو وہ بیچارہ وہیں چوکھٹ پر سر رکھ کے پڑ گیا اور اسی حالت میں سو گیا۔ ماں آئی، اُس نے دروازہ کھولا اور اپنے بچے کو اس طرح چوکھٹ پر سَر رکھ کے پڑا دیکھ کے اس کا دل بھر آیا اور مامتا کا جذبہ اُبھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، بچے کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کو پیار کرنے لگی، اور کہہ رہی تھی: بیٹے! تو نے دیکھا تیرے لیے میرے سوا کون ہے؟ تو نے نالائقی، نادانی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے اور میرا دل دکھا کے مجھے وہ غصہ دلایا جو تیرے لیے میری فطرت نہیں ہے، میری فطرت اور مامتا کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں تجھے پیار کروں اور تجھے راحت و آرام پہنچانے کی کوشش کروں، تیرے لیے ہر خیر اور بھلائی چاہوں، میرے پاس جو کچھ ہے تیرے ہی لیے ہے۔ اُس عارف نے یہ سارا ماجرا دیکھا اور اس میں اُن کے لیے جو سبق تھا وہ لیا۔"

اس قصہ پر غور کرتے وقت رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سامنے رکھیے: اَللّٰہُ اَرحَمُ بِعِبَادِہٖ مِن ھٰذِہٖ بِوَلَدِھَا[1] "خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنے بندوں کے لیے اس سے زیادہ پیار اور رحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچّے کے لیے ہے"۔ کیسے بدبخت اور محروم ہیں وہ بندے جنھوں نے نافرمانی کی راہ اپنا کے ایسے رحیم و کریم پروردگار کی رحمت سے اپنے کو محروم کر لیا ہے اور اس کے قہر و غضب کو بھڑکا رہے ہیں، حالانکہ توبہ کا دروازہ اُن کے لیے کھلا ہوا ہے اور وہ اُس کی طرف قدم بڑھا کے اللہ تعالیٰ کا وہ پیار حاصل کر سکتے ہیں جس کے سامنے ماں کا پیار کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حقائق کا فہم اور یقین نصیب فرمائے۔

---

[1] صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ ایک عورت تھی جو والہانہ انداز میں اپنے بچّے کو بار بار اٹھا کے سینے سے لگاتی اور دودھ پلاتی تھی، دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ مامتا کے جذبہ سے اس کا سینہ بھرا ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا: "خدا کی قسم! اللہ کی ذات میں اپنے بندوں کے لئے اس سے زیادہ پیار اور رحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچّے کے لئے ہے"۔

سچی توبہ کا حکم اور اس کے فوائد

توبہ فرضِ عین ہے اور سچی توبہ کرنے والوں کا صلہ آخرت میں جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْاتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّكَفِّرَعَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَاالْاَنْهٰرُ "اے ایمان والوں! اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع (اور اس کے آگے توبہ) کرو، مخلصانہ توبہ۔ امید ہے کہ تمہارا رب تمہاری برائیاں تم سے دور کر دے اور تم کو ایسی جنتوں میں داخل فرمادے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی"۔ (سورۃ التحریم: آیت ۸)

توبہ نصوح سے مراد وہ توبہ ہے جو دل کی پوری ندامت، پشیمانی، انقیاد، سچے اور پختہ عزم کے ساتھ ہو اور جس کے بعد اس گناہ کی طرف کوئی خیال اور ارادہ بھی باقی نہ رہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سچی توبہ فرضِ عین ہے۔ ہر ایمان والے کو چاہیے کہ وہ فوراً اپنے گناہوں سے توبہ کر کے ایمان و تقویٰ کی سیدھی شاہراہ کو اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہوں اور اُن کے اثرات کو دور فرمائے گا اور اس کو جنتوں میں ہمیشہ کے لیے داخل فرمادے گا۔

توبہ گناہوں سے پاکی کا ذریعہ

انسان کے آئینۂ فطرت کا جوہر پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے، اس لیے نیکی سے اس کی پوری موافقت ہے اور گناہ اس کے آئینۂ فطرت کو زنگ آلود اور داغدار کرتا ہے، لیکن ندامت کے آنسو اور سچی توبہ اس کو اس طرح صاف و شفاف کرتی ہے کہ اس پر کوئی داغ دھبہ اور گرد باقی نہیں رہ جاتا۔ اسی حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَاذَنْبَ لَهٗ "گناہوں سے توبہ کرنے والا اس شخص جیسا ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں"۔

(ابن ماجہ، بیہقی، مشکوۃ)

توبہ کے سبب دل سے گناہوں کا زنگ دور ہو جاتا ہے اور دل پاک، صاف اور شفاف ہو جاتا ہے۔ چناں چہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
"بے شک مومن بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، پھر اگر اس نے گناہ کے بعد توبہ و استغفار نہ کیا، بلکہ مزید گناہ پر گناہ کیے تو دل کی سیاہی اور بڑھ

جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کے دل پر چھا جاتی ہے، اور یہی وہ سیاہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا: كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ "ہر گز نہیں! بلکہ ان کے (برے) کرتوتوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے (جس کی وجہ سے وہ ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں)"۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں کا صیقل توبہ و استغفار ہے۔ بندہ کو چاہیے کہ وہ اپنے گناہوں سے جلد از جلد توبہ کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گناہوں کا زنگ اس قدر بڑھ جائے کہ وہ اس کے پورے دل پر چھا جائے جس کے بعد اس کا دل بینائی سے محروم ہو جائے اور وہ (خدا نہ کرے) قیامت کے روز کفار و مشرکین کی صف میں کھڑا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچی توبہ نصیب فرمائے اور بُری موت سے بچا کر ایمان و تقویٰ پر خاتمہ نصیب فرمائے۔ آمین!

سچی توبہ کے دنیوی فائدے

پہلے بھی یہ بیان گزر چکا ہے کہ توبہ و استغفار کرنے والے کی دنیوی زندگی اچھی اور پاکیزہ گزرتی ہے، یہاں اس کے بارے میں قرآن و حدیث سے مزید کچھ نقل کر دیتا ہوں۔ قرآن مجید نے حضرت ہود علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا خطاب، جو انہوں اپنی قوم کو کیا تھا، نقل کیا ہے۔ اس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے قوم سے یہ بھی فرمایا تھا کہ: وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ "اے میری قوم! اپنے رب سے معافی مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو، وہ تمہارے اوپر خوب (رحمت کی) بارشیں برسائے گا اور تمہاری قوت میں اضافہ کرے گا اور تم مجرم بن کر روگردانی نہ کرو"۔

(سورۂ ہود: آیت ۵۲)

اور حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی قوم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ "پس میں نے (ان سے) کہا کہ اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے

خوب بارشیں برسائے گا اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا، اور تمہارے لیے باغات پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کرے گا۔ تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لیے کسی وقار و عظمت اور جلال کی توقع نہیں رکھتے"۔ (سورۂ نوح: آیت ۱۰ تا ۱۳)

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے ذریعے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِىْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ "اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو، وہ تم کو ایک وقت مقررہ تک سامانِ زندگی پہنچائے گا، اچھا سامانِ زندگی اور ہر مستحق فضل (زیادتی والے) کو (خاص) اپنے فضل (زیادتی) سے نوازے گا"۔ (سورۂ ہود: آیت ۳)

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی اور اس آخری آیت میں استغفار کے بعد توبہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے توبہ کی حقیقت اور زیادہ واضح ہو گئی۔ وہ یہ کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور جرائم کی معافی مانگے اور ان سے آئندہ باز رہنے کا پختہ عزم کرے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اس صحیح راہ کو اختیار کرلے جس کی طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے۔

۲۔ دوسری بات مذکورہ بالا آیات میں یہ بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سچی اور خالص توبہ کے سبب خوب رحمت کی بارشیں برسائے گا۔ یہ حلال وپاک رزق کی فراوانی کی تعبیر ہے کہ توبہ اور ایمان وتقویٰ کے سبب آسمان وزمین کی برکتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس کا پورا بیان ان شاء اللہ تقویٰ کے باب میں آئے گا۔

۳۔ تیسری بات ان آیتوں میں یہ بیان ہوئی کہ توبہ واستغفار اور ایمان وتقویٰ کے سبب اللہ تعالیٰ تمہارے لیے باغات پیدا کردے گا اور تمہارے لیے پانی کی نہریں جاری کردے گا۔

۴۔ چوتھی بات یہ فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ توبہ واستغفار کی برکت سے تم کو مال اور اولاد میں فروغ اور ترقی نصیب فرمائے گا۔

۵۔ پانچویں بات ان آیتوں میں یہ ذکر ہوئی کہ وہ تمہاری قوت میں اضافہ پر اضافہ کرے گا۔ اس سے مراد جسمانی، مالی اور تمام مادی قوتوں پر مزید روحانی قوت و عزت کا اضافہ بھی ہے۔ اور اس میں اجتماعی توبہ سے اس برکت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تمہاری سیاسی قوت، شوکت اور دبدبہ میں اضافہ کرے گا اور اضافی قوت میں قلبی اطمینان و سکون بھی شامل ہے۔

۶۔ ان آیات میں چھٹی بات یہ بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ تم کو توبہ و استغفار اور رجوع الی اللہ کی برکت سے ایک مقررہ وقت تک سامانِ زندگی پہنچائے گا، اچھا سامانِ زندگی۔ اس سے مراد وہ سامانِ زندگی ہے جس سے انسان فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تمہارے لیے جتنا وقت مقرر ہے اس وقت تک تم کو دے گا۔

سامانِ زندگی کی اقسام

سامانِ زندگی (جس سے لوگ دنیا کی زندگی میں فائدہ اٹھاتے ہیں، اس) کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: وہ سامانِ زندگی (مال و دولت وغیرہ ہے) جو انسان کو دھوکے اور غفلت میں ڈال دیتا ہے۔ وہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے مزید دور کر دیتا ہے اور فخر، غرور اور حسد جیسی بدترین بیماریوں میں مبتلا کر کے اس کی دنیا و آخرت کو برباد کر دیتا ہے۔

دوسری قسم: وہ سامانِ زندگی ہے جو انسان کی شکر گزاری میں اضافہ کرتا ہے اور انسان کی دنیا و آخرت دونوں کے لیے اطمینان، سکون، راحت، عزت اور کامیابی و کامرانی کا سبب بنتا ہے۔ پہلی قسم کو متاع الغرور (یعنی دھوکے کا سامانِ زندگی) اور دوسری قسم کو متاعِ حسن (یعنی اچھا اور حسن و خوبی والا سامانِ زندگی) کہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں جتنی زندگی تمہارے لیے مقدر ہے، اس میں بھی توبہ و استغفار اور ایمان و تقویٰ کے سبب اللہ تعالیٰ تم کو اچھی اور پاکیزہ زندگی نصیب فرمائے گا، اور تم کو حسن و خوبی والا سامانِ زندگی عطا فرمائے گا جس کی وجہ سے تم ذلت و خواری کے بجائے عزت، شرف، باہمی الفت اور ظاہری و باطنی امن و سکون کے ساتھ وقت گزارو گے۔

دنیا کا یہ سامان، مال و دولت اور دبدبہ وہ سامانِ زندگی نہ ہو گا جو ناشکروں اور گمراہ لوگوں کو ملتا ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ سے اور زیادہ غفلت اور دوری میں پڑ جاتے ہیں اور وہ ان کے لیے فخر و غرور، حسد، بے چینی اور باہمی بغض و عناد، فساد و بدامنی اور بالآخر دنیا و آخرت کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے، بلکہ یہ وہ حسن و خوبی والا سامان ہو گا جو تمہارے اخلاق و کردار کے اندر اور زیادہ حسن و خوبی پیدا کرے گا۔ اس کی وجہ سے تمہاری شکر گزاری اور ایمان و تقویٰ میں اضافہ ہو گا اور تم اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق اچھی طرح ادا کرو گے۔ یہ وہ سامانِ زیست ہو گا جس کے سبب تم دنیا میں خیر و صلاح پھیلاؤ گے اور شر، ظلم و فساد مٹاؤ گے۔ خلاصہ یہ کہ یہ وہ سامانِ زندگی ہو گا جو تمہارے لیے دنیا و آخرت دونوں جہاں کے لیے اطمینان و سکون کا باعث بنے گا۔

تمام تر مسائل اور مشکلات کا حل

بلاشبہ توبہ و استغفار کرنا اور ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرنا انسان پر دنیا اور آخرت کی نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے، اسی کی وجہ سے دنیا کے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں اور اسی کی وجہ سے دنیاوی مصائب اور آفتیں دور ہو جاتی ہیں۔ اس پر تاریخ، تجربہ اور قرآن مجید سب گواہ ہیں کہ جن لوگوں نے توبہ و استغفار اور ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کی، ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی میں بھی نوازا اور ان کو عزت و شرف کی زندگی نصیب کی۔

ہر پریشانی کا علاج

بس ہر پریشانی کا علاج اور ہر کامرانی کا راز توبہ و استغفار اور ایمان و تقویٰ کے اپنانے میں ہے۔ ابن صبیح کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے قحط سالی کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ ایک دوسرا شخص آیا، اس نے اپنے فاقہ و تنگی کی شکایت کی، انہوں نے اس کو بھی یہی جواب دیا۔ تیسرا آدمی آیا، اس نے اولادِ نرینہ کے لیے دعا کی درخواست کی، تو انہوں نے اس کو بھی یہی جواب دیا۔ چوتھا آدمی آیا اور اس نے عرض کی کہ میرا باغ خشک ہو گیا ہے، پھل نہیں دیتا، انہوں نے اس کو بھی یہی جواب دیا کہ استغفار کرو، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ ابن صبیح کہتے ہیں کہ ہم نے ان سے عرض کیا کہ مختلف لوگوں نے مختلف چیزوں کے بارے میں دعا کی درخواست کی۔ آپ نے

سب کا ایک ہی جواب دیا۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا، بلکہ اللہ تعالیٰ سورۂ نوح میں فرماتا ہے: اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّهٗ کَانَ غَفَّارًا۝ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا۝ وَیُمْدِدْکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْهٰرًا۝ یعنی "اپنے پروردگار سے مغفرت مانگو، یقین جانو وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا، اور تمہارے لیے باغات پیدا کرے گا، اور تمہاری خاطر نہریں مہیا کرے گا"۔

(سورۃ النوح: آیت ۱۰ تا ۱۳)

خلاصہ یہ کہ سچی توبہ و استغفار ہی میں ہر تنگی، پریشانی، فقر وفاقہ اور غم کا علاج ہے، جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اب اس کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی پڑھ لیجیے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ مِنْ کُلِّ ضِیْقٍ مَّخْرَجًا وَّمِنْ کُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَرَزَقَهٗ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ "جو بندہ استغفار کو لازم پکڑلے (یعنی اللہ تعالیٰ سے برابر اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہے) تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر تنگی سے نجات پانے کی راہ نکال دیتا ہے اور اس کا ہر رنج و غم اور پریشانی دور کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے اور ایسے طریقوں سے (حلال وپاک) رزق دیتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا"۔

(ابوداؤد)

یاد رہے کہ یہ وعدہ صرف استغفار پڑھنے پر نہیں، بلکہ توبہ و استغفار کی اس حقیقت پر ہے جس کا بیان بار بار گذر چکا ہے۔ وہ یہ کہ بندہ اپنے قصوروں اور کوتاہیوں پر نادم اور پشیمان ہو، دل سے اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرتا ہو اور اپنی اصلاح کی کوشش میں لگا ہوا ہو۔ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ "اور جو شخص تقویٰ کو اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے (ہر تنگی سے) نکلنے کی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ (اور ایسے طریقوں) سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کا خیال و گمان بھی نہیں ہوتا"۔

(سورۃ الطلاق: آیت ۲،۳)

الفاظِ توبہ واستغفار

توبہ میں گناہوں سے باز آنا اور پچھلے گناہوں اور قصوروں پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا ہوتا ہے، لہٰذا توبہ و استغفار کے لیے کوئی خاص زبان یا خاص الفاظ ضروری نہیں، بلکہ بندہ جس زبان اور جن مناسب الفاظ سے توبہ و استغفار کرے گا، وہ اگر سچے دل سے ہو تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی توبہ و استغفار ہے۔ لہٰذا توبہ و استغفار کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدھے سادھے طریقے پر اپنی زبان میں ہی عاجزی وانکساری کے ساتھ گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ سے گناہوں پر معافی مانگے اور توبہ کرلے، مثلاً یہ کہ یا اللہ! میرے کیے ہوئے گناہوں، قصوروں اور کوتاہیوں کو معاف کر دیجیے۔ البتہ قرآن و حدیث میں معافی مانگنے کے کئی طرح کے الفاظ آئے ہیں، یہ وہ الفاظ ہیں جن سے آدمی عاجزی وانکساری سیکھ جاتا ہے۔

صرف الفاظ کے پڑھنے سے توبہ قبول نہ ہوگا اور توبہ واستغفار کا حق ادا نہ ہوگا

اگرچہ ان الفاظ کا پڑھنا بھی بہت ہی بابرکت ہے، لیکن جب تک ان کے معنی نہ سیکھے جائیں اور معنی کو مدِ نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ سے معافی نہ مانگی جائے، ان کے پڑھنے سے توبہ قبول نہ ہوگی اور نہ توبہ و استغفار کا حق ادا ہوگا۔ غرض یہ ہے کہ توبہ و استغفار کے جو الفاظ قرآن وحدیث میں ذکر کیے گئے ہیں ان کا پڑھنا اور ان کی تلاوت کرنا اگرچہ فائدہ و ثواب سے خالی نہیں، لیکن جب تک ان الفاظ کو سمجھ کر ان کے ذریعے سچے دل سے توبہ و استغفار نہ کیا جائے اس وقت تک ان کی حیثیت ایک ذکر کی تو ہوگی، لیکن توبہ و استغفار ہر گز نہ ہوگا۔ اس لیے یہاں توبہ و استغفار کے جن الفاظ کو لکھا جاتا ہے ان کا ترجمہ بھی ساتھ لکھا جاتا ہے۔ آپ ان الفاظ کے ترجمے کو سیکھیں۔ پھر ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کریں۔ اگر عربی کے الفاظ یاد نہ ہوں تو ان کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اس سے اپنی بولی میں توبہ و استغفار کریں۔

توبہ کرنے کے مختصر الفاظ

۱۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ

”میں اپنے رب اللہ سے ہر گناہ، قصور اور کوتاہی کی معافی اور بخشش مانگتا ہوں اور اس کے سامنے توبہ کرتا ہوں“۔

۲۔ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوابُ الْغَفُوْرُ

"اے میرے رب! مجھے معاف کر دے اور مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما، بے شک توہی توبہ قبول کرنے والا بخشنے والا ہے"۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک ہی مجلس میں سو مرتبہ مذکورہ بالا الفاظ سے توبہ واستغفار کرتے تھے۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

۳۔ نبی کریم ﷺ سے توبہ واستغفار کے یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ

"میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور بخشش چاہتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو الحیّ والقیوم ہے اور اس کے حضور میں توبہ کرتا ہوں"۔ (ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

۴۔ آپ ﷺ کبھی کبھی مسجد میں ان الفاظ کے ساتھ بھی استغفار کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ کُلَّهٗ دِقَّهٗ وَجُلَّهٗ وَاَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ وَعَلَانِیَتَهٗ وَسِرَّهٗ

" اے میرے رب! میرے تمام قصوروں، کوتاہیوں کو خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، پہلے ہوں یا پچھلے، علانیہ (کھلے) ہوں یا چھپے ہوئے، سب کو معاف و بخش دے" (صحیح مسلم، مشکوٰۃ: کتاب الصلوٰۃ)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا استغفار

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے سلام پھیرنے سے پہلے جو دعا سکھائی تھی، وہ یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ

مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

"یا اللہ ! بے شک میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی دوسرا گناہوں اور قصوروں کو نہیں بخشتا، لہٰذا تو مجھ کو بخش دے اپنی طرف سے خاص طور پر بخشنا، اور مجھ پر رحم فرما، بے شک تو بخشنے والا مہربان ہے"۔ (دیکھیے بخاری، مسلم، مشکوٰۃ: کتاب الصلوٰۃ)

سیّد الاستغفار

نبی کریم ﷺ نے توبہ و استغفار کے کچھ کلمات سکھائے ہیں اور ان کو آپ ﷺ نے سید الاستغفار بتایا ہے۔وہ کلمات یہ ہیں:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَااِلٰہَ اِلَّااَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَاعَبْدُكَ وَاَنَاعَلٰی عَھْدِكَ وَوَعْدِكَ

مَااسْتَطَعْتُ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَاصَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ

وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَاِنَّهٗ لَایَغْفِرُالذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ

" یااللہ ! تومیرا پروردگار (مالک ومولا) ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو نے ہی مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں اور جہاں تک مجھ سے ہوسکے گا تیرے ساتھ کیے ہوئے (ایمانی) عہد اور (اطاعت وفرمانبرداری کے) وعدے پر قائم رہوں گا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ میں اقرار و اعتراف کرتا ہوں کہ تو نے مجھے نعمتوں سے نوازا اور یہ اقرار واعتراف کرتا ہوں کہ میں نے گناہ اور تیری نافرمانیاں کی ہیں (میں آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتا ہوں)۔ پس تو مجھے بخش دے، کیوں کہ تیرے سوا گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں"۔ (صحیح البخاری)

توبہ و استغفار کے ان الفاظ کے بارے میں خود آپ ﷺ نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص پورے یقین کے ساتھ ان کلمات سے صبح کے وقت توبہ و استغفار کرلے تو شام تک اگر اس کا انتقال ہوگیا تو وہ جنتی ہوگا اور جو ان کلمات کو پورے یقین کے ساتھ شام کے وقت پڑھے گا تو صبح تک اگر اس کا انتقال ہوگیا تو وہ جنتی ہوگا۔ (بخاری ومشکوٰۃ)

اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کے لیے آسان ترین اور مختصر الفاظ یہ ہیں:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ "میں اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا ہوں"۔یارَبِّ اغْفِرْ لِیْ "اے میرے پروردگار! مجھ کو بخش دے" یا اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ "اے اللہ! مجھ کو بخش دے"

حضرت آدم علیٰ نبیناوعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی توبہ واستغفار کے الفاظ

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علی نبیناوعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت حوّا علیہا السلام کو توبہ واستغفار کے جو کلمات سکھائے تھے، وہ یہ ہیں: رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡلَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ "اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا (توہی ہم کو معاف فرما) اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم خسارہ پانے (اور گھاٹا اٹھانے) والوں میں سے ہو جائیں گے"۔

(سورۃ الاعراف: آیت ۲۳)

حضرت موسیٰ علیٰ نبیناوعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے استغفار کے الفاظ

حضرت موسیٰ علی نبیناوعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں بخشش اور معافی مانگی تھی:

رَبِّ اِنِّىۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِىۡ فَاغۡفِرۡ لِىۡ "اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، پس تو مجھ کو بخش دے"۔ (سورۃ القصص: آیت ۱۶)

یا اللہ! ہم سب کو اپنی عظمت، کبریائی اور بڑائی کا احساس واستحضار اور اپنی شدید محبت نصیب فرما اور ہم سب کو سچی توبہ اور استغفار کی توفیق عنایت فرما اور ہم سب کی کامل بخشش فرما۔ آمین!

توبہ کے واقعات

بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ کی توبہ

میں نے کتاب "ملتقط" میں پڑھا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا اور اس کے پاس صرف ایک اونی جبہ اور ایک مشکیزہ تھا جس سے وہ لوگوں کو پانی پلایا کرتا تھا۔ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں دنیا کی کوئی چیز فقط اس جبے اور مشکیزے کے چھوڑ کر نہیں جارہا، اور قیامت کے دن مجھے ان کے اٹھانے کی طاقت نہیں ہے اس لیے میرے مرنے کے بعد یہ جبہ اور مشکیزہ فلاں بادشاہ کو پہنچادیں تاکہ وہ اپنے سامانِ مملکت کے ساتھ اسے بھی اٹھالے۔ جب عابد کا انتقال ہوگیا تو اس کے مریدوں نے بادشاہ کو اس کی وصیت سنائی۔ بادشاہ کہنے لگا: یہ عابد ایک جبہ اور مشکیزہ اٹھانے سے عاجز ہوگیا تو میں اتنی ساری دنیاوی چیزیں کیسے اٹھاؤں گا۔ اس نے وہ جبہ لے کر پہن لیا اور مشکیزہ لے کر، بادشاہت چھوڑ کر نکل پڑا اور لوگوں کو پانی مشکیزہ میں سے بھر کر پلایا کرتا۔

(سچی توبہ کرنے والے ترجمہ کتاب التوابین: ص ٦٣، ٦٤)

غار میں پناہ لینے والوں کی توبہ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین آدمی راستے پر چلے جارہے تھے کہ اچانک بارش آگئی اور انہوں نے ایک پہاڑ میں موجود غار میں پناہ لے لی، اور غار کے دروازے پر ایک چٹان گر گئی جس سے غار کا دروازہ بند ہوگیا۔ ان میں سے ایک نے کہا: اپنے نیک اعمال پر غور کرو اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔

ان میں سے ایک نے کہا: اے اللہ! میرے بوڑھے ماں باپ ہیں اور بیوی بچے ہیں۔ میں بکریاں چراتا تھا اور جب میں واپس آتا تو بکری کا دودھ نکال کر پہلے اپنے والدین کو پلاتا قبل اس کے کہ اپنے بچوں کو پلاؤں۔ ایک دن میں بکریاں چراتا ہوا دور نکل گیا، واپسی میں دیر ہوگئی، جب آیا تو والدین سوچکے تھے، تو میں نے دودھ نکالا اور ان کے سرہانے کھڑا ہوگیا اور میں نے ناپسند جانا کہ انہیں نیند سے اٹھاؤں، حالاں کہ میرے معصوم بچے میرے پاؤں سے لپٹ کر بھوک کے مارے رورہے تھے۔ طلوعِ فجر تک وہ سوتے رہے

اور میں یونہی کھڑا رہا۔ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ صرف تیری رضا کے لیے کیا تھا تو ہمارے لیے کچھ راستہ کھول دے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں، تو اللہ تعالیٰ نے تھوڑا سا شگاف کھول دیا۔

دوسرے نے کہا: اے اللہ! میری ایک چچازاد بہن تھی جو مجھے بہت زیادہ پسند تھی، جس طرح مرد عورت کو پسند کرتا ہے۔ میں نے اس سے اس کا نفس مانگا تو اس نے انکار کر دیا مگر یہ کہ جب میں سو دینار اس کو لا کر دوں تو میں نے محنت کی اور سو دینار جمع کر کے اسے لا کر دیے اور جب میں اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے اس کی ٹانگوں میں بیٹھا تو اس نے کہا کہ اے اللہ کے بندے! اللہ سے ڈر اور مہر کو اس کے حق کے بغیر مت توڑ، تو میں وہاں سے اٹھ گیا۔ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ عمل محض تیری رضا کی خاطر کیا تھا تو ہمارے لیے راستہ کھول دے تا کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔ تو اللہ نے اس شگاف کو اور بڑا کر دیا۔

تیسرے نے کہا: اے اللہ ! میں نے ایک مزدور کرائے پر رکھا۔ جب اس نے اپنا کام نمٹا دیا اور اس نے مزدوری مانگی تو میں نے اس سے اعراض کیا، تو وہ اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کی اجرت بڑھ گئی اور پھر میں نے اس سے ایک گائے خریدی اور اس کے بچے بھی ہوئے۔ وہ کافی عرصے کے بعد میرے پاس آیا تو اس نے مجھے کہا کہ اللہ سے ڈر اور مجھ پر ظلم نہ کر، میرا حق دے دے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ گائے اور اس کے بچے لے جا۔ وہ کہنے لگا: مجھ سے مذاق مت کر اور اللہ سے ڈر۔ تو میں نے پھر کہا کہ میں تجھ سے مذاق نہیں کر رہا، یہ گائے اور اس کے بچے لے جا۔ وہ اسے لے کر چلا گیا۔ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ سب کچھ محض تیری رضا کی خاطر کیا ہے تو باقی شگاف بھی کھول دے، تو اللہ تعالیٰ نے (شگاف بڑا کر کے) راستہ کھول دیا۔ (حوالہ بالا)

کفل اسرائیلی کی توبہ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص "کفل" تھا۔ وہ کوئی گناہ کرنے میں حرج محسوس نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے پاس ایک عورت آئی۔ اس نے اسے ساٹھ دینار دیے کہ وہ اس سے بدکاری کرے۔ تو جب یہ مقصد پورا کرنے کے لیے بیٹھا تو وہ عورت کپکپانے لگی اور رو دی۔ اس نے کہا کہ تو کیوں روتی ہے، کیا میں نے کوئی زبردستی کی ہے؟ اس نے کہا: نہیں! لیکن میں نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔ کفل نے کہا: تو پھر یہ کام کرنے

کیوں آگئی حالاں کہ تو نے کبھی نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ ایک ضرورت کی بنا پر میں مجبور ہو گئی، تو کفل نے اسے چھوڑ دیا اور کہا کہ چلی جا اور یہ دینار تیرے ہوئے۔ پھر کہنے لگا: واللہ! کفل اب کبھی گناہ نہیں کرے گا، اور یہ اسی رات مر گیا۔ صبح اس کے دروازے پر لکھا ہوا تھا: "اللہ تعالیٰ نے کفل کی مغفرت کر دی"۔
(حوالہ بالا)

سو انسانوں کے قاتل کی توبہ

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: کیا میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوا ایک واقعہ سناؤں جسے میرے کانوں نے سنا اور دل نے محفوظ کر لیا؟ ایک بندے نے ننانوے قتل کیے تھے۔ اس نے توبہ کرنا چاہی تو وہاں کے کسی اہل علم سے پوچھا تو اس نے کسی اور شخص کا پتہ دیا۔ یہ اس دوسرے شخص کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں نے ننانوے قتل کیے ہیں، کیا میں توبہ کر سکتا ہوں؟ تو اس نے کہا: کیا! ننانوے قتل کے بعد توبہ؟ تو اس قاتل نے تلوار نکال کر اسے بھی قتل کر دیا۔ اب سو قتل مکمل ہو گئے۔ اس کے بعد پھر اس نے توبہ کرنا چاہی، پھر کسی اہل علم سے پوچھا کہ میں نے سو قتل کیے ہیں، کیا میں توبہ کر سکتا ہوں؟ اس عالم نے جواب دیا کہ توبہ اور تیرے درمیان کیا حائل ہے؟ اس گندی بستی سے نکل کر نیک بستی چلا جا اور وہاں اپنے رب کی عبادت کر۔ یہ اس بستی کی طرف چل دیا اور راستے میں اسے موت نے آلیا۔

اب اس کے بارے میں ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب جھگڑنے لگے تو ابلیس نے کہا کہ میں اس کا زیادہ حق دار ہوں اس لیے کہ اس نے کبھی میری نافرمانی نہیں کی، تو رحمت کے فرشتوں نے کہا کہ یہ توبہ کر کے نکلا تھا۔ حضرت ابو رافع سے مروی ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا اور انہوں نے اپنا جھگڑا اس کے سامنے پیش کیا۔ "ہم دوبارہ پہلی روایت کی طرف آتے ہیں" اس نے کہا کہ دونوں بستیوں کی طرف دیکھو، جس بستی کے یہ زیادہ قریب ہو اس بستی میں اسے شمار کرنا۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ہم سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جب اسے موت آنے لگی تھی تو اس نے اپنے آپ کو نیکوں کی بستی کی طرف دھکیلا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے نیکوں کی بستی کو اس کے قریب کر دیا اور گندی بستی کو اس سے دور کر دیا، تو فرشتوں نے اسے نیکوں کی بستی میں شمار کیا۔

ایک گناہ گار عورت کو غلط فتوی دینے پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی توبہ

میں نے "تنبیہ الغافلین" میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ پڑھا۔ وہ خود فرماتے ہیں: ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ کر میں مسجد سے باہر نکلا تو وہاں ایک عورت نقاب اوڑھے کھڑی تھی۔ اس نے مجھے مخاطب کیا اور کہا کہ اے ابو ہریرہ! میں نے ایک سنگین گناہ کا ارتکاب کیا ہے، کیا میری توبہ ہو سکتی ہے؟ میں نے پوچھا کہ تیرا گناہ کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے زنا کیا اور اس سے پیدا ہونے والے بچے کو ہلاک کر دیا۔ میں نے کہا: تو خود بھی ہلاک ہوئی اور اس کو بھی کیا، واللہ تیری کوئی توبہ نہیں۔

"اس نے یہ سن کر چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر گئی اور بعد میں (ہوش آنے پر) وہاں سے چلی گئی۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں فتویٰ دے رہا ہوں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں پورا واقعہ گوش گزار کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا واقعہ سننے کے بعد فرمایا: " اے ابو ہریرہ! تو خود ہلاکت میں پڑ گیا اور دوسرے کو بھی ڈال دیا، کیا تجھے یہ آیت یاد نہیں:

"اور وہ لوگ قتل نہیں کرتے کسی نفس کو بغیر حق کے، اور زنا نہیں کرتے، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے گناہوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دیتے ہیں" (سورۃ الفرقان: آیت ۶۸ تا ۷۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں وہاں سے نکلا اور مدینے کی گلیوں میں پھر پھر کر لوگوں سے پوچھتا کہ مجھے اس عورت کا پتا کون بتلائے گا جس نے کل مجھ سے فتویٰ پوچھا تھا؟ (میری دیوانگی دیکھ کر) بچوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مجنون ہو گیا۔ جب رات ہوئی تو اس عورت سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے اسے آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنایا اور یہ کہ اس کی توبہ ہو سکتی ہے۔ وہ عورت یہ سن کر خوشی سے چیخ پڑی اور کہنے لگی: میرا ایک باغ ہے وہ اپنے گناہ کے کفارے میں مساکین پر صدقہ کرتی ہوں۔

(سچی توبہ کرنے والے ترجمہ کتاب التوابین: ص ۱۱۶،۱۱۵)

درویش ابراہیم ابن ادھم رحمہ اللہ کی توبہ

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کے خادم ابراہیم بن بشار کہتے ہیں کہ میں نے ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ کا شروع سے معاملہ کیا تھا؟ انہوں نے بتایا کہ میرے والد اہل بلخ (بلخ خراسان کا مشہور علاقہ ہے، ذکر اور غلہ کی کثرت کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔) میں سے تھے اور خراسان (خراسان کی حدود عراق سے شروع ہو کر ہند تک پہنچتی ہیں) کے بادشاہوں میں سے تھے۔ ہمیں شکار بہت پسند تھا۔ ایک مرتبہ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ میرا کتا بھی میرے ساتھ تھا۔ اسی دوران ایک خرگوش یا لومڑی مجھے نظر آئی۔ گھوڑے کو حرکت دی تو مجھے اپنی پشت سے یہ آواز آئی کہ "تو نہ اس کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور نہ تجھے اس کا حکم دیا گیا ہے"۔ میں نے رک کر دائیں بائیں دیکھا، مگر کوئی نظر نہ آیا تو میں نے کہا: اللہ تعالیٰ ابلیس پر لعنت کرے۔ پھر دوبارہ میں نے گھوڑے کو حرکت دی۔ پھر میں نے وہ آواز تیز سنی: "اے ابراہیم! تو نہ اس کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور نہ ہی تجھے اس کا حکم دیا گیا ہے۔" تو میں رک گیا اور میں نے کہا: "تو نے متنبہ کر دیا، تو نے متنبہ کر دیا، میرے پاس رب العالمین کی طرف سے ڈرانے والا پہنچ گیا۔ واللہ! آج کے بعد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔"

میں اپنے گھر لوٹ آیا اور اپنے والد کے ایک چرواہے کے پاس گیا۔ اس سے ایک جبہ اور چادر لی اور اپنے کپڑے اُسے دے دیے۔ پھر عراق کی طرف چل دیا۔ ایک زمین مجھے اٹھاتی اور دوسری زمین مجھے گراتی۔ یونہی گرتے پڑتے میں عراق پہنچ گیا۔ وہاں چند دن محنت مزدوری کی، لیکن وہاں حلال روزی دستیاب نہیں ہو سکی تو میں نے وہاں کے مشائخ سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر حلال کمانا چاہتے ہو تو شام چلے جاؤ۔ میں شام کی طرف چل دیا۔ وہاں ایک شہر پہنچا جسے منصورہ کہتے تھے۔ یہ مصیصہ (شہر کا نام) تھا۔ میں نے چند دن وہاں مزدوری کی، مگر وہاں حلال روزی نہیں ملی۔ میں نے وہاں کے ایک شیخ سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ اگر حلال روزی چاہتے ہو تو پھر طرطوس چلے جاؤ، وہاں بہت کام ہے اور اچھا ہے، تو میں طرطوس چلا گیا۔ وہاں محنت مزدوری کی، باغوں کی نگرانی کرتا اور کھیتوں کی کٹائی کرتا۔

ایک مرتبہ میں سمندر کے کنارے بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے اپنے باغ کی نگرانی کے لیے کرائے پر لیا۔ میں کافی دن اس کے باغ میں رہا۔ ایک دن اس کا خادم اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ باغ میں

آیا اور مجلس لگا کر بیٹھ گیا، اور پھر مجھے بلا کر کہا کہ ہمارے لیے باغ کا سب سے اچھا، میٹھا اور بڑا انار لے کر آؤ۔ میں اس کے پاس ایک بڑا انار لے گیا۔ خادم نے انار لے کر توڑا تو اسے کھٹا پایا۔ مجھے کہنے لگا: اے ناطور! کتنے ہی عرصے سے تم ہمارے باغ میں ہو اور تمہیں اب تک معلوم نہیں کہ میٹھا انار کیسا ہوتا ہے اور کھٹا کیسا؟ ابراہیم بن ادھم کہتے ہیں کہ میں نے اسے کہا کہ واللہ! میں نے آج تک تمہارے پھلوں میں سے کچھ نہیں کھایا اور نہ ہی مجھے کھٹے میٹھے کی پہچان ہے۔ خادم نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرکے کہا: اس شخص کی بات سن رہے ہو۔ پھر مجھے کہا کہ تو کیا خود کو ابراہیم بن ادھم سمجھتا ہے جو اس حد سے آگے نہیں بڑھتا، یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

دوسرے دن اس نے مسجد میں میرا ذکر کیا تو کچھ لوگ مجھے پہچان گئے۔ خادم اپنے ساتھ کچھ سر کردہ لوگوں کو لے کر آیا۔ میں انہیں دیکھ کر درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے اور میں الٹے پاؤں باہر نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ میرا پہلا واقعہ ہے اور طرطوس سے ریگستانی علاقوں کی طرف نکل آنے کی وجہ ہے۔

ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن الفرج کو اپنا ایک واقعہ کچھ یوں سنایا:

ایک مرتبہ میں ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ راستے کا منظر گھر سے نظر آتا تھا۔ میں نے ایک بوڑھے شخص کو، جس نے چادر پہنی ہوئی تھی، دیکھا۔ اس دن بہت گرمی تھی۔ وہ بوڑھا شخص میرے محل کے سائے میں آرام کرنے بیٹھ گیا۔ میں نے خادم سے کہا کہ ان بزرگ کے پاس جاکر میرا سلام کہو اور گزارش کرو کہ اندر ہمارے پاس آجائے، اس پر میرا دل آگیا۔ وہ خادم جاکر اسے بلا لایا۔ اس نے آکر سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا اور میں نے اس کے اندر آنے پر خوشی کا اظہار کیا اور اسے اپنے برابر میں بٹھالیا۔ میں نے اسے کھانا پیش کیا تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ پھر میں نے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا: وراء النھر سے۔ میں نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا: حج کرنے کا، اور اس دن ذی الحجہ کی پہلی یا دوسری تاریخ تھی۔ میں نے کہا: اس وقت کیسے؟ تو اس نے جوب دیا: اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ میں نے کہا: میں ساتھ چلوں؟ اس نے کہا: اگر پسند کرو تو چلو۔ میں نے سفر کے مناسب کپڑے پہنے اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چلا اور ہم بلخ سے نکل گئے۔ حتی کہ ہم ایک بستی سے گزرے تو مجھے وہاں کا ایک کسان

ملا۔ میں نے اس سے اپنی بعض ضروریات کی چیزیں مانگیں۔ اس نے ہمیں انڈے اور روٹی دی اور ہمیں کھانے کے لیے کہا۔ ہم نے وہ کھالیا۔ پھر وہ پانی لایا۔ ہم نے پانی پیا۔ پھر اس بوڑھے نے مجھے کہا: اللہ کا نام لے کر اٹھ اور میرا ہاتھ پکڑ کر چل۔ ہم چلتے جارہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ زمین ہمارے نیچے سے یوں گزر رہی تھی جیسے وہ کوئی موج ہو۔ ہم ایک کے بعد دوسرے شہر سے گزرتے چلے گئے اور وہ مجھے بتاتا گیا کہ یہ فلاں شہر ہے، اور فلاں، اور یہ کوفہ ہے، پھر کہا: تم یہیں ٹھہرو میں رات میں آؤں گا۔ رات کو وہ پھر آیا اور مجھے لے چلا اور راستے بھر جگہوں کے نام بتاتا گیا اور میں نے کہا: یہ فیر ہے۔ اس کے بعد کہا: یہ مدینہ منورہ ہے، اور میں زمین کو موج کی طرح اپنے پاؤں سے گزرتے دیکھ رہا تھا۔ پھر ہم روضہ رسول ﷺ پر آئے، زیارت کی۔ پھر وہ مجھ سے جدا ہو گیا اور کہا کہ رات نماز کی جگہ ملیں گے، وہ مجھے وہاں آکر ملا، پھر مجھے لے کر چلا حتیٰ کہ رات ہی میں ہم مکہ پہنچ گئے۔ وہ مجھ سے پھر جدا ہونے لگا تو میں نے کہا: میں ساتھ چلوں گا۔ اس نے کہا: میں شام جارہا ہوں۔ میں نے کہا: میں ساتھ چلوں گا۔ اس نے کہا: چلو حج کے بعد زمزم کے پاس ملیں گے۔

حج کے بعد وہ مجھے مقررہ جگہ پر مل گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا، ہم نے بیت اللہ کا طواف کیا۔ پھر مکہ سے نکل پڑے۔ اس نے پہلے کی طرح کیا، ہم بیت المقدس پہنچ گئے۔ جب مسجد میں داخل ہوئے تو اس نے مجھے سلام کیا اور کہا: میں فلاں وقت انشاء اللہ تمہیں ملوں گا، مگر میں اس کے بعد اسے نہ دیکھ سکا اور نہ ہی اس کا نام مجھے معلوم ہوا۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ میں اپنے شہر کمزوروں کی طرح چلتا، منزل بہ منزل رکتا ہوا واپس آیا اور بلخ پہنچ گیا۔ یہ میرا پہلے پہل کا واقعہ ہے۔

ابرہیم بن بشار کہتے ہیں کہ ہم بحری سفر پر ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کے ساتھ تھے۔ دورانِ سفر بڑی اچھی ہوا چل رہی تھی اور سواریاں بہت تھیں۔ اچانک بڑی سخت و تند ہوا چلی، کشتیاں ٹوٹنے لگیں۔ اس وقت ابراہیم عباء میں لپٹے سوئے ہوئے تھے۔ کشتی والے ان کے پاس آئے اور کہا: اے بھائی! جس مشکل میں ہم پھنسے ہیں تم لیٹے دیکھ رہے ہو اور تمہیں کوئی پرواہ نہیں ہے۔ ابراہیم بولے! آج جیسے دن کے لیے جس نے تیاری نہیں کی ہوگی وہ کامیاب نہیں ہوگا، پھر انہوں نے اپنے ہونٹوں کو حرکت دی۔ اچانک پانی کی طرف سے ایک آواز آئی: تمہارے درمیان ابراہیم بن ادھم موجود ہے، پھر بھی تم ڈر رہے ہو۔ اے

ہوا، اور اے بے قرار سمندر! ٹھہر جا اللہ کے حکم سے۔ سمندر ساکن ہو گیا اور ہوا بھی رک گئی اور سمندر ایسا سپاٹ ہو گیا جیسے کوئی لکڑی کا تختہ ہو۔

حضرت شقیق بلخی رحمہ اللہ کی توبہ

علی بن محمد بن شقیق بلخی کہتے ہیں کہ میرے دادا (حضرت شقیق رحمہ اللہ) کے پاس تین سو گاؤں تھے، لیکن جب ان کا انتقال ہوا تو کفن دینے کے لیے کفن کا کپڑا تک موجود نہ تھا۔ انہوں نے اپنا سارا مال اپنے سامنے ہی صدقہ کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ترکی تجارت کی غرض سے چلے گئے۔ اُس وقت وہ نوجوان تھے۔ جہاں تجارت کرنے گئے اس قوم کا نام خلوخیہ تھا اور وہ بتوں کو پوجتی تھی۔ میرے دادا بتوں کے گھر عبادت خانہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ان کا عالم سر اور داڑھی کے بال مونڈے ہوئے سرخ ار غوانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اسے حضرت شقیق نے کہا کہ جو کچھ تو کر رہا ہے سب باطل ہے، ان سب کا، تیرا اور ساری مخلوق کا ایک مالک اور صانع ہے، اس کے جیسا کوئی نہیں ہے۔ دنیا و آخرت اسی کے لیے ہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر مخلوق کا رازق ہے۔ تو بُت کدے کے خادم نے انہیں کہا کہ تیرا اپنا فعل تیرے قول کے مطابق نہیں ہے، تو حضرت شقیق نے کہا: وہ کیسے؟ اس نے کہا: تیرا خیال ہے کہ تیرا ایک خالق ہے جو ہر چیز پر قادر ہے، حالانکہ تو خود مشقت برداشت کر کے اتنی دور روزی کمانے آیا ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی جو تو نے کہی ہے تو تیرا مالک تجھے وہاں بھی روزی دے سکتا ہے۔ حضرت شقیق کہتے تھے کہ اس ترکی کی یہ بات میرے زہد کا سبب بن گئی۔ چناں چہ انہوں نے اپنا سارا مال صدقہ کر دیا اور علم حاصل کرنے لگ گئے۔

(سچی توبہ کرنے والے ترجمہ کتاب التوابین: ۱۶۲ تا ۱۶۷)

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ کی توبہ

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اُن سے اُن کی توبہ کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ "میں پولیس میں تھا اور بہت شراب پیتا تھا۔ میں نے ایک خوبصورت باندی خریدی جو میرے لیے بہت اچھی ثابت ہوئی۔ اس سے میرے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ مجھے اس سے بہت محبت ہو گئی۔ جب وہ پیروں پر چلنے لگی تو اس کی محبت میرے دل میں اور بڑھ گئی۔ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ جب میں

شراب پینے لگتا تو وہ آکر شراب گرا دیتی تھی۔ جب اس کی عمر دو سال ہوئی تو اس کا انتقال ہو گیا۔ مجھے اس کی موت نے دل کا مریض بنا دیا۔ جب پندرھویں شعبان کی رات تھی اور جمعہ کی رات بھی تھی، میں نشے میں چور ہو کر سو گیا، اور میں نے عشا کی نماز بھی اس دن نہیں پڑھی تھی۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو گئی ہے اور صور پھونکا جا چکا ہے۔ قبریں پھٹ رہی ہیں اور حشر قائم ہے اور میں لوگوں کے ساتھ ہوں۔ اچانک میں نے اپنے پیچھے سرسراہٹ محسوس کی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک بہت بڑا کالے اور زرد رنگ کا اژدھا میرے پیچھے منہ کھولے میری طرف بڑھ رہا ہے تو میں اس سے ڈر کر بھاگا۔ بھاگتے ہوئے میں ایک صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ایک بزرگ کے پاس سے گزرا جن کے پاس خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں سلام کیا: انہوں نے جواب دیا، تو میں نے کہا کہ "شیخ! مجھے اس اژدھے سے بچایئے، اللہ آپ کو اپنے ہاں پناہ دے گا۔" وہ بزرگ روتے ہوئے کہنے لگے کہ میں کمزور ہوں اور یہ مجھ سے بہت طاقتور ہے، میں اس پر قادر نہیں ہو سکتا، لیکن تم جلدی سے بھاگ جاؤ، شاید اللہ تعالیٰ کسی کو تم سے ملا دے جو تمہیں اس سے بچا لے۔

میں سیدھا بھاگنے لگا تو میں وہاں قیامت کے مناظر دیکھنے لگا۔ ایک اونچائی پر چڑھا تو وہاں زبردست آگ تھی۔ میں نے اس کی ہولناکی کو دیکھا اور میں نے چاہا کہ اژدھے سے بچنے کے لیے اس آگ میں کود جاؤں، مگر کسی نے چیخ کر کہا کہ لوٹ آ! تو اس آگ کا اہل نہیں ہے، تو میں مطمئن ہو کر واپس آ گیا اور اژدھا میری تلاش میں تھا۔ میں اسی بزرگ کے پاس آیا اور انہیں کہا کہ شیخ! میں نے آپ سے پناہ مانگی تھی لیکن آپ نے نہیں دی۔ وہ بزرگ پھر معذرت کر کے کہنے لگے کہ میں کمزور آدمی ہوں، لیکن اس پہاڑ پر چڑھ جاؤ وہاں پر مسلمانوں کی امانتیں ہیں، ہو سکتا ہے کہ تیری بھی کوئی امانت وہاں ہو جو تیری مدد کر سکے۔ میں اس پہاڑ پر چڑھا جو چاندی سے بنا تھا۔ اس میں جگہ جگہ سوراخ تھے اور غاروں پر پردے پڑے ہوئے تھے اور سب طاقچوں پر ریشم کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ جب میں اژدھے سے ڈر کر پہاڑ کی طرف بھاگا تو کسی فرشتے نے چیخ کر کہا: پردے ہٹا دو، طاقچے کھول دو، تو پردے اٹھ گئے اور طاق کھول دیئے گئے۔ پھر ان طاقچوں سے چاندی کی رنگت جیسے چہروں والے بچے نکل آئے اور اژدھا بھی میرے قریب ہو گیا۔ اب میں بڑا ہی پریشان ہوا تو کسی بچے نے چیخ کر کہا: تمہارا ستیاناس! دیکھ نہیں رہے ہو کہ

دشمن اس سے کتنا قریب آچکا ہے، چلو! سب باہر آؤ۔ پھر بچے فوج در فوج نکلنا شروع ہو گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ میری وہ بچی جو مر چکی تھی وہ بھی نکلی اور مجھے دیکھتے ہی رو کر کہنے لگی: واللہ! میرے والد۔ پھر وہ تیر کی طرح کود کر ایک نور کے ہالے میں گئی اور میرے سامنے نمودار ہو گئی اور اپنا بایاں ہاتھ میرے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھا کر اسے پکڑ کر کھڑی ہوئی اور دایاں ہاتھ اژدھے کی طرف بڑھایا تو وہ اُلٹے پاؤں بھاگ گیا۔

پھر اس نے مجھے بٹھایا اور میری گود میں آبیٹھی اور اپنا سیدھا ہاتھ میری داڑھی میں پھیرتے ہوئے کہنے لگی: "ابا جان! کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ لوگوں کے دل اللہ کے ذکر کے لیے جھک جائیں۔" (سورۃ الحدید: آیت ۱۶) اور رونے لگی، تو میں نے کہا کہ میری بچی! کیا تمہیں قرآن معلوم ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں! ہم لوگ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر اس اژدھے کے بارے میں بتاؤ جو مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ آپ کے بُرے اعمال تھے جنہیں خود آپ نے طاقتور بنایا تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ بزرگ کون تھے؟ اس نے بتایا کہ وہ آپ کے اچھے اعمال تھے جنہیں آپ نے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ وہ آپ کے برے اعمال کو دفع نہ کر سکے۔ میں نے پوچھا کہ میری بچی! تم لوگ اس پہاڑ میں کیا کرتے ہو؟ اُس نے کہا: ہم مسلمانوں کے معصوم بچے اسی میں رہتے ہیں اور قیامت ہونے تک رہیں گے، ہم منتظر ہیں کہ تم کب ہمارے پاس آؤ اور ہم تمہاری شفاعت کریں۔

مالک بن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں خوفزدہ حالت میں بیدار ہوا اور میں نے شراب پھینک کر اس کے برتن توڑ دیے اور اللہ سے توبہ کر لی۔ یہ میری توبہ کا سبب بنا۔

(سچی توبہ کرنے والے) ترجمہ کتاب التوابین): ۱۹۶تا۱۹۸)

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تمیمی کی توبہ

علی بن خشرم کہتے ہیں کہ مجھے فضیل بن عیاض کے ایک پڑوسی نے بتایا کہ فضیل ڈاکو تھے اور اکیلے رہزنی کرتے تھے۔ ایک رات وہ لوٹ مار کرنے نکلے تو ایک قافلہ تک پہنچے جو ابھی رات ہی کو پہنچا تھا، تو ایک آدمی نے دوسرے سے کہا کہ اس بستی سے دور رہ کر چلو، یہاں ایک فضیل نامی شخص ہے جو اکیلا لوٹ مار کر لیتا ہے۔ یہ بات سن کر فضیل پر کپکپی طاری ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ لوگو! میں فضیل ہوں، آرام

سے جاؤ، واللہ! اب میں بہت کوشش کروں گا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کروں۔ اس طرح انہوں نے ڈاکہ زنی سے توبہ کرلی۔

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ انہوں نے قافلے والوں سے کہا کہ تم فضیل کے شر سے امن میں ہو، اور ان لوگوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنے لگے۔ اس دوران کسی کو یہ آیت پڑھتے سنا: "کیا اب تک وہ وقت نہیں آیا کہ لوگوں کے دل اللہ کے ذکر کے لیے جھک جائیں۔" (سورۃ الحدید: آیت ۱۶) یہ سنتے ہی انہوں نے کہا: کیوں نہیں! وہ وقت آپہنچا ہے۔ تو یہی ان کی توبہ کی ابتدا ہے۔

ابراہیم بن اشعث کہتے ہیں کہ میں نے حضرت فضیل کو ایک رات یہ آیت تلاوت کرتے سنا: "اور ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے، حتیٰ کہ جان لیں تم میں سے مجاہدین اور صابرین کو اور تمہاری خبریں جان لیں۔ (محمد: ۳۱)" تو حضرت فضیل "اور تمہاری خبریں جان لیں۔" کے الفاظ کو دہراتے جاتے اور کہتے " اے اللہ! تو ہمارے واقعات جانچے گا۔ اگر جانچے گا تو ہماری رسوائی ہوگی اور عیوبِ پوشیدہ کھل جائیں گے۔ اگر تو ہمارے واقعات جانچے گا تو ہمیں ہلاک کرے گا اور عذاب دے گا۔" اور میں نے اُنہیں یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ:

" تو لوگوں کے لیے مزین ہوتا ہے، اُن کے لیے اعمال کرتا ہے، اور تیاری کرتا ہے، اور تو ریاکاری کرتا ہے حتیٰ کہ وہ تجھے پہچان کر کہیں کہ "یہ نیک آدمی ہے"، اور تیری ضروریات کو پورا کریں، تیری مجلس میں آیا جایا کریں اور تیری تعظیم کریں۔ یہ تو تیری ناکامی ہے۔ اگر یہ تیری صحیح حالت ہے تو بری حالت کیسی ہوگی۔" اور میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے بھی سنا:

"اگر تجھ کو اس بات کی قدرت ہو کہ معروف نہ ہو تو ایسا ضرور کر، اور تجھے معروف ہونا ضروری بھی نہیں، اگر تیری تعریف نہ کی جائے تو تجھے کیا کمی ہو جائے گی، اور اگر تو لوگوں کے نزدیک مذموم اور اللہ کے نزدیک محمود ہو تو پھر تیرا کیا بگڑتا ہے۔"

بشر بن حارث رحمہ اللہ صوفی کی توبہ

محمد بن دینوری کہتے ہیں کہ میں نے بشر بن حارث رحمہ اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: (ان سے پوچھا گیا تھا کہ تمہاری توبہ کا واقعہ کیا ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ سب اللہ کے فضل و کرم سے ہوا، میں تمہیں کیا

بتاؤں) میں ایک بہت چالاک اور جتھے والا انسان تھا۔ ایک دن میں کہیں جا رہا تھا کہ مجھے ایک کاغذ راستے میں پڑا ملا۔ اسے میں نے اٹھایا تو اس میں بسم اللہ لکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے صاف کر کے جیب میں ڈال لیا۔ میرے پاس ایک درہم کے سوا اور پیسے بھی نہیں تھے۔ میں نے ایک مہنگی خوشبو لے کر اُس کو اس کاغذ میں مسل دیا۔ رات کو جب میں سویا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے: اے بشر بن حارث! تو نے ہمارا نام راستے سے اٹھا کر اسے خوشبو میں بسایا ہے، ہم بھی تیرا نام دنیا و آخرت میں مہکا دیں گے۔" پھر ایسا ہی ہوا۔

مروی ہے کہ ایک مرتبہ بشر اپنے غفلت کے زمانے میں گھر میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے شراب کے مشغلے میں مصروف تھے کہ وہاں سے ایک نیک شخص گزرا۔ اس نے دروازہ بجایا۔ باندی باہر نکلی تو اس نے پوچھا کہ اس گھر کا مالک آزاد ہے یا غلام۔ اس نے کہا کہ آزاد انسان ہے۔ صالح شخص نے کہا: ہاں! تو سچ کہتی ہے، کیوں کہ اگر یہ غلام ہوتا تو اللہ کی عبودیت اختیار کرتا اور لہو و طرب کو چھوڑ دیتا۔ بشر نے ان کی یہ باتیں سن لیں اور ننگے سر ننگے پیر دروازے پر دوڑتے ہوئے آئے تو وہ شخص جا چکا تھا۔ انہوں نے باندی کو کہا: "ترا ستیاناس! یہ کون شخص تھا جو دروازے پر تجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ساری بات انہیں بتادی۔ بشر نے پوچھا: وہ کس طرف گیا ہے؟ اس نے سمت بتائی تو بشر اس کے پیچھے دوڑے اور اسے جا لیا اور کہا کہ میرے آقا! کیا آپ ہی میرے دروازے پر میری باندی سے بات کر رہے تھے۔ یہ سن کر بشر مٹی میں اپنے گال رگڑنے لگے اور کہتے جاتے: نہیں! تو غلام ہے، غلام ہے، پھر یہ ننگے سر اور ننگے پیر گھومتے رہتے حتیٰ کہ اسی سے معروف ہو گئے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ پاؤں میں چپل کیوں نہیں پہنتے۔ انہوں نے جواب دیا: میرا آقا مجھے صلاح نہیں عطا کرے گا، مگر صرف جب ننگے پیر ہوں گا، میں اب مرتے دم تک ننگے پیر ہی رہوں گا۔

(سچی توبہ کرنے والے ترجمہ کتاب التوابین: ۱۹۶ تا ۲۰۲)

دس لڑکوں اور دس نوجوانوں کی توبہ

ابو علی الروذباری کی بہن فاطمہ بنت احمد کہتی ہیں کہ:

بغداد میں دس نو عمر لڑکے تھے۔ ان کے ساتھ دس نوجوان تھے۔ انہوں نے ایک لڑکے کو کسی کام سے بھیجا۔ اس نے دیر کر دی تو یہ سب اس پر غصہ ہونے لگے۔ اتنے میں وہ ہنستا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ

میں ایک خربوزہ تھا، تو یہ لڑکے اسے کہنے لگے کہ ایک تو دیر کر دی اور ہنستا ہوا آرہا ہے۔ اس نے کہا کہ میں ایک عجیب چیز لے کر آیا ہوں، خربوزہ پر بشر بن حارث نے ہاتھ رکھا تھا اور میں نے اسے بیس درہم میں خرید لیا ہے۔ یہ سن کر ان لڑکوں میں ہر ایک نے باری باری اسے چومنا اور آنکھوں سے لگانا شروع کر دیا، تو اس نے کہا کہ اتنا بلند مرتبہ بشر کو کیسے حاصل ہو گیا؟ کہا کہ پرہیز گاری کی وجہ سے۔ تو اس نے کہا کہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ اللہ سے توبہ کر چکا ہے، تو لڑکوں نے کہا کہ آج سے ہم سب اس کے جیسے بن کر دکھائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ پھر وہ لڑکے تقویٰ کے راستے پر گامزن ہو گئے اور طرطوس چلے گئے جہاں یہ سب جہاد میں شہید ہو گئے۔ (سچی توبہ کرنے والے ترجمہ کتاب التوابین:۲۰۲)

ایک عورت کے پیچھے لگنے والے شخص کی توبہ

ابو الفتح بن مخرق کہتے ہیں کہ:

ایک آدمی ایک شامی عورت کے پیچھے لگ گیا اور چاقو لے کر اس کے سامنے آگیا۔ جو کوئی بھی اسے بچانے آتا وہ اسے زخمی کر دیتا۔ یہ آدمی بڑا طاقتور تھا۔ اسی دوران عورت چیختی رہی۔ اتنے میں بشر بن حارث وہاں سے گزرے اور اس آدمی کے قریب ہو کر اسے کندھا مارتے ہوئے آگے نکل گئے۔ وہ آدمی زمین پر گر گیا اور پسینے پسینے ہو گیا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور عورت اپنے راستے چل دی۔ لوگوں نے آدمی سے پوچھا: کیا ہوا؟ اس نے کہا: پتا نہیں، لیکن اس بڑے میاں نے مجھے کندھا مارتے ہوئے کہا کہ اللہ تجھے اور تیرے عمل کو دیکھ رہا ہے، تو میں اس کی بات سن کر کمزور پڑ گیا اور مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی، اور پتا نہیں یہ آدمی کون تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ بشر بن حارث تھے۔ اس نے کہا کہ ہائے میری بدقسمتی! وہ آج کے بعد میری طرف کیسے نظر کرے گا۔ پھر اس شخص کو بخار چڑھ گیا اور ساتویں دن اس کا انتقال ہو گیا۔

(سچی توبہ کرنے والے ترجمہ کتاب التوابین:۲۰۳)

☆......☆......☆

تقویٰ کا بیان

تقویٰ کے معنی

تقویٰ کا اصل "وقایہ" ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی حفاظت کرنا، نگہداشت کرنا، نگہبانی کرنا اور محفوظ کرنا۔ تقویٰ کے معنی ہیں نفس کو ایسی چیز سے بچانا اور محفوظ کرنا جس سے ضرر کا اندیشہ ہو۔ شریعت کی اصطلاح میں ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچانا اور محفوظ رکھنا جو انجام اور آخرت کے لحاظ سے " مضر اور نقصان دہ ہوں" تقویٰ کہلاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، گناہ سے، اس کے برے نتائج سے اور اللہ تعالیٰ کے غضب وناراضگی سے بچتے رہنا، یایوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف وعظمت کی وجہ سے ہر گناہ سے بچنے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پوری فرمانبرداری کرنے کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔

تقویٰ کے اجزا

مذکورہ بالا تعریف میں غور کریں تو تقویٰ کے چار اجزا بنتے ہیں، یعنی تقویٰ چار چیزوں سے وجود میں آتا ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی عظمت کا احساس۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن (اچھا گمان) رکھنا۔

۳۔ اخلاص۔

۴۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنا اور ان کی نافرمانی سے بچتے رہنا۔

تقویٰ کی اس تعریف سے معلوم ہوا کہ تقویٰ درست ایمان کا پھل اور نتیجہ ہوتا ہے۔ انسان کا ایمان ویقین جس قدر مضبوط اور راسخ ہو گا اس قدر وہ متقی، باکردار اور نیک سیرت ہو گا۔ جس شخص کے ایمان سے تقویٰ کے برگ وبار پیدا نہ ہوں اس کا ایمان یا تو نہایت کمزور اور بودا ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے۔

خوف ورجا کی تعریف وتحصیل

خوف یعنی ڈرنا، دل کی حالتوں میں سے ایک حالت ہے۔ یہ انسان میں کسی چیز کے متعلق اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس چیز کے متعلق اسے علم ومعرفت (پہچان) حاصل ہو جاتی ہے، مثلاً: بچہ کو یہ علم نہیں ہوتا کہ انگارہ کیا چیز ہے اور اس کی خاصیت کیا ہے؟ تو وہ اس کے رنگ کو دیکھ کر اُٹھالیتا ہے، لیکن جس بچے کو یہ علم اور پہچان ہو جائے کہ انگارہ جلاتا ہے تو وہ اس سے ڈرے گا، یا مثلاً: جو بچہ سانپ، بچھو کے ضرر سے ناواقف ہے تو وہ سانپ کو دیکھ کر اس کو پکڑنے کی کوشش کرے گا اور جو اس سے واقف ہے وہ اس سے ڈرے گا۔ اسی طرح جس انسان کو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کے متعلق جس قدر علم ومعرفت حاصل ہو گا وہ اس قدر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے گا۔

لیکن یہ خوف، سانپ بچھو کے خوف کی طرح نہیں جو اپنے اندر سانپ، بچھو کی نفرت لیے ہوئے ہے، بلکہ یہ ایسا خوف ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ جلال، قہاریت، جبّاریت، صفتِ عدل اور صفاتِ کمال اور اس کے ساتھ شدید محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ایک مؤمن جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ اور اس کی نافرمانی سے ڈرتا ہے تو دوسری طرف وہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جمال، رحمانیت، رحیمیت اور کریمیت کو دیکھ کر پُر اُمید ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت ہی نیک گمان رکھتا ہے، اسی اُمید کو "رجا" یعنی اچھی اُمید کہتے ہیں۔

نااُمیدی، کفر اور صلاحیتوں کی تباہی کا ذریعہ ہے

اُمید انسان میں عمل کی خواہش اور طلب پیدا کرتی ہے۔ یہ کاہل کو چُست اور چُست کو اور زیادہ سرگرم عمل بنادیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں نااُمیدی ہے جو حرکت وعمل کے تمام اسباب ودواعی کو یکسر ختم کردیتی ہے۔ نااُمیدی کا عنصر سب سے زیادہ کفار ومشرکین میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں میں جن کا ایمان بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی نظر مادی وسائل واسباب پر ہی ہوتی ہے اور جب مادی اسباب ووسائل سے اپنے آپ کو عاجز پاتے ہیں تو نااُمید ہو جاتے ہیں۔

پکے مومن کی رجا واُمید کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ کفار، مشرکین اور باطل کے خلاف لڑتا ہے۔ ظاہری اسباب کم یا نہ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے فتح وکامرانی کی اُمید باندھے رکھتا ہے۔ اگر اس پر تنگی

اور مشکل کے اوقات آجاتے ہیں تو بھی اللہ تعالیٰ سے لو لگا کر مطمئن رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تنگی وپریشانی کے ان اوقات کو ختم کردے گا۔ اگر کبھی اس سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ سے گناہ کی معافی مانگ لیتا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ غرض اسباب ووسائل کو استعمال میں لاکر بھی مومن بندہ کی نظر اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے، اس لیے وہ اسباب ووسائل سے محروم ہو کر بھی اللہ تعالیٰ سے مایوس نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس کافر یا کمزور ایمان والا جب اسباب ووسائل کو اپنے اردگرد نہیں پاتا تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کا عمل وحرکت رک جاتا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سے نااُمیدی انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو تباہ کرڈالتی ہے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو زندگی اور قوت بخشتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے اس کی عظیم اور لامحدود قدرت اور اس کی بے انتہا رحمت کے باوجود مایوس اور نااُمید ہو، وہ مومن کیسے ہو سکتا ہے؟ اس لیے قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ: إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ "اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی مایوس اور نااُمید ہوتے ہیں"۔ (سورۂ یوسف: آیت ۸۷)

یہ بھی یاد رکھیں! کہ مسلمان کا "خوف" بھی رجا کی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے اندر لیے ہوئے ہوتا ہے، بلکہ اس کے خوف کا منشا و محرک بھی محبوبِ حقیقی کی ناراضگی کا احساس ہوتا ہے۔

اُمید ضرر رساں اشیاء سے بچنے کا سبب

جس طرح کسی چیز سے ضرر کا خوف انسان کو اس چیز کے ضرر سے بچانے کا سبب ہوتا ہے، اسی طرح اُمید بھی عمل پر اُبھارنے کے ساتھ ساتھ ضرر سے بچائے رکھنے کا سبب ہوتی ہے۔ اگر اُمید کی چنگاری نہ ہو تو انسان اپنے آپ کو ضرر رساں چیزوں سے نہیں بچاسکتا، مثلاً: آدمی کڑوی دوا کے پینے اور سخت سے سخت پرہیز کرنے کو اس اُمید پر اختیار کرلیتا ہے کہ اس دوا اور پرہیز سے میں صحت مند ہو جاؤں گا یا کم از کم صحت مزید خراب ہو جانے سے بچ جائے گی۔ آپ نے غور کیا ہو گا کہ جب کوئی شخص اپنی صحت سے نااُمید ہو جاتا ہے تو وہ علاج اور پرہیز کو چھوڑ دیتا ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ آدمی اس وقت تک کسی چیز سے ڈرتا اور بچتا رہتا ہے جب تک اس کو یہ اُمید ہو کہ اس طرح میں موت یا ضرر سے بچ

جاؤں گا اور جب اس کی یہ اُمید جاتی رہتی ہے تو پھر وہ اپنی حفاظت چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص گناہ کرلیتا ہے اور اس کو یہ اُمید نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کردے گا اور دوزخ کے عذاب سے بچالے گا تو ایسا شخص توبہ اور اپنی اصلاح کی راہ کو اختیار نہیں کرے گا، بلکہ وہ یہی سمجھے گا کہ جب جہنم ہی ٹھکانا ہے اور اس سے خلاصی کی کوئی اُمید ہی نہیں تو پھر توبہ اور اصلاح کے کیا معنی ہیں؟

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے ضرر سے بچنے کے لیے جس طرح خوف کی ضرورت ہے اسی طرح اُمید کی بھی ہے۔ آخرت میں نجات وفلاح کے لیے بھی انہی دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ ان میں سے اگر کوئی ایک نہ رہے تو نہ تقویٰ وجود میں آسکتا ہے نہ نجات وفلاح۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ گناہوں، گناہوں کے برے نتائج اور جہنم سے ڈرے اور توبہ واصلاح کی راہ کو اختیار کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھے کہ وہ اس کو معاف فرمائے گا، توبہ واصلاح کی صورت میں اس کو اپنا مقرب اور دوست بنائے گا اور جنت الفردوس میں داخل فرمائے گا۔

خوف ورجا کے بعد تصحیح نیت ہے

خوف ورجا کے بعد عمل کے لیے اخلاص کا نمبر آتا ہے۔ اسی خشیت، خوفِ الٰہی اور رجا (اُمید) سے اخلاص وجود میں آتا ہے، کیوں کہ جب آدمی کسی چیز کے ضرر سے ڈرتا ہے اور خیر کی اُمید رکھتا ہے تو اس ضرر سے دل کی گہرائیوں سے بچتا ہے اور اس خیر کو خلوصِ دل کے ساتھ اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے برعکس جس چیز سے ضرر کا اندیشہ یا خیر کی توقع نہ ہو اس سے بچنے یا اسے اختیار کرنے میں قطعاً خلوص نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ بچنا یا اختیار کرنا صرف ظاہر داری اور نمائش ہوگی۔

اطاعت کے ساتھ پرہیزگاری

خوف ورجا اور اخلاص کے بعد عمل اور پرہیز کا نمبر آتا ہے۔ یہ عمل وپرہیز، خوف ورجا کا ثمرہ ہوتا ہے۔ عمل سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس کی پسندیدہ چیزوں کو اپنانا اور اُن پر عمل کرنا ہے اور پرہیز سے مراد ان باتوں اور کاموں سے اپنے آپ کو بچانا ہے جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تقویٰ چار چیزوں سے مرکب ہے یعنی خوف، رجا، اخلاص اور پرہیز، ان میں سے اگر کوئی ایک بھی نہ رہے تو حقیقی تقویٰ، جو مطلوب ہے، وہ وجود میں نہیں آسکتا۔

بعض علمائے کرام نے تقویٰ کے دو اجزا قرار دیئے ہیں، ایک خوفِ الٰہی اور دوسرا اس کے مطابق عمل و پرہیز۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے، کیوں کہ عمل و پرہیز، خوف ورجا کے بغیر نہیں ہوتا اور نہ اخلاص، خوف واُمید کے بغیر پیدا ہو سکتا ہے۔ غرض تقویٰ کے اجزا سمٹ کر دو بھی ہو جاتے ہیں اور پھیل کر چار بھی، نیز بعض مقامات پر "تقویٰ" کے معنی خوف اور ڈر سے کیے جاتے ہیں، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ خوف کا نتیجہ اور پھل پرہیز کرنا اور بچنا ہے۔

تقویٰ کا خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈر کر گناہوں سے بچتا رہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سے پرہیز کرے، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پوری اطاعت اور فرمانبرداری کرے اور اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کرے اور ان تمام کاموں اور باتوں سے بچتا رہے جو اس کے خالق و مالک اللہ رب العالمین کے تعلق اور اس کے رابطے میں خلل ڈالیں۔ بس تیرا رب تجھے وہاں نہ دیکھے جہاں جانے سے اس نے منع کیا ہے اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جہاں حاضر ہونے کا اس نے حکم دیا ہے۔

تقویٰ قرآن وسنت کی روشنی میں

تقویٰ کی اسی حقیقت کو قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں، مثلاً: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۞ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۞ "اور جو شخص اپنے پروردگار کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اپنے نفس کو بری خواہش سے روکتا رہا (یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتا رہا) تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہو گا۔"

(النازعات: آیت ۴۱-۴۰)

اور کہیں اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو یوں بیان فرماتا ہے کہ: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۞ "اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اس کی نافرمانی سے بچتا رہتا ہے بس یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔" (سورۂ نور: آیت ۵۲)

"تقویٰ" کی روح اگرچہ خوف اور خشیتِ الٰہی ہے، لیکن یہاں دو الفاظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں جن میں سے "حالتِ دل" کی تعبیر کے لیے لفظ "خشیّت" کو استعمال کیا گیا ہے اور حدودِ الٰہی کی پاسداری اور نافرمانی سے بچنے کے لیے لفظ "تقویٰ" کو استعمال کیا گیا۔ صرف مذکورہ بالا دو آیتوں میں غور کریں، ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے خوف پر ہوائے نفس اور بری خواہشات کی روک تھام کو مرتب کیا (یعنی نفس کو بری خواہش اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانا؛ یہی تقویٰ ہے) اور دوسری آیت میں خشیتِ الٰہی اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے پر يَتَّقْهِ یعنی تقویٰ اختیار کرنے (یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے) کو مرتب کیا۔

نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ "خبردار! میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تم سے زیادہ متقی اور پرہیز گار ہوں (اللہ تعالیٰ کا زیادہ فرمان بردار اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں زیادہ محتاط ہوں)۔" (بخاری ومسلم)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اَمَا سَلَكْتَ طَرِيْقًا ذَا شَوْكٍ "تم کبھی ایسے راستے پر چلے ہو جس میں کانٹے ہوں۔ فرمایا: "ہاں"۔ کہا: فَمَا عَمِلْتَ اس حالت میں تم نے کیا کیا؟ فرمایا: شَمَّرْتُ وَجَهَدْتُ میں نے اپنے آپ کو سمیٹا اور کوشش کی (کہ کانٹوں سے بچ کر نکل جاؤں)۔ کہا: فَذٰلِكَ التقوىٰ یہی تقویٰ کی حقیقت ہے۔ یعنی جب کوئی کانٹوں سے ڈرتا ہے تو وہ ان سے کپڑے سمیٹ کر بچنے کی کوشش کرتا ہے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے، تاکہ کوئی کانٹا چُبھ نہ جائے۔ اسی طرح قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں غور و فکر کرنے کے بعد یہی حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ تقویٰ کا معجون خوف، رجا، عمل اور پرہیز سے بنتا ہے۔

نجات کے لیے مجرد دعوائے ایمان کافی نہیں

مذکورہ بالا دونوں آیتوں سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہوگئی کہ نجات وفلاح کے لیے صرف دعوائے ایمان کافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ دوسری چیز یہ کہ صرف ظاہری اطاعت بھی کافی نہیں، بلکہ اس اطاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خشیت، اللہ تعالیٰ کی

حدود کی پاسداری اور پرہیز بھی ضروری ہے۔ بس مکمل فلاح اور نجات پانے والے لوگ وہی ہیں جو ہر حالت میں اپنے تمام ذاتی اغراض و مفادات سے بالاتر ہو کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں، ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو اور وہ اپنی روزمرہ زندگی میں اللہ تعالیٰ کی حدود کی پوری پوری پاسداری کریں۔

تقویٰ کا مرکز دل ہی ہے

خوف، خشیتِ الٰہی، تقویٰ اور پرہیز گاری دل کی صفت ہے اور ان کا اصل تعلق دل سے ہے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ تقویٰ کا مرکز دل ہی ہے۔ اس کے متعلق بطورِ نمونہ قرآن و حدیث سے کچھ پڑھ لیجیے:

۱۔ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۞ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۞

”خاص اللہ تعالیٰ کے ہو کر رہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر اسے پرندے اُچک لیتے ہیں یا ہوا اُسے اُڑا کر کسی اور دور جگہ پھینک دیتی ہے۔ بات یہی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نامزد چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔“ (سورۃ الحج: آیت ۳۲-۳۱)

۲۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ

”اللہ تعالیٰ کو ان (قربانیوں) کے گوشت نہیں پہنچتے اور نہ ان کا خون پہنچتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو تمہارا تقویٰ (یعنی تقویٰ کا عظیم رکن جو اخلاص و للٰہیت ہے وہی) پہنچتا ہے۔“

(سورۃ الحج: آیت ۳۷)

یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر و قیمت اس عمل کی ہے جس سے مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اخلاص و محبت کے ساتھ ہو، ورنہ اخلاص و للٰہیت کے بغیر عظیم سے عظیم عبادت بھی بے روح ڈھانچہ بن جاتی ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دلی اخلاص و تقویٰ ہی شرفِ قبولیت حاصل کرتا ہے تو جس کے دل میں جتنا

اخلاص زیادہ ہو گا اس کا عمل اتنا ہی قیمتی اور مقبول ہو گا۔ اس سے یہ بھی خوب معلوم ہوا کہ تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہے۔

شعائر اللہ کی تعظیم توحید میں داخل ہے

مذکورہ بالا آیتوں میں سے پہلی آیت میں توحید کی بلندی، شرک کی پستی اور مذمت بیان کرکے اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی بتلائی کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لگی ہوئی چیزوں کی محبت و تعظیم شرک میں داخل نہیں اور نہ یہ توحید کے منافی کوئی چیز ہے، بلکہ مطلوبہ توحید میں داخل، اور عین توحید کا نتیجہ، اثر اور علامت ہے۔

"شعائر اللہ" سے مراد وہ مقدس چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و معبودیت کے لیے علامات اور نشانیاں قرار دی گئی ہیں اور بالخصوص جو حق تعالیٰ شانہ کی طرف منسوب ہیں، جیسے: قرآن مجید اور کتبِ سماویہ، بیت اللہ، صفا، مروہ، مساجد، قربانی کے جانور وغیرہ، نیز انبیاء علیہم السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اولیاء اللہ وغیرہ۔ اسی طرح تمام حدود و فرائض اور احکامِ دینیہ، غرض اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام سے لگی ہوئی تمام چیزوں کا ادب واحترام حسبِ مراتب ضروری ہے اور ان کی بے حرمتی حرام اور ممنوع ہے۔ ان اشیا کا ادب واحترام اور ان سے محبت شرک نہیں، بلکہ عین توحید کے آثار اور علامات ہیں۔ ان چیزوں سے محبت اور ان کی حسبِ مراتب قدردانی واحترام از خود توحید کے مفہوم میں داخل ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے وابستہ اشیا سے محبت اور ان کا احترام خود اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کی قدردانی کی علامت ہے۔

جو کوئی اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہو اور اس کے دل میں اللہ جل شانہ کی عظمت ہو تو وہ اس کے نام سے لگی ہوئی چیزوں کی ضرور قدر کرے گا اور ان سے محبت رکھے گا، کیوں کہ یہ مسلّمہ قاعدہ ہے کہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے اور محبوب سے وابستہ اور منسوب اشیا بھی محبوب ہوتی ہیں۔ یہ احترام و تعظیم دل کے تقویٰ اور سچی توحید کا نتیجہ ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی تعظیم موجود ہے جبھی تو وہ اس کے نام لگی ہوئی چیزوں کا احترام وادب کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر شعائر اللہ کی ہتک کرے تو یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے خالی ہے۔

خلاصہ یہ کہ شعائر اللہ کی تعظیم و تکریم کے بغیر توحید کو توحید نہیں کہا جا سکتا، بلکہ وہ تفریق اور نفاق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ ہو اور اس کی پسندیدہ چیزوں اور اس کے نام لگی ہوئی چیزوں سے محبت نہ ہو تو یہ دعویٰ باطل اور منافقانہ ہے۔ شعائر اللہ کی تعظیم و تکریم ہی عین توحید کے آثار و علامات اور توحید کے مفہوم میں داخل ہے، البتہ تعظیم اور عبادت میں فرق کرنا ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تعظیم و تکریم کے پردے میں کسی مخلوق کی عبادت اور پرستش کی جائے، کسی غیر اللہ کو سجدہ اور رکوع کیا جائے، غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز مانی جائے یا کسی چیز کی تعظیم و تکریم میں اللہ تعالیٰ کے مقررہ حدود سے تجاوز کیا جائے۔ ایسی صورتوں میں تعظیم اور تکریم اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں ہوگی، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور توحید کا منافی رویہ اور عمل ہوگا جو دین اسلام کی رو سے حرام ہے۔

(توحید، محبت اور تعظیم کی پوری تفصیل "توحید و شرک" میں دیکھیں۔)

۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ

امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝

"بلاشبہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے حضور میں پست آواز سے (یعنی دبی اور دھیمی آواز سے) بولتے ہیں یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو "تقویٰ" کے لیے جانچ لیا ہے اور ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے۔" (سورۂ حجرات: آیت ۳)

۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُهٗ وَلَا یَخْذُلُهٗ وَلَا یَحْقِرُهٗ

اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا وَیُشِیْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلٰثَ مِرَّاتٍ

"ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا (دینی) بھائی ہے (لہٰذا کوئی) مسلمان مسلمان پر ظلم نہ کرے اور اس کی مدد و اعانت ترک نہ کرے اور اس کو ذلیل اور حقیر نہ سمجھے، پھر آپ ﷺ نے اپنے سینے (مبارک) کی طرف تین بار اشارہ کرکے فرمایا کہ التقویٰ ھٰھُنَا تقویٰ یہاں ہے۔ (یعنی سینے اور دل کے اندر ہوتا ہے)۔" (بحوالہ مسلم: باب الشفقۃ والرحمۃ)

قرآن مجید کی مذکورہ بالا چند آیتوں اور حدیث شریف سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تقویٰ کا مرکز انسان کا دل ہی ہے اور اس کا اصل تعلق انسان کے دل ہی سے ہے۔ پھر دل کا یہ خوف و خشیت اور محبتِ الٰہی، تقویٰ ہی ہوتا ہے جس کا اثر انسان کے تمام افعال اور اعمال میں دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے جس طرح تقویٰ کا لفظ دلی کیفیت اور صفت پر بولا جاتا ہے اسی طرح اسی صفت کے اثر اور نتیجہ پر بھی یہی "تقویٰ" کا لفظ بولا جاتا ہے اور تقویٰ کا تعلق ظاہر اور باطن دونوں سے ہے۔

تقویٰ کا جوہر یا عشقِ الٰہی

بس تقویٰ باطل سے بچاؤ، عشقِ حق اور عشقِ الٰہی کا وہ جوہر ہے جو انسان کے اندر فطری طور پر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ وہی تخم ہے جو اچھے جذبات والے درست اعمال سے ترقی بھی کرتا ہے اور اس سے اچھے جذبات اور اچھے اخلاق اور اچھی سیرت بھی بنتی ہے۔ اعمال، مثلاً: روزہ، نماز وغیرہ میں سے تقویٰ کے عطر کو نچوڑا جاتا ہے اور اس سے تقویٰ کی قوت بنتی ہے۔ جس قدر تقویٰ کی قوت زیادہ ہوتی ہے اُسی قدر انسان حسنِ اخلاق، بلند کردار اور روحانی ترقیوں کی راہ پر برابر بڑھتا ہے، اور اسی کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی ابدی نعمتوں کی طرف کھنچتا اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اس کے برعکس جو شخص حق کے متلاشی جوہر کو نفسانی خواہشات، خود غرضی، ریا، بخل، حسد، ضد اور عناد جیسی بداخلاقیوں میں دبائے رکھے تو ایسے شخص کے برے اعمال تو کیا، اس کے بظاہر اچھے اعمال میں بھی فساد آجاتا ہے۔ اس کی نماز اور روزہ وغیرہ کو جب نچوڑا جاتا ہے تو ان سے وہی دنیا، خواہشِ نفس اور فجور کے تخم کا پانی نکلتا ہے جو تقویٰ کے جوہر کے بجائے خواہشِ نفس اور فجور کے تخم کو ترقی دیتا ہے۔ اس طرح انسان کا جوہرِ تقویٰ دب کر برباد ہو جاتا ہے اور وہ ابدی تباہیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۞ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۞ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۞ "پھر ڈال دی اس کے دل میں اس کی بدی اور اس کا تقویٰ۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے اپنے نفس کو (پاک کر کے حسنِ اخلاق سے) آراستہ کیا۔ اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو (برائیوں اور بداخلاقیوں کے ساتھ) آلودہ کیا۔" (سورۃ الشمس: آیت ۸-۱۰)

درجاتِ تقویٰ بقدرِ معرفت

پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال وصفاتِ کمال کے علم ومعرفت سے خوف، رجا اور اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ جس شخص کو جس قدر اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم اور معرفت حاصل ہو گی، اُسی قدر وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے خائف ہو گا اور اُسی قدر وہ "متقی" ہو گا (یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے اور پرہیز کرنے کی کوشش بھی کرے گا) اور اسی قدر اُس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن اور محبت بھی ہو گی۔ علم ومعرفت کے بقدر مفید ثمرات بر آمد ہوں گے۔ علم، یقین اور معرفت کی بقدر بندوں میں ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کے خوف کی اقسام اور تقویٰ کی حرکات کی نوعیت اور اقسام بھی مختلف ہوں گی۔

درجاتِ خوف کی قسموں کی مثال

بعض لوگوں کا خوف جہنم سے ہوتا ہے، بعض کا جنت کے چھوٹنے سے اور بعض کا کسی اور وجہ سے۔ اس بات کو عوام کے ذہنوں کے قریب کرنے کے لیے ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے اس مسئلے کے سمجھنے میں قدرِ آسانی پیدا ہو جائے گی، مثلاً: ملک کا خلیفہ اور امیر ایسا ہے جو نہایت عدل وانصاف والا ہے، اس کی گرفت بھی اتنی مضبوط ہے کہ کوئی مجرم جرم کر کے نہ بھاگ سکتا ہے اور نہ اس کو کوئی اس کی سزا سے بچا سکتا ہے۔ نیز وہ اپنی رعایا پر بہت ہی مہربان ہے اور اپنی رعایا پر اپنے خداداد خزانوں کو نچھاور کرنے والا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے سونے، چاندی اور گندم کے بڑے بڑے خزانے اور گودام دیے ہیں، وہ محبت وشفقت والا بھی ہے اور جو اس کا دوست بننا چاہے وہ اس کو اپنا دوست بھی بنا لیتا ہے۔ اب اس بادشاہ کے یہ خداداد کمالات حکومت کے جس باشندے پر جس قدر کھلیں گے اسی قدر وہ اس سے خائف بھی ہو گا اور اس کی نافرمانی سے بھی بچے گا۔

مثلاً: بعض لوگ ایسے ہوں گے جو جرائم سے صرف اس لیے ڈرتے رہیں گے اور بچتے رہیں گے کہ بادشاہ کی مقررہ کردہ سزاؤں سے بچ جائیں اور بادشاہ کے انعامات کو بھی حاصل کریں۔ جو لوگ اس کی صفات سے اور زیادہ واقف ہوں اور ان کو اس کا تجربہ ہو چکا ہو تو ان کو بادشاہ یا اس کے خلیفہ سے بغاوت کا

تو تصور بھی نہ ہو گا، بلکہ وہ تو خلیفہ کے احکام کی بجا آوری میں کوتاہی سے بھی ڈرتے رہیں گے اور وہ اس کے جاری کردہ احکام پر خوب پختگی سے اور بیداری کے ساتھ کاربند ہوں گے۔ جن کو اس دوسری قسم سے بھی زیادہ تجربہ، علم اور اس خلیفہ کی پہچان ہو گی تو وہ اس خلیفہ کے منشا کو سمجھنے کی کوشش کریں گے، تاکہ وہ اس کے قُرب اور دوستی کو حاصل کر کے اس کے دوست اور مقرب بن جائیں، وہ ان کا محبوب اور یہ اس کے محبوب ہو جائیں۔ اس قسم کے لوگ اس سے بھی ڈرتے اور بچتے رہیں گے کہ کوئی بات ایسی نہ ہو جائے جس کی وجہ سے بادشاہ کے ساتھ تعلق اور قُرب میں نقصان آئے۔ نیز وہ ہر اس رکاوٹ سے بھی ڈرتے اور بچتے رہیں گے جو تعلق اور قُرب کی ترقی میں حائل ہوتی ہے۔

یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی، اس کی رحمت، مہربانی، حسن وجمال اور عدل وغیرہ ہر ایک صفتِ کمال لامحدود ہے۔ پھر خالق اور مخلوق، عبد اور معبود کے درمیان جو نسبت، علاقہ اور محبت وعظمت کا تعلق ہے اس کے لیے یہ مثال بہت پھیکی سی لگتی ہے، تاہم اس سے خوف اور تقویٰ کے موٹے موٹے درجات سمجھ میں آسکتے ہیں۔

محرکاتِ تقویٰ واقسامِ خوف

جو لوگ جرائم اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے تقویٰ اختیار کر کے بچتے رہتے ہیں تو اس کا محرک چونکہ خوف اور ڈر ہی ہوتا ہے، اس لیے یہاں خوف کی وجوہات اور اقسام (جو تقویٰ کے محرکات ہیں،) کو ذکر کرتے ہیں، ان کو پڑھ لیجیے:

(۱) دنیا کی وجہ سے ڈرنا اور بچنا

دنیا کی مصیبتوں اور تکالیف سے ڈر کر گناہوں اور جرائم سے بچنا، یا دنیا کے حصول کے لیے غلطیوں سے ڈرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو اپنی شہرت کے بہت بھوکے ہوتے ہیں یا دنیا کی تکالیف سے سخت گھبراتے ہیں۔ جو لوگ تکالیف سے ڈرتے ہیں وہ تو جرائم کا ارتکاب اس لیے نہیں کرتے کہ وہ حکومت یا قومی تنظیموں کی سزا یا جرمانوں سے بچ سکیں اور جو لوگ شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں یا مال و دولت کے سخت لالچی ہوتے ہیں وہ ظاہری غلطیوں سے اس لیے ڈرتے اور بچتے

ہیں کہ یہ غلطیاں ان کی شہرت یامال ودولت کمانے میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ وہ ایسے بھلائی والے کام کرتے ہیں جن سے ان کی شہرت زیادہ سے زیادہ ہو سکے یاان کو زیادہ سے زیادہ دنیاوی ترقی یامال ودولت حاصل ہو جائے، یااس لیے ٹھیک ٹھیک ملازمت کرتے ہیں کہ ان کی تنخواہ بڑھادی جائے وغیرہ وغیرہ۔

ایسے لوگ ظاہری گناہ اور جرائم سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں کے سامنے اچھے کام اور اچھے اعمال بھی کرتے ہیں، لیکن چونکہ ان کا یہ سارا تقویٰ، احتیاط اور پرہیز گاری دنیا کی خاطر ہوتی ہے اس لیے ایسے لوگ علیحدگی میں، جہاں ان کو کوئی انسان نہ دیکھتا ہو، حلال وحرام کی تمیز نہیں کریں گے اور اُس وقت وہ بھلائی اور نیکی کے کاموں میں سست ہوں گے۔ یہ لوگوں کی وہ قسم ہے جس کو ریاکار یا منافق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۲) لوگوں سے حیا کی بنا پر برے کاموں سے احتیاط کرنا

اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگوں میں صفت حیا کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ زیادہ دیندار نہیں ہوتے لیکن وہ بُرے کاموں سے صرف اس لیے بچتے اور احتیاط کرتے ہیں کہ لوگ دیکھیں گے اور ان کے سامنے بے عزتی ہو جائے گی اور شرمندہ ہو جائیں گے۔ تو وہ صرف شرمندگی کی وجہ سے بُرے اور غلط کاموں سے مجتنب رہتے ہیں۔

(۳) باطل سے بچ کر حق اختیار کرنا

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر برائی اور مضر چیز سے بچاؤ، بھلائی اور حق کی حمایت ومحبت اور جستجو انسان میں رکھ دی ہے۔ جن لوگوں نے اپنے ضمیر کو باطل سے خراب نہ کیا ہو وہ خداداد قوت کی بنا پر ہر برائی سے بچتے ہیں۔ قرآن مجید اور دینِ اسلام چونکہ سراسر حق ہے اس لیے جس کے اندر حق کی طلب وجستجو اور باطل کا ڈر ہو گا تو وہ باطل مذہب چھوڑ کر دینِ حق کو قبول کرے گا، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِینَ "یہ وہ کتاب ہے جس (کے کتابِ الٰہی ہونے) میں کوئی شک نہیں، یہ ہدایت ہے متقیوں کے لئے۔"

(سورۃ البقرہ: آیت ۲)

یعنی یہ ان لوگوں کو ہدایت پر چلاتی ہے جن کے اندر قبولیتِ حق کی استعداد باقی ہو اور وہ باطل سے، اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی ناراضگی سے بچنا چاہتے ہوں۔ یہ کتاب ہدایت ہے حق کے طالبوں کے لئے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ "یہ لوگوں کے سمجھانے کے لیے بیان ہے اور متقیوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔"

(سورۂ آل عمران: آیت ۱۳۸)

(۴) دنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرنا

بعض انسانوں پر یہ حقیقت پوری طرح کھل گئی ہوتی ہے اور وہ اس پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ انسانی افعال اور اعمال کے ساتھ ان کے نتائج اور ثمرات بندھے ہوئے ہوتے ہیں جیسا کہ مادی چیزوں کی خاصیتیں ہوتی ہیں، کوئی گرم ہے کوئی ٹھنڈی، کوئی ترش ہے کوئی میٹھی، کوئی قابض ہے کوئی مسہل وغیرہ۔ اسی طرح اعمال کے بھی خواص اور اثرات ہوتے ہیں جو انسان کی دنیاوی اور اُخروی زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تو ایسے حضرات پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں اور ہر اُس عمل سے ڈرتے اور بچتے رہتے ہیں جس کا انجام اور نتیجہ برُا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس میں وقتی طور پر تسکینِ خواہش یا کچھ فائدہ ہوتا ہے، لیکن وہ اس وقتی فائدہ اور وقتی خواہش پوری کرنے سے پرہیز کرتے ہیں تاکہ بڑی مصیبت اور عذاب سے بچ سکیں۔

(۵) ترقیِ آخرت میں رکاوٹ بننے والے ہر عمل سے بچنا

بعض لوگ باہمت ہوتے ہیں، ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان سے کوئی ایسا عمل صادر نہ ہو جائے جو اُن کے لیے آخرت کے لحاظ سے نقصان دہ ہو اور نہ کوئی ایسا عمل ترک کیا جائے جو آخرت میں ترقی کا باعث بنتا ہو۔ ایسے لوگ عذاب سے ڈرنے والے اور آخرت کے درجات کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر وہ کام کر گزرتے ہیں جس میں آخرت کی ترقی دیکھتے ہیں اور ہر اس کام کو چھوڑ دیتے ہیں جو آخرت کی دائمی زندگی کی خوشیوں میں خلل ڈالتا ہو۔

(۶) اللہ تعالیٰ کی ناشکری سے بچنا

بعض سمجھ دار لوگ جب اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے ظاہری و باطنی انعامات و احسانات دیکھتے ہیں تو وہ ان پر شکر ادا کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جسمانی، ظاہری، باطنی اور خارجی، تمام نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف استعمال کرنے سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں اور انعامات کی قدر دانی کر کے ان کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے مطابق (یعنی اللہ تعالیٰ کی پوری اطاعت اور فرمان برداری میں) استعمال کرتے ہیں، تاکہ یہ انعامات ان سے زائل نہ ہوں اور آخرت کی لازوال نعمتیں بھی میسر ہوں۔ یہ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ ان کی نظروں کے سامنے ہے اور وہ اسے دیکھ رہے ہیں یا وہ ان کو دیکھ رہا ہے۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر یہ حقیقت خوب واضح ہوگئی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ظاہر و باطن، اعمال اور خیالات کو ہر حال میں دیکھ رہا ہے اور یہ حالت ان پر ایسی چھائی رہتی ہے کہ وہ اس سے غافل نہیں ہوتے۔ ان حضرات کو اللہ تعالیٰ کی اس نظر اور دیکھنے سے حیا آتی ہے اور اس حیا کی وجہ سے وہ گناہوں سے ڈرتے اور بچتے ہیں۔

(۸) اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا خوف

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کی ہیبت ایسی چھائی رہتی ہے کہ نہ تو ان کو جنت کا خیال ہوتا ہے اور نہ دوزخ کا، صرف اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے اور احتیاط کرتے رہتے ہیں۔

(۹) محبوبِ حقیقی کی ناراضگی سے ڈرنا

بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی اور شدید محبت ہوا کرتی ہے اور یہ محبت ان کے دلوں پر ایسی چھائی رہتی ہے کہ ان کو اکثر اوقات گناہوں سے بچتے یا نیک اعمال کرتے وقت جنت اور دوزخ کا کوئی تصور بھی نہیں آتا، بلکہ وہ صرف محبوب کی ناراضگی کی وجہ سے اُس کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں اور ان کا نیک اعمال سے بھی محبوبِ حقیقی کی خوشنودی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اس کو "مقامِ محبت" کہتے ہیں۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ کے قُرب میں زیادہ سے زیادہ کوشش

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قُرب میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر اس رُکاوٹ سے ڈرتے ہیں جو ان کے خالق اور ان کے درمیان حائل ہو کر ان کے قُرب میں اضافے کو روکتی ہے، یا اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان تعلق اور قُرب کو سست بناتی ہے یا ان کو محبوبِ حقیقی سے دور کرتی ہے۔ وہ اس طرح کی ہر رکاوٹ سے ڈرتے رہتے ہیں اور اس سے بچنے اور اس کو ہٹانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

خوف کی یہ چند وجوہات یا اقسام تھیں جو سمیٹ کر بیان کی گئیں ہیں، ورنہ اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر ہر ایک قسم میں ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجات ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ کسی شخص کی پرہیز گاری میں خوف کی ایک سے زائد اقسام بھی جمع ہو جاتی ہیں۔

تقویٰ کے درجات

مذکورہ بالا تقویٰ کے محرکات کے بعد تقویٰ کے درجات کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن پھر بھی تقویٰ کے چند مشہور درجات لکھ دیئے جاتے ہیں تاکہ متّقیوں کی مختلف اقسام اور صورتیں سامنے آجائیں اور ہم زیادہ سے زیادہ متقی اور پرہیز گار بننے کی کوشش کریں۔ تقویٰ کے درجات سے پہلے تقویٰ کا خلاصہ سمجھ لیجیے:

تقویٰ کیا ہے؟

دین و ایمان کو ضرر پہنچانے والی چیزوں سے پرہیز کرنا یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق اور قُرب میں رکاوٹ ڈالنے والی چیزوں سے پرہیز کرنا تقویٰ ہے۔ جب تقویٰ کی آسان تعریف سامنے آچکی تو اب اس کی موٹی موٹی اقسام سمجھ لیجیے:

۱۔ تقویٰ کا ادنیٰ اور کمتر درجہ یہ ہے کہ کفر، شرک، بدعات، حرام چیزوں اور کبائر یعنی بڑے گناہوں سے پرہیز کیا جائے اور فرائض اور واجبات اور دین کے دوسرے ضروری امور ادا کیے جائیں۔

۲۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان اعمال اور کاموں سے بھی اجتناب کیا جائے جن کا مکروہ ہونا یقینی

طور پر ثابت ہو، نیز صغیرہ یعنی چھوٹے گناہوں سے بھی پرہیز کیا جائے اور مستحبات اور اسلامی آداب کا بھی خوب اہتمام کیا جائے۔

۳۔ تیسرا درجہ یہ کہ جن کاموں کے کرنے میں یا جن چیزوں کے کھانے، پینے یا استعمال کرنے میں حرام کا شبہ ہو، ان سے اجتناب کیا جائے، مثلاً: کسی چیز کے متعلق حلت و حرمت دونوں قسم کے دلائل موجود ہوں، ایک دلیل سے اس کی حرمت ثابت ہوتی ہو اور دوسری سے حلت، اور فقہائے اسلام نے اس کی ظاہری حالت دیکھ کر حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا ہو پھر بھی اس میں حرمت کی ایک دلیل کی موجودگی کی وجہ سے اس کو چھوڑ دیا جائے۔

اگر حرام ہونے کا قوی احتمال اور مضبوط دلیل موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں صرف وہم کی بنا پر کسی حلال چیز کے استعمال کو مشتبہ چیز نہیں سمجھا جائے گا۔ مشتبہ چیز وہ ہوتی ہے جس کی دلیل میں حرمت کی بو پائی جاتی ہو اور جو سلیم الفطرت انسان کے دل کو کھٹکے تو ایسی چیزوں کے چھوڑنے کے بعد انسان پر تقویٰ کے اعلیٰ درجات و مقامات کھلتے ہیں۔ چناں چہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ التقویٰ حَتَّى يَدَعَ مَا حَاكَ فِي الصَّدْرِ "بندہ تقویٰ کی حقیقت کو اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کو نہ چھوڑے جو اس کے دل میں کھٹکے۔" (بخاری: کتاب الایمان)

شاید حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو گی جیسا کہ ایک اور حدیث سے یہ ملعوم ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو باتیں پوچھیں ان میں ایک بات یہ تھی کہ گناہ کیا چیز ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: إِذَا حَاكَ فِي قَلْبِكَ شَيْءٌ فَدَعْهُ "جب کوئی چیز تیرے دل میں کھٹکے تو اس کو چھوڑ دو۔" (ابن حبان)

اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حلال ظاہر ہیں اور حرام بھی ظاہر ہیں اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، لہٰذا جس شخص نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین کو پاک و محفوظ کر لیا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہوا وہ حرام میں مبتلا ہو گیا، اور اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو

ممنوعہ چراگاہ کے کنارے اپنا ریوڑ چراتا ہے اور ہر وقت اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کے جانور اس ممنوعہ چراگاہ میں داخل ہو جائیں اور چرنے لگیں، خبر دار ہر بادشاہ کی ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چراگاہ حرام چیزیں ہیں"۔ (بخاری و مسلم)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال و حرام جن کے واضح اور بیّن احکامات موجود ہیں وہ تو سب کو معلوم ہیں، مثلاً: چوری، زنا، مردار جانور، غیبت وغیرہ حرام ہیں اور سبزیاں، گندم وغیرہ کھانا حلال ہے، لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے حرام اور حلال ہونے کے بارے میں دلائل متعارض ہوتے ہیں اور واضح حکم معلوم نہیں ہوتا، بلکہ یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ حرام ہیں یا حلال، مثلاً:

ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کا ارادہ کیا۔ ایک دوسری عورت نے آکر یہ بات کہہ دی کہ میں نے تو تم دونوں کو اپنا دودھ پلایا ہے۔ اس صورت میں یہ عورت مشتبہ ہو گئی کیوں کہ ایک طرف تو عورت کا بیان ہے کہ میں نے تم دونوں کو اپنا دودھ پلایا ہے، اس لیے یہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہوئے اور یہ تو ظاہر ہے کہ رضاعی بھائی بہن کا نکاح درست نہیں، لہٰذا اگر اس دلیل کو دیکھا جائے تو ان دونوں کے درمیان قطعاً نکاح جائز نہیں، مگر دوسری طرف چونکہ ایک عورت کا بیان ہے جس پر کوئی شرعی گواہی موجود نہیں ہے اس لیے اس عورت کی بات پر یقین نہیں کیا جاسکتا کہ یہ عورت صحیح کہہ رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عورت محض بدنیتی کی وجہ سے یہ بات کہہ رہی ہو اور ان دونوں کے درمیان افتراق کرانا چاہتی ہو، تو ایسی صورت میں کہا جائے گا کہ نکاح درست ہے، یا مثلاً:

کسی شخص کے پاس کچھ مال حلال کمائی سے آیا اور کچھ ناجائز طریقے سے اور یہ معلوم نہیں کہ کتنا مال حرام کمائی سے آیا ہے تو ایسی صورت میں سارا مال اس شخص کے حق میں مشتبہ ہو گیا، بہر حال جب دونوں طرف سے حلال و حرام کے قوی احتمالات اور دلائل آجائیں تو ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ حرام میں مبتلا ہونے کے اندیشہ سے اس چیز کو چھوڑ دیا جائے اگرچہ ظاہری شریعت کا فتویٰ یہی ہو کہ وہ جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت رابعہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے رابعہ! تم یہی تو پوچھنے آئے ہو کہ نیکی کیا ہے؟ اور گناہ کیا ہے؟

میں نے عرض کیا کہ "جی ہاں" تو (یہ سن کر) آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں جمع کیں اور ان کے ساتھ میرے سینے کو مار کر فرمایا: اِسْتَفْتِ نَفْسَكَ اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ يَا وَابِصَةُ "اپنے آپ سے دریافت کرو اور اپنے دل سے پوچھ لیا کرو۔"

یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین بار فرمائے اس کے بعد فرمایا کہ: اَلْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَاَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّ دَ فِي الصُّدُوْرِ وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ وَاَفْتَوْكَ "یعنی نیکی وہ ہے جس سے نفس مطمئن ہو جائے اور جس سے دل کو سکون واطمینان حاصل ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور جس سے سینے میں شک وتردد پیدا ہو جائے، اگرچہ لوگ تجھے (درست ہونے کا) فتویٰ دیں تو بھی اس چیز سے پرہیز کر)۔" (احمد دارمی مشکوٰۃ)

اس طرح کی احادیث میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اپنے دل سے دریافت کرنے کا یہ حکم اس صورت میں ہے جب کسی چیز کے بارے میں کوئی واضح شرعی فیصلہ سامنے نہ ہو اور اس میں علمائے امت کا اختلاف ہو۔ ایسی صورتِ حال میں اس قول کے مطابق عمل کرنا چاہیے جس کو اپنا دل صحیح اور راجح تسلیم کرے اور دل اس پر مطمئن ہو جائے۔ اسی طرح اگر کوئی مشتبہ چیز ہے تو اس کو بھی چھوڑ دے اگرچہ علما نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا ہو جیسا کہ اس کی دو مثالیں پہلے لکھ دی گئی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ضمیر کی صحیح رہنمائی کا جوہر اور حق وباطل کی یہ کسوٹی ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو نصیب فرماتے ہیں جو صالح اور متقی ہوں اور جن کے دل ہوائے نفس کی کدورت سے پاک اور خدا ترسی کے جوہر سے معمور ہوں۔ اس کا بیان ان شاء اللہ "تقویٰ کے فضائل" میں آئے گا۔

یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو قلبِ سلیم رکھتے ہیں اور جن کے دل صرف خیر وبھلائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور برائی سے بے زار رہتے ہیں۔ اس لیے برائی کی بدبو محسوس کر کے ان کے دل بے چین ہو جاتے ہیں اور خیر وبھلائی کی خوشبو سے ان کے دل مطمئن اور پر سکون ہو جاتے ہیں، ورنہ جن کو حلال وحرام کی کوئی پرواہ نہ ہو ان کو کیا کھٹکے گا۔

۴۔ ایسے مباح اور جائز کاموں سے بھی پرہیز کرنا جو حرام میں پڑجانے کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی مباح اور جائز چیزوں کے استعمال سے بچیں جن کے زیادہ استعمال سے حرام میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، مثلاً: زیادہ کھانا، پینا جو غفلت کا سبب بن جاتا ہے، یا جن مباحات کی وجہ سے کسی برتر مقصد کے حصول میں نقصان واقع ہو، مثلاً: جائز کھیل یا تجارت وغیرہ میں اس قدر مشغول ہو جانا کہ علم کے حصول یا دین اسلام کے لیے جدوجہد میں نقصان آجائے، یا ایسا کھیل کھیلنا جس میں نہ جسمانی فائدہ ہو، نہ جہاد کی تیاری سے تعلق رکھتا ہو۔ چناں چہ حضرت عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ اَنْ يَكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهٖ حَذَرًا لِمَا بِهٖ بَأْسٌ یعنی "بندہ اس وقت تک (کامل) پرہیز گاروں میں شمار نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ان چیزوں کو نہ چھوڑے جن میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں، تاکہ اس طرح وہ ان چیزوں سے بچ سکے جن میں قباحت ہے۔"

(ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس وقت تک صحیح معنوں میں کامل متقی اور پرہیز گار نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس اندیشہ سے مباح یا کسی مباح چیز کی کثرت استعمال کو بھی نہ چھوڑ دے کہ مبادا یہ مباح چیز کسی حرام، مکروہ یا مشتبہ چیز تک پہنچنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

۵۔ تقویٰ کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کے خیال سے بھی پرہیز کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مباح کاموں میں بھی اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی حضوری کو بھر دیں۔ جو بھی کام کریں، ایسے کریں گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ کر کر رہے ہیں اور اسی کی خوشنودی کے لیے کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ کفار کے ساتھ لڑنے یا بحث و مباحثہ کرنے اور اپنی بیوی کے ساتھ بات چیت اور ملنے کے وقت بھی اللہ تعالیٰ یاد رہے۔ اسی طرح ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کو تلاش کریں۔ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی و درماندگی کا اظہار ہو اور اس کی طرف فقر و احتیاج ہو۔

خلاصہ یہ کہ جو کام یا چیز بھی بندہ اور اللہ تعالیٰ کے تعلق اور حضوری میں خلل ڈالتی ہو یا حضوری اور تعلق سے مانع ہو اُس سے بچا جائے اور اپنی زندگی کے تمام شعبوں، تمام افعال، اعمال اور باتوں میں یہ

فکر چھائی رہے کہ گویا میں اپنے پروردگار کے سامنے ہوں اور گویا میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ دل کی لو اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگائیں، یہ فکر ہر وقت غالب رہے کہ میرا پروردگار مجھے دیکھ رہا ہے، اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ رکھیں اور ہر اُس کام اور بات سے پرہیز کریں جو اس تعلق میں کمی کا باعث بنے یا ترقی کو روکے۔

مذکورہ بالا پانچ درجے ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک درجے میں ادنیٰ سے اعلیٰ تک بے شمار درجات ہیں، مثلاً: پانچواں درجہ، جو کہ سب سے اعلیٰ ہے، اس کو لے لیں، تو اللہ تعالیٰ کے مقرب لوگوں میں ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجات بن جاتے ہیں۔ دیکھیے! انبیاء علیہم السلام کا بھی اللہ تعالیٰ سے قُرب و تعلق تھا اور دوسرے اولیاء اللہ کا بھی۔ دونوں میں نام کی مناسبت کے سوا اور کوئی مناسبت نہیں، پھر دوسرے انبیاء علیہم السلام کے بھی قُرب واحسان کا ایک مرتبہ تھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی قُرب واحسان کا ایک مرتبہ تھا، پھر ان کے درمیان جو فرق ہے وہ اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے۔

حدیث کی اصطلاح میں اس آخری درجہ کو "احسان" کہا جاتا ہے۔ یہ مقام جس راہ سے حاصل ہوتا ہے اس کو طریقت، تصوف، سلوک اوراحسان کہا جاتا ہے، اسی راہ کو راہِ تزکیہ یا طریقِ تقویٰ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔اس کا بیان "اخلاق" کے باب میں آچکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو تقویٰ کے اعلیٰ ترین مقام کی ترغیب

خلاصہ یہ کہ تقویٰ، قُربِ الٰہی اور احسانی کیفیت کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجات ومقامات ہوتے ہیں۔ مومن کے لیے ولایتِ عامہ سے مقربین کی ولایتِ خاصہ تک قُرب اور رضائے الٰہی کی جملہ منازل تقویٰ ہی سے طے ہوتی ہیں۔ قُربِ حق اور رضائے الٰہی کے لامحدود مدارج تقویٰ والے اعمال ہی کے مختلف درجات ہیں۔ اس کا اعلیٰ مقام " احسان" سے شروع ہوتا ہے اور احسان یہ ہے کہ آدمی اس دھیان سے زندگی گزارے کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کے سامنے ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے یا اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے قُرب ورضا کی راہوں کو جاننا اور ان پر آخری دم تک چلنا سلوک کا مقصد ہے اور یہ ریاضت، محنت، مجاہدہ اور صحبتِ صالح ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے

بندوں کو یہی ترغیب دی ہے کہ وہ تقویٰ واحسان کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کی حتی الوسع کوشش کریں۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز میں بیان فرمائی ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۞ یعنی "جو ایمان لائے اور نیک کام کیے ان پر کوئی گناہ نہیں ان میں جو پہلے کھا چکے ہیں جبکہ (آئندہ کو) پرہیز گار ہوئے اور ایمان لائے اور نیک اعمال کیے، پھر پرہیز گار ہوئے اور ایمان لائے، پھر پرہیز گار ہوئے اور خوب نیکی کی اور اللہ تعالیٰ محسنین (یعنی نیکوکاروں) سے محبت رکھتا ہے۔" (مائدہ: آیت ۹۳)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا.... یعنی "پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو (یعنی اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرو) سنو اور حکم مانو (یعنی اپنی پوری قوت وتوانائی، تقویٰ اور سمع وطاعت میں خرچ کرو)۔"

(سورۂ تغابن: آیت ۱۶)

نیز ایک جگہ ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۞ "اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس سے تقویٰ کا حق ہے اور نہ مرو مگر ایسے حال میں کہ تم مسلمان ہو۔" (سورۂ آل عمران: آیت ۱۰۲)

اس کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حَقَّ تُقٰتِهٖ هُوَ اَنْ يُّطَاعَ فَلَا يُعْصٰى وَيُذْكَرَ فَلَا يُنْسٰى وَيُشْكَرَ فَلَا يُكْفَرُ "حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری ہر کام میں کی جائے، کسی کام میں نافرمانی نہ کی جائے، اور اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ یاد رکھا جائے اور کبھی نہ بھولا جائے، اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کیا جائے اور کبھی ناشکری نہ کی جائے۔"

(دیکھیے ابن کثیر، قرطبی، مستدرک وغیرہ)

حَقَّ تُقَاتِهٖ کی یہی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

(دیکھیے تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس)

اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کا اعلیٰ اور حقیقی مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں اپنی پوری قوت اور توانائی اس طرح صرف کی جائے کہ اس میں نافرمانی کا کوئی شائبہ نہ ہو، اور اپنے دل، زبان اور عمل سے اُس کا اِس طرح شکر ادا کیا جائے کہ اس میں ناشکری کی کوئی آمیزش نہ ہو۔ ایسی حالت میں بندے اور معبود، ساجد اور مسجود میں دوری کے پردے اُٹھ جاتے ہیں، بندے کا دل جاگ جاتا ہے اور اس کے دل کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے محبوبِ حقیقی کا مشاہدہ دل سے کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی اس پر ہر آن کھلتی رہتی ہے اور اس میں برابر ترقی جاری رہتی ہے اور اس کے دل پر اللہ تعالیٰ کی یاد اور استحضار اس قدر غالب رہتا ہے کہ کبھی بھی اس پر غفلت طاری نہیں ہوتی ہے۔ اس کو اصطلاح میں "مقامِ احسان" یا احسانی کیفیت کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مومن کے لیے روحانی ترقی کا اعلیٰ مقام ہے۔ یہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ جل شانہ اپنے بندے کے ساتھ خصوصی محبت کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جس پر پہنچنے کے بعد بندہ کی مرضی اور ارادے اللہ تعالیٰ کی مرضی میں فنا اور ڈوب کر ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر اُس کی پوری زندگی کے خدوخال یعنی اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، دیکھنا، اُس کا ہر ارادہ اور ہر خواہش، زندگی کا ہر لمحہ اور ہر حرکت وسکون اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: "جو شخص میرے ولی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو میں اس کے ساتھ لڑائی کا اعلان کرتا ہوں اور میرا بندہ میرا قُرب کسی ایسے ذریعہ سے حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ان چیزوں سے زیادہ محبوب ہو جو میں نے اس پر فرض کی ہیں، اور میرا وہ بندہ (جس کو فرائض کے ذریعے میرا تقرب حاصل ہے) برابر نوافل (نفلی نمازیں، نفلی روزے، ذکر واذکار اور نفلی صدقات وغیرہ) کے ذریعہ میرا تقُرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں (کیوں کہ وہ فرائض، نفلی عبادات، ذکر واذکار اور ہر قسم کی اطاعت کو اختیار کرلیتا ہے اور نافرمانی سے بالکل اجتناب کرتا ہے) اور جب میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں کہ وہ اس کے ذریعہ سے سنتا ہے، میں اس کی بینائی بن جاتا ہوں کہ وہ اسی کے ذریعہ سے دیکھتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ اسی کے ذریعہ پکڑتا ہے، اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو اس کو ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ کسی چیز سے پناہ چاہے تو میں اسے ضرور بچاؤں گا۔"
(صحیح بخاری، مشکوٰۃ)

اس حدیث کے اندر اور بھی بہت سی باریکیاں علمائے کرام اور صوفیائے عظام نے بیان فرمائی ہیں، لیکن ان میں سے بعض بہت ہی مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں، بلکہ جب تک یہ مذکورہ کیفیت حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک اس کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا، اس لیے درمیانی درمیانی بات لکھ دی جس میں عوام وخواص دونوں کے لیے سمجھنے کے اسباب موجود ہیں۔

تقویٰ کے درجات اور نام نہاد پرہیز گار

جب تقویٰ کی تعریف اور اس کے درجات معلوم ہوگئے تو تقویٰ کا غلط مفہوم اور اس کا جھوٹا لباس خود بخود تار تار ہو گیا جو بعض نام نہاد متقیوں اور پرہیز گاروں یا نام نہاد صوفیوں نے اوڑھ رکھا ہے۔ عام لوگ ان کو متقی اور پرہیز گار کہتے ہیں جو نوافل اور مستحبات میں خوب زور وشور دکھاتے ہیں اور اسلامی آداب، بلکہ بعض خود ساختہ آداب کا خوب اہتمام کرتے ہیں، اسی طرح کھانے پینے کی چیزوں میں پاک وناپاک میں تو دور دور کے توہمات وشکوک نکال کر ان سے اپنے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بندوں کے حقوق (جو واجب اور لازم ہیں وہ ان) سے غفلت برتتے ہیں اور معاملات کی خرابی میں غیر مسلموں سے بھی آگے آگے رہتے ہیں۔ قرض لے کر بھول جاتے ہیں، اپنا کام نکالنے کے لیے جھوٹ، چاپلوسی اور غیبت بھی کرتے ہیں اور دوسرے بندوں کے حقوق بھی مارتے ہیں، مال کے حاصل کرنے میں یہ نام نہاد پرہیز گار اور متقی سود تک سے گریز نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ کہ دین کے ضروری اور اہم فرائض وواجبات میں کوتاہی کرتے ہیں اور حرام ومکروہ چیزوں اور کاموں کو اختیار کرتے ہیں، بلکہ یہ نام نہاد پرہیز گار دنیا پرستی، مال وجاہ کی حرص، لالچ، تکبر اور حسد جیسے برے اخلاق میں عوام سے بھی بازی لے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی ان حضرات کی پرہیز گاری اور بزرگی مجروح نہیں ہوتی اور نہ ان کے ایمان ویقین کے زبانی جمع خرچ (اور جھوٹے وعدوں) میں فرق آتا ہے۔ گویا ان کا تقویٰ، ایمان، یقین، تصوّف اور بزرگی فرائض اور واجبات کو چھوڑ کر صرف مستحبات (جن کا درجہ فرائض، واجبات اور سنن کے بعد ہے) کا اپنانا ہے۔ وہ حرام کاموں اور مکاریوں میں پڑ کر صرف ظاہری طور پر ان چیزوں سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں جن سے بچنا عوام کے نزدیک بزرگی،

تقویٰ، پرہیز گاری یا ایمان ویقین کی دلیل بن سکتی ہے۔ یہ تقویٰ اور پرہیز گاری سراسر قرآن وسنت کے خلاف ہے، یہ شیطانیت اور تکبر ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا تقویٰ صرف اس کی زندگی کے ایک شعبہ میں دکھائی دیتا ہے تو یہ بھی محض تکلف اور بناوٹ ہے اور یہ اس کی اتباعِ نفس کی علامت ہے۔

تقویٰ اور پرہیز گاری تو دل کی ایک صفت ہے۔ یہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر انسان کو حق کے ساتھ شدید محبت، اس کو اپنانے کی شدید رغبت اور باطل سے سخت نفرت وبغض ہوا کرتی ہے، یا بالفاظ دیگر یہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر فعل وعمل کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بنانے کی شدید محبت ورغبت اور اُس کی مخالفت سے شدید نفرت ہوتی ہے۔ حرام چیزوں سے بچنا (جو اللہ تعالیٰ اور بندے کے تعلق میں رخنہ ڈالتی ہیں یا ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہیں) یا حق کا متلاشی ہونا؛ یہ سب کچھ اس صفت کے برگ وبار ہیں۔ جس شخص میں جس قدر یہ صفت زیادہ ہوگی، اسی قدر وہ شخص متقی، پرہیز گار اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا، اسی قدر اللہ تعالیٰ کا قُرب اس کو حاصل ہوگا اور اس میں وہ ترقی کرے گا۔ اس کے دل کی یہ صفت (یعنی تقویٰ) اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں واضح طور پر دکھائی دے گی۔ اس کا ہر قول وفعل، ہر محبت وبغض اور ایک ایک لمحہ اسی صفت میں رنگا ہوا ہوگا۔ جس میں جس قدر یہ صفت ہوگی، اسی قدر اس کی زندگی اللہ تعالیٰ کی صفات کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوگی۔

تقویٰ کے ثمرات

تقویٰ کی تعریف ودرجات وغیرہ کے بعد اب تقویٰ کے ثمرات پڑھ لیجیے:

۱۔ متقی حق اور نیکی کو قبول کرنے والا ہوتا ہے۔

متقی اور پرہیز گار شخص حق کا متلاشی اور طالب رہتا ہے۔ وہ بہت محتاط ہوتا ہے، اپنے ہر قدم کو بہت احتیاط سے اٹھاتا ہے، اپنے کسی فکر وعمل میں بے پروا نہیں ہوتا، ہر بات اور کام کو اچھی طرح سمجھنے اور درستگی کے ساتھ کرنے کی کھٹک رکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ حق کی تلاش میں برابر لگا رہتا ہے، ہر باطل اور ہر برائی سے بچتا رہتا ہے اور ہر حق، اچھائی اور نیکی کو تلاش کر کے اختیار کرتا رہتا ہے۔ دل کی یہی وہ صفت ہے جو ہر انسان میں فطری طور پر رکھی گئی ہے۔

جن لوگوں نے اپنی بداعمالیوں (یعنی جھوٹ ، فریب وغیرہ) سے اس صفت کو جلا کر راکھ نہ کر دیا ہو، وہی لوگ قرآن مجید اور حق سے فائدہ اٹھانے والے ہوتے ہیں، کیوں کہ قرآن مجید اور دینِ اسلام ہی سراسر حق ، نیکی اور بھلائی ہے۔ جو بھی حق اور نیکی کا متلاشی ہو گا وہ قرآن مجید کو اور اس کی تعلیمات کو سن کر ضرور فائدہ اٹھائے گا۔ یہ خود ان کی اپنی فطرت اور ضمیر کی آواز ہوتی ہے۔ پھر قرآن وسنت کی تعلیم اور عمل سے اس صفت میں برابر ترقی ہوتی رہتی ہے، چناں چہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞ "یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں، یہ متقی لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞ "یہ لوگوں کے واسطے بیان ہے اور تقویٰ والوں کے لیے ہدایت ونصیحت ہے۔" (سورۂ آل عمران: آیت ۱۳۸)

اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کتاب سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جن کے اندر تقویٰ کا جوہر موجود ہو۔ جس طرح سورج چمکتا تو سب کے لیے ہے، لیکن اس کی روشنی سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو آنکھیں بھی رکھتے ہیں اور آنکھوں کو دیکھنے کے لیے کھولتے بھی ہیں، اسی طرح یہ کتاب اُتری تو سب ہی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہے، لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جن کے اندر تقویٰ کا جوہر موجود ہو، یا بالفاظِ دیگر جن کے اندر قبولیتِ حق کی صلاحیت باقی ہو اور وہ حق کے طالب بنیں۔

۲۔ مومن اور متّقی شعائر اللہ سے محبت اور ان کی تعظیم کرتا ہے۔

ایمان ویقین والا متقی اور پرہیز گار اللہ تعالیٰ کے نام لگی ہوئی چیزوں سے محبت رکھتا ہے اور ان کی تعظیم وتکریم کرتا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۞ "بات یہی ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نامزد چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ اور پرہیز گاری سے ہے۔" (سورۃ الحج: آیت ۳۲)

نیز اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی تعظیم وتکریم اور ان کے ساتھ محبت رکھنے پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۞

"اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اونچی نہ کرو اور نہ بلند آواز سے آپ سے بات کیا کرو جیسا کہ تم ایک دوسرے سے پکار کر (بات) کیا کرتے ہو، کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ بلاشبہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور پرہیز گاری کے واسطے جانچا ہے، ان کے لیے بخشش (اور معافی) ہے اور بڑا اجر۔"

(سورۃ الحجرات: آیت ۳،۲)

۳۔ حق لانے والا اور تصدیق کرنے والا متقی ہے۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۞

"اور جو سچی (اور حق) بات لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی متقی اور پرہیز گار ہیں۔"

(سورۂ زمر: آیت ۳۳)

۴۔ متقی صابر اور صاحبِ استقامت ہو گا۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۞

"بلاشبہ جو پرہیز گاری کرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

(سورۂ یوسف: آیت ۹۰)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۞

"اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔"

(سورۂ آل عمران: آیت ۱۸۶)

۵۔ متقی معاف کرتا ہے۔

وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی

"تمہارا معاف کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۷)

۶۔ ہر حال میں عدل تقویٰ کی علامت ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۞

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے واسطے انصاف وعدل کی گواہی دینے پر قائم رہو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ اُبھارے کہ عدل وانصاف کو چھوڑ دو۔ عدل وانصاف کرو، یہی بات تقویٰ کے قریب تر ہے اور اللہ (کی نافرمانی) سے بچو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے یقیناً خبر دار ہے۔"

۷۔ متقی شخص مال کے حصول میں بہت ہی احتیاط کرتا ہے۔ وہ سود اور ہر قسم کے ناجائز مال سے بچنے کی پوری کوشش کرتا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوا الرِّبٰۤوا اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۞ "اے ایمان والو! سود دوگنا پر دوگنا کر کے مت کھاؤ اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی اور اس کی ناراضگی) سے بچتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔"

(سورۂ آل عمران: آیت ۱۳۰)

۸۔ متقی اور پرہیز گار شخص والدین، بہن بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوگا، اور اس کے دل میں مخلوق کے لیے رحم، مہربانی اور اس پر شفقت ہوگی، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡبًا ۞ "اور اس اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی اور ناراضگی) سے پرہیز کرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ داروں کے تعلقات کو بگاڑنے سے بچو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔" (سورۃ النساء: آیت ۱)

اس آیتِ کریمہ کے شروع میں بھی اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ "اے لوگو! اس اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے پرہیز کرو جس نے تمہیں ایک

جان سے پیدا فرمایا، پھر چند جملوں کے بعد دوبارہ فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰہَ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پرہیز گاری، اپنی نافرمانی اور ناراضگی سے بچنے کی تاکید کے بعد کچھ احکامات دے دیئے ہیں جو یہ ہیں: صلہ رحمی، رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات کو نہ بگاڑنا اور رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَھُمْ — اور یتیموں کو ان کا مال دے دیا کرو۔

وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ — یعنی ردی مال کو (ان کی) عمدہ چیز سے نہ بدلو۔

وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَھُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِکُمْ — اور ان (یتیموں) کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔

اس کے بعد یتیم بچیوں کے معاملہ میں عدل وانصاف، ان پر رحم کرنے اور ظلم نہ کرنے کا حکم دے دیا اور پھر اپنی بیویوں کے مہر کی ادائیگی، ان پر مہربانی، ان پر رحم اور ترس کھانے کا اور ان کا حق خوشی سے دے دینے کا حکم فرمایا۔ اس کے بعد یہ حکم دے دیا کہ جب تک یتیموں میں اس قدر سمجھ پیدا نہ ہو کہ وہ کاروبار سنبھال سکیں اُس وقت تک ان کے مالوں میں سے تو ان کو روٹی، کپڑا اور ان کے ضروری اخراجات دیتے رہو اور ان کو نصیحت کی باتیں بھی کہتے رہو، لیکن اُن کو اُن کے اموال سپرد نہ کیا کرو کہ وہ ان کو بے جا اُڑائیں گے، البتہ جب وہ کاروبار سنبھالنے کی حد تک پہنچ جائیں اور وہ ہوشیار بھی ہوں تو پھر دو گواہوں کے سامنے اُن کو اُن کے مال سپرد کر دو اور آخر میں رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں پر رحم ومہربانی کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ: وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَۃَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنُ فَارْزُقُوْھُمْ مِّنْہُ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝ ”اور جب (میراث کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار، یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے کچھ انہیں بھی دے دیا کرو اور ان سے اچھی بات کہو۔“
(سورۃ النساء: آیت ۸)

۹۔ متقی اور پرہیز گار شخص کا اللہ تعالیٰ اور اُس کی تعلیمات وہدایات پر توکل[1]، پورا پورا بھروسہ اور اعتماد ہوتا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۝ ”اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی اور ناراضگی) سے بچتے رہو اور ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔“
(سورۂ مائدہ: آیت ۱۱)

---

① (توکل کسے کہتے ہیں اس کی تفصیل ”توکل کے باب“ میں دیکھ لیں۔)

۱۰۔ متقی نیک کاموں میں تعاون کرے گا۔

متقی اور پرہیز گار نیک کاموں اور نیکی کی باتوں میں تعاون کرے گا اور ظلم، برائی اور بُری باتوں میں کسی کے ساتھ تعاون اور مدد نہیں کرے گا۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ "اور آپس میں نیکی اور تقویٰ (کے کاموں اور باتوں) میں مدد کرو اور گناہ و ظلم پر مدد نہ کرو اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی وناراضگی) سے پرہیز کرو، بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔"

(سورۂ مائدہ: آیت ۲)

۱۱۔ دو مسلمانوں یا دو مسلمان جماعتوں یا قوموں کے درمیان صلح صفائی کرانے اور ان کے باہمی تعلقات کو بہتر بنانے کا کام بھی پرہیز گاروں کا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال میں صلح اور ظالم کا ہاتھ روکنے کی تعلیم اور مسلمانوں کے گروہ بندیوں میں عدل و انصاف کے ساتھ صلح اور ان کے باہمی تعلقات بہتر بنانے کی تلقین کے بعد فرماتے ہیں: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ "بلاشبہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، پس اپنے بھائیوں میں صلح کرو اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی اور ناراضگی) سے بچتے رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

(سورۃ الحجرات: آیت ۱۰)

۱۲۔ متقی اور پرہیز گار غیبت وغیرہ جیسے ناجائز کاموں سے پرہیز کرے گا۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی غیبت کرنے، اُن کا مذاق اُڑانے، اُن پر فقرے کسنے، طعن کرنے اور ان پر بلا وجہ بدگمانی سے منع کر کے آخر میں فرماتے ہیں کہ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ "اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی اور ناراضگی) سے بچتے رہو، اللہ تعالیٰ یقیناً بڑا توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔"

(سورۃ الحجرات: آیت ۱۲)

۱۳۔ متقی اور پرہیز گار شخص اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور دینِ اسلام کو غالب کرنے کے لیے ہر باطل کے ساتھ پوری قوت سے لڑے گا اور اس لڑنے اور جہاد میں اللہ تعالیٰ کے حدود و احکامات کی پوری پوری نگہداشت کرے گا، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ

الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۞" اے ایمان والو! اپنے نزدیک کے کافروں سے قتال کرو (یعنی لڑو) اور چاہیے کہ وہ تم میں سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔" (سورۃ التوبہ: آیت ۱۲۳)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞" اے ایمان والو! صبر کرو اور (دشمن کے مقابلہ میں) ثابت قدم اور مضبوط رہو اور (دشمن کے مقابلہ کے لئے تیار رہو) اللہ تعالیٰ (کی ناراضگی اور نافرمانی) سے بچو، تاکہ فلاح پاؤ۔"
(سورۂ آلِ عمران: آیت ۲۰۰)

نیز اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتے ہیں (کہ کفار و مشرکین کے ساتھ اس وقت تک قتال اور جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے اور اللہ تعالیٰ کا دین قائم ہو جائے)، پھر اس کے بعد کچھ اور احکامات بتلا کر فرماتے ہیں کہ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۞" اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں اور پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔" (سورۃ البقرہ: آیت ۱۹۴)

۱۴۔ یہ چند آیات بطورِ نمونہ پیش کی گئیں، ورنہ قرآن مجید کے تقریباً ہر رکوع میں تقویٰ اور پرہیز گاری کا حکم ہے۔ جگہ جگہ قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی کسی خیر کے کرنے کا حکم دیتے ہیں مثلاً: نماز یا حج کا حکم، یا کسی چیز سے منع فرماتے ہیں تو اس کے بعد یا اس سے پہلے وَاتَّقُوا اللّٰهَ کہہ کر اپنی نافرمانی سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں۔ اس طرح کی ترغیب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرو، اس کی نافرمانی اور ناراضگی سے بچتے رہو، جو جو احکامات دیئے گئے ہیں ان پر اخلاص کے ساتھ عمل کرو اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے اللہ تعالیٰ کے لیے پرہیز کرو۔ لہٰذا اگرچہ تقویٰ اور پرہیز گاری کا تعلق دل سے ہے، لیکن یہی تقویٰ ہے جس کا ثمرہ دین اسلام پر خلوص اور پختگی سے عمل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ پیغمبروں نے اپنی اپنی قوموں سے کہہ دیا کہ: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۞" پس اللہ تعالیٰ (سے خوف کھا کر اس کی نافرمانی) سے بچو اور میری اطاعت کرو۔"
(سورۂ شعراء: آیت ۱۰۸)

یا مثلاً اللہ تعالیٰ تقویٰ اور پرہیز گاری کے متعلق فرماتے ہیں:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

یعنی "نیکی (صرف) یہی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو، بلکہ نیکی تو اُن لوگوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں، اور اُس کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، اور سوال کرنے والوں کو، اور غلاموں کے آزاد کرنے میں (اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا) مال دیں، اور نماز پڑھیں، اور زکوٰۃ دیں، اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں، اور تنگدستی میں، بیماری میں اور (دشمن اسلام کے ساتھ) لڑائی کے وقت صبر کرنے (یعنی ثابت قدم رہنے) والے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔"

(سورۂ بقرہ: آیت ۱۷۷)

تقویٰ کی اہمیت

تقویٰ اسلام کا ایک عظیم رکن ہے، اسلام کی پوری عمارت دل کے اس جوہرِ تقویٰ پر کھڑی کی جاتی ہے۔ جو شخص اپنے کرتوت سے اس صفت کو جلا کر ختم کر دیتا ہے اس پر حق کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسے شخص کے اعمال بظاہر نیک بھی ہوں تو بھی وہ وقتی اور ریاکاری سے بھرپور محض نمائشی اعمال ہوتے ہیں جو اس کے لیے نہ تو دنیاوی زندگی میں راحت وسکون اور اطمینان کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور نہ آخرت میں، بلکہ یہی نمائشی اعمال اس کی قلبی بے چینی و بے قراری اور آخرت کی آگ کو اور زیادہ گرم کر دیتے ہیں۔

تقویٰ کی بنیاد پر کیا ہوا عمل ہی مقبول ہے

اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہی عمل مقبول ہے جو انسان کے تقویٰ سے پیدا ہوا ہو اور اس کے برگ وبار میں اسی تقویٰ کی روح دوڑ رہی ہو، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآءُ هَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ "پس اللہ تعالیٰ کو نہ ان (قربانی کے جانوروں) کے گوشت پہنچتے ہیں اور نہ خون، بلکہ اس کو (تو صرف) تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔" (سورۃ الحج: آیت ۳۷)

مطلب یہ ہے کہ جانور کو ذبح کر کے محض گوشت کھانے اور کھلانے یا اس کا خون گرانے سے تم اللہ تعالیٰ کی رضاو خوشنودی کبھی حاصل نہیں کر سکتے، نہ یہ خون و گوشت اٹھ کر اس کی بارگاہ تک پہنچتا ہے، نہ یہ طریقہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو گوشت اور خون کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں تو تمہارے دل کا تقویٰ اور تمہارا قلبی خلوص پہنچتا ہے، کیوں کہ جانور کی قربانی ایک علامتی فعل ہے۔ یہ قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر کے اپنے محبوب فرزند حضرت اسماعیل علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیش کیا اور اس حقیقت کا عملی اظہار فرمایا کہ مسلمان کو ہر وقت اپنی عزیز ترین چیز بھی اپنے رب اور دینِ اسلام کی خاطر قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

مسلمان اس قربانی کے ذریعے اس عزم اور جوش کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال، اولاد، عزت اور جان کو اُس کی راہ میں اسی طرح قربان کرنے کے لیے تیار ہیں جس طرح اس جانور کو ذبح اور قربان کر رہے ہیں۔ اگر قربانی کی یہ حقیقت سامنے نہ ہو، اس کے اندر اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے ساتھ محبت کا یہ جوش وخروش نہ ہو اور اعمال میں للّٰہیت اور خلوص کا جوہر موجود نہ ہو اور آدمی صرف رسمی طور پر جانور کی گردن پر چھری چلادے یا دین کا کوئی دوسرا عمل صرف رسمی طور پر ادا کرے تو گو اس نے ظاہر میں قربانی کر دی یا خدا پرستی کا عمل کر دیا، لیکن فی الحقیقت وہ اس قربانی اور عمل کی روح سے بے خبر رہا، حالانکہ اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے والی چیز روح اور اخلاص ہی ہے نہ کہ ظاہری عمل ورسم۔ لہٰذا دل میں جتنا خلوص ہوگا اور آدمی کی قربانی اور عمل پر تقویٰ کا رنگ جتنا زیادہ ہوگا، اتنی ہی اس کی مقبولیت ہوگی اور وہ عمل اور قربانی اسی قدر وزنی اور آخرت میں کام آنے والی ہوگی۔ اسی حقیقت کو

قرآن مجید نے بار بار سامنے لایا ہے، چناں چہ ایک جگہ فرمایا ہے کہ: اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۞ ” اللہ تعالیٰ تو صرف متقیوں اور پرہیز گاروں سے قبول فرماتا ہے۔“

(سورۂ مائدہ: آیت ۲۷)

اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف وہی عمل قبول ہے جو تقویٰ سے پیدا ہوا ہو اور جس کے اندر اخلاص و تقویٰ کی روح دوڑ رہی ہو۔

متقی اور پرہیز گار شخص کو اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے۔ وہ جس قدر پرہیز گار ہوتا ہے اس قدر اللہ تعالیٰ کو محبوب اور اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز و مکرم ہوتا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار اس بات کو بیان فرمایا ہے کہ: فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۞ ”پس بلاشبہ اللہ تعالیٰ متقین اور پرہیز گاروں سے محبت رکھتا ہے۔“ (سورۂ آل عمران: آیت ۷۶، توبہ: آیت ۴)

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ ”بے شک تم میں سے زیادہ عزت والا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی اور پرہیز گار ہو۔“ (سورۂ حجرات: آیت ۱۳)

اللہ تعالیٰ متقی اور پرہیز گار کے ساتھ ہے

جو شخص متقی اور پرہیز گار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہوں پر اس بات کو بیان فرمایا ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ۞ ”اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔“

(سورۂ بقرہ: آیت ۱۹۴، سورۂ توبہ: آیت ۳۶)

متقی اور پرہیز گار ہی اللہ تعالیٰ کا دوست اور ولی ہوتا ہے

متقی اور پرہیز گار اللہ تعالیٰ کا دوست اور ولی ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتا ہے اور اس سے پوری قوت سے پرہیز کرتا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَّاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ۞ ”اور بے شک ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی پرہیز گاروں کا دوست اور مددگار ہے۔“ (سورۂ جاثیہ: آیت ۱۹)

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۞ "یاد رکھو! بے شک اللہ تعالیٰ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (یہ اولیاء اللہ) وہ لوگ (ہیں) جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔" (سورہ یونس: آیت ۶۲، ۶۳)

ولایت کی بڑی بڑی دو قسمیں ہیں:

ایک ولایتِ عامہ: جو ہر مومن اور مسلمان کو حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ یعنی "اللہ تعالیٰ مومنوں کا دوست ہے۔" (سورۂ آل عمران: آیت ۶۸)

دوسری قسم ولایتِ خاصہ: یہ وہ ولایت ہے جو اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے والے متقی اور پرہیزگاروں کو حاصل ہے۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

سکونِ قلب، راحت اور برکت پرہیزگاروں کے لیے ہے

جو شخص اللہ تعالیٰ کے خوف سے چھوٹے بڑے گناہ چھوڑ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور تعلیمات پر پورا پورا عمل کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں بھی قلبی سکون واطمینان اور راحت و آرام نصیب فرماتا ہے، اس کی زندگی، روزی وغیرہ میں برکت ہو جاتی ہے گویا وہ دنیا میں رہتے ہوئے جنت کے آثار کو اپنے اوپر محسوس کرتا ہے۔ جب اسے کوئی مشکل پیش آجاتی ہے تو اس مشکل سے اللہ تعالیٰ اس کو نجات دے دیتا ہے اور دنیا کی مصیبت اس کے لیے بسا اوقات دنیا میں ہی ترقی کا باعث بن جاتی ہے۔ حضرت یوسف علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کنوئیں میں گرادیا گیا، جیل میں ڈال دیا گیا، لیکن ہر مصیبت، جو بظاہر مصیبت نظر آرہی تھی، ان کے لیے دنیا میں بھی ترقی پر ترقی کا سبب بنی اور آخرت تو ہوتی ہی پرہیزگاروں کے لیے ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۞ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۞ "اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچا، اللہ تعالیٰ (تنگی اور مشکل

حالات میں سے) اس کے لیے نجات کا کوئی راستہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو۔"

(سورۃ الطلاق: آیت ۲،۳)

اللہ تعالیٰ چند آیتوں کے بعد پھر فرماتا ہے: وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ اَمۡرِهٖ يُسۡرًا ۝ "اور جو شخص اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچتا رہے، اللہ تعالیٰ اس کے کام کو آسان کر دیتا ہے۔"

(سورۃ الطلاق: آیت ۴)

نیز اللہ تعالیٰ ایک دوسری جگہ فرماتا ہے کہ: وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰٓى اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰـكِنۡ كَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝ "اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ (اور پرہیز گاری) اختیار کرتے (یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بچتے) تو ہم آسمان اور زمین سے برکتوں اور نعمتوں کے دروازے ضرور ان پر کھول دیتے، لیکن انہوں نے (حق اور پیغمبروں کو) جھٹلایا تو ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ہم نے ان کو پکڑ لیا (اور دنیا اور آخرت کی سخت سزا اور عذاب میں گرفتار ہو گئے)۔" (سورۃ اعراف: آیت ۹۶)

انجامِ خیر اور اُخروی خوشیاں صرف پرہیز گاروں کے لیے ہیں

متقی اور پرہیز گار شخص ہی ہے جس کے لیے انجام اور آخرت کی خوشیاں مقدر ہیں، اسی کے لیے جنت اور آخرت کی ابدی نعمتیں ہوں گی اور جو جس قدر متقی اور پرہیز گار ہو گا اُسی قدر ابدی نعمتوں اور خوشیوں میں ترقی پر ترقی کرتا ہو گا۔ چناں چہ قرآن مجید میں بار بار اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ: وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ۝ "اور انجام خیر پرہیز گاروں ہی کے لیے ہو گا۔"

(سورۃ الاعراف: آیت ۱۲۸)

نیز ارشاد ہے: فَاصۡبِرۡ اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ۝ "پس صبر کرو، بے شک بہتر انجام پرہیز گاروں ہی کے لیے ہوتا ہے۔" (سورۃ الھود: آیت ۴۹)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰى "بہترین انجام تقویٰ اور پرہیز گاری کے لیے ہے۔" (سورۃ طٰہٰ: آیت ۱۳۲)

آخرت کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿﴾ "اور دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشہ ہے (یعنی ایک عارضی اور فانی چیز ہے) اور آخرت کا گھر پرہیز کرنے والوں کے لیے بہتر ہے، پھر کیوں نہیں سمجھتے۔"

(سورۂ انعام: آیت ۳۲)

جنت کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ "اور اپنے رب پروردگار کی بخشش کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین جتنی ہے، جو پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔"
(سورۂ آل عمران: آیت ۱۳۳)

اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: مَثَلُ الْجَنَّۃِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ؕ اُکُلُھَا دَآئِمٌ وَّظِلُّھَا ؕ تِلْکَ عُقْبَی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّعُقْبَی الْکٰفِرِیْنَ النَّارُ ﴿﴾ "اس جنت کا حال جس کا وعدہ پرہیز گاروں سے کیا گیا ہے، ایسا ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس کے پھل (اور میوے) اور سائے ہمیشہ رہیں گے اور یہ پرہیز گاروں کا انجام ہے اور کافروں کا انجام تو جہنم کی آگ ہے۔" (سورۂ رعد: آیت ۳۵)

سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ جنت کی خوشیاں بیان کرکے آگے فرماتا ہے کہ: تِلْکَ الْجَنَّۃُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ کَانَ تَقِیًّا ﴿﴾ "یہ وہ جنت ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے اُس کو اس کا وارث بنائیں گے جو پرہیز گار ہو گا۔" (سورۂ مریم: آیت ۶۳)

قرآن مجید کی یہ چند آیتیں لکھ دی گئیں، یہ بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں ورنہ جب یہ معلوم ہے کہ دینِ اسلام کے تمام اعمال کی بنیاد ہی تقویٰ پر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی تمام تر تعلیمات پر عمل کرنا احکامات، فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات کو ادا کرنا داخل ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ہر قسم کے گناہ سے بچنا، بلکہ ان چیزوں سے بچنا بھی داخل ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے ذرہ برابر بھی غافل کردے تو قرآن مجید میں جو کچھ بھی فضائل ہیں وہ سب کے سب پرہیز گاروں ہی کے لیے ہیں۔ تمام کے تمام اچھے

اعمال خواہ وہ اخلاق ہوں جیسے صبر وشکر وغیرہ یا ظاہری اعمال میں سے ہوں جیسے نماز، روزہ، جہاد وغیرہ یہ سب کے سب اسی شجرۂ تقویٰ کے عمل کی شاخیں اور پھول وپتے ہیں۔ یہی تقویٰ ہے جس کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ کا دوست بن جاتا ہے، یہی تقویٰ ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب ومقرب بندہ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ومکرم بن جاتا ہے اور یہی تقویٰ ہے جس کے اعلیٰ درجہ کو احسان کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعلیٰ سے اعلیٰ تقویٰ اور پرہیز گاری نصیب فرمادے۔ آمین

متقی فراست والا ہوتا ہے

جو شخص جس قدر متقی اور پرہیز گار ہو گا اسی قدر وہ فراست والا ہو گا اور اسی قدر وہ حق اور باطل میں، مفید اور غیر مفید میں فرق کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ایسا نور اور ایسی بصیرت عطا کی جاتی ہے جس پر وہ ہر چیز کو پرکھ کر معلوم کر لیتا ہے کہ یہ حق ہے یا باطل، کھوٹی ہے یا کھری، مفید ہے یا غیر مفید، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا وَّیُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَیَغۡفِرۡ لَکُمۡ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ "اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچتے رہو اللہ تعالیٰ تم میں حق وباطل میں تمیز کی قوت پیدا کر دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔"

(سورۂ انفال: آیت ۲۹)

فرقان ایک روشنی ہے جس سے حق اور باطل، مفید اور غیر مفید، ہدایت اور گمراہی کا واضح امتیاز ہو جاتا ہے۔ یہ فرقان تقریباً وہی چیز ہے جس کو معرفت یا بصیرت کہا جاتا ہے۔ بصیرت انسان میں وہ اندرونی روشنی پیدا کر دیتی ہے جس کے ذریعے وہ ظاہری پہلوؤں سے دھوکہ کھائے بغیر ہر بات کو اس کے اصل روپ میں دیکھتا ہے۔

متقی مومن کی نگاہ

انسان کی نگاہ جس قدر آگے مستقبل پر ہوتی ہے اُس کی نگاہ میں اسی قدر قوت وگہرائی ہوتی ہے اور جہاں تک نگاہ جاتی ہے وہاں تک کی چیزیں اس پر کھول دی جاتی ہیں۔ ذرا غور کیجیے! آدمی کی نگاہ اگر صرف عارضی لذت اور راحت پر ہوتی ہے تو اس پر صرف اپنی عارضی لذت وراحت حاصل کرنے کی

چیزیں اور اسباب کھلتے ہیں۔ اس سے آگے کے حقائق اور زندگی کے غم اور خوشیاں اس سے پوشیدہ رہتی ہیں، اور جس شخص کی نگاہ دنیا میں عزت حاصل کرنے پر ہوتی ہے تو وہ عارضی لذت و سکون کی چیزوں مثلاً منشیات، لغویات، فحش اور حرام چیزوں سے اجتناب کرتا ہے۔ اس کی نظر پہلے کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتی ہے اور اس کی نگاہ پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ آگے آنے والے دنوں پر ہوتی ہے، اس لیے اس کی نگاہ نشہ آور چیزوں اور شہوانی جذبات وغیرہ کے نقصانات کو اچھی طرح معلوم کرلیتی ہے اور پھر وہ ان سے بچتا رہتا ہے۔

اسی طرح جس کی نگاہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و قوت، اس کی صفات اور آخرت پر ہوتی ہے تو اس کی نگاہ اس قدر تیز ہوتی ہے کہ آج سے لے کر آخرت تک کی نقصان دہ چیزیں اس کے سامنے آجاتی ہیں اور وہ حق و باطل میں امتیاز کرلیتا ہے۔ اگر ایک آدمی کی نظر کمزور ہے، صرف ایک گز کے فاصلے پر لگتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس پر صرف ایک گز کی حد تک چیزیں منکشف ہوں گی اور ایک گز کے آگے جو گڑھے اور خطرات ہیں وہ اس سے چھپے رہیں گے۔ اگر کسی کی نظر ایک میل دور تک کام کرتی ہے تو اس پر ایک میل تک کی چیزیں کھلیں گی اور اس سے آگے کی چیزیں اس کی نظروں سے غائب رہیں گی۔

یہی حال دنیا والوں اور آخرت والوں کا ہے۔ دنیا پرستوں کی نگاہیں صرف دنیا کی حد تک محدود رہتی ہیں، ان کے فیصلے اور کام دنیاوی مفادات اور جذباتِ باطلہ کے تحت ہوتے ہیں۔ وہ حق و باطل کو نہیں پرکھ سکتے۔ اس کے برعکس آخرت والوں کی نگاہیں ان حضرات کے مقابلے میں تیز ہوتی ہیں اور وہ حق و باطل کی خوشبو اور بدبو کو پالیتے ہیں۔ بلاشبہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے غضب سے ڈرتا ہے اور وہی کرتا رہتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس سے بچتا رہتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے تو یہ خوف و تقویٰ اس کی اندرونی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے اور وہ حد درجہ حقیقت پسند بن جاتا ہے۔

یہ تقویٰ اس کے ذہن کے تمام پردوں کو ہٹا دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق و باطل، صحیح و غلط اور مفید و غیر مفید میں امتیاز اور فرق کرنے لگتا ہے۔ اسی علمی اور بصیرتی فرقان کے ثمرات بالآخر عملی میدان میں آجاتے ہیں اور عام لوگوں پر بھی یہ بات کھل جاتی ہے کہ جو کچھ یہ صاحبِ بصیرت کہتے تھے وہی بات

حق اور سچ تھی۔ اس طرح بالآخر متقی عملی میدان میں جیت جاتا ہے۔

اسی حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے عام فہم انداز میں اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہے، چناں چہ حضرت امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: اِتَّقُوْا فَرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ "مومن کی فراست سے بچو کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

(المعجم الاوسط رواہ الطبرانی واسنادہ حسن مجمع الزوائد: ج ۱۰، ص ۲۶۸)

اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ تقویٰ ہر نیکی کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قُرب کا ذریعہ اور دنیا و آخرت کی تمام سعادتوں کا راز اسی تقویٰ میں ہے۔ تمام اسلاف نے تقویٰ کے ذریعہ ہر بھلائی حاصل کی۔ ان کی ہر کامیابی کا راز اسی صفت تقویٰ کے اندر پنہاں تھا، وہ اسی کی وجہ سے دشمنوں پر غالب آجاتے تھے اور لوگوں کے دلوں کو بھی اسی کے ذریعے فتح کرتے تھے۔ تمام تر فتوحات اسی تقویٰ کی برکت سے انہیں حاصل ہوئیں اور اسی کی وجہ سے وہ پوری دنیا پر غالب آ گئے۔

تقویٰ کیسے حاصل ہو گا؟

۱۔ جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ تقویٰ کا مرکز دل ہی ہے اور جسم کے تمام تر اعمال وافعال کا دارومدار دل کی اصلاح اور درستگی پر ہے۔ تو یاد رہے کہ دل کی اصلاح اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات پر کامل یقین اور اس کے حاضر ناظر ہونے کا ہمہ وقت خیال نہ ہو اور یہ کیفیت عموماً بغیر مشق کے حاصل نہیں ہوتی۔ جس طرح انسان کی بدکاری بُری تعلیم، بُری صحبت اور برے کاموں کی مشق سے بڑھتی جاتی ہے، اسی طرح اچھے کاموں کی مشق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۞ "جو لوگ راہ پر آئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت اور بڑھائی، اور ان کو ان کا تقویٰ عطا کیا۔" (محمد: آیت ۱۷)

اس لیے تقویٰ کو قصداً اختیار کیا جائے گا جس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حلال اور حرام کردہ اور مشتبہ چیزوں کو معلوم کیا جائے اور اپنی پوری زندگی کو بہت احتیاط سے گزاریں تاکہ زندگی کے

کسی شعبہ میں بھی ایسا عمل نہ ہونے پائے جو اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر ناپسند ہو، بلکہ اُن مباح چیزوں کی کثرتِ استعمال سے بھی پرہیز کریں جن کے زیادہ استعمال سے حرام و مکروہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کریں (اس کی تفصیل ان شاء اللہ "ذکر اللہ" کے بیان میں موجود ہے)۔[1] ہر وقت زبان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رکھنے کی کوشش کریں۔ اور تمام بدن کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر اس کے ہر ہر عضو کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں استعمال کریں۔ زبانی ذکر کے ساتھ عملی ذکر کا خوب اہتمام کیا جائے۔

۳۔ ریاضت کی راہ کو اختیار کریں، یعنی حسب توفیق روزے رکھیں، کھانا کم کھائیں، نیند کم کریں، ابتدائی مراحل میں لوگوں سے اختلاط (ملنا جلنا) کم کر دیں اور باتوں کو اس قدر کم کر دیں کہ بغیر ضرورت کے کوئی بات زبان سے نہ نکالیں، غرض یہ کہ نفس کو سخت کاموں کا عادی بنانے کی حتی الوسع کوشش کریں۔

۴۔ غیر متقی بدکاروں، دنیا پرستوں اور غافل لوگوں کی صحبت سے پرہیز کریں اور سچائی کے ساتھ دینِ اسلام پر چلنے والوں اور پرہیزگاروں کی صحبت میں رہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۞ " اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو۔" (توبہ: آیت نمبر ۱۱۹)

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں اور رسول اللہ ﷺ کی بہت سی حدیثوں میں مختلف انداز سے اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ سچے اور پاکیزہ لوگوں کی صحبت اور محبت کو اختیار کیا جائے اور برے لوگوں کی صحبت اور ان کی دوستی و محبت سے پرہیز کیا جائے۔

۵۔ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ اور احسانی کیفیت حاصل کرنے کا آسان اور بے ضرر راستہ "سلوک واحسان، تزکیہ یا راہِ تقویٰ" ہے جس کو اصطلاح میں "تصوف" کہا جاتا ہے، اس کو اپنایا جائے اور کسی مسلمان متقی، پرہیزگار، صاحبِ دل اور روحانی امراض اور ان کے علاج سے واقف اور ماہر شخص کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ

---

[1] ذکر اللہ کے موضوع پر حضرت مفتی صاحب کی تفصیلی کتاب "ذکر اللہ کے فضائل و مسائل" کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے۔ زین

دے دیا جائے اور جو علاج وہ تجویز کرے اس پر اہتمام سے عمل کیا جائے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کا طالب اور اپنی جستجو میں سچا ہو اس نے اس راستے کو اپنا کر بہت جلد اپنی منزل کو پالیا۔ اس کی پوری تفصیل "تصوف" کے بیان میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل و کرم سے اپنا سچا اور صحیح تعلق نصیب فرمائے اور تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات پر پہنچائے۔ (آمین)

تقویٰ کے واقعات

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا احتیاط

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا جو مقررہ مقدار میں کما کر انہیں دیا کرتا تھا۔ ایک رات وہ کچھ کھانا لایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس میں سے ایک لقمہ نوش فرمالیا۔ غلام نے عرض کیا کہ آپ ہر رات دریافت فرمایا کرتے تھے (کہ کہاں سے کما کر لائے ہو؟) لیکن آج رات آپ نے مجھ سے نہ پوچھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے نہ پوچھ سکا۔ اب بتاؤ یہ کھانا کہاں سے لائے ہو؟ اس نے کہا: میں زمانہ جاہلیت میں ایک قوم کے پاس سے گزرا تھا اور میں نے ان کے ایک بیمار پر دم کیا تھا، انہوں نے مجھے کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا، آج میرا گزر ادھر کو ہوا تو ان کے ہاں شادی ہورہی تھی، انہوں نے مجھے یہ دیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم تو مجھے ہلاک کرنے لگے تھے۔ اس کے بعد حلق میں انگلی ڈال کر قے کرنے کی کوشش کی، مگر ایک لقمہ اور وہ بھی بھوک کی شدت میں کھایا گیا نہ نکلا۔ کسی نے عرض کیا: پانی سے ہی قے ہوسکتی ہے۔ انہوں نے پانی کا بہت بڑا پیالہ منگوایا اور پانی پی پی کر قے فرماتے رہے یہاں تک کہ مشکل سے وہ لقمہ نکالا۔ کسی نے عرض کیا کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے یہ ساری مشقت اس ایک لقمہ کی وجہ سے برداشت فرمائی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میری جان کے ساتھ بھی یہ لقمہ نکلتا تو بھی میں اس کو نکالتا، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو بدن حرام مال سے پرورش پائے آگ اس کے لیے بہتر ہے، مجھے یہ ڈر ہوا کہ میرے بدن کا کوئی حصہ اس لقمہ سے پرورش نہ پا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا احتیاط

۱۔ حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ دودھ نوش فرمایا جو انہیں بہت پسند آیا۔ جن صاحب نے پلایا تھا ان سے دریافت فرمایا کہ تمہیں یہ دودھ کہاں سے ملا؟ انہوں نے بتایا کہ میں فلاں پانی پر گیا تھا، وہاں صدقہ کے جانور پانی پینے آئے ہوئے تھے، ان لوگوں نے ان جانوروں کا دودھ نکال کر ہمیں دیا، میں نے اپنے اس مشکیزہ میں وہ دودھ ڈال لیا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منہ

میں انگلی ڈال کر وہ سارا دودھ قے کر دیا۔ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، تقویٰ اور احتیاط سیکھنے کے لیے ہم لوگ ہر وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ لگے رہتے تھے۔

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رات کے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان سے ملنے آئے۔ حضرت نے ان کو اندر بلالیا اور ان کے آتے ہی چراغ گل کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ میرے آتے ہی آپ نے چراغ کیوں گل کر دیا۔ فرمایا کہ اس میں بیت المال کا تیل ہے اور میں اس وقت بیت المال ہی کا کام کر رہا تھا، اب چونکہ ہم اور آپ باتیں کریں گے اور یہ کام بیت المال کا نہیں ہے، اس لیے تیل سے بات چیت میں انتفاع نہیں کر سکتے۔

حضرات! آپ کو اس پر بھی تعجب ہوگا، مگر اس کی وجہ وہی ہے کہ آپ کو شریعت کے اصول و قواعد معلوم نہیں اور جو معلوم بھی ہیں تو ان پر عمل کا اہتمام نہیں ہے۔

ف: شاید یہاں کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ اتنی احتیاط کس سے ہو سکتی ہے؟ یہ تو قدرت سے باہر ہے، تو سن لیجیے کہ قدرت سے باہر تو نہیں، ہاں دشوار ضرور ہے۔ (پسندیدہ واقعات:۱۲۳)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا احتیاط

حضرت یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دو بیویاں تھیں۔ ان میں سے جس کی باری کا دن ہوتا اس دن دوسری کے گھر سے وضو نہ کرتے۔ پھر دونوں بیویاں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملک شام گئیں اور وہاں دونوں اکٹھی بیمار ہوئیں اور اللہ کی شان دونوں کا ایک ہی دن میں انتقال ہوا۔ لوگ اس دن بہت مشغول تھے اس لیے دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے دونوں میں قرعہ ڈالا کہ کس کو قبر میں پہلے رکھا جائے۔ حضرت یحییٰ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی دو بیویاں تھیں۔ جب ایک کے پاس ہوتے تو دوسری کے ہاں سے پانی بھی نہ پیتے۔

(حیاۃ الصحابہ:۷۶۸/۲تا۷۶۹)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا واقعہ

بارہ اکبر پور ایک مقام ہے۔ اس کے قریب ایک چھوٹا سا اسٹیشن لال پور ہے۔ ایک دفعہ میں بارہ سے وہاں پہنچا اور بارش کے سبب وقت سے پہلے پہنچا۔ اتفاق سے جس وقت میں پہنچا، بارش ہونے لگی اور

اسٹیشن کا سائبان بوچھاڑ سے نہ بچا سکتا تھا۔ اکبر پور میں ایک منصف صاحب میرے جاننے والے تھے۔ ان کو اطلاع ہوگئی تو انہوں نے اسٹیشن ماسٹر کو لکھ دیا کہ یہ ہمارے دوست ہیں ان کی راحت کا کافی انتظام کیا جائے۔ اس غریب نے ہمارے واسطے ایک بڑا کمرہ کھلوادیا۔ شام ہوئی تو چوکیدار سے کہا کہ کمرہ میں روشنی کردو۔ اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ غالباً اس وقت ہمارے واسطے سرکاری تیل جلاکر روشنی کی جائے گی جو شرعاً جائز نہیں، کیوں کہ سرکاری تیل سرکاری کاموں کے واسطے دیا جاتا ہے نہ کہ نجی طور پر مسافروں کی خاطر رات بھر جلانے کے واسطے۔ اب اگر اسٹیشن ماسٹر مسلمان ہوتا تو میں بے تکلف اس سے کہہ دیتا کہ ہمارے واسطے سرکاری تیل کا جلانا جائز نہیں مگر وہ تو ہندو تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کے سامنے شرعی مسئلہ بیان کروں تو یہ کیا سمجھے گا، بلکہ عجب نہیں کہ تمسخر (مذاق) کرنے لگے۔ غرض جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو میں نے خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ اس وقت آپ ہی مجھ کو گناہ سے بچایئے، میری کوشش تو بے کار ہے۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ دفعتاً اسٹیشن ماسٹر نے ملازم سے کہا کہ سرکاری تیل مت جلانا، ہماری ذاتی لالٹین رکھ دینا۔

ف: اس سے معلوم ہو گیا کہ اگر انسان ہمت وارادہ کرے تو خدا تعالیٰ مدد کرتے ہیں، اس لیے آپ گھبرائیں نہیں بلکہ ہمت سے کام لیں۔ (پسندیدہ واقعات: ۱۲۳تا۱۲۴)

ایک نوجوان کا احتیاط

یحییٰ بن ایوب خزاعی بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس شخص سے سنا ہے جو بیان کر رہا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک جوان عبادت گزار تھا، ہر وقت مسجد میں رہتا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پر بڑا تعجب کرتے تھے۔ اس کا باپ نہایت بوڑھا تھا۔ یہ جب عشا کی نماز پڑھ چکتا تو اپنے والد کی طرف جایا کرتا تھا اور اس کی گزر گاہ ایک عورت کے دروازے کے سامنے سے تھی۔ وہ عورت اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس کے لیے اس کے راستہ میں کھڑا رکھتی تھی۔ ایک رات اس جوان کا گزر اس کی طرف ہوا، یہ عورت اسے پھسلانے لگی، یہاں تک کہ یہ جوان اس عورت کے پیچھے چلا۔ جب دروازہ پر پہنچا، عورت گھر میں داخل ہو گئی اور اسے داخل ہوتے وقت یاد آیا اور اس دروازے سے ہٹ گیا اور یہ آیتِ کریمہ اس کی زبان پر جاری ہوئی: اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا

فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿﴾" یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آ جاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں، سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں"۔

تو وہ جوان بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس عورت نے اپنی باندی کو آواز دی۔ اس کے اٹھانے میں ان دونوں نے ایک دوسرے کو مدد دی اور اس کو اٹھا کر اس جوان کے دروازہ تک لائیں۔ وہ جوان بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے باپ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کا والد اس کی طلب میں نکلا، پس دروازہ پر دیکھا کہ اس پر بے ہوشی تھی۔ باپ نے بعض رشتہ داروں کو بلایا، انہوں نے اسے اٹھایا اور اندر داخل کر دیا۔ اس جوان کو ہوش نہ آیا یہاں تک کہ رات کا وہ حصہ چلا گیا جو اللہ نے چاہا، اس وقت اس کو ہوش ہوا۔ اس کے والد نے اس سے پوچھا: اے میرے بیٹے! کیا حال ہے؟ جوان نے کہا: خیر ہے۔ باپ نے کہا: میں تجھ سے اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، تو جوان نے اپنے باپ کو ساری بات کی خبر دی۔ باپ نے پوچھا: اے میرے بیٹے! تو نے کون سی آیت پڑھی؟۔ جوان نے وہی آیت پڑھ دی اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے اسے حرکت دی، پس اچانک اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اسے غسل دے کر لے جایا گیا اور رات ہی میں اسے دفن کر دیا گیا۔ جب صبح ہوئی تو یہ قصہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس جوان کے باپ کے پاس آئے اور اس لڑکے کے بارے میں اسے صبر دلایا اور فرمایا: تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی تھی؟ کہا: اے امیر المؤمنین! رات کا وقت تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھ کو اس کی قبر کے پاس لے چلو، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور جو حضرات آپ کے ساتھ تھے قبر پر آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے فلاں! وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿﴾ (ترجمہ: جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا کیے جانے سے ڈرا اُس کے لیے دو جنتیں ہیں) تو اس جوان نے قبر کے اندر سے جواب دیا: اے عمر! میرے رب نے مجھے وہ دونوں باغ جنت دے دیے۔ (حیاۃ الصحابہ: ۲۶۶/۳تا۲۶۸)

مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ کا تقویٰ

ایک مرتبہ قطب الدین صاحب مؤلف "مظاہر حق" نے اپنے استاذ شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ، مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ، مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ اور چند دوسرے احباب کی دعوت کی۔ شاہ

اسحاق صاحب رحمہ اللہ نے تو منظور فرمالی اور سب حضرات نے بھی، مگر مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ نے منظور نہیں فرمائی۔ اس سے نواب صاحب کو ملال ہوا اور انہوں نے شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ سے شکایت کی کہ میں نے مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ کی دعوت کی تھی، انہوں نے انکار کر دیا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ پر عتاب فرمایا، اور فرمایا کہ ارے مظفر حسین رحمہ اللہ ! تجھے تقویٰ کی بد ہضمی ہوگئی، کیا نواب قطب الدین کا کھانا حرام ہے؟ انہوں نے کہا: حاشاوَ کلا! مجھے نواب صاحب پر اس قسم کی بدگمانی نہیں ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: پھر تو کیوں انکار کرتا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! نواب صاحب نے آپ کی بھی دعوت کی ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب کی بھی، اور ان کے علاوہ اتنے آدمیوں کی، اور آپ کو پالکی میں لے جائیں گے، اس میں بھی ضرور صرف ہوگا اور نواب صاحب گو بگڑ گئے ہیں، مگر پھر بھی وہ نواب زادہ ہیں اور دعوت میں ضرور نوابانہ تکلف بھی کریں گے، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب مقروض بھی ہیں اور جتنا روپیہ وہ دعوت میں صرف کریں گے وہ ان کی حاجت سے زائد بھی ہے، تو یہ روپیہ وہ اپنے قرض میں کیوں نہیں دیتے؟ ایسی حالت میں ان کا کھانا کراہت سے خالی نہیں۔ یہ بات شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ذہن میں بھی آگئی، اور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میاں قطب الدین! اب ہم بھی تمہارے یہاں کھانا نہ کھائیں گے۔

اس پر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ حاشیہ میں فرماتے ہیں: قولہ: کراہت سے خالی نہیں، اقول: کہ وہ اعانت بعیدہ ہے مطل فی اداء القرض کی، کیا دقیق تقویٰ ہے۔ اور اُستاذ کیسے مقدس، یا تو شاگرد کو لتاڑ رہے تھے یا ان ہی کا اتباع کر لیا۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب محشی بخاری رحمہ اللہ کا تقویٰ

حضرت مولانا احمد علی صاحب محشی بخاری کلکتہ میں مقیم تھے، وہیں پڑھایا کرتے تھے اور چھٹی کے زمانے میں سہارنپور آتے تو مظاہر علوم میں بھی پڑھاتے تھے۔ ایک دفعہ مدرسۂ قدیم کی تعمیر کے زمانے میں سہارنپور تشریف لائے اور یہ دیکھ کر کہ مدرسہ تعمیر ہو رہا ہے کلکتہ چندے کے لیے تشریف لے گئے، اور واپسی سفر پر اُن کے حساب کا پرچہ میں نے خود دیکھا، ایک ایک پیسہ کا حساب، کارڈ اور لفافہ کا اس میں

درج تھا، اور اخیر میں یہ بھی درج تھا کہ کلکتہ سے فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے کی غرض سے گیا تھا، اگر چہ چندہ وہاں اندازے سے زیادہ ہوا، مگر میرے سفر کی غرض چندہ کی نیت سے جانے کی نہیں تھی، اس لیے اتنی مقدار خرچ حساب میں سے وضع کر لیا جائے۔

حضرت مولانا مظہر صاحب رحمہ اللہ کا تقویٰ

حضرت مولانا مظہر صاحب مظاہر علوم اوّل صدر مدرس کا یہ دستور تھا کہ اوقاتِ مدرسہ میں اگر کوئی ذاتی عزیز ملاقات کے لیے آتا، تو بات شروع کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر اتنے منٹوں کو تاریخ وار درج کرتے رہتے تھے، اور ماہ کے ختم پر ان سب منٹوں کو جمع فرما کر اگر نصف یوم سے کم ہوتا تو آدھے روز کی رخصت اور زائد ہوتا تو پورے روز کی رخصت مدرسہ میں درج کرا دیتے، البتہ اگر کوئی فتویٰ وغیرہ پوچھنے آتا تو اس کا اندراج نہ کرتے۔

مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کا تقویٰ

مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم دیوبند ایک مرتبہ مدرسہ کے ڈھائی سو روپے لے کر مدرسہ کی سالانہ روداد طبع کرانے کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔ اتفاق سے روپے چوری ہو گئے۔ مولوی صاحب نے اس چوری کی کسی کو اطلاع نہیں کی اور مکان آکر کوئی زمین بیچ کر اور ڈھائی سو روپے لے کر دہلی پہنچے اور کیفیت چھپوا کر لے آئے۔ کچھ دنوں بعد اس کی اطلاع اہلِ مدرسہ کو ہوئی، اُنہوں نے مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کو واقعہ لکھا اور حکم شرعی دریافت کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ مولوی صاحب امین تھے اور روپیہ بلا تعدی کے ضائع ہوا ہے، اس لیے اُن پر ضمان نہیں۔ اہلِ مدرسہ نے مولانا محمد منیر صاحب رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ آپ روپیہ لے لیجیے اور مولانا کا فتویٰ دکھلا دیا۔ مولوی صاحب نے فتویٰ دیکھ کر فرمایا: کیا میاں رشید احمد نے فقہ میرے ہی لیے پڑھا تھا؟ اور کیا یہ مسائل میرے ہی لیے ہیں؟ ذرا اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھیں، اگر اُن کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپیہ لے لیتے؟ جاؤ! لے جاؤ اس فتویٰ کو، میں ہر گز دو پیسے بھی نہ لوں گا۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا تقویٰ

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ سہارنپور سے کانپور تشریف لے جارہے تھے۔ کچھ گنے ساتھ تھے جن کو محصول ادا کرنے کی غرض سے اسٹیشن پر تُلوانا چاہا، مگر کسی نے نہ تولا، بلکہ ازراہِ عقیدت ریلوے کے غیر مسلم ملازمین نے بھی کہہ دیا کہ آپ یوں ہی لے جایئے، ہم گارڈ سے کہہ دیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ: گارڈ کہاں تک جائے گا؟ کہا: غازی آباد تک۔ فرمایا: غازی آباد سے آگے کیا ہو گا؟ کہا گیا کہ یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا۔ حضرت نے فرمایا: اور آگے کیا ہو گا؟ کہنے لگا کہ وہ کانپور تک لے جائے گا اور وہاں آپ کا سفر ختم ہو جائے گا۔ فرمایا: نہیں، وہاں سفر ختم نہ ہو گا، ایک اور سفر آخرت بھی ہے، وہاں کیا انتظام ہو گا؟ یہ سن کر سب دنگ رہ گئے اور بہت متأثر ہوئے۔

حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری رحمہُ اللہ کا تقویٰ

حضرت مولانا عبد القادر صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ پنجاب کے سفر میں بہت بڑا مجمع ہو جاتا تھا، بہت دفعہ اس کی نوبت آئی کہ تشریف لے جانے سے پہلے حضرت رحمہ اللہ نے فرمادیا کہ: میں فلانے کا مدعو ہوں اور اس سے زائد پانچ آدمی میرے ساتھ ہوں گے، اس سے زائد جو ہوں وہ اپنے قیام وطعام کا انتظام کرلیں۔ حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہ کو ڈاکٹر برکت علی نے کچھ دنوں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں رہنے کو کہہ دیا تھا۔ حضرت رحمہ اللہ کو وہاں قیام کی وجہ سے اس دوران میں بہت چندہ بھی ہوا۔ حضرت رحمہ اللہ کو منع کیا گیا کہ حضرت کا قیام مدرسہ کی ضروریات میں داخل ہے، حضرت رحمہ اللہ کے یہاں قیام کی وجہ سے مدرسہ کو بھی بہت نفع ہے، مگر حضرت رحمہ اللہ نے منظور نہیں فرمایا، خود بھی چندے کے نام سے کرایہ ادا کیا اور حضرت رحمہ اللہ کے قیام کی وجہ سے جو مہمان پنجاب وغیرہ سے آتے تھے اُن سے بھی خاص طور سے تاکید کر کے چندہ دلوایا کہ ان لوگوں کا قیام بھی مدرسہ میں ہوتا تھا، خاص طور سے پاکستان سے آنے والے مہمانوں سے بھی چندہ دلوایا۔ اسی طرح رائے پور خانقاہ میں اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کی کوٹھی چونکہ مدرسہ میں وقف تھی اس لیے اُس کا کرایہ بھی حضرت چپکے چپکے چندے کے نام سے ادا کرتے رہتے تھے۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ؒ کا تقویٰ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ اپنے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ کے متعلق لکھتے ہیں:

مظاہر علوم کا جب سالانہ جلسہ ہوتا تھا، میں نے اکابر مدرسین وملازمین میں سے کبھی کسی کو جلسہ کے کھانے یا چائے یا پان کو کھاتے نہیں دیکھا۔ جملہ حضرات مدرسین اپنا اپنا کھانا کھاتے تھے جب بھی وقت ملے، البتہ حضرت قدس سرہ مدرسہ کے خصوصی مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے، لیکن حضرت کے مکان سے دس بارہ آدمیوں کا کھانا آتا تھا جو متفرق مہمانوں کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا، اسی میں سے حضرت نوش فرماتے تھے، مدرسہ کی کوئی چیز کھاتے نہیں دیکھا۔

مولانا عنایتِ الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ دوشب وروز مدرسہ کے اندر رہتے اور ظہر کے وقت یا رات کے بارہ بجے اپنے دفتر کے کونے میں بیٹھ کر ٹھنڈا اور معمولی کھانا تنہا کھالیتے تھے۔

مولانا ظہور الحق صاحب مدرس مدرسہ اس زمانے میں مطبخ طعام کے منتظم ہوتے تھے اور چوبیس گھنٹہ مطبخ کے اندر رہتے تھے لیکن سالن، چاول وغیرہ کا نمک کسی طالب علم سے چکھواتے تھے خود نہیں چکھتے تھے، جب وقت ملتا اپنے گھر جاکر کھانا کھا آتے۔ اسی طرح سے دیگر اکابر مدرسین کو میں نے کوئی شے مدرسہ کی چکھتے نہیں دیکھا۔

ان سب احتیاطوں کے باوجود حضرت سہارنپوری قدس سرہ جب ۴۴ھ میں مستقل قیام کے ارادہ سے حجاز تشریف لے گئے تو اپنا ذاتی کتب خانہ یہ فرماکر مدرسہ کے اندر وقف کر گئے تھے کہ نہ معلوم مدرسہ کے کتنے حقوق ذمہ رہ گئے ہوں گے۔ (اکابر کا تقویٰ:۳۷تا۳۸)

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے والد ماجد کا تقویٰ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ اپنے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمہ اللہ کے متعلق فرماتے ہیں:

میرے والد صاحب کے زمانہ میں مدرسہ کا مطبخ جاری نہیں ہوا تھا، نہ مدرسہ کے قریب کسی طباخ کا مکان تھا۔ گھر والوں کے نہ ہونے کے زمانہ میں جامع مسجد کے قریب ایک طباخ کی دکان تھی جس

کا نام اسمٰعیل تھا۔ اس کے یہاں سے کھانا آیا کرتا تھا۔ سردی کے زمانہ میں وہاں سے کھانا آتے آتے خصوصاً شام کو ٹھنڈا ہو جاتا تھا تو سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے سامنے اندر نہیں، بلکہ باہر رکھواتے تھے۔ اس کی تپش سے وہ تھوڑی دیر میں گرم ہو جاتا تھا، تو یہ فرما کر دو تین روپے ہر ماہ چندہ کے اندر داخل فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی آگ سے انتفاع ہوا ہے۔ تنخواہ تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ نے اپنے سات سالہ قیام مدرسہ میں کبھی لی ہی نہیں۔

(اکابر کا تقویٰ:۳۷)

اخلاصِ نیت کا بیان

لغت میں نیت کے معنی دل سے قصد اور ارادہ کرنے کے آتے ہیں۔ یہی چیز کسی عمل کے مقصد کا تعین کرتی ہے اور یہی چیز ہے جو کسی عمل کا باعث اور محرک ہوا کرتی ہے، لیکن شریعتِ مطہرہ کی خاص اصطلاح میں صرف ارادہ اور قصد کو نیت نہیں کہا جاتا، بلکہ ارادہ اور قصد کے ساتھ جب عبادت کو غیر عبادت سے، عادت کو غیر عادت سے یا ایک عبادت کو دوسری عبادت سے ممتاز کرنا مقصود ہو تو یہ نیت کہلائے گی، مثلاً:

ایک شخص دن بھر کھانے پینے سے پرہیز کرتا ہے، اب اس پرہیز کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں، مثلاً: حکیم نے ہر طرح کھانا پینا کچھ وقت کے لیے بند کیا ہے یا اس کی عادت ہے کہ صرف مغرب کے بعد کھاتا پیتا ہے اور دن بھر اس کو کسی چیز کے کھانے کا شوق ہی نہیں، یا پیٹ خراب ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور ایک وجہ پرہیز کی یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے لیے عبادت کے طور پر کھانے، پینے سے پرہیز کیا جائے، تو یہاں اس آخری قصد وارادے نے عبادت کو عادت سے جدا کر دیا۔ اسی کو اصطلاح میں نیت کہتے ہیں۔ اسی طرح کوئی نمازِ ظہر کی نیت کرتا ہے تو وہ اس نیت سے دوسری عبادات مثلاً عصر کی نماز کو الگ کر دیتا ہے۔

اخلاق میں نیت کی اہمیت

اخلاق کے متعلق جب یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ان کا تعلق انسان کے باطن سے ہے اور افعال واعمال انہی اندرونی کیفیات اور جذبات کے مظاہر، ثمرات، علامات اور نشانیاں ہیں تو اس سے یہ بات بھی خود بخود معلوم ہو گئی کہ اخلاص، تقویٰ کا رُکنِ اعظم ہے اور اخلاق کی بحث میں ارادہ اور نیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگر نیت صحیح نہیں تو بظاہر بڑے بڑے نیک کام حسنِ خلق اور نیکی کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ایسے بے روح کاموں کا نتیجہ آخرت میں نقصان اور خسران کے سوا کچھ نہیں، بلکہ دنیا میں بھی یہ اعمال کسی دنیوی تعریف وستائش کے قابل نہیں اور نہ ان کے اچھے نتائج نکلتے ہیں، بلکہ جس عمل میں اخلاص کی روح موجود نہ ہو تو ایسے بے جان اعمال اور بڑے بڑے کام معاشرے میں بھی اصلاح کے

بجائے بگاڑ کا سبب بن جاتے ہیں۔

بُری نیت سے درست عمل بھی فساد برپا کرے گا

بُری نیت کی وجہ سے صرف اعمال ہی بے جان نہیں بنتے بلکہ عمل کا جو ڈھانچہ اور جسم وجود میں آتا ہے، وہ ڈھانچہ اور جسم اپنی ظاہری چمک دمک کے باوجود چوں کہ بُری نیت سے بنا ہے، تو اُس بُری نیت کے برے اثرات معاشرے بلکہ پوری دنیا پر پڑیں گے، کیوں کہ ہر اختیاری عمل جس ارادہ اور نیت سے وجود میں آتا ہے، وہی ارادہ اور نیت اُس عمل کا اصل مواد ہوتا ہے، عمل اس کی صورت اور شکل ہوا کرتی ہے۔ اب اگر نیت، ارادہ اور مواد ہی فاسد ہے تو شکل وصورت خواہ کیسی ہی اچھی کیوں نہ ہو، اس سے نہ صرف یہ کہ آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہوگا، بلکہ اس کے بُرے اثرات معاشرے اور قوم پر بھی پڑیں گے۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اگر ایک شخص زہرِ قاتل کو عطر کی شکل میں، دودھ کے رنگ میں، شربت کی صورت میں یا دوا کی صورت، اور دوا کے نام سے پیش کرتا ہے تو بھی وہ زہر قاتل ہی ہے اور اس کا نقصان صرف اس کے پیش کرنے والے تک محدود نہ ہوگا، بلکہ ایسا شخص معاشرے اور قوم کو بھی نقصان پہنچائے گا، کیوں کہ بظاہر خوشبو اور مٹھاس وغیرہ فوائد کے باوجود یہ زہر قاتل بہر حال انسانی وجود کے لیے خطرناک ثابت ہوگا، اس لیے کہ ان اچھی صورتوں، شکلوں اور ناموں سے پیش کی جانے والی چیز کا مواد ہی مہلک اور نقصان دہ ہے۔

اسی طرح اگر کوئی بظاہر اچھا کام کرتا ہے مثلاً فقیروں کی امداد کرتا ہے، لیکن اس کا ارادہ اور نیت فاسد ہے، مثلاً نیت یہ ہے کہ لوگ مجھے بڑا شخص مان لیں تو ایسی صورت میں بظاہر چند فقیروں کو مالی فائدہ ہونے کے باوجود اس شخص کے اس عمل سے بھی باہمی اخوت، اُلفت اور رحم کے جذبات معاشرے میں نہیں بڑھیں گے، بلکہ اس سے کبر و بڑائی، ناچاقی اور بے رحمی کے جذبات کو فروغ ہوگا۔ دیکھیے! بعض اوقات لوگ مال پانی کی طرح بہا دیتے ہیں، مثلاً انتخابات کے موقع پر اُمیدوار فقیروں اور غریبوں کی خوب امداد کرتا ہے، لیکن چوں کہ نیت فاسد ہوتی ہے اس لیے اس ظاہری مودّت اور مہربانی سے معاشرہ بننے کے بجائے بگڑتا ہے۔ اِسی طرح بری نیت کے برے اثرات صرف اس بری نیت والے پر نہیں پڑتے

بلکہ اس کے غلط اثرات معاشرے پر بھی پڑتے ہیں۔ اگرچہ ان غلط اثرات کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ہم بگاڑ کو دوسری چیزوں کی طرف منسوب کریں، تاہم اس کا زیادہ تر تعلق دلوں اور نیتوں کے فساد سے ہوتا ہے۔

بُرا عمل ٹھیک نیت کے ساتھ بھی سخت خطرناک ہے

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات برا عمل ٹھیک نیت سے کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں اس ٹھیک نیت کا فائدہ معاشرے کو بھی پہنچنا چاہیے اور اس پر ٹھیک نیت کرنے والے کو بھی فائدہ اور ثواب ملنا چاہیے۔ مثلاً: کوئی شخص چوری صرف اس نیت اور ارادہ سے کرتا ہے کہ اس سے فقیروں کی امداد کرے، گویا ایسی صورت میں چوری کا تخم یا مواد فقیروں کی ہمدردی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اس کے جذبات ایک طرف تو اچھے ہیں، لیکن دوسری طرف اس کے جذبات برے بھی ہیں، کیوں کہ جس طرح فقیروں کی امداد کرنا ایک اچھا جذبہ ہے، اسی طرح چوری ڈاکہ، ظلم کے جذبات اپنے اندر لیے ہوئے ہے، ورنہ اگر یہ چوری کرکے یا ڈاکہ ڈال کر فقیروں کی امداد کر سکتا ہے، تو ایسا بھی تو کر سکتا ہے کہ محنت مزدوری کرکے کمائے اور پھر اس سے فقیروں کی امداد کرے، لیکن اس کے اندر چونکہ حرص اور ظلم کے جذبات بھی ہیں اس لیے وہ دوسروں کے اموال کو چراتا ہے یا غصب کرتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی زہر گوندھ کر اس کے برتن بنائے اور پھر اس زہریلے برتن میں دودھ ڈال کر پیش کرے، ایسی صورت میں یہ شخص بعض اوقات دُگنے جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک تو زہر کی وجہ سے لوگوں کو نقصان پہنچا رہا ہے اور دوسری طرف دودھ کو بھی ضائع کر رہا ہے۔

اسی طرح اچھی نیت کے ساتھ برے عمل کو سمجھیے کہ بسا اوقات اچھی نیت کے ساتھ برا عمل کرنے میں دگنا جرم ہوتا ہے اور یہ جرم اس وقت اور بھی سخت اور خطرناک ہو جاتا ہے جب اس برے عمل اور کام کو شرعی جواز کے بغیر حلال سمجھا جائے کہ ایسی صورت میں شرعی حرام کو حلال سمجھنا کفر اور احکامِ الٰہی سے بغاوت کی بات ہوگی۔

اس پوری تفصیل سے جو بات معلوم ہوئی وہ یہ کہ اختیاری اعمال کا مواد انسان کا ارادہ اور نیت ہے۔ صحیح اور درست عمل وہی ہے جس کا جسم اور ڈھانچہ بھی صحیح ہو (یعنی وہ کام بھی اچھا ہو) اور اس عمل کی یہ اچھی صورت جس نیت اور جذبے سے وجود میں آچکی ہو، وہ بھی بالکل صحیح اور درست ہو۔ جو عمل برا

ہے، لیکن اس کا وجود اچھی نیت سے بن چکا ہے تو ایسی صورت صحیح مواد کو غلط اور ظلم کے زہریلے مواد سے خلط ملط کرنا یا اپنی ٹھیک نیت اور مواد کو زہریلی چیزوں میں پیش کرنا ہے، ایسا عمل بعض حالات میں برا، بعض حالات میں بدترین اور بعض حالات میں انتہائی سخت گھناؤنا جرم بن جاتا ہے۔ جو شخص اچھا عمل بری نیت سے کرتا ہے تو ایسی صورت میں یہ شخص اور بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے کہ وہ زہریلے مواد کو اچھی صورت میں پیش کر کے قوم اور معاشرہ کو برباد کر دیتا ہے اور یہی وہ نفاق اور ریاکاری ہے جس کے ادنیٰ سے اعلیٰ تک بے شمار درجات ہو سکتے ہیں جیسا کہ اس کا بیان "کتاب الایمان" میں موجود ہے۔

خلوصِ نیت اور صحتِ عمل کے باوجود بلا ایمان عمل بے کار ہے

رہی یہ بات کہ ارادہ بھی ٹھیک ہے اور عمل بھی درست اور اچھا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہیں، یعنی دینِ اسلام کو قبول نہیں کیا ہے تو ایسے عمل کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟ مثلاً: کسی غیر مسلم کو مخلوق پر ترس اور رحم آجاتا ہے اور وہ اسی ترس اور رحم کے جذبے سے فقرا اور ناچار لوگوں کی امداد کرتا ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ ایک غیر مسلم رحمدل ہو سکتا ہے۔ وہ اس رحمدلی کی بنیاد پر لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ایسے عمل کا فائدہ دنیا میں اس رحمدل کو بھی ہو سکتا ہے اور معاشرہ پر بھی کچھ اچھے اثرات پڑ سکتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے، ایسے شخص میں اگر دوسرے سخت امراض نہ ہوں تو اکثر ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ جاتے ہیں اور دینِ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں، لیکن دوسری بدبختیوں کی وجہ سے اگر کوئی اسلام سے محروم رہ جاتا ہے اور کفر کی حالت میں دنیا سے چلا جاتا ہے تو اس کے دل میں چوں کہ ایمان نہیں ہے جو اس عمل کی روح اور بنیاد ہے، اس لیے ایسی صورت میں اس عمل کا دنیاوی فائدہ تو ہو گا لیکن روح اور بنیاد سے خالی ہونے کی وجہ سے وہ دائمی طور پر کارگر ثابت نہ ہو گا اور آخرت میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

نیت اور عمل کے صلاح وفساد کا خلاصہ

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہوا کہ اختیاری اعمال میں بڑی بڑی چار صورتیں بن گئیں:

۱۔ مواد: یعنی نیت اور ارادہ بھی صحیح ہو اور اس سے بننے والا وجود اور ڈھانچہ، یعنی عمل بھی صحیح اور درست ہو اور ایسا عمل کرنے والا مؤمن بھی ہو، ایسے شخص کے جس قدر جذبات اور ارادے نیک اور اچھے ہوں گے اور جس قدر ایمان ویقین اور رضائے الٰہی میں زیادہ پختہ ہوگا، اسی قدر اس کے اعمال وزنی ہوں گے۔ دنیا آخرت دونوں کے لحاظ سے اسی قدر صحیح اور اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

۲۔ ٹھیک نیت وارادہ اور جذبات سے کام کر رہا ہے اور کام بھی ٹھیک اور درست ہے، لیکن کرنے والا مسلمان نہیں، تو دنیا کے لحاظ سے فائدہ ہوگا، لیکن اگر ایسا شخص کفر کی حالت میں مرا، تو بنیاد اور ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آخرت میں اس کے اعمال بے کار ہوں گے اور وہ آخرت کے لحاظ سے گھاٹے اور نقصان میں ہوگا۔

۳۔ ایمان بھی ہے اور جذبات وارادے بھی اچھے ہیں، لیکن بری اور غلط شکل میں اس کو پیش کرتا ہے۔ اس سے کام کی نوعیت اور غلط ہونے کے لحاظ سے اسی قدر بد نتائج دنیا میں برآمد ہوں گے اور بعض صورتوں میں بدترین جرائم کا مرتکب ہوگا جس کی وجہ سے آخرت میں بھی نقصان اٹھائے گا۔

۴۔ نیت فاسد اور خراب ہے، لیکن ریاکاری کی وجہ سے وہ اس کو ٹھیک اور درست جسم اور ڈھانچے میں پیش کرتا ہے، یعنی دھوکہ دہی اور ریاکاری کے لیے اچھا عمل کرتا ہے تو ایسے شخص کا یہ عمل دنیا کے لحاظ سے بھی معاشرے اور قوم کے لیے نتائج کے اعتبار سے فائدہ مند نہیں اور آخرت میں تو نقصان ہی نقصان ہے۔ پھر جس قدر ریاکاری زیادہ ہوگی اسی قدر اس کے دنیاوی واخروی نقصانات بھی زیادہ ہوں گے۔

فساد کا سبب فسادِ نیت ہے

آج کل اکثر قوموں، ملکوں، قبیلوں اور گھروں میں، بلکہ بظاہر دیندار معاشرے کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے درمیان بھی اخوت اور الفت کے آثار بہت کم پائے جاتے ہیں اور ظاہری طور پر اچھے اور عمدہ کاموں کے باوجود معاشرے میں فساد بڑھ رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ نیتوں کا فساد ہے۔ درست

اعمال کے ڈھانچوں میں بری نیتوں کی نجاست معاشرہ کو بدبودار کرتی ہے۔ معاشرے میں کینسر کی طرح ریاکاری، ظاہر داری، نمائش اور حرص ولالچ کی وبا پھیل رہی ہے جس کی وجہ سے انسانوں کے دلوں میں الفت و اخوت اور رحمت کے جذبات کے بجائے منافقت، تنفر اور خود غرضی کے جذبات بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ یہ ریاکاری اور بے اخلاصی کے دنیوی نقصانات ہیں اور اس کے جو غلط اثرات ریاکاروں کی آخرت کی ابدی زندگی پر پڑتے ہیں وہ تو اس قدر گھناؤنے ہوں گے جن کا تصور بھی اس دنیا میں نہیں کیاجاسکتا۔ اس کا مزید بیان ان شاءاللہ تعالیٰ آگے آجائے گا۔

خلوصِ نیت

خالص اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کسی دوسری جنس کی آمیزش اور ملاوٹ نہ ہو، مثلاً: ہم کہتے ہیں کہ یہ دودھ خالص ہے، یہ گھی خالص ہے یہ شہد خالص ہے، یعنی ان میں کسی دوسری جنس کی کوئی ملاوٹ اورآمیزش نہیں ہے۔

چوں کہ اخلاص کا اصل انسان کا ارادہ اور نیت ہے اور نیت میں ہی اخلاص ہوتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نیت صرف ایک ہی چیز کی ہو اور صرف ایک ہی چیز اس کام اور عمل کا محرک بنے۔ اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نیت خالص ہو، اس میں سوائے رضائے الٰہی کے اور کسی چیز کی آمیزش نہ ہو، یعنی درست اور ٹھیک کام کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے سوا ہر غرض سے پاک رکھا جائے، نہ تو اس میں دکھاوے کی بو پائی جائے، نہ جسمانی راحت اور نہ کوئی دوسرا ذاتی مفاد اس میں پایا جائے۔ اگر کسی عمل کا محرک صرف رضائے الٰہی نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ دوسری جنس کی نیت بھی پائی جائے تو وہ عمل خالص نہ رہے گا اور عمل میں جس قدر رضائے الٰہی کے سوا نیت پائی جائے گی، اسی قدر وہ عمل خالص نہ رہے گا۔

ہر عمل کی مختلف نیتیں ہوسکتی ہیں

بلاشبہ انسان کے ہر عمل کا محرک پست سے پست اور بلند سے بلند ہوسکتا ہے۔ مثلاً ایک انسان کسی دوسرے کے ساتھ تعاون کرتا ہے تو اس تعاون اور امداد کی مختلف اغراض ہوسکتی ہیں مثلاً یہ کہ:

۱۔ وہ اس سے خوش ہو کر اس کی مالی امداد کرے۔

۲۔ لوگوں میں مشہور ہو جائے کہ بہت بڑا خدمت گزار ہے تو وہ انتخابات میں اس کے حق میں ووٹ ڈال دیں گے۔

۳۔ لوگ اس کو متواضع، بااخلاق اور دین دار شخصیت جان کر اس کی عزت واحترام کریں۔

۴۔ لوگوں کے ساتھ تعاون اس لیے کرتا ہے تا کہ کل اس کے ساتھ بھی وہ تعاون کریں۔

۵۔ وہ لوگوں کی خدمت سے طبعاً خوش ہوتا ہے اور اسی لیے تعاون و خدمت کرتا ہے کہ لوگوں کی خدمت کر کے اپنی خوشی کا سامان کرے۔

۶۔ اس کا تعاون کسی انسان سے محبت کی وجہ سے ہو۔

۷۔ اس کو کسی احسان کا بدلہ دینا مقصود ہو۔

۸۔ اس شخص کے دل میں رحم وترس زیادہ ہے جب بھی وہ کسی کو تکلیف اور مشقت میں دیکھتا ہے تو اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔

۹۔ اس کے تعاون اور خدمت سے مقصود صرف اور صرف خالقِ کائنات اللہ رب العالمین کی رضا و خوشنودی ہو۔

۱۰۔ مقصود یہ ہو کہ اس کام کی وجہ سے جنت مل جائے گی۔

اس طرح ایک ہی کام کی کئی مختلف اغراض ہو سکتی ہیں جو ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ کی طرف بہت سے درجات پر تقسیم ہو سکتی ہیں۔ جو نیت اور غرض جس قدر ذاتی اور نفسانی خواہش کے رنگ میں رنگی ہو وہ اس قدر پست ہو گی اور جو جس قدر ذاتی اور نفسانی غرض سے پاک ہو، وہ اتنی ہی قابل قدر اور بلند ہو گی۔

پھر انسانوں کی اغراض اپنی قوت اور ضعف کے لحاظ سے بھی ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجات میں تقسیم ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کوئی زیادہ لالچی ہوتا ہے کوئی کم، کوئی زیادہ متقی اور پاک باز ہوتا ہے اور کوئی اس سے کم۔

یہاں ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ جنت کے حصول کے لیے کوئی کام کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں۔ یہ بھی بہت ہی اعلیٰ مقصد ہے، لیکن سب سے اعلیٰ اور بلند ترین مقصد یہ ہے کہ ہر کام صرف

اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے کیا جائے، اور اس کے ایمان و یقین اور معرفتِ الٰہی کے بقدر ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجات ہو سکتے ہیں۔ جو شخص جس قدر ایمان و یقین اور معرفتِ الٰہی میں بڑھا ہوا ہو، اس کا اخلاص و یقین اُسی قدر وزنی اور بڑھا ہوا ہو گا اور اسی قدر اس کے اعمال وزنی ہوں گے۔ مثلاً عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و یقین اور ان کے خلوص کا یہ حال تھا کہ ان کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لَاتَسُبُّوْا اَصحَابِیْ فَلَوْاَنَّ اَحَدَکُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَھَبًا مَابَلَغَ مُدَّاَحَدِھِمْ وَلَا نَصِیْفَہٗ ”تم میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو بُرا نہ کہو حقیقت یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد کے پہاڑ کے برابر سونا (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کر دے تو اس کا ثواب میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک مُدّ (یعنی ایک صاع کے چوتھائی حصہ) یا آدھے مُدّ (یعنی صاع کے آٹھویں حصہ) تک بھی نہیں پہنچ سکتا“۔

(صحیح بخاری و مسلم)

جب عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلوص کا یہ حال ہے تو خاص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلفائے راشدین کے خلوص کی شان کیا ہو گی؟ غرض اعمال کا وزن ایمان و یقین اور خلوص کے بقدر ہوتا ہے۔ جس عمل میں جس قدر اخلاص ہو گا، اسی قدر وہ عمل وزنی ہو گا۔

اب اخلاص کے فضائل اور ریاکاری کی مذمت اور وعیدوں کو پڑھ لیجیے:

قرآن مجید میں اخلاص کے فضائل اور ریاکاری کی مذمت

اخلاص کے فضائل اور ریاکاری کی مذمت قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آئی ہے۔ ان میں سے چند کو پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ وَمَاتُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ

”اور تم اللہ تعالیٰ ہی کی رضامندی کے لیے خرچ کرتے ہو“۔

(سورۃ البقرۃ: آیت ۲۷۲)

۲۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝

”اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بھی بیچ ڈالتے ہیں (یعنی جو اپنے پروردگار کی رضاجوئی کے لیے اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لیے ہر وقت

تیار رہتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے"۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۲۰۷)

۳۔ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ فَسَوۡفَ نُؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ۝

"اور جو کوئی یہ کام اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کرے تو ہم اس کو اَجرِ عظیم دیں گے"۔ (سورۃ النساء: آیت ۱۱۴)

ان آیات سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہ عمل قبول ہوتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہو، خواہ وہ نماز، روزہ، صدقہ و خیرات ہو یا بندوں کے حقوق۔ ہر درست کام کے اندر صرف ایک ہی جذبہ کار فرما ہو اور وہ یہ کہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ اہلِ عقل کے چند اوصاف بیان فرماتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے عہد وپیمان کو توڑتے نہیں اور وہ اس چیز کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑے رکھنے کا حکم فرمایا ہے (یعنی والدین، رشتہ داروں اور بندوں کے حقوق ادا کرتے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں)۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ یہ کام کسی نمود و نمائش یا دنیوی غرض سے نہیں کرتے، بلکہ وَيَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ وَيَخَافُوۡنَ سُوۡٓءَ الۡحِسَابِ وَالَّذِيۡنَ صَبَرُوا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِمۡ یعنی "اور وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں اور جو اپنے رب کی خوشنودی میں (حق پر) ثابت قدم رہتے ہیں"۔ (سورۃ الرعد: آیت ۲۰ تا ۲۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ سب کچھ (نیک کام کرنا) دنیا کے لیے نہیں، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی طلب اور اس کے عذاب کے خوف سے سبب ہے اور اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی راہ میں جو مشکلات و مصائب پیش آتے ہیں وہ ان کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے برداشت کرتے ہیں۔ وہ کسی سختی سے گھبرا کر راہِ حق سے نہیں ہٹتے اور ان کا یہ صبر واستقلال بھی صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہی کے لیے ہوتا ہے، نہ اس لیے کہ لوگ ان کو مستقل مزاج و بہادر وغیرہ کے القابات و خطابات سے یاد کریں اور نہ ان کے صبر کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسے مجبور ہوں کہ صبر کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ ان کے انفرادی، اجتماعی دینی کام اور ان کا صبر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے ہو۔ یہی لوگ عقلمند ہیں اور ان ہی لوگوں کو کامیابیاں ملتی ہیں۔

اخلاص کی اس حقیقت کو سورۂ دہر میں یوں واضح فرمایا:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۞ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۞ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۞

"اور وہ اس کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں، محتاج کو، یتیم کو اور قیدیوں کو، ہم تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں، ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ (اور شاباش)۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس دن کے شر (اور آفت ومصیبت) سے ان کو بچایا اور ان کو تازگی اور سرور (خوشی) سے نوازا"۔ (سورۃ الدہر: آیت ۸ تا ۱۱)

اخلاص والا عمل آخرت کی کھیتی میں

انسان کا عمل گویا ایک بیج اور تخم ہے، جو شخص صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کوئی درست عمل کرتا ہے تو وہ اس کو آخرت کی کھیتی میں کاشت کرتا ہے وہ اس عمل کی بہار اور باغات آخرت میں دیکھے گا۔

۴۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۞ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی) میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ (بویا جائے اور وہ) سات بالیں (خوشے) اگائے اور ہر بالی (خوشے) میں سو دانے ہوں، اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے (اس کے ایمان ویقین اور نیت کے بقدر اس سے بھی زیادہ) بڑھا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا، جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ دل آزاری کرتے ہیں، ان کے

لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور نہ تو ان پر کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگیں ہوں گے "۔

(سورۃ البقرۃ: آیت ۲۶۱ تا ۲۶۲)

ان آیات سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال و جان میں سے کچھ لگاتے ہیں، مخلوق کی خدمت کرتے ہیں، اگر وہ اس خرچ و خدمت کے بعد احسان جتلاتے ہیں یا کسی پہلو سے بھی کوئی دل آزاری کرتے ہیں تو یہ بھی اخلاص کے منافی ہے۔ اس کی وضاحت آنے والی آیات میں موجود ہے۔

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آخرت کی کھیتی میں پڑنے والا عمل ہمیشہ کے لیے بڑھتا رہتا ہے، پھلتا پھولتا رہتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمال کا ثواب اور بڑھوتری عمل کی نوعیت، عمل کے زمانے اور عمل کرنے والے کی ظاہری و باطنی کیفیات اور اس کے ایمان ویقین پر مبنی ہو گی۔ اگر ایک نیکی مشکل حالات اور کم وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اس کا اجر آسان حالات اور وسائل کی فراوانی کے ساتھ کی جانے والی نیکی کی نسبت زیادہ ہو گا۔ اسی طرح ایک نیک عمل پورے جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا تو اس کا اجر و ثواب کم جوش و خروش سے کیے ہوئے عمل کی نسبت زیادہ ہو گا۔

ہر نیکی ایمان ویقین، حالات اور اخلاص کے مطابق تولی جائے گی۔ اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ جسے چاہتا ہے، بڑھاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی چاہت اس کے قانونِ مشیت کی حکمت اور عدل پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لیے بعد میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور جاننے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو چھوٹی یا بڑی، پوشیدہ یا اعلانیہ نیکی کی جاتی ہے، اس کی مقدار، نوعیت اور کیفیت سب کی سب اس کے علم میں رہتی ہے، اور اُس کے خزانے بھی لا محدود ہیں، اس کا علم بھی غائب و حاضر پر محیط ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق اجر دے گا اور اس کے خزانوں میں اس سے کوئی کمی نہیں آسکتی۔

احسان جتلانا یا دل آزاری کرنا ریاکاری جیسا ہے

پہلے بھی بتایا گیا تھا کہ نیکی کر کے احسان جتلانا یا کسی بھی پہلو سے نیکی کرنے کی وجہ سے کسی کی دل آزاری کرنا اخلاص کے منافی اور ریاکاری کے مترادف ہے۔

۵۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْہِ تُرَابٌ فَاَصَابَہٗ وَابِلٌ فَتَرَکَہٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ۝ وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ کَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَھَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُکُلَھَا ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

"اے ایمان والو! احسان جتلا کر اور دُکھ پہنچا کر اپنے صدقات کو اس شخص کی طرح برباد مت کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، پس اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنی چٹان ہو جس پر کچھ مٹی پڑی ہو، پھر اس پر زور کی بارش برسے تو (وہ ساری کی ساری مٹی کو بہا کر) اس کو بالکل صاف کر دے۔ ایسے لوگوں کو اپنی (خیرات وصدقات کی) کمائی ذرہ برابر بھی ہاتھ نہ لگے گی اور اللہ تعالیٰ کفر اختیار کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اور (اس کے برعکس) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور اپنے دلوں کو مضبوط اور پختہ کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو (اگر) اس پر زور کی بارش برسے تو دگنا پھل لائے اور اگر اس پر بارش نہ (بھی) برسے تو شبنم ہی اس کے لیے کافی ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کا خوب دیکھنے والا ہے"۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۲۶۴ تا ۲۶۵)

ان آیات میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ ریاکاری کے ساتھ صدقہ وخیرات کرنے والے کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ولا یومن باللہ والیوم الآخر "وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتا"۔

ظاہر ہے کہ یہ قید اس لیے تو نہیں رکھی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہو تو پھر ریاکاری کے ساتھ صدقہ وخیرات کا ثواب ملے گا، بلکہ ریاکار کا اجر وثواب تو صرف اس کی ریاکاری ہی سے باطل ہو جاتا ہے، اگرچہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ تو یہاں ان الفاظ کو اس لیے لایا گیا کہ جس شخص کو

اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر کامل ایمان ویقین ہو، وہ ہرگز لوگوں کو دکھانے کے لیے کوئی کام نہیں کرے گا۔ یہ ریاکاری تو منافق لوگوں کے مناسبِ حال ہے۔ مؤمن کی یہ شان نہیں کہ وہ ریاکاری کرے۔

۲۔ دوسری بات یہاں یہ بتائی گئی کہ جو شخص صدقہ وخیرات دے کر احسان جتلائے، یا دینی خدمات پر فخر کرے، یا ان صدقات وخیرات اور خدمات کی وجہ سے کسی کو کسی پہلو سے ستائے، اس کو ایذا پہنچائے تو اس کا عمل بھی اسی طرح باطل ہو جاتا ہے جس طرح ریاکار کا عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ اعمال جو بظاہر خالص نیت سے کیے گئے ہوں ان کی حفاظت بھی سخت ضروری ہے اور بظاہر اخلاص سے کیا ہوا عمل بھی انسان کے اپنے ہاتھوں ضائع ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنی دینی خدمات پر فخر کرتے ہیں یا لوگوں پر احسان جتلاتے ہیں یا کسی پہلو سے ستاتے ہیں تو ان کی دین داری اوپری ہوتی ہے، اُن کی دین داری راسخ نہیں ہوتی اس لیے بعد کے حالات اس کی دین داری اور نیک کاموں سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ اور خود ہی ان کو بتا دیتے ہیں کہ تمہارے یہ اعمال اخلاص سے نہ تھے ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے ہوتے تو لوگوں پر احسان جتلانے یا ان کو ستانے کا کیا معنیٰ؟

۳۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے صدقہ کی تمثیل بھی بیان کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور تثبیتِ نفس کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ یہ تثبیتِ نفس کیا ہے؟۔ تثبیت، ثبت سے نکلا ہے اور ثبت کے معنیٰ ہیں ثابت رہنا، ایک حالت پر جمے رہنا۔ تو تثبیت کے معنیٰ ہیں مضبوط کرنا، جمائے رکھنا اور مستحکم کرنا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے مال کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ اس مقصد سے بھی خرچ کرتے ہیں کہ وہ اس طرح اپنے نفس کی تربیت کریں تا کہ وہ دین کے احکام کی تعمیل اور خدمتِ خلق میں اللہ تعالیٰ کے لیے اچھی طرح پختہ اور مضبوط ہو جائیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانی ومالی قوتوں کو خرچ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کرنا، ایک ریاضت اور مجاہدہ ہے جو ابتداءً نفس پر شاق اور گراں گزرتا ہے، لیکن مسلسل خدمتِ خلق اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانی ومالی قوتوں کو خرچ کر کے انسان کا نفس قابو میں آجاتا ہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا، مخلوق کی خدمت کرنا اور لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کرنا اس کی عادت اور صفت بن جاتی ہے اور اس طرح انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے قُرب کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔

۴۔ ان آیات میں غیر مخلص اور اپنی خدمت اور خرچ کا احسان جتانے والوں کی تمثیل اس کاشتکار سے دی ہے جس نے اپنی فصل ایسی زمین میں بوئی جس کے نیچے سخت اور چکنی چٹان ہو اور جب اس پر بارش کا جھونکا آئے تو چٹان کے اوپر کی ساری مٹی فصل سمیت بہہ جائے اور نیچے خالی چٹان نکل آئے۔ اس مثال سے یہ بتایا جارہاہے کہ جس طرح اس کاشتکار کی ساری محنت اور بویا ہوا تخم بھی ضائع اور برباد ہو جاتا ہے اسی طرح اس خیرات کرنے والے کے صدقات و خیرات اور خدمات بھی برباد اور ضائع ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جو خیرات اور خدمات کر کے احسان جتاتا ہے اور دل آزاری کرتا ہے، وہ غیر مخلص ہے اور اس کی دینداری اور اخلاص وقتی اور عارضی ہیں۔ مخصوص حالات اس کی دینداری اور اخلاص سے پردہ اٹھادیتے ہیں۔

ان آیات میں ان لوگوں کے انفاق کی تمثیل بھی بیان ہوئی ہے جو اپنے مال کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اپنے نفس کی تربیت کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ بے شک یہ لوگ اپنی خدمات کی عظیم اجر پائیں گے، کیوں کہ انہوں نے بہہ جانے والی (دنیا کی) زمین پر باغ لگانے کے بجائے (آخرت کی) ایسی بلند سطح اور اچھی آب وہوا والی زمین پر اپنا باغ لگایا ہوا ہے کہ بارش ہو تو وہ اس کو برباد کرنے کے بجائے اس کی بار آوری کو دوچند کر دیتی ہے اور اگر بارش نہ بھی ہو تو شبنم اور ہلکی پھوار بھی آب وہوا کی وجہ سے اس کی کفایت کرتی ہے۔

اخلاص کی برکت اور قیمت

مذکورہ بالا آیات میں غور و فکر کریں۔ ان دونوں آیتوں میں صدقات و خیرات کرنے والے دو قسم کے آدمیوں کا بیان آیا ہے۔ ایک وہ جس کی نیت اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی نہیں، بلکہ اس کے سوا کوئی دوسری غرض ہو، مثلاً لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنا مال خیر کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی نیت اور غرض سے غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی مدد کرتے ہیں اور اپنا مال خیر کے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے ظاہری عمل میں بظاہر کوئی فرق نہیں، کیوں کہ دونوں بظاہر یکساں طور پر اپنا مال

غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں پر خرچ کرتے ہیں، مگر قرآن مجید بتلاتا ہے کہ ان دو قسم کے لوگوں کی نیتیں چوں کہ مختلف ہیں، اس لیے دونوں کے عمل کے ثمرات و نتائج بھی مختلف ہیں۔ ایک کا عمل سراسر خیر وبرکت اور دوسری قسم کے لوگوں کا بالکل ضائع وبرباد۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اخلاص والا عمل قبول ہے

اللہ تعالیٰ کسی کے صرف ظاہری عمل کو نہیں دیکھتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی نظر دلوں اور جذبات پر بھی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہ عمل قبول ہے جو محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہو۔

۶۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ " اللہ تعالیٰ کے پاس تمہاری ان قُربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ اس کے پاس تو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے "۔ (الحج: آیت ۳۷)

اس آیت میں قُربانی کی اصل حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اونٹ وغیرہ کی قُربانی پیش کر کے اپنے دل کی اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ یا اللہ! جس طرح ہم نے آپ کے دیے ہوئے اونٹ وغیرہ کو ذبح کیا ہے، اسی طرح اپنے نفس کو ذبح کر کے آپ کے ہر حکم پر اپنی تمام خواہشاتِ نفس کو قُربان کرتے ہیں اور آپ کے دیے ہوئے مال، اولاد اور جان کے ساتھ خود بھی تیری راہ میں اسی طرح قُربان ہونے کے لیے تیار ہیں۔ انسان کا یہی خلوص اور اللہ تعالیٰ کے قوانین اور ہدایت کی نگہداشت کا یہی جذبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچتا ہے۔ لہٰذا قُربانی کا جانور ذبح کر کے محض گوشت کھانے کھلانے یا اس کا خون گرانے سے تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کبھی حاصل نہ ہو گی جب تک تمہاری قُربانیوں پر تقویٰ کا رنگ نہ ہو۔ جس شخص کے دل میں جس قدر خلوص ہو گا اور اس کے عمل پر جتنا زیادہ تقویٰ کا رنگ چڑھا ہو گا اس کی قبولیت اور اجر و قیمت اتنی زیادہ ہو گی اور جو عمل خلوص و تقویٰ سے خالی ہو گا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہ ہو گی اور نہ آخرت میں اس عمل پر کچھ ملے گا۔

اخلاص اور ریاکاری کے متعلق چند احادیث

قرآن مجید کی مذکورہ بالا چند آیات جو اخلاص کے بارے میں نقل کی گئی ہیں، ان سے اخلاص کی قدر وقیمت اور ریاکاری کے نقصانات اور تباہ کاریاں اچھی طرح سامنے آئیں۔ اب اس کے متعلق نبی کریم ﷺ کے چند ارشادات بھی پڑھ لیجیے:

۱۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّۃِ وَاِنَّمَا لِامْرِءٍ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِامْرَأَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَاھَاجَرَاِلَیْہِ

”انسانی اعمال کا دارومدار بس نیتوں پر ہے اور آدمی کو اس کی نیت ہی کے مطابق پھل ملتا ہے۔ تو جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کی (یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضاجوئی اور اطاعت کے سوا اس کی ہجرت کا کوئی اور محرک نہیں تھا) تو اس کی ہجرت در حقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی کی طرف ہوئی (اور اس کو اس ہجرت پر اجرِ عظیم ملے گا) اور جو شخص کسی دنیاوی غرض کے لیے، یا عورت سے نکاح کے لیے ہجرت کرتا ہے (اس کی یہ ہجرت اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے لیے نہ ہوگی، بلکہ جس دوسری نیت اور غرض سے اس نے ہجرت کی ہے عنداللہ بس) اس کی طرف اس کی ہجرت مانی جائے گی“۔ (بخاری ص ۱۲۱۴ و مسلم ص ۷۶۰)

اخلاص کے بغیر بڑے سے بڑا کام بھی بے قیمت اور مردود ہے

اس حدیث میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ تمام اعمال کے صلاح وفساد، خیر وشر، عنداللہ مقبول ہونے یا مردود ہونے کا دارومدار انسان کی نیت پر ہے۔ عملِ صالح وہی ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر وقیمت اُس عمل کی ہوگی، جو درست ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے کیا گیا ہو، اور خیر کا جو بھی کام کسی بری غرض اور فاسد نیت سے کیا گیا ہو، وہ نہ اعمالِ صالحہ کے زمرے میں آئے گا اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا۔ اگرچہ بظاہر وہ بہت ہی نیک اور خیر کا کام سمجھا جاتا ہو، لیکن اس میں جس قدر فاسد نیت اور غرض ہوگی اس کے مطابق وہ عمل فاسد اور مردود ہوگا۔

۲۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جن لوگوں کے خلاف فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا جائے گا، ان میں ایک شہید ہو گا۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے لایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ میں نے تجھے کیا کیا نعمتیں دی تھیں، وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی سب نعمتوں کا اقرار کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ بتا! تو نے ان نعمتوں میں رہ کر کیا کام کیا؟۔ وہ عرض کرے گا کہ میں نے تیری راہ میں جہاد کیا، یہاں تک کہ شہید کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تُو جھوٹ کہتا ہے، تو نے جہاد اس لیے کیا تھا کہ لوگ تجھے بڑا بہادر کہیں (اور تیرا یہ مقصد تو حاصل ہو چکا ہے، کیوں کہ دنیا میں) لوگ تجھے بڑا بہادر کہہ چکے ہیں۔ اس کے بعد اس کو جہنم میں پھینک دیے جانے کا حکم ہو گا اور وہ اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

دوسرا شخص وہ ہو گا، جس نے علم دین حاصل کیا ہو گا اور دوسروں کو اس کی تعلیم بھی دی ہو گی اور قرآن مجید بھی خوب پڑھا ہو گا۔ اس کو بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے انعامات اور احسانات یاد کرا کے اس سے بھی دریافت فرمائے گا کہ ان نعمتوں میں رہ کر تو نے کیا عمل کیا؟ وہ نعمتوں کا اقرار کر کے کہے گا کہ اے اللہ ! میں نے علم سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور تیری رضاجوئی میں قرآن مجید پڑھتا رہا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے جھوٹ بولا، تو نے علم اس لیے سیکھا تھا اور قرآن تو اس لیے پڑھتا تھا کہ تجھے عالم و قاری و عابد کہا جائے، لہٰذا (تیرا یہ مقصد تجھے حاصل ہو چکا ہے اور دنیا میں) تیرا عالم ہونا، قاری ہونا اور عابد ہونا مشہور ہو چکا ہے، پھر اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہو جائے گا اور وہ بھی اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

تیسرا شخص ایک سخی ہو گا جس پر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بڑی وسعت فرما رکھی ہو گی، ہر طرح کا مال اس کو عطا فرمایا ہو گا۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں اور احسانات بتلائے گا۔ وہ سب کا اقرار کرے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس سے بھی پوچھے گا کہ تو نے میری ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ عرض کرے گا کہ اے اللہ! جس جس راستہ اور جن جن کاموں میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے، میں نے تیرا دیا ہوا مال ان سب ہی راستوں میں خرچ کیا ہے اور صرف تیری رضاجوئی کے لیے خرچ کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ (اس کے جواب میں یہی) فرمائے گا کہ تو نے جھوٹ کہا۔ درحقیقت یہ سب کچھ تو نے

اس لیے کیا کہ دنیا میں تو سخی مشہور ہو، پس (تیرا یہ مقصد تجھے حاصل ہو چکا ہے اور دنیا میں) تیری سخاوت اور فیاضی مشہور ہو گئی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں حکم فرمائے گا اور وہ بھی اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم، مشکوۃ کتاب العلم)

تین عظیم کام اور عظیم شخصیتیں

بلاشبہ کفر و ظلمت اور باطل کے خلاف مال و جان سے لڑنا اور اپنا سر حق کی خاطر قربان کرنا بہت ہی عظیم کام ہے۔ اسی طرح علم دین کا حصول و فروغ جس میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات، عقائد اور اعمال و افعال بتلائے جاتے ہیں بہت ہی عظیم کام ہے اور اس پر عمل کر کے پوری انسانیت کو تاریکی اور جہالت سے نکال کر دنیا اور آخرت کے چین و سکون حاصل کیا جاتا ہے۔ نیز یہ بھی بہت بڑا کام ہے کہ فقیروں، مسکینوں، حاجت مندوں اور رفاہی کاموں میں اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مال خرچ کیا جائے۔ تو یہ تین کام ایسے ہیں کہ اگر ان کو رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر کیا جائے تو ان سے پورے معاشرے میں چین و سکون، باہمی الفت و محبت اور رحم و کرم کی فضا بن جاتی ہے اور باطل و طاغوت اور ظلم و غرور کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اور یہ تینوں اقسام یعنی عالم، مجاہد اور سخی لوگ بہت بڑی شخصیتیں ہوتی ہیں، لیکن جب ان عظیم کاموں اور انہیں اختیار کرنے والی شخصیتوں میں بھی رضائے الٰہی کے علاوہ کوئی دوسری روح اور دوسری اغراض کا خون دوڑ رہا ہو تو یہ عظیم کام صرف آخرت کے لحاظ سے ہی نہیں، بلکہ دنیا کے لحاظ سے بھی معاشرے اور انسانیت کے لیے بے نتیجہ ثابت ہو جاتے ہیں اور ریاکاری کا زہر جب ان عظیم کاموں میں آ جاتا ہے تو اس کا اثر معاشرے پر بھی نتیجتاً بہت ہی برا پڑتا ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس قدر عظیم کام بھی اگر اخلاص کی روح سے خالی ہوں تو ایسے عظیم کام کرنے والے بھی جہنم ہی میں پھینک دیے جائیں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض ناسمجھ لوگ مذکورہ بالا حدیث کو بہت ہی غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ دیکھیے! بعض علما، شہدا اور سخی لوگ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے جبکہ ایک سنت پر عمل کرنے والے کو

سو شہیدوں (سو شہیدوں والی روایت کا مطلب اور مفہوم کتاب قیامِ حق اور اقامتِ دین میں پڑھ لیجیے) کا ثواب مل جاتا ہے، لہٰذا جہاد پر جانے میں خطرہ ہے، کیوں کہ اگر ذرہ برابر بھی اخلاص نہ ہو گا تو جنت کے بجائے دوزخ ہے اور یہاں مفت میں سو شہیدوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے، حالاں کہ یہ بہت ہی بڑا مغالطہ ہے، اس کی پوری تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ جہاد کے بیان میں آجائے گی۔ لیکن یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ جاہلوں کی ایسی بے ہودہ باتوں سے عوام کے دلوں میں جہاد، علم اور سخاوت، باہمی رحم والفت کے جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور جو جماعت اور قوم ان تین جذبات سے خالی ہو جاتی ہے وہ تو کیا فلاح پائے گی، دنیا کے لحاظ سے بھی وہ پریشان حال اور برباد ہو جاتی ہے۔ حدیث شریف تو صرف یہ بتلا رہی ہے کہ بری نیت اس قدر مہلک ہے کہ وہ ان عظیم کاموں میں آجائے تو ان کو بھی فاسد کر ڈالے گی اور اللہ تعالیٰ کے بے شمار انعامات اور اس کے عظیم توفیقات کی ناشکری کی وجہ سے یہ لوگ پہلے جہنم میں پھینک دیے جائیں گے۔

یہاں تو ان کاموں کی اہمیت سامنے آجاتی ہے کہ جب ان عظیم کاموں میں بری نیت اس قدر مہلک ہے اور ایسے عظیم کام کرنے والوں کی بے اخلاصی معاف نہیں کی جائے گی تو ان کے علاوہ جو کام ہیں ان میں بے اخلاصی کیسے معاف کر دی جائے گی۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اگر کوئی بادشاہ اعلان کرے کہ فلاں کام میرا بیٹا بھی کر دے تو اس کو سب سے پہلے سزا دوں گا، بادشاہ کی اس بات کا مطلب یہ تو نہیں کہ اُن کو بیٹے سے محبت نہیں یا ان کے نزدیک بیٹے کی اہمیت نہیں، بلکہ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ وہ کام اس قدر خطرناک ہے کہ اس میں پڑنے والی اس قدر اہم اور محبوب شخصیتوں کو بھی معاف نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کام کے کرنے والے اپنی اہمیت اور محبوبیت کی بقدر غیر اہم اور مبغوض ہو جائیں گے۔ جس طرح بادشاہ یہ جملہ کہہ کر ایک طرف اس کام کی نزاکت کو بیان کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے بیٹے کی اہمیت اور محبوب ہونے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، اسی طرح حدیث شریف میں ریا کے تباہ کن اثرات اور نتائج کو بیان کر کے اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے کہ عالم، مجاہد اور سخی اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین بندے ہیں، اگر ان کے علم، سخاوت اور جہاد میں اخلاص وللّٰہیت ہو۔ جیسا کہ جہاد، شہادت، علم اور سخاوت کے بہت ہی زیادہ فضائل قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ اخلاص کو دیکھتا ہے

۳۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ " اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے"۔
(مسلم، مشکوٰۃ: باب الریاء)

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت کا معیار کسی کی شکل وصورت یا دولت مندی نہیں، بلکہ نیک نیتی، اخلاص اور نیک کرداری ہے اور اسی نیک نیتی اور نیک کرداری پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے اور بعض روایتوں میں اس حدیث کے الفاظ یوں بھی آئے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى اَجْسَادِكُمْ وَلَا اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ " اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں اور تمہارے صرف ظاہری اعمال کو نہیں دیکھتا، بلکہ (اعمال کے ساتھ) تمہارے دلوں کو (بھی) دیکھتا ہے"۔ (جمع الفوائد: ج۲، ص)

ایک حدیث میں ہے کہ آدمی چار ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا ہو اور علم بھی اور وہ اس مال کو علم کے مطابق (اچھے کاموں میں) اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ دوسرا وہ شخص جو اس شخص کو دیکھ کر (اپنے دل میں خیال رکھتا ہے اور) کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی مال وعلم عطا فرمائے تو میں بھی اس جیسی خیرات وصدقات کروں۔ یہ دونوں اشخاص نیتکے لحاظ سے اجر وثواب میں برابر ہیں۔ تیسرا وہ شخص ہے جس کو صرف مال عطا ہوا ہے اور علم نہیں، اور یہ شخص اپنی جہالت کی وجہ سے فضول اور بے جا اپنے مال کو اُڑاتا ہے اور چوتھا شخص وہ ہے جو اس (تیسرے شخص) کو دیکھ کر (یہ ارادہ رکھتا ہے اور) کہتا ہے کہ اگر مجھے مال مل جائے تو میں بھی اسی طرح (مال کو بے جا خرچ کر کے) عیش کروں گا تو یہ دونوں اشخاص (نیتوں کے لحاظ سے) گناہ میں برابر ہیں"[1]۔ (ابن ماجہ)

---

[1] (یعنی اس نیک نیتی کی وجہ سے اس کو نیت کا ثواب ملے گا اور جس قدر اچھی نیت ہو گی، اسی قدر اچھی نیت کا اجر وثواب ہو گا اور جس شخص کی نیت جس قدر بری ہو گی، اسی قدر بد نیتی کے بقدر اس کو گناہ ہو گا)

اخلاص کی قیمت اور بے اخلاصی کی بربادی

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیک نیتی اور اخلاص کی وجہ سے انسان دنیاو آخرت میں سرخروئی اور کامیابی پالیتا ہے اور بے اخلاصی دنیاو آخرت کا نقصان اور تباہی ہے۔ آخر اتنا تو سوچیے کہ ایک شخص آپ کی بڑی خدمت کرتا ہے اور آپ کو ہر طرح کی راحت و آرام پہنچاتا ہے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن پھر آپ کو معلوم ہو جائے کہ وہ آپ کی خدمت اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں کرتا اور نہ آپ کے ساتھ اس کی عقیدت ہے، نہ خالص محبت، بلکہ وہ تو آپ کی خدمت اس لیے کرتا ہے کہ کوئی ذاتی غرض آپ سے پوری کرنا چاہتا ہے یا آپ کی خدمت کرکے آپ کے دوستوں یا رشتہ داروں سے کوئی ذاتی غرض پوری کرنا چاہتا ہے تو ایسی صورت میں آپ کے ہاں بھی اس کی خدمت وغیرہ کی کوئی قیمت باقی نہ رہے گی، لیکن چوں کہ ہم کسی کی بے اخلاصی کا اندازہ چوں کہ نہیں لگا سکتے، اس لیے ہمیں تو مغالطہ دیا جاسکتا ہے، مگر جو ذات انسان کے خیالات اور اس کے دل کو دیکھتی ہے اس کو نہیں دیا جاسکتا، ایسی صورت میں اعمال کی قیمت بقدرِ اخلاص لگے گی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں جس کا محرک اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بجائے دنیاوی غرض اور نفسانی خواہش ہو۔

اخلاص کے ساتھ ایک کھجور کا ثواب

۴۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ وَلَا يَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّا الطَّيِّبَ وَاِنَّ اللّٰهَ يَتَقَبَّلُهَا بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ يُرَبِّيْهَا لِصَاحِبِهٖ كَمَا يُرَبِّيْ اَحَدُكُمْ فَلُوَّهٗ حَتّٰى تَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ " جو شخص کھجور کے برابر حلال کی کمائی میں سے صدقہ کرتا ہے اور (یہ یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ صرف حلال مال کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے (یعنی کھجور کے برابر صدقہ کو) اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے اور پھر اس کو صدقہ دینے والے کے لیے اسی طرح پالتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنا بچھڑا پالتا ہے یہاں تک کہ وہ (صدقہ یا اس کا ثواب) پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

۵۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَن کَانَتْ نِیَّتُہٗ طَلَبَ الْاٰخِرَۃِ جَعَلَ اللّٰہُ غِنَاہُ فِی قَلْبِہٖ وَجَمَعَ لَہٗ شَمْلَہٗ وَاَتَتْہُ الدُّنیَا وَھِیَ رَاغِمَۃٌ وَمَنْ کَانَت نِیَّتُہٗ طَلَبَ الدُّنیَا جَعَلَ اللّٰہُ الْفَقْرَ بینَ عَیْنَیْہِ وَشَتَّتَ عَلَیہ اَمرَہٗ وَلَا یَاْتِیْہِ مِنھَا اِلَّا مَا کُتِبَ لَہٗ ”جس شخص کی نیت محض آخرت (اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی) کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی کرتا ہے اور اس کو اطمینانِ خاطر بخشتا ہے، نیز اس کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے اور جس شخص کی نیت دنیا کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کا فقر و احتیاج اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے اور اس کے کام اور ذہن کو پراگندہ اور منتشر کر دیتا ہے، اور (دنیا میں سے بھی) اس کو اتنا ہی ملتا ہے جو اس کے لیے لکھا گیا ہے“۔
(ترمذی، دارمی، مشکوۃ)

۶۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ تَعَالٰی اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرکِ مَن عَمِلَ عَمَلاً اَشرَکَ فِیہِ مَعِیْ غَیرِی تَرَکْتُہٗ وَشِرْکَہٗ وَفِی رِوَایَۃٍ فَاَنَا مِنہُ بَرِیْءٌ ھُوَلِلَّذِی عَمِلَہٗ ” اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک اور شرکت سب سے بے نیاز ہوں (یعنی باقی شرکا تو ایک دوسرے کے اشتراک اور تعاون کے محتاج ہوتے ہیں، اور آپس میں ایک دوسرے کے شریک بنتے ہیں، اور شرکت پر راضی اور مطمئن ہو جاتے ہیں، لیکن میں چوں کہ خالقِ کائنات اور قادرِ مطلق ذات ہوں اور میں ہر قسم کی شرکت سے بالکل بے نیاز اور سخت بیزار ہوں)، پس جو شخص کوئی عمل (عبادت وغیرہ) کرے، جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرے (یعنی میری رضاجوئی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کو دکھانے کی نیت کرتا ہے) تو میں اس کو اور اس کے شرک دونوں کو چھوڑ دیتا ہوں، اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بے تعلق اور بیزار ہوں، وہ عمل (میرے لیے نہیں، بلکہ) صرف اس دوسرے کے لیے ہے، جس کے لیے اس نے کیا ہے۔“ (مسلم، مشکوۃ)

۷۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ جب الحزن (یعنی غم کے کنویں یا خندق) سے پناہ مانگا کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب الحزن کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَادٍ فِیْ جَھَنَّمَ تَتَعَوَّذُ مِنْہُ جَھَنَّمُ کُلَّ یَوْمٍ مِائَۃَ مَرَّۃٍ ”جہنم

میں ایک وادی (یا خندق) ہے (جو اس قدر بری اور ذلیل کن ہے کہ) جس سے خود جہنم ہر دن میں سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ اس میں کون لوگ جائیں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: القُرَّاءُ المُرَاءُوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ یعنی وہ زیادہ قرآن پڑھنے والے (یا بڑے عبادت گزار) جو لوگوں کو دکھانے کے لیے اچھے اعمال کرتے ہیں۔ (ترمذی)

ریا، شرکِ اصغر یا شرکِ خفی ہے

اسی طرح قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں ریاکاری کی بہت ہی مذمت آئی ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریا کو شرکِ اصغر اور شرکِ خفی سے موسوم کیا ہے۔ چناں چہ محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے تمہارے متعلق سب سے زیادہ خطرہ "شرکِ اصغر" سے ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: وَمَا الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ؟ قَالَ اَلرِّيَاءُ شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ریا" (یعنی دِکھلاوا)۔

اور حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: مَن صَلّٰى يُرَائِي فَقَد اَشرَكَ . وَمَنْ صَامَ يُرَائِي فَقَدْ اَشرَكَ. وَمَن تَصَدَّقَ يُرَائِي فَقَدْ اَشْرَكَ "جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھی، اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ وخیرات کیا، اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا، اس نے شرک کیا"۔ (مسند احمد)

ریاکاری کی مذمت

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ ریاکاری کی مذمت بیان کرکے فرماتے ہیں کہ:

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک منادی اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے کسی عمل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا ہے، وہ اس شریک سے اپنا ثواب مانگ لے۔ اللہ جل شانہٗ شرکت سے بے نیاز ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم لوگ دجال کا تذکرہ کر رہے تھے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جس کا میں تم پر دجال سے بھی زیادہ خوف کرتا ہوں۔ ہم نے عرض کیا کہ ضرور بتائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شرکِ خفی ہے۔ مثلاً ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے (اخلاص سے شروع کی ہے، کوئی شخص اس کی نماز کو دیکھنے لگے) وہ آدمی کے دیکھنے کی وجہ سے اپنی نماز لمبی کر دے۔

ایک دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف چھوٹے شرک کا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: چھوٹا شرک کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ریا ہے۔ ایک حدیث میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ بندوں کو اُن کے اعمال کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔ ان لوگوں سے یہ ارشاد ہوگا کہ جن کو دکھانے کے لیے کیے تھے، دیکھو ان کے پاس تمہارے اعمال کا بدلہ ہے یا نہیں۔ (مشکوٰۃ)

قرآن پاک میں بھی حق تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا "جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے (اور ان کا محبوب و مقرب بننا چاہے) تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے"۔

(سورۃ الکہف: آیت ۱۱۰)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں بعض (دینی) مواقع میں اللہ جل شانہٗ کی رضا کے واسطے کھڑا ہوتا ہوں، مگر میرا دل چاہتا ہے کہ میری اس کوشش کو لوگ دیکھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب مرحمت نہیں فرمایا، حتی کہ یہ آیت نازل ہوگئی۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک صاحب نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں صدقہ کرتا ہوں اور صرف اللہ جل شانہٗ کی رضا مقصود ہوتی ہے، مگر دل یہ چاہتا ہے کہ لوگ مجھے اچھا کہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ایک حدیثِ قدسی میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں میرے ساتھ کسی دوسرے شخص کو شریک کرتا ہے تو میں اس سارے عمل کو ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ میں صرف اس عمل کو

قبول کرتا ہوں جو خالص میرے لیے ہو۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ آیتِ شریفہ تلاوت فرمائی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ساتھی کے ساتھ بہترین تقسیم کرنے والا ہوں۔ جو شخص اپنی عبادت میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو ساجھی کر دے، میں اپنا حصہ بھی اس ساجھی کو دے دیتا ہوں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جہنم میں ایک وادی ایسی ہے کہ جس سے جہنم بھی خود چار سو مرتبہ روزانہ پناہ مانگتی ہے، وہ ریاکاروں کے واسطے ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد آیا ہے کہ جبُّ الحُزْن سے پناہ مانگا کرو (یعنی غم کے کنوئیں سے جو جہنم میں ہے)۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اس میں کون لوگ رہیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنے اعمال میں ریاکاری کرتے ہیں۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ آیتِ شریفہ قرآن پاک میں سب سے آخر میں نازل ہوئی (درِ منثور)۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ ارشاد ہے: يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ " اے ایمان والو! تم احسان جتا کر ایذا پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو جس طرح وہ شخص (برباد) کرتا ہے جو اپنا مال لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے خرچ کرتا ہے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور قیامت پر۔ اس شخص کی مثال ایسی ہے کہ ایک چکنا پتھر ہو، اس پر کچھ مٹی آگئی ہو (اور اس مٹی میں کچھ سبزہ وغیرہ جم گیا ہو)، پھر اس پتھر پر زور کی بارش پڑ جائے سو وہ اس کو بالکل صاف کر دے گی (اسی طرح احسان رکھنے والوں، ایذا دینے والوں اور ریاکاروں کا خرچ کرنا بھی بالکل صاف اڑ جائے گا اور قیامت کے دن) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (یعنی یہ جو نیکیاں کی تھیں، صدقات دیے تھے۔ یہ سب ضائع جائیں گے)"۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۲۶۴)

اس کے علاوہ اور بھی کئی جگہ قرآن پاک میں ریا کی مذمت فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ احادیث میں کثرت سے اس پر تنبیہ کی گئی ہے اور بہت زیادہ اہمیت سے حضور اقدس ﷺ نے اپنی اُمت کو اس پر تنبیہ کی ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ خالص اللہ جل شانہٗ کے لیے کیا جائے اور جتنا بھی اہتمام ہو سکے، اس کا کیا جائے کہ اس میں ریا اور نمود و شہرت اور دکھاوے کا شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ مگر اس جگہ شیطان کے ایک بڑے مکر سے بے فکر نہیں ہونا چاہیے۔ دشمن جب قوی ہوتا ہے وہ مختلف انواع سے اپنی دشمنی نکالا

کرتا ہے۔ یہ بہت مرتبہ آدمی کو اس وسوسے کی بدولت کہ اخلاص تو ہے ہی نہیں، اہم ترین عبادتوں سے روک دیا کرتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شیطان اول تو نیک کام کرنے سے روکتا ہے اور ایسے خیالات دل میں ڈالا کرتا ہے جس سے اس کام کے کرنے کا ارادہ ہی پیدا نہ ہو، لیکن جب آدمی اپنی ہمت سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور اس کے روکنے پر عمل نہیں کرتا تو وہ کہا کرتا ہے کہ تجھ میں اخلاص تو ہے ہی نہیں، یہ تیری عبادت و محنت بے کار ہے، جب اخلاص ہی نہیں تو پھر ایسی عبادت کرنے سے کیا فائدہ؟ اور اس قسم کے وسوسے پیدا کر کے نیک کام کرنے سے روک دیتا ہے اور جب آدمی رک جاتا ہے تو اس کی غرض پوری ہو جاتی ہے۔(احیاء) اس لیے اس خیال سے نیک کام کرنے سے رکنا نہیں چاہیے کہ اخلاص تو ہے نہیں، بلکہ نیک کام کرنے میں اخلاص کی کوشش کرتے رہنا چاہیے اور اس کی دعا کرتا رہے کہ حق تعالیٰ محض اپنے لطف سے دستگیری فرمائے، تاکہ نہ تو دین کا مشغلہ ضائع ہو، نہ برباد ہو۔

(فضائل صدقات، حصہ اول: ص۱۶۱ تا ۱۶۵)

ریا کی تعریف اور اس کا بیان

کوئی عبادت، دینی کام یا نیک عمل اس لیے کرنا یا اپنے سابقہ اعمالِ صالحہ کو اس لیے شہرت دینا کہ لوگوں کے دل میں اُس کی وقعت اور قدر و منزلت پیدا ہو جائے، شرکِ خفی یا ریا کہلاتا ہے (لیکن اگر کوئی نیک عمل لوگوں کو دکھانے کے لیے اس نیت سے کرتا ہو کہ وہ بھی اس طرح عمل کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ایسا کرنے سے اکثر لوگ بالآخر ایسی ریا میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کو اپنی ریاکاری کا علم بھی نہیں ہوتا، جو ریاکاری سے بھی زیادہ خطرناک ہے)۔

جو شخص ریاکاری کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یا تو اس کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین ہی نہیں اور وہ محض اپنے ذاتی مفادات کے لیے اللہ تعالیٰ، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت کو ماننے اور ایمان واسلام کا دعویٰ کرتا ہے، یا یقین تو ہے لیکن وہ اس قدر کمزور ہے کہ مخلوق سے اُس کی جس قدر اجر اور عزت وذلت کی توقع ہے اتنی اُمید اللہ تعالیٰ سے نہیں، یا وہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق دونوں سے اجر و داد

حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال ریاکار شخص کا دل یا تو اللہ تعالیٰ پر ایمان ویقین سے خالی ہو گا یا پھر ایمان ویقین ہونے کے باوجود اس قدر کمزور ہو گا کہ وہ اپنے اعمال کو محض اللہ تعالیٰ کے لیے خالص نہیں کر سکتا۔

ریاکاری کی دو بڑی قسمیں: کفر و نفاق اور شرکِ اصغر

ریاکاری (یعنی اندر نیت و غرض کچھ اور ہو اور ظاہر میں کچھ اور باور کرا رہا ہو اور بتلا رہا ہو، اس) کی دو بڑی قسمیں بنتی ہیں:

۱۔ کوئی شخص نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو، نہ اس کے رسول ﷺ پر اور نہ آخرت پر۔ لیکن لوگوں کو باور کرائے کہ وہ مسلمان ہے اور بظاہر دینی اعمال بھی کرتا ہے۔ یہ اصل ایمان میں ریا ہے، اسے نفاق بھی کہتے ہیں، اور اس کے کرنے والے کو منافق۔ یہ جلی اور عظیم شرک سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور اس کا حشر دوسرے مشرکین و کفار سے زیادہ سخت اور اس کا ٹھکانا سب سے نیچے، انتہائی خراب اور بُرا ہے۔

نفاق کی بھی کئی قسمیں ہیں:

اول یہ کہ اندر سے اسلام کا بالکل منکر ہو، لیکن مسلمانوں میں افتراق و انتشار پھیلانے اور فتنہ برپا کرنے کے لیے خود کو مسلمان ظاہر کرے اور ظاہری فرمانبرداری جیسے نماز وغیرہ ادا کرے۔

دوم یہ کہ اندر سے تو صاف منکر ہو، لیکن مسلمانوں سے اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے ایمان اور اسلام کا اظہار کرے، اگرچہ فتنہ انگیزی کا خیال نہ ہو۔

سوم یہ کہ دل سے اسلام کا صاف منکر تو نہ ہو، لیکن اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان بھی نہ ہو، بلکہ کفر و ایمان میں متردد اور متذبذب ہو، لیکن صرف مسلمانوں کی جماعت میں رہنے کی وجہ سے بظاہر اسلام کا نام لیوا ہو، یا یہ کہ دل سے اسلام کو تو برحق مانتا ہو، مگر حبِ دنیا، اپنی ذاتی مفادات اور شہوات کے غلبہ نے اس کو ایسا نکما بنا دیا ہو کہ دنیا کی خاطر وہ اسلام اور مسلمانوں کی بربادی اور دین کے مذاق اڑانے کو مباح عمل کی طرح برداشت کر لیتا ہو، اور ایسے حالات میں بھی جہاد سے جی چراتا ہو جبکہ اسلام اور مسلمانوں کو اس کی سخت ضرورت ہو۔ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر ان مختلف اقسام کے منافقین کی نشاندہی کی ہے، مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۚ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۚ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۚ

" اس (قیامت کے) دن جبکہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا (ان سے کہا جائے گا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لیے ایسی جنتوں کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔ اس روز منافق مردوں اور عورتوں (کا حال یہ ہو گا کہ وہ) مومنوں سے کہیں گے کہ ذرا ہماری طرف دیکھو، تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں، (مگر) ان سے کہا جائے گا کہ پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ اور (وہاں) نور تلاش کرو۔ پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا، اُس کے اندر رحمت ہو گی اور باہر کی جانب عذاب ہو گا۔ منافق اہلِ ایمان کو پکاریں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے، مومن جواب دیں گے،: ہاں! مگر تم نے اپنے آپ کو فتنوں میں ڈال دیا، ہماری تباہی کا انتظار کرتے رہے، شک میں پڑے رہے اور دھوکہ میں ڈال دیا تمہیں جھوٹی توقعات نے، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آپہنچا، اور دھوکہ دیتا رہا تمہیں تمہارے اللہ کے بارے میں وہ بڑا دغاباز (شیطان)۔ پس آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا تھا۔ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور وہی تمہاری خبر گیری کرنے والی ہے اور یہ بد ترین انجام ہے"۔ (سورۃ الحدید: آیت ۱۲ تا ۱۵)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۚ

”یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے درجے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے“۔ (سورۃ النساء: آیت ۱۴۵)

ریا کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر تو ایمان ہو، لیکن عبادات اور دوسرے خیر کے کاموں کو لوگوں کے دکھلاوے اور نام و نمود کے لیے کرے، اسی کو ریا کہتے ہیں اور اسی کو شرکِ خفی یا شرکِ اصغر بھی کہتے ہیں۔

شرکِ اصغر یا شرکِ خفی کی اقسام

شرکِ اصغر یا شرکِ خفی کی بھی ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک اور ضعف و قوت کے لحاظ سے بہت سی اقسام اور درجات ہوسکتے ہیں، لیکن یہاں اس کی موٹی موٹی چند اقسام بیان کرتے ہیں:

۱۔ ریا کی پہلی قسم یہ ہے کہ فرائض میں تو ریا نہ ہو، لیکن اگر کوئی پاس ہو تو نفل نمازوں، صدقات اور دیگر مستحبات کا اہتمام ہو اور اگر کوئی نہ دیکھے تو نہ نوافل ہوں نہ مستحبات۔ یہ ریا بھی خطرناک ہے۔

۲۔ دوسری قسم یہ ہے کہ تنہائی میں اتنی عبادت یا کارِ خیر نہیں کرتا جتنی لوگوں کی موجودگی میں کرتا ہے، ایسی عبادت پر بھی شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔

۳۔ تیسری قسم ریا کی یہ ہے کہ جو عبادت اور نیک عمل لوگوں کے سامنے کرتا ہے وہی ان کی غیر موجودگی اور تنہائی میں بھی کرتا ہے، لیکن لوگوں کے سامنے زیادہ نشاط، مسرت اور حسن سے ادا کرتا ہے۔ مثلاً کوئی ہمیشہ تہجد پڑھتا ہو، لیکن مہمان کے سامنے زیادہ نشاط اور خوبصورت طریقے سے پڑھے۔ اس میں بھی ریا ہے اگرچہ پہلی قسم سے کم ہے (البتہ اگر کارِ خیر میں رضا اور خوشنودی تو اللہ تعالیٰ کی مقصود ہو اور جب کوئی دیکھنے والا ہو تو نشاط اور حسنِ ادائیگی بھی نہ ہو، مگر طبیعت خوش ہو جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا اور اس عمل کو قبول فرمائے گا۔ بلکہ اگر اس کو خوشی صرف اس بنا پر ہو کہ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے نیک اعمال کو ظاہر فرمایا اور بُرے اعمال اور گناہوں کو پوشیدہ رکھا، کیوں کہ نیکی کا اظہار کرانا اور گناہوں کی ستّاری کرنا قیامت کی رسوائی سے بچاؤ کی علامت ہے تو، اس قسم کی خوشی میں کوئی مضائقہ نہیں)۔

۴۔ چوتھی قسم ریا کی یہ ہے کہ عمل کرنے والے کو کسی کی موجودگی یا غیر موجودگی کی پرواتو نہ ہو، لیکن یہ چسکا لگا ہوا ہو کہ کسی طرح لوگوں کو میرے نیک اعمال اور باطنی حالات کی خبر ہو جائے اور وہ مختلف طریقوں سے اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ [1]

۵۔ ریا کی پانچویں قسم یہ ہے کہ کسی نیک عمل کو محض اس لیے ترک کردے کہ لوگ اسے ریاکاری کا طعنہ دیں گے یا اپنی خفیہ مجالس یا اپنے خیالات میں اسے ریاکار سمجھیں گے۔ یہ بھی ریا کی بہت خطرناک قسم ہے، کیوں کہ یہ شخص بے عملی کے ساتھ لوگوں کے سامنے اپنے اخلاص اور اپنی بزرگی کا ثبوت مہیا کرنا چاہتا ہے جبکہ دوسرے ریاکار عمل کر کے اپنی نیکوکاری کی شہرت چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک باریک ریاکاری کا عمل ہے۔

شرکِ خفی اور ریا کی کئی قسمیں اور بھی ہیں جو بہت باریک ہیں لیکن قابلِ معافی ہیں۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ "ازالۃ الخفاء" میں معقل بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو بکر! شرک تم میں چیونٹی کے پاؤں کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا شرک اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کہ کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی معبود بنائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] (یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ جو اعمال کرتے ہیں اور اپنے اندر کچھ کیفیات محسوس کرتے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے اعمال اور اندرونی کیفیات کا اظہار ہو، تاکہ لوگوں میں ہماری شہرت ہو، لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو محض ظاہری حالت اور کیفیت بڑے لوگوں کی طرح بنالیتے ہیں اور ایسے اعمال کا اظہار کرتے ہیں جو انہوں نے کیے نہیں ہیں، مثلاً کسی نے نفلی روزہ نہیں رکھا ہو، لیکن ہونٹوں کو خشک رکھے یا کہتا رہے کہ میرا روزہ ہے، یا تہجد نہیں پڑھتا مگر ایسی حالت بنالیتا ہے یا ایسے الفاظ اور اشارے کرتا ہے کہ لوگ سمجھیں کہ یہ بڑا تہجد گزار ہے، یا صوفیا کی چند باتیں سیکھ کر انہیں دہراتا ہو تاکہ لوگ اس کو بڑا صوفی اور تصوف کا ماہر سمجھیں، یا چند روایات و حکایات سیکھ لے اور انہیں صرف اس لیے بیان کرتا رہے کہ لوگوں پر یہ ثابت کردے کہ بڑا عالم ہے، یا کوئی غمگین اور رونی صورت بنائے تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کو دین کا بڑا غم ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ ایسی شدید قسم کی ریا اور مکاری ہے کہ کسی بھی باحیا انسان سے اس کا صدور ممکن نہیں۔

یہاں یہ خیال رہے کہ یہ چیزیں دوسروں میں تلاش نہ کریں، کیونکہ یہ نفل نماز، روزہ، تہجد، ذکر، اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا اور یاد رکھنا اور دین کا غم وغیرہ تو بہت اہم امور ہیں، لیکن صرف دکھلاوے کی وجہ سے ریا اور شرکِ خفی بن جاتے ہیں۔ اس لیے دوسروں کے بارے میں تو خیال بس یہ رہے کہ وہ اس کو اچھی نیت سے کر رہے ہیں اور ان کی کیفیت یقینی ہے، البتہ اپنے بارے میں ہر وقت بدگمان رہے اور اپنی جان کا محاسبہ کرتا رہے اور اپنی نیت کو خالص بنانے کی کوشش کرتا رہے اور ریا کے خوف سے کسی عمل کو بھی نہ چھوڑیں، یہ شیطان کا دھوکہ ہے)

نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ البتہ شرک چیونٹی کے پاؤں کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے۔ کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو تم کہہ لیا کرو، تو اس (شرک) کا قلیل اور کثیر سب جاتا رہے (یعنی معاف ہو جائے)، پھر فرمایا: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ. (ازالۃ الخفاء: ج۲، ص۱۳۰)

ریاکاری کے وسوسے سے اعمال نہ چھوڑیں

یاد رکھیں! کہ ریا کا عمل وہ ہے جو قصداً اپنی شہرت اور نام آوری کی غرض سے کیا جائے یا اپنے کیے ہوئے اعمال لوگوں میں اس لیے مشہور کیے جائیں، تاکہ لوگ اس کے معتقد ہو جائیں جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، اور یہ سب اختیاری چیزیں ہیں۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں کو ریاکاری کا وسوسہ آتا ہے تو پھر اعمال ہی کو چھوڑ دیتے ہیں، یہ قطعاً صحیح نہیں۔ اعمالِ صالحہ ضرور کریں اور ریاکاری کے خدشہ سے کوئی عمل نہ چھوڑیں، بلکہ کرنے کے ساتھ ساتھ خلوصِ نیت کی کوشش میں لگے رہیں، کیوں کہ ریاکاری کے وسوسوں اور اندیشوں میں ڈال کر اعمالِ صالحہ سے روکنا بھی شیطان کا ایک عظیم حربہ ہے تاکہ انسان کو بے عمل بنایا جائے۔ نیز کبھی کبھی اچھے اعمال کرنے کے بعد ریاکاری کا وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے تو ریاکاری اور ریاکاری کے وسوسے میں بھی بڑا فرق ہے، کیوں کہ ریاکاری اختیاری چیز ہے کہ جس عمل کا محرک اور باعث ہی اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے بجائے دوسری چیز ہو اور وسوسہ آنا غیر اختیاری چیز ہے، بلکہ ریا کا وسوسہ آنا للّٰہیت اور خلوص کی علامت ہے کہ یہ شخص ریاکاری سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے تو اس کو اپنے اعمال میں ریاکاری محسوس ہوتی ہے ورنہ جس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول مقصود ہی نہ ہو تو اس کو اس قسم کے خیالات اور وسوسے کیونکر آسکتے ہیں۔

اعمالِ صالحہ کی وجہ سے خود بخود مشہور ہو جانا ریاکاری نہیں

یہ بات بھی یاد رکھیں! کہ جو شخص کسی نیک عمل کی وجہ سے دنیا میں خود بخود مشہور ہو جائے اور لوگ اس سے محبت کرنے لگیں تو یہ ریاکاری کے زمرے میں داخل نہیں بشرطیکہ وہ عمل شہرت کی غرض سے نہ کرتا ہو۔ جیسا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو اچھا عمل کرتا ہو اور اس کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کرتے

ہیں؟ اور ایک روایت میں ہے کہ پوچھنے والے نے یوں عرض کیا کہ ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو اچھا عمل کرتا ہے اور لوگ اس سے اس کی وجہ سے محبت کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ یعنی "یہ تو بندۂ مومن کی نقد بشارت ہے۔" (مسلم)

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے نیک عمل کی شہرت ہو جانا اور لوگوں کا اس کی تعریف کرنا یا اس سے محبت کرنا کوئی بری بات نہیں ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں ملنے والے انعام سے پہلے اس دنیا میں نقد صلہ اور اس بندہ کی عنداللہ مقبولیت کی ایک خوشخبری اور علامت ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۞ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۞ یعنی "وہ راتوں کو کم ہی سوتے ہیں اور آخر رات میں (اللہ تعالیٰ سے) مغفرت (اور معافی) مانگتے ہیں۔" (سورۃ الذاریات: آیت ۱۷)

مطلب یہ ہے کہ ہمارے بندے راتوں کو بہت کم سوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں رات گزارتے ہیں، پھر بھی جب صبح ہونے لگتی ہے تو اپنی عبادت پر ناز نہیں کرتے کہ ہم نے ساری رات اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں گزاری، بلکہ ڈرتے رہتے ہیں کہ معلوم نہیں، ہماری عبادت قبول بھی ہے یا نہیں اور اپنی کوتاہیاں سامنے آجاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگنے لگتے ہیں۔ یہ ہے اخلاص وللّٰہیت، نہ یہ کہ عبادت پر ناز و فخر کیا جائے، جو لوگ عبادت پر فخر اور ناز کرتے ہیں، ایسے حضرات کے دل اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت سے خالی ہوتے ہیں۔

اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرکے سمجھتے ہیں کہ گویا ہم نے اللہ تعالیٰ پر احسان کیا، ورنہ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بڑائی ہو، وہ تو ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے گا اور کسی حالت پر قانع نہیں ہوگا۔ نیز ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ

اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝

یعنی ”بے شک جو اپنے رب کی ہیبت سے ڈرنے والے ہیں اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں، جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو (کسی طرح بھی) شریک نہیں کرتے اور وہ (اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے) جو کچھ دے دیتے ہیں اس حال میں دے دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی لوگ نیکیوں میں آگے بڑھنے والے ہیں۔ (سورۂ مومنون: آیت ۵۷تا۶۱)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ (اور وہ جو کچھ دے دیتے ہیں اس حال میں دے دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے ہیں) کے بارے میں پوچھا کہ کیا اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ (جس کی وجہ سے ان کے دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں)

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: لَا يَا بِنْتَ الصِّدِّيقِ وَلٰكِنَّهُمُ الَّذِيْنَ يَصُوْمُوْنَ وَ يُصَلُّوْنَ وَيَتَصَدَّقُوْنَ وَهُمْ يَخَافُوْنَ اَنْ لَّا يُقْبَلُ مِنْهُمْ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرَاتِ ”اے صدیق کی بیٹی! ایسا نہیں، بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں اور اس کے باوجود انہیں ڈر لگتا ہے کہ شاید ان کے یہ اعمال نامقبول نہ ہو جائیں، یہی وہ لوگ ہیں جو نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں“۔ (ترمذی وابن ماجہ)

اور یہی حالت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں گم ہوگئے تھے، اپنے کیے ہوئے نیک اعمال اُن کی نظروں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کی وجہ سے گم ہو جاتے تھے۔

اخلاص محبتِ الٰہی کا ثمرہ ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ کی محبت دنیا کی ہر چیز پر غالب ہو تو پھر انسان کے اعمال محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہی ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ صفحات میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ انسان کے اعمال کا اصل پیکر اور اصل وجود وہی ہے جو اس کے دل کے کارخانے میں تیار ہوتا ہے اور انسانی اعمال کے اصل مواد انسان کے

جذبات، اس کی نیت اور ارادہ ہیں۔ اس سے خود بخود یہ بات معلوم ہوگئی کہ نیت کوئی زبانی چیز نہیں کہ انسان کہہ دے کہ میری نیت ٹھیک اور راست ہے، بلکہ نیت تو ایک کشش، رغبت اور ایک تحریک ہے جو دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہی آدمی کو کام میں مشغول کر دیتی ہے۔

اب یہ بات کہ کشش، رغبت اور تحریک دل میں کیسے پیدا ہوتی ہے؟ اس کا آسان اور سادہ جواب یہ ہے کہ یہ محبت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے یا اپنی اصلاح و تزکیۂ نفس سے محبت ہے اور وہ کسی دین دار شخص کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا دوست اور محبوب ہے یا یہ میری اصلاح کرے گا تو وہ اس کی خدمت اور فرمانبر داری کرتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی محبت میں وہ اس دیندار شخص کی فرمانبر داری اور خدمت کرتا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کی وجہ سے اب اس کی نیت میں دوسری دنیاوی اغراض شامل نہیں ہوں گی۔

اس کے برعکس ایک دوسرا شخص ہے، وہ بھی اس دیندار شخص کی عزت و احترام اور خدمت کرتا رہتا ہے، لیکن اس کو اپنی شہرت سخت محبوب ہے تو اس کی خدمت، عزت اور احترام کی نیت میں یہ بات شامل ہوگی کہ یہ نام آور یا معروف بزرگ مجھے کسی منصبِ عزت پر فائز کر دے، مثلاً اپنا نائب اور خلیفہ بنائے وغیرہ وغیرہ۔ نیز جس شخص کے دل میں دنیا اور مال کی سخت محبت ہو تو اس کے ہر کام میں، خواہ وہ دین کا ہو یا دنیا کا، کسی نہ کسی طرح دنیا اور مال و متاع کے حصول کی نیت شامل ہوگی، اگرچہ وہ اس کو محسوس نہ کرے کیوں کہ دنیا سے بھرے ہوئے دل میں سے نکلنے والا عمل دنیا کے زہر سے آلودہ ہو کر ہی نکلے گا۔

نیز جس شخص کو کوئی جابر شخص یہ حکم دے کہ فلاں کام کرو، مثلاً: تین میل تک میرے سامنے دوڑو اور یہ اس پر بھی گراں گذرے، لیکن اس کو اپنی جان محبوب ہے تو اپنی جان بچانے کی محبت میں مرنے کے بجائے تین میل دوڑنے کو اختیار کرے گا۔ یا کسی کو مال کی ضرورت ہے، چوں کہ انسان کو اپنی حاجت پوری ہونے سے محبت ہوتی ہے تو ایسی صورت میں وہ سخت مزدوری اور ناگوار محنت اس لیے اختیار کرتا ہے کہ اسے اپنی حاجت اور ضرورت کی تکمیل، آسائش اور آرام سے زیادہ محبوب ہے۔ لہٰذا اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنے آرام کو قربان کر لیتا ہے۔

غرض جہاں بھی دیکھیں! یہی بات مل جائے گی کہ انسان پر یا تو اللہ تعالیٰ کی محبت غالب ہو گی، یا کسی شخص کی محبت غالب ہو گی، یا اپنی جان بچانے کی محبت زیادہ محبوب ہو گی، یا اپنی عزت زیادہ محبوب ہو گی، یا اپنی شہرت کا سخت خواہاں ہو گا وغیرہ وغیرہ، اور جس چیز کی محبت غالب ہو گی وہی چیز کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا باعث اور محرک ہو گی۔

اگر مذکورہ بالا مقدمہ اور تفصیل ذہن میں آچکی ہے تو یہ بات خود بخود ذہن میں آجائے گی کہ وہی انسان سب سے زیادہ خالص اور پر خلوص عمل کرے گا جس کے دل میں دنیا کے بجائے اللہ تعالیٰ کی محبت سب سے زیادہ ہو۔ ورنہ اگر کسی شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کے بجائے دنیا کی محبت زیادہ ہو تو دنیاوی کام تو کیا، اس کے تمام دینی کاموں کا بھی کوئی نہ کوئی دنیاوی و نفسانی محرک ہو گا۔ یا تو وہ طلبِ شہرت کے لیے کام کرتا ہو گا یا دنیاوی معاوضہ کے لیے، یا اس طرح کا اور کوئی نہ کوئی دنیاوی اور نفسانی مقصد اس میں شامل ہو گا، بلکہ ایسے شخص کی تحقیق اور اختلافی مسائل میں بحث و مباحثہ وغیرہ میں بھی حق کی تلاش اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی مدِ نظر نہیں ہو سکتی، بلکہ اس میں بھی وہ شہرت اور اپنے نفس کی خواہش کا متلاشی ہو گا، اور یہی نفس پرستی ہے، اگرچہ اس کی شکلیں اور تصویریں مختلف ہیں اور یہی خواہشِ نفس حبِ دنیا ہے، نفس پرستی اور دنیا پرستی ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے: اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ "کیا آپ نے اس کو دیکھا ہے جس نے خود اپنی نفسانی خواہش کو الہ (یعنی معبود اور خدا) بنالیا ہے۔"

خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت جب تک دنیا اور دنیا کی ہر ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان اور عزت پر غالب نہ ہو اس وقت تک انسان کے اعمال میں کھوٹ اور غیر اللہ کی آمیزش باقی رہے گی۔ اس لیے اصل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت ہی انسان کو اللہ تعالیٰ کا خالص بندہ بنالیتی ہے اور یہی مومن کی صفت ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ "اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت رکھتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے حاصل ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے حاصل ہو؟ اس کو یہاں نہایت اختصار کے ساتھ لکھوں گا اور اس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ کتاب کے دوسرے عنوانات میں مفصل مل جائے گی۔

۱۔ توحیدِ الٰہی کو پوری طرح اپنایا جائے، اعتقادی لحاظ سے بھی اور عملی لحاظ سے بھی[1]۔

۲۔ شعائر اللہ اور اللہ تعالیٰ سے وابستہ چیزوں سے محبت کریں، جس کی تفصیل اسی کتاب میں "محبت کے بیان" میں موجود ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کریں اور یاد رکھیں، آسمان و زمین میں فکر کریں اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کو یاد کریں[2]۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی تمام تعلیمات اور ہدایات یا بالفاظِ دیگر پورے دینِ اسلام پر مضبوطی سے کاربند رہنے کی کوشش کریں۔

۵۔ ایسے لوگوں کی صحبت میں رہیں جن میں دنیا کی محبت پر اللہ تعالیٰ اور آخرت کی محبت وخوف غالب ہو[3]۔

اس کے ساتھ ساتھ نیت کو خالص کرنے کے لیے چند تجاویز بھی بتائی جاتی ہیں، ان شاء اللہ ان پر عمل کرنے سے اعمال میں اخلاص آسکے گا۔

نیت کو خالص کرنے کے لیے چند تجاویز

۱۔ یہ سوچے کہ جس بدن کی راحت کے لیے، اس کو خوش کرنے کے لیے کام کرتا ہوں یا عمل کرکے جن لوگوں کی نگاہوں میں عزت اور تعریف چاہتا ہوں، نہ وہ رہیں گے اور نہ میں رہوں گا۔ تھوڑے دنوں کے بعد کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوگا، پھر ایسی بے بنیاد چیزوں کی طلب میں اپنے اعمال کو برباد کرکے کیوں اپنی آخرت کو برباد کروں۔

۲۔ بے اخلاصی اور ریاکاری پر آنے والی وعیدوں کو بار بار پڑھیں اور آخرت کو کثرت سے یاد کریں۔

۳۔ اس دھیان کو حاصل کرنے کی کوشش کریں کہ آپ پر ہر وقت یہ خیال چھایا رہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ کو آپ دیکھ رہے ہیں، ورنہ اتنا تو خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ اور آخرت کو کثرت سے

---

[1] جس کی پوری تفصیل اسلامی عقائد و نظریات کے توحید اور کلمہ طیبہ کے بیان میں موجود ہے۔

[2] جس کی پوری تفصیل "ذکر اللہ کے فضائل و مسائل" میں موجود ہے۔

[3] جس کی تفصیل ان شاء اللہ "صحبت اور رفاقت کے بیان" میں آجائے گی۔

یاد کرنے اور اس دھیان کو پختہ کرنے کے لیے اس کا مراقبہ کیا کریں۔ سب سے آسان اور سہل کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی باشرع، نیک، صالح اور ماہر صوفی کے سپرد کر دیں۔

چند چیزیں ریاکاری اور بے اخلاصی میں شامل نہیں

۱۔ اپنے استاد، شاگرد، مرشد یا کسی بزرگ کو اس نیت سے اچھی آواز بنا کر قرآن مجید سنانا کہ ان کا دل خوش ہو جائے، یہ ریا اور بے اخلاصی میں شامل نہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ اگر نیت اللہ تعالیٰ کی رضا کی ہے اور دل میں وسوسہ آتا ہے کہ شاید میں اس عبادت میں ریاکاری کرتا ہوں، نفس کی خواہش پوری کرتا ہوں، تو یہ ریا اور بے اخلاصی نہیں، بلکہ وسوسئہ ریا یا وسوسئہ بے اخلاصی ہے، اس کی ہرگز پروانہ کریں اور نہ پریشان ہوں، ورنہ شیطان وسوسہ ڈال کر اس عمل سے محروم کر دے گا، جیسا کہ پہلے بھی یہ گذر چکا۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ غلطیوں کو بہر حال چھپانا چاہیے، اپنی غلطیوں اور خطاؤں کو چھپانا ریاکاری نہیں ہے۔

اخلاصِ نیت کا خلاصہ

اب اس بحث کے آخر میں پھر اخلاصِ نیت کے بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

ہر کام کو نفس کی آمیزش سے بالکل پاک کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضاجوئی کے لیے کیا جائے، یعنی دین کا جو بھی کام کرے اس میں نہ تو دکھلاوا ہو، نہ منصب و عزت اور اقتدار کی لالچ ہو اور نہ راحت مطلوب ہو، مثلاً کوئی روزہ رکھنے سے کسی شہرت کا متمنی نہیں ہے لیکن روزہ اس لیے رکھتا ہے کہ پیٹ میں خرابی ہے، اور اس خیال سے روزہ رکھے کہ پیٹ ٹھیک ہو جائے، یا مثلاً کوئی ہوٹل کے کرایہ سے بچنے کی غرض سے مسجد میں اعتکاف کرلے، یا گرمی کے موسم میں وضو پر وضو اس غرض سے کرے کہ ٹھنڈک حاصل ہو جائے، یا کوئی مزدور نماز اس لیے لمبی پڑھے کہ اتنی دیر کام کی محنت سے جان چھوٹ جائے، غرض کسی دینی کام میں جب اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے بجائے ذرہ برابر کسی طرح بھی نفس کی آمیزش پائی جائے تو وہ عمل خالص نہیں رہتا۔ جتنی آمیزش ہو گی اتنی مقدار اخلاص کی اس میں کم ہو گی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں خالص عمل ہی مقبول ہے اور عمل اخلاص کے بقدر ہی وزنی ہوتا ہے۔

البتہ اگر کسی کام میں اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی ہی مقصود ہے، لیکن ایک ہی عمل میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لائق متعدد نیتیں جمع ہو جائیں تو یہ اخلاص کے منافی نہیں، بلکہ جس قدر نیتیں ہوں گی اسی قدر ثواب زیادہ ہو گا، مثلاً مسجد جاتے وقت انتظارِ نماز کی نیت ہو، اعتکاف کی نیت بھی ہو اور یہ بھی غرض ہو کہ مسجد جا کر وہاں آنکھوں، کانوں کی حفاظت ہو گی اور یہ بھی نیت ہو کہ وہاں اللہ تعالیٰ کو یاد کروں گا، تلاوت، درود شریف، استغفار اور تہلیل و تسبیح کروں گا۔ اسی طرح جتنی نیتیں ہوں گی تو چوں کہ یہ صرف ایک ہی طرح کی نیتیں ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی۔ اس لیے اس ایک عمل میں جس قدر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے کاموں کی نیتیں کی جائیں گی، اتنا ثواب ملے گا۔ البتہ ضروری یہ ہے کہ دوسری جنس اور نفس کی کسی راستے کی نیت نہ ہو ورنہ جتنی بری نیتیں ہوں گی اس قدر گناہ ہو گا۔

اخلاص کی علامتیں

اخلاص کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر قول و فعل، ہر سرگرمی اور دینی کام کا مقصد بس اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کی کامرانی ہو۔ عمل کرنے والا کسی مال اور دنیاوی عزت کا حریص نہ ہو، وہ کسی اقتدار اور منصب کا بھوکا نہ ہو، وہ دنیا میں کسی طرح کے خطابات والقابات اور داد کے حصول کا امیدوار نہ ہو تو اس سے خود بخود اخلاص کی علامتیں سامنے آگئیں، تاہم ان کو الگ الگ بیان بھی کیا جاتا ہے:

نیک کام خلوت و جلوت میں ایک ہی انداز سے کرنا

۱۔ اخلاص کی ایک علامت یہ ہے کہ نیک کام مثلاً نماز، صدقہ وغیرہ خلوت اور علیٰحدگی میں بھی اُسی انداز سے کیا جائے جس حسن و خوبی کے ساتھ لوگوں کے سامنے کیا جاتا ہے۔ ایک کاشتکار یا باغبان اپنی کھیتی اور باغ میں شب و روز کام کرتا ہے۔ لوگ اس کو دیکھیں یا نہ دیکھیں وہ اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، کیوں کہ وہ اس محنت کے ذریعے لوگوں سے کسی داد، شاباش یا کسی مال و منصب کا خواہاں نہیں ہوتا، بلکہ اس کی نظر فصل اور پھلوں پر رہتی ہے کہ اپنے وقت پر اس کھیت اور باغ سے مجھے غلہ اور پھل ملے گا۔ اسی طرح جو شخص ہر کام میں صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت پر نظر رکھتا ہو، اس کو نفع و نقصان اور عزت و ذلت کا مالک مانتا ہو اور اس کی نظر آخرت پر لگی ہوئی ہو، وہ ہر حال میں، خواہ اس کو لوگ دیکھیں یا نہ

دیکھیں، اپنے کام کو حسن وخوبی سے جاری رکھے گا۔ اسی حقیقت کو سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ نے یوں بیان فرمایا ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا صَلّٰی فِی الْعَلَانِیَۃِ فَاَحْسَنَ وَصَلّٰی فِی السِّرِّ فَاَحْسَنَ قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ ھٰذَا عَبْدِیْ حَقًّا ”بے شک جب بندہ اعلانیہ (لوگوں کے سامنے) نماز پڑھتا ہے تو حسن وخوبی سے پڑھتا ہے اور جب (تنہائی میں) پوشیدہ طور پر پڑھتا ہے تو (اس وقت بھی اسی) حسن و خوبی کے ساتھ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرا سچا (اور راست باز) بندہ ہے“۔ (ابن ماجہ، مشکوٰۃ: باب الریاء)

دینی اور نیک کاموں کا نتیجہ دنیا میں نہ ڈھونڈنا

۲۔ اخلاص کی دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ مخلص انسان نیک اور دینی کام کر کے اس کا نتیجہ دنیا میں تلاش نہیں کرتا، بلکہ اس کی نظر اللہ تعالیٰ اور آخرت پر رہتی ہے، اس لیے وہ نیک اور دینی کام کر کے نتیجے سے بے فکر ہو جاتا ہے جیسا کہ کاشتکار اپنے کھیت اور باغ میں محنت مزدوری کر کے اسی وقت فصل اور پھل کا امیدوار نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس کے اصل وقت کا انتظار کرتا ہے اور فصل کاٹنے اور پھل لینے تک وہ فصل اور پھلوں کی تباہی اور ہلاکت سے ڈرتا رہتا ہے کہ کوئی آسمانی یا زمینی آفت یا چرند پرند اس کو ضائع نہ کر دیں۔ یہی حال مخلص کا ہوتا ہے کہ وہ آخرت کے نتیجے کا انتظار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخلص دینی اور نیک کاموں کی وجہ سے کسی منصب و اقتدار اور کسی مسند و امارت پر فائز ہونے کا قطعاً لالچ نہیں کرتا، بلکہ وہ ان جیسی چیزوں سے ڈرتا ہے کہ کہیں ان چیزوں کی وجہ سے آخرت کی کامیابیوں سے محروم نہ ہو جائے۔

اپنے نیک کاموں کی تشہیر نہ کرنا

۳۔ اخلاص کی تیسری علامت یہ ہے کہ مخلص اپنے دینی اور نیک کاموں کی تشہیر نہیں کرتا کہ میں نے یا ہم نے یا ہماری جماعت نے یوں کیا اور یوں کیا۔ جو لوگ اپنے نیک اور دینی کاموں کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، دراصل وہ اپنے دینی اور نیک کاموں کا صلہ اور بدلہ اللہ تعالیٰ کے بجائے لوگوں سے اور آخرت کے بجائے دنیا میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اخلاص کی علامت اجتماعی کاموں میں

۴۔ اخلاص کی چوتھی علامت کا تجربہ اجتماعی کاموں میں ہوتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اخلاص کا سب سے بڑا تجربہ اجتماعی کاموں میں ہی ہوتا ہے، کیوں کہ اجتماعی کاموں میں دینِ حق کے قیام وبقا کے لیے اپنے ہم کام ساتھیوں کی باتوں اور ناچاقیوں وغیرہ کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کبھی امیر اور کبھی مامور، کبھی جرنیل اور کبھی سپاہی بننا پڑتا ہے۔ اب ایسی اونچ نیچ کی صورت میں اگر اخلاص کی قوت موجود ہو تو تمام مراحل اور ہر قسم کی اونچ نیچ میں مخلص یکساں طور پر اپنی دینی محنت کو جاری رکھے گا کیوں کہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کے لیے کرتا ہے نہ کہ لوگوں اور منصب و عزت کے حصول کے لیے، اور اگر اخلاص نہ ہو تو وہ بات بات پر اپنے ہم کام ساتھیوں پر بے جا تنقید کرے گا، عزت و منصب کی صورت میں خوش ہوگا اور یہ چیزیں نہ ہونے کی صورت میں دوسروں کی ٹانگیں کھینچے گا، اور جو مخلص ہوتا ہے وہ دوسروں کو آگے کرے گا اور دوسروں کی ترقی سے خوش رہے گا اور دوسروں کی عزت اور ترقی پر اس کا دل باغ باغ ہوگا۔ یہ وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ کبھی ذلیل ورسوا نہیں کرے گا۔

دینی امور میں لالچی ہونا

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مخلص انسان دینی امور میں بہت لالچی ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ سے زیادہ راضی ہو جائے۔ اس لیے اس کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کروں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی مخلوق کی خدمت سب سے زیادہ کروں اور جب کوئی دوسرا ایسا کام کرتا ہے تو اس کو رشک بھی آتا ہے اور یہ آرزو بھی کرتا ہے کہ میں بھی اس طرح کام کروں تاکہ مجھ سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے، لیکن وہ حسد کے مرض میں مبتلا نہیں ہوتا۔

آج کل اکثر دینی کام کرنے والوں کا حال

آج کل اکثر دینی کام کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ ایک دینی ادارے والے دوسرے دینی ادارے کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دینی مدرسہ کے اہتمام کرنے والے دوسرے دینی مدرسہ کی بیخ کنی

کر رہے ہیں۔ یہی حال دینی جماعتوں کا ہے اور یہی حال ایک ہی مدرسہ اور ایک ہی جماعت میں کام کرنے والوں کا ہے کہ ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ میرے نام کا ڈنکا بجے۔ وہ دوسروں کے عیوب دیکھ کر ان کو چھپاتے نہیں بلکہ خود ان کے پھیلانے اوران کی تشہیر کا ذمہ اپنے سر لے لیتے ہیں، بلکہ ایک جماعت دوسری جماعت، ایک ادارہ دوسرے ادارے، ایک کارکن یا استاد دوسرے کارکن اوراستاد کی برائی اور غلطی کا شدت سے منتظر رہتا ہے تاکہ کسی طرح وہ بدنام ہو جائے۔ یہ خالص شیطانی ذہنیت ہے۔ ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں قیامت میں شیطانوں کی صف میں نہ کھڑے ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب کی ستّاری فرمائے، ورنہ جہاں تک اخلاص اور للّٰہیت کی بات ہے وہ آج کل کے مسلمانوں میں بہت کم پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے دینی کاموں اوربظاہر نیک کاموں کے باوجود روز بروز ہمارا معاشرہ جنتی معاشرہ ہونے کے بجائے جہنمی معاشرہ بن رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص وللّٰہیت کی دولت سے نوازے، آمین!

مخلص احسان جتلانے اور ستانے والا نہیں ہوتا

۵۔ اخلاص کی پانچویں علامت یہ ہے کہ مخلص شخص اپنی دینی خدمات،نیک کاموں اور اپنے کیے ہوئے صدقات وغیرہ کی وجہ سے نہ کسی پر احسان جتلائے گا اور نہ ان کی وجہ سے کوئی دنیوی فائدہ، داد یاشکریہ حاصل کرنے کا امیدوار ہو گا اور نہ وہ ان کی وجہ سے کسی کی دل آزاری کرے گا۔ وہ تو اس ذات سے اجر وثواب کا امیدوار ہو گا جس کی خوشنودی اور رضاجوئی کے لیے اس نے کام کیا ہے، اور جو شخص دوسروں پر احسان جتلاتا ہے یادوسروں سے عزت، داد یاشکریہ وغیرہ کے حصول کا طلبگار اورامیدوار ہو یا وہ اپنے کیے ہوئے احسان کی وجہ سے کسی کی دل آزاری کرتا ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس نے یہ کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے نہیں کیا، بلکہ اس نے وہ کام لوگوں کے لیے کیا ہے جس کا بیان پہلے مدلل اور مفصل گزر چکا ہے۔

مخلص دوسروں کے نیک کاموں سے خوش ہوتا ہے

۶۔ اخلاص کی چھٹی علامت یہ ہے کہ مخلص دوسروں کے نیک کاموں سے خوش ہوتا ہے اور جس ہاتھ سے بھی کوئی برائی مٹ جائے تو وہ اس سے خوش ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی محبت ہو، اس کے دین سے اس کو سچا لگاؤ ہو اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ

خیر خواہی کرنے کا طالب ہو، ظاہر ہے کہ ایسا شخص دوسروں کے نیک کاموں سے خوش ہو گا، اُن کو پسند کرے گا اور اُن کا ایک گونہ احسان مند ہو گا کہ گویا وہ اسی کا کام کرتے ہیں۔

اس کے بر عکس جو شخص دوسروں کے نیک کام کو پسند نہ کرے اور جب دوسروں کے ہاتھ سے کوئی برائی مٹے وہ اس سے خوش نہ ہو تو ایسا شخص مخلص نہیں ہو سکتا۔ وہ خود پرست اور مفاد پرست ہے۔ وہ دین پھیلانا اور بے دینی کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ دین کے پھیلاؤ اور بے دینی کے مٹانے میں عزت اور منصب کا خواہشمند ہے۔ اس لیے جب دوسروں کے ہاتھ سے نیک کام وجود میں آئے یا کوئی برائی ختم ہو جائے تو وہ اس سے جلتا ہے کہ یہ عزت اور منصب دوسرے کو کیوں ملا اور یہ داد اور عزت میں نے کیوں حاصل نہ کی۔ اس لیے ایسا شخص دوسروں کے نیک کام کا معترف نہ ہو گا اور نہ ان کے نیک کاموں کی تعریف کو برداشت کر سکے گا۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ چند بھائیوں کی ایک مشترک کھیتی ہے، اس میں جھاڑ جھنکار پھیلی ہوئی ہے۔ ایک بھائی اس کھیتی میں کام کر رہا ہے۔ اس جھاڑ جھنکار کو بن بیخ سے اکھاڑ رہا ہے لیکن وہ جھاڑ جھنکار زیادہ ہے، وہ اس کو پوری طرح صاف نہیں کر سکتا اور اسی اثناء میں اس کی غیر موجودگی میں اس کا دوسرا بھائی آتا ہے، وہ پوری ہمت سے اس میں کام کر کے اس کھیتی کو صاف کر لیتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پہلا بھائی اس دوسرے بھائی کا احسان مند ہو گا اور اُس سے خوش ہو گا کہ اس نے اس کا ہاتھ بٹایا۔ اسی طرح ایک مخلص شخص بھی دوسروں کے نیک اور دینی کاموں سے اس وقت تک خوش رہتا ہے جب تک کہ وہ ان کاموں میں کسی خرابی اور فساد کے مرتکب نہ ہوں۔

مخلص نیک کام کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے

۷۔ اخلاص کی ساتویں علامت یہ ہے کہ مخلص دینی اور نیک کام کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے کہ کہیں یہ کام میرے لیے فائدہ کے بجائے نقصان کا باعث نہ بنے، مثلاً ایک شخص ہے جس سے اللہ تعالیٰ دین کا بہت کام لے رہا ہے، لوگوں کو اس سے بہت زیادہ دینی نفع پہنچ رہا ہے۔ وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر اور مخلوقِ الٰہی کی خدمت میں مصروف ہے اور اس کی وجہ سے لوگوں کی دینی، دنیوی، مادی اور روحانی ضروریات بھی پوری ہو رہی ہیں۔ اب اگر یہ شخص ان تمام نعمتوں کے بارے میں یہ خیال کرتا ہے کہ یہ

میرا کمال ہے تو اس میں فخر و ناز کے جذبات پیدا ہوں گے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری، خود پرستی اور بے اخلاصی کی علامت ہے۔

اور اگر ان نعمتوں کے بارے میں اس کا یہ پختہ یقین ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی فضل و کرم ہے تو اس کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو گا۔ وہ ایک تو اس بات سے خوف کھائے گا کہ کہیں یہ ترقی استدراج نہ ہو کہ اس کی وجہ سے ہلاکت و تباہی میں پڑ جاؤں یا خدانخواستہ میری کوئی بات یا عمل اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو جس کی وجہ سے یہ نعمت مجھ سے چھین لے یا کہیں اپنے کمال پر نظر چلی گئی ہو، حالاں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی نوازشات ہیں، تو ایسی صورت میں لازماً اس کا وبال یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ یہ نعمتیں مجھ سے چھین لے گا۔ اس طرح وہ نیک اور دینی کام کرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزتا رہتا ہے اور یہی اخلاص اور اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت ہے۔

اپنے آپ کو مخلص سمجھنے والا مخلص نہیں

جو شخص اپنے آپ کو مخلص سمجھتا ہے وہ حقیقی معنوں میں مخلص نہیں، کیوں کہ جو شخص اپنی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں اپنے آپ کو مخلص سمجھتا ہے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی محبت کی کمی ہے اور جس کے اندر عظمت اور محبت کی کمی ہوتی ہے تو اس کی نظر اپنے اعمال پر ہوتی ہے اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی بے اخلاصی ہی کو اخلاص سمجھتا ہے اور اپنے اعمال پر فخر کرنے لگتا ہے کہ گویا میں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ احسان کیا ہے، حالاں کہ اگر سچی محبت اور عظمت دل میں ہوتی تو ایک عشق ہزار بدگمانیاں ہوتیں، ایسی صورت میں اس کی نظر کبھی اپنے اعمال پر نہ پڑتی۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کے سامنے اپنے کیے ہوئے اچھے اعمال کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتا اور اس کو یہ ڈر لگتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا یہ عمل میرے منہ پر مارا جائے۔ اس لیے تو مخلص بندہ نیک اعمال کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاتا ہے کہ یا اللہ! میرا یہ عمل (جس کی توفیق بھی تو نے ہی دی تھی) آپ کی شان کے لائق اور پورے اخلاص کے ساتھ ادا نہیں ہوا مگر آپ ہی اس کو اپنی شان کے مطابق قبول فرمائیے۔

مخلص داعیِ حق تنہائی کے ذکر و مناجات کے لیے بے چین رہتا ہے

۸۔ اخلاص کی آٹھویں علامت یہ ہے کہ مخلص داعیٔ حق اور مصلح خلوت اور تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ساتھ مناجات کے لیے بے چین رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخلص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت رکھنے والا ہوتا ہے، اس لیے وہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا حکم مان کر لوگوں میں دین کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے اور دینی خدمات سر انجام دیتا ہے اور دوسری طرف اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور اس کی نظر اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے جس وقت وہ دوسروں کی علمی، مالی یا جانی خدمت کرتا ہے، لیکن اس وقت چوں کہ اس کا خیال مخلوق کی طرف ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ مشغول رہتا ہے اس لیے وہ بے چین رہتا ہے کہ جلد از جلد اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرکے یکسوئی کے ساتھ اپنے محبوبِ حقیقی کو یاد کرے۔

اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی معشوق و محبوب اپنے محب اور عاشق کو کسی کام پر بھیجے تو اس کام کو کرتے ہوئے اس کا دل محبوب کے ساتھ اٹکا رہتا ہے اور وہ اس کام کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دینے کے لیے بھاگ دوڑ بھی کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے لیے بے چین بھی رہتا ہے کہ میں اس کام سے فارغ ہو کر جلد از جلد اپنے محبوب سے تنہائی میں ملوں۔ یہی حال مخلص اور اللہ تعالیٰ کے سچے بندے کا ہوتا ہے، اس کا دل ہر وقت یہی چاہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تنہائی میں مناجات کرے، ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی یاد میں مصروف ہو، مگر اپنے محبوبِ حقیقی اللہ رب العالمین ہی کا حکم ہوتا ہے کہ اس کی ہدایات دوسروں کو پہنچائے اور اُس کے مخلوق کی علمی، مالی اور جانی خدمت کرے۔ اس لیے اپنے پروردگار اور محبوب کے حکم کی تعمیل میں اپنی خواہش کو فنا کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم اور اپنی ذمہ داری پوری کرکے خلوت اور تنہائی کی طرف لپک جاتا ہے۔

آپ حضرات انبیا علیہم السلام خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سچے مصلحین و مبلغین کی زندگیوں پر نظر ڈالیں تو ان کی زندگیوں میں اسی دو طرفہ بے چینی کو پائیں گے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے حکم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لیے بے چین ہوتے ہیں اور ان کی خدمت میں سرگرم رہتے ہیں اور دوسری طرف خلوت و تنہائی میں اپنے محبوبِ حقیقی کے ساتھ مناجات

کرتے ہیں، اُس کو یاد کرتے ہیں اور اس کے سامنے ایسی بے چینی اور دلی جوش سے روتے ہیں جیسا کہ آگ پر رکھی ہوئی ہانڈی جوش مارتی ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ دین کے کام کرتے ہیں، خواہ وہ دعوت و تبلیغ ہو یا درس و تدریس، جہاد ہو یا اصلاح کا کام؛ وہ اگر انہی کاموں میں اس قدر مشغول ہوں کہ ان کو ہر وقت لوگوں میں بیان اور کام کرنے کا شوق چڑھا رہتا ہو اور وہ خلوت و تنہائی کے لیے بے چین نہ ہوں، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اُن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ شدید محبت نہیں جو مومن کے لیے ضروری ہے۔ وہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے نہیں کرتے، بلکہ اپنے نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کرتے ہیں، ورنہ اگر ان کو اللہ تعالیٰ سے صحیح معنوں میں محبت ہوتی تو ان کا دل تنہائی اور خلوت کے ذکر اور یاد میں خوش ہوتا اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز اور ذکرِ الٰہی میں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنوں میں اپنا بندہ بنائے اور ہم سب کو صدق و اخلاص سے نوازے، آمین

اخلاص کے واقعات

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اخلاص

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ مثنوی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے معرکۂ جہاد میں ایک یہودی کو پچھاڑلیا اور سینہ پر بیٹھ کر ذبح کرنا چاہا۔ یہودی نے آپ کے چہرہ پر تھوک دیا تو فوراً چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مولانا فرماتے ہیں:

اور خدا او انداخت بر روئے علی   افتخار ہر نبی و ہر ولی

بعض لوگوں نے اس شعر کو الحاقی کہا ہے کہ یہ کسی شیعی نے مثنوی میں بڑھادیا ہے، کیوں کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افتخار ہر نبی کہا ہے مگر یہ خیال غلط ہے، کیوں کہ فخر ہمیشہ چھوٹوں کو بڑوں پر نہیں ہوتا، کبھی بڑوں کو بھی چھوٹوں پر فخر ہوتا ہے کہ دیکھو! یہ ہمارا لڑکا کیسا لائق ہے۔ حدیث میں بھی تو ہے تَزَوَّجُوا لُوَدُوْدَ الْوَ لُوْدَ فَاِنِّیْ اُبَاهِیْ بِکُمُ الْاُمَمَ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اوپر فخر کریں گے۔ ویسا ہی افتخار یہاں مراد ہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ یہودی کو چھوڑ کر الگ ہو گئے تو اس نے سوال کیا کہ حضرت! دشمن پر قابو پا کر اور اس کی گستاخی دیکھ کر چھوڑ دینا تعجب خیز ہے۔ فرمایا: گستاخی کی وجہ سے چھوڑ دیا کیوں کہ اس سے پہلے تو میں اللہ کے واسطے مار رہا تھا اور گستاخی کے بعد نفس کو ہیجان اور جوش انتقام ہوا تو میرا تجھے مارنا خالص اللہ کے واسطے نہ ہوتا، بلکہ اس میں شفائے غیظ نفس بھی شامل ہوتا۔ اس کو میں نے گوارانہ کیا، کیوں کہ یہ شان اخلاص کے خلاف تھا۔

یہ سنتے ہی یہودی ایمان لے آیا۔ صاحبو! ہمارے امر بالمعروف میں اثر نہ ہونے کی یہ بھی وجہ ہے کہ ہمارے اندر خلوص نہیں۔ ہمارے سب وعظ و نصائح اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے ہوتے ہیں ورنہ اخلاص ہو تو ضرور اثر ہو۔ (خطبات حکیم الامت ج۱۹، ص ۲۶۳ تا)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا اخلاص

جنگ یرموک جاری تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کی قیادت کر رہے تھے کہ مدینہ سے قاصد ایک خط لے کر آیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتقال

ہو گیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے جانشین مقرر ہوئے ہیں۔ خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ نئے خلیفہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے ان کی جگہ ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو سالارِ افواجِ اسلامیہ مقرر کیا ہے۔

یہ خط سب سے پہلے حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہی کے ہاتھ میں پہنچا۔ اسے پڑھ کر وہ ذرا بھی بددل نہ ہوئے۔ خاموشی کے ساتھ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو خبر دے دی کہ اب آپ میرے سردار ہیں اور میں آپ کا ماتحت، اور اس خبر کو عام طور پر شہرت نہ دی کہ کہیں فوج میں بددلی اور ہراس نہ پھیل جائے۔

کسی نے آپ سے پوچھا کہ "معزولی کی خبر سے آپ کے حملوں کی سختی میں ذرا فرق نہ آیا۔"

آپ نے جواب دیا کہ:

"میں خدا کے لیے لڑ رہا تھا نہ کہ عمر رضی اللہ عنہ کے لیے۔"

شیخ ابو الحسن نوری رحمہ اللہ کا اخلاص

شیخ ابو الحسن نوری رحمہ اللہ ایک دفعہ ساحل کی طرف گئے تو دیکھا کہ کشتیوں پر مٹکے لدے ہوئے ہیں اور ساحل پر اتارے جا رہے ہیں۔ آپ رحمہ اللہ نے ملاح سے پوچھا کہ ان مٹکوں میں کیا ہے؟ کہا: خلیفہ کے لیے شراب آئی ہے۔ آپ کو یہ سنتے ہی غصہ آیا اور فرمایا: ذرا لکڑی تو دو۔ اس نے لکڑی دے دی اور سمجھا کہ ویسے ہی مذاق کر رہے ہیں، مگر آپ ڈنڈا لے کر کشتیوں پر جا چڑھے اور ایک طرف سے مٹکوں کو توڑنا شروع کیا۔ دس مٹکے تھے، نو کو تو توڑ دیا، ایک چھوڑ دیا۔ مخبر نے خلیفہ کو اطلاع دی کہ ابو الحسن نوری نے شاہی شراب کے مٹکے توڑ دیئے۔ دربار میں بلائے گئے اور سوال ہوا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی؟ فرمایا: حدیث میں ہے: مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ اس لیے میں نے منکر کو دیکھ کر اس کو مٹا دیا۔ خلیفہ نے کہا کہ یہ کام محتسب کا ہے، تم کو محتسب کس نے بنایا؟ فرمایا: مجھے اس نے محتسب بنایا جس نے تجھ کو خلیفہ بنایا۔ کہا: سند؟ فرمایا: حق تعالیٰ فرماتے ہیں: يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۞ اس میں کسی کی تخصیص نہیں۔ پس میں اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو کر چکا ہوں، اب تو جو کچھ میرے ساتھ معاملہ کرے اس پر صبر کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ خلیفہ نے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک مٹکہ چھوڑ دیا۔ اس کا اُنہوں نے عجیب جواب دیا۔ فرمایا کہ جب میں نو مٹکے توڑ چکا

تو میرے نفس نے کہا: اے ابو الحسن ! آج تو نے بڑا کام کیا کہ خلیفہ کی بھی پرواہ نہ کی، واقعی تو دین کے معاملہ میں بڑا جری ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ہاتھ روک لیا، کیوں کہ اب میرا توڑنا اللہ تعالیٰ کے واسطے نہ ہوتا نفس کے واسطے ہوتا، اور میں نے یہ گوارا نہ کیا کہ جو کام اللہ کے واسطے کیا جائے اس میں نفس کی آمیزش ہو اس لیے دسویں مٹکے کو چھوڑ دیا۔

اخلاص کے دو واقعات

حضرت حاجی صاحب کا یہ مذاق تھا، فرمایا کرتے تھے کہ دوستوں سے باتیں کرنا بھی عبادت ہے مگر شرط یہی ہے کہ خلوص ہو، نیت اچھی ہو۔ اس خلوص اور نیت اچھی پر ایک حکایت یاد آئی :

دو بزرگ تھے، درمیان میں دونوں کے دریا حائل تھا۔ ایک بزرگ کے پاس کھانے کو نہ تھا، دوسرے بزرگ کو مکشوف ہوا۔ اپنی بیوی سے کہا کہ ان بزرگ کو کھانا پہنچادو۔ بیوی نے کہا کہ درمیان میں دریا حائل ہے، کیسے جاؤں ؟ فرمایا: یہ کہنا کہ بہ برکت فلاں شخص کے (یہ اپنی طرف اشارہ تھا) جس نے چالیس سال سے اپنی بیوی سے ہمبستری نہیں کی، راستہ مل جائے۔ بیوی کو بڑا تعجب ہوا کہ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہے، ہر وقت تو سینے پر سوار رہتا ہے، مگر ان کے کہنے سے یہی کہہ دیا اور دریا پایاب ہو گیا، کھانا پہنچادیا۔ ان بزرگ نے اس کے سامنے ہی کھالیا۔ واپسی کے وقت اس خاتون نے دریا کے حائل ہونے کا اشکال پیش کیا۔ انھوں نے یہ دعا سکھلائی کہ بہ برکت اس شخص کے (یہ اشارہ تھا اپنی طرف) جس نے چالیس سال سے کھانا نہیں کھایا، راستہ مل جائے۔ اس پر مکرر تعجب ہوا کہ میرے سامنے کھانا کھایا، اتنا جھوٹ کہنے سے پھر راستہ مل گیا۔ اپنے شوہر سے یہ اشکال پیش کیا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ مطلب اس کا یہ تھا کہ ہمبستری اور تناول طعام امر کے تحت تھا، حظِ نفس کے لیے نہ تھا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

کار پاکان را قیاس از خود مگیر: گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

اس خلوص پر ایک مناظرہ یاد آیا:

ایک مرتبہ مولوی تراب صاحب لکھنوی اور مفتی سعد اللہ صاحب رامپوری میں گفتگو ہوئی۔ مولوی تراب صاحب مولود متعارف کے حامی تھے اور مفتی صاحب مانع۔ تراب صاحب نے مفتی صاحب سے کہا: کیوں صاحب! ابھی تک آپ کا انکار چلا ہی جاتا ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ ابھی تک آپ کا اصرار

چلا ہی جاتا ہے۔ مولوی تراب صاحب نے کہا: واللہ! ہمارے اس فعل کا منشا بجز محبت رسول اللہ ﷺ کے اور کچھ نہیں۔ سعد اللہ صاحب نے کہا: واللہ! ہمارے منع کا منشا بجز متابعت رسول اللہ ﷺ کے اور کچھ نہیں۔ مولوی تراب صاحب نے کہا: الحمد اللہ! ہم تم دونوں ناجی ہیں۔ یہ رنگ تھا اہل اخلاص کے مناظرہ کا۔ (ملفوظات حکیم الامت: جلد ۴، ص ۳۸)

شیخ عبد اللہ مجذوم کی اہلیہ کا اخلاص

شیخ عبد اللہ قریشی مجذوم بہت بڑے اللہ کے ولی تھے، مگر اندھے اور جذامی تھے۔ ان کے ایک مرید کی جواں سال خوبصورت بیٹی نے باپ سے کہا کہ میں اللہ کی خوشنودی کے لیے کوئی کام ایسا کرنا چاہتی ہوں جو خالص اللہ کے لیے ہو اور جس میں میرا نفس بالکل شریک نہ ہو، اس لیے میں نے طے کیا ہے کہ آپ میرا نکاح شیخ قریشی سے کر دیں۔ باپ نے شیخ سے اس کا نکاح کر دیا۔ شیخ قریشی لڑکی کے جذبہ و اخلاص اور نفس کی قُربانی سے بہت متاثر ہوئے، آپ نے خدا سے دُعا مانگی کہ الٰہی! میں جب اس لڑکی کے پاس جایا کروں تو میری شکل ایک خوبرو صحت مند جوان جیسی ہو جایا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے دُعا قبول فرمائی۔ چناں چہ شبِ زفاف حضرت قریشی ایک خوبصورت جوان کی صورت میں اُس لڑکی کے پاس گئے، وہ غیر مرد سمجھ کر بھاگی۔ آپ بولے: گھبراؤ مت! میں قریشی ہوں، میں نے تمہاری اس قُربانی سے متاثر ہو کر دُعا کی تھی کہ میں تمہارے سامنے اس شکل میں آیا کروں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اخلاص کی برکت سے قبول فرمائی۔ لڑکی بولی: افسوس! آپ نے میرے سب کیے پر پانی پھیر دیا۔ آپ اپنی اصلی شکل اور بیماری کے ساتھ ہی مجھ سے ملا کریں تاکہ مَیں آخرت میں اپنے اس عمل کا پورا پورا اجر پا سکوں۔

(جواہرات علیہ: ۱۰۲، بحوالہ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانیؒ)

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا اخلاص

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے ایک واقعہ سنایا کہ مولانا محمد رفیع عثمانی مد ظلہم لکھتے ہیں: کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے کانپور میں ایک جلسہ منعقد کروایا جس میں اپنے استاذ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو دعوت دی اور کانپور کے علما کو بھی دعوت دی جن کو اپنے عقلی علوم پر ناز تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اہل دیوبند ان علوم سے عاری ہیں۔ بہر حال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے بیان شروع فرمایا۔ حضرت شیخ الہند

رحمۃ اللہ علیہ تو ہر علم و فن تفسیر، حدیث، فقہ، فلسفہ اور منطق وغیرہ کے، حتیٰ کہ جہاد کے بھی امام تھے۔ اپنے بیان کے اندر علوم و فنون کے وہ دریا بہائے کہ مجمع میں موجود تمام بڑے بڑے علمائے کرام مبہوت رہ گئے۔ اسی دوران وہ علمائے معقولین مع اپنے مریدوں کے آ گئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کو دیکھا تو قدرے توقف کیا اور اسی وقت مضمون کو ادھورا چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت! کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟ فرمایا: "بس! اب بیان نہیں کروں گا"۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ "حضرت! اب تو بیان کا وقت آیا تھا۔" فرمایا کہ ہاں! میرے دل میں بھی یہی خیال آ گیا تھا، اسی لیے تقریر ختم کر دی، کیوں کہ پہلے اللہ کے لیے تھی اور اب اس میں دکھاوا شامل ہو جاتا۔

(اکابر کا اخلاص اور باہمی تعلق: ۲۱ تا ۲۲)

اخلاص کا نور

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک بزرگ اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہدیہ لانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ راستہ میں خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا باندھا، وہ لا کر بطورِ ہدیہ پیش کر دیا۔ ان بزرگ نے اس کی اتنی قدر کی کہ ان لکڑیوں کو احتیاط کے ساتھ رکھا اور وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد غسل کے لیے جو پانی گرم کیا جائے وہ اسی سوختہ سے کیا جائے۔

فائدہ: جو چیز حب فی اللہ کی بنا پر اخلاص کے ساتھ آئے اس میں نور ہوتا ہے، اس کو ضرور استعمال کرنا چاہیے، کیوں کہ جو چیز اخلاص سے دی جاتی ہے اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

تکبر وغرور کا بیان

تکبر اور غرور بد ترین مرض ہے اور بہت سے باطنی امراض اس سے پیدا ہوتے ہیں، جیسے حسد، بخل، حقوق کی ادائیگی میں دھاندلی اور ریا وغیرہ۔

تکبر کے معنی

"کبر" بڑائی کو کہا جاتا ہے اور تکبر بڑائی کے اظہار کو کہتے ہیں۔ جب کوئی انسان اپنے اندر کوئی وصف وکمال دیکھتا ہے تو اس کے دل میں اس کمال کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور جب خیال ترقی کرتا ہے تو وہ ان لوگوں کو، جن میں یہ وصف وکمال دکھائی نہیں دیتا یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وہ بڑائی ہے جس کو کِبر کہا جاتا ہے، اور پھر جب وہ باطنی بڑائی کو اپنے قول وفعل یا ادا سے ظاہر کرتا ہے تو اس کِبر کے اظہار کو تکبر کہا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے "کبر" کی حقیقت کو یوں بیان فرمایا کہ: اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ "کبر یہ ہے کہ حق بات کو ہٹ دھرمی سے نہ ماننا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔" (مسلم، مشکوٰۃ)

تکبر کے درجات

تکبر کے بڑے بڑے دو درجے ہیں۔

۱۔ تکبر کا پہلا درجہ حق کے معاملہ میں تکبر کرنا ہے کہ قصداً حق کا انکار اس لیے کیا جائے کہ وہ حق اس متکبر کے بجائے دوسرے کے پاس ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اس حق کو جو دوسرے کے پاس ہے اگر قبول کرے تو یہ اُس دوسرے کی برتری کو تسلیم کرنا ہوتا ہے اور اِس سے اُس کا پندار سیادت مجروح ہوتا ہے، اس لیے وہ سرے سے حق کا ہی انکار کرتا ہے۔

جو لوگ قصداً حق سے ٹکراتے ہیں وہ قوم کے وہ مغرور اور متکبر لوگ ہوتے ہیں جو دینی یا دنیوی لحاظ سے لوگوں کی قیادت وپیشوائی کرتے ہوں۔

انہیں مغرور قائدین، پیشوا اور لیڈروں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: اِنَّ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ سُلۡطٰنٍ اَتٰىہُمۡ ۙ اِنۡ فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ اِلَّا کِبۡرٌ مَّا ہُمۡ بِبَالِغِیۡہِ "جو لوگ کسی حجت وسند کے بغیر، جو ان کے پاس آئی ہو، اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں جھگڑا (اور کجی نکال کر ان کا انکار) کرتے ہیں (اس کی وجہ اور کوئی نہیں بلکہ) ان کے دلوں میں صرف کبر ہوتا ہے کہ وہ اس تک کبھی پہنچنے والے نہیں۔" (سورۃ المؤمن: آیت ۵۶)

اس کا مطلب وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کی مخالفت کا سبب یہ نہیں کہ ان سے حق مخفی ہے یا ان کے پاس اس کے خلاف کوئی سند، حجت اور دلیل ہے بلکہ یہ صرف اس وجہ سے مخالفت کر رہے ہیں کہ ان کے دلوں میں کبر اور بڑائی ہے، وہ ڈرتے ہیں کہ اگر انہوں نے تمہاری بات تسلیم کر لی تو یہ تمہاری برتری تسلیم کر لینا ہے جس سے ان کا پندار سیادت مجروح ہوتا ہے کیوں کہ اس صورت میں وہ تمہارے مقابلے میں اپنی برتری کھو دیں گے۔

خلاصہ یہ کہ جانتے بوجھتے حق سے ٹکرانے والے دراصل وہ مغرور لوگ ہوتے ہیں جو دینی یا دنیاوی اعتبار سے لوگوں کی قیادت اور پیشوائی کرتے ہوں اور عام لوگ چوں کہ ان کے پیروکار اور ان کے ماننے والے ہوتے ہیں اس لیے ان کی وجہ سے ابتداءً عوام کی اکثریت حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ البتہ جب ان مغرور باطل پرستوں کا زور ٹوٹ جاتا ہے تو سادہ لوح عوام کی آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں اور پھر وہ بھی حق کو اپنا لیتے ہیں۔

۲۔ تکبر کا دوسرا درجہ مخلوق کے معاملے میں تکبر کرنا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت، حسن و جمال، جسمانی قوت وطاقت یا علم سے نوازا ہو، یا انہیں اللہ تعالیٰ نے کسی شرف والے خاندان میں پیدا کیا ہو، یا انہیں اقتدار وعزت نصیب کی ہو، یا انہیں کثرت سے نوافل، ذکر وعبادت اور نیک کاموں کی توفیق ملی ہو، تو بہت سے ناشکرے اور مغرور ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ان خداداد نعمتوں کی وجہ سے دوسروں کو حقیر وذلیل سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ صحیح رویہ یہ ہے کہ ان نعمتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے اور ان نعمتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بندوں کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں اُن کو حسن وخوبی سے پورا کریں۔

اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس اور تکبر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتیں عنایت فرمائی ہیں، پھر انسانوں میں سے بعض کو وہ نعمتیں اور صلاحیتیں ملیں جو دوسروں کو نہیں ملیں۔ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو علم کی عظیم نعمت سے نوازا، کسی کو مال ودولت کی فراوانی نصیب فرمائی، کسی کو دوسروں پر حاکم اور بادشاہ بنایا، کسی کو دو آنکھیں اور بہترین بینائی دی، کسی کو اچھی صحت ملی، کسی کو عزت والا منصب عطا فرمایا۔ اس طرح انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے مقابلے میں مختلف خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے، اور لوگ اس پر خوش ہوتے ہیں کہ ہم کو یہ یہ نعمتیں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ملی ہیں۔ یہ خوش ہونا تکبر نہیں، بلکہ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ سے خوش اور راضی رہنا ضروری ہے اور ان کا انکار کفرانِ نعمت، ناشکری اور اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کی ناقدری ہے۔

لہٰذا اگر کوئی اپنے اوپر دوسروں سے زیادہ نعمتوں کا احساس کرتا ہے مثلاً مال ودولت والا شخص یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک فقیر کے مقابلہ میں زیادہ مال ودولت عنایت فرمائی ہے یا اَن پڑھ کے مقابلے میں پڑھا لکھا عالم دین بنایا ہے یا بیماری کے مقابلے میں صحت بخشی ہے یا دوسروں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کمال میں ممتاز فرمایا ہے تو یہ تکبر میں داخل نہیں۔ تکبر تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو ان خوبیوں اور نعمتوں کا مستحق سمجھ کر دوسروں کو حقیر یا اپنے آپ کو دوسروں سے افضل سمجھے۔

بندے کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے بارے میں یہ خیال کرے کہ میری ذات، میری صلاحیتیں اور یہ تمام نعمتیں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور بخشش ہیں۔ میری ذات میں کوئی بھی کمال اور کسی عمل کی ذرہ برابر صلاحیت نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے یہ نعمتیں نصیب فرمائی ہیں اور ہر وقت اس اندیشہ میں رہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر مجھ سے یہ نعمتیں چھین نہ لے۔ کسی کو بھی حقیر نہ جانے خواہ اس کا ظاہر جیسا بھی ہو۔ اس کے متعلق یہی خیال کرے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی خوبی ہو جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجھ سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہو، یا آنے والے وقت میں اس کو ہدایت ہو جائے اور وہ بڑے بڑے دینی کام کر کے انجام کے اعتبار سے مجھ سے بڑھ جائے۔ میری کوئی عادت خدانخواستہ ایسی بری ہو، جو میرے لیے آخرت کی بربادی

کا باعث بنے۔

ہم زندگی میں بار بار اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ صاحبِ منصب اور حاکم جیل میں جاتے ہیں اور فقیر بادشاہ بن جاتے ہیں ۔ بعض دیندار لوگ بالآخر گمراہ ہو کر دنیا سے اسی حال میں چلے جاتے ہیں، فساق وفجار اور کافر ہدایت پا کر ایسے بڑے بڑے دینی اور خیر خواہی کے کام کر جاتے ہیں کہ پیدائشی مسلمانوں اور نیکو کاروں سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے بندوں کو چاہیے کہ کسی کو حقیر اور خود کو دوسروں سے افضل نہ سمجھیں، کیوں کہ افضلیت کا دارومدار اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبولیت پر ہے۔ بندے تو صرف اتنی بات معلوم کر سکتے ہیں کہ فلاں صاحبِ کمال ہے یا کوئی صحت مند ہے یا بیمار۔ مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون افضل اور بہتر ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

تکبر کی مذمت اور اس کے نقصانات

تکبر بہت سے روحانی اور اخلاقی امراض اور تمام رذائل جیسے ریا، بغض، کینہ اور حسد وغیرہ کی ماں اور بنیاد ہے ، بہت سی بیماریاں اسی ایک مرض سے جنم لیتی ہیں، تکبر انتہائی سخت جرم ہے، قرآن وحدیث میں اس بارے میں بہت زیادہ وعیدیں آئی ہیں اور اس مرض کی بہت زیادہ مذمت بیان فرمائی گئی ہے۔

ذیل میں اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں سے کچھ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

متکبر اللہ تعالیٰ کا حریف بنتا ہے

جو آدمی کبر اور تکبر کے مرض میں مبتلا ہے اور اپنی بڑائی کا اظہار کرتا ہے، دراصل یہ شخص اپنی حقیقت کو بھولا ہوا ہے اور بندگی کے بجائے خود اللہ تعالیٰ کا حریف اور مدمقابل بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ "پس ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں جو رب ہے آسمانوں کا اور رب ہے زمین کا، رب ہے تمام جہانوں کا۔ اسی کے لیے بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔" (سورۂ جاثیہ: آیت ۳۶-۳۷)

جب ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں اور وہی اس عظیم کائنات کا پروردگار ہے اور وہی تمام جہانوں کا رب اور مالک ہے تو پھر کسی اور کو ہرگز یہ زیبا نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہو کر اللہ تعالیٰ کی کائنات میں تکبر کا رویہ اختیار کرے۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ... ”اور بڑائی اسی کے لیے ہے.....۔“

یہ دوسری آیت پہلی آیت کا نتیجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس ساری کائنات کا پروردگار اس کا خالق ومالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور ساری تعریفیں اسی کے لیے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے آسمانوں اور زمین میں کسی دوسرے کے لیے کبریائی اور بڑائی کی گنجائش کہاں سے نکل آئی؟۔

پس جب کبریائی کا حق دار وہی ہے تو سب کو اُسی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور صرف اسی کے آگے سر افگندہ ہونا ہے۔ اگر کوئی اس کی مملکت میں اس کے مقابل سر اٹھاتا ہے تو وہ اس کی کبریائی کو چیلنج کرتا ہے اور جو اس کی کبریائی کو چیلنج کرے گا تو وہ لازماً تباہ وبرباد ہو جائے گا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ عزیز یعنی غالب اور زبردست ہے اس لیے اس کی گرفت سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ بہت سے مشرکین، متکبر دندناتے پھرتے ہیں تو گویا وہ اللہ کی گرفت سے باہر ہو گئے، ایسا ہرگز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ان کی سرکشی کے لیے مہلت دے رکھی ہے اور اس مہلت میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت ہوتی ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ عزیز کے ساتھ حکیم بھی ہے اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کفار کی بدحواسی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ۞ ”یہ اس سبب سے ہے کہ تم زمین میں ناحق اتراتے اور اکڑتے رہے۔“ (سورۃ المؤمن: آیت ۷۵)

اللہ تعالیٰ ہی تمام کائنات کا خالق ومالک ہے، سب کچھ اسی کی ملکیت ہے۔ اس وجہ سے کبریائی صرف اسی کو زیبا ہے۔ اگر کوئی دوسرا اِس کائنات میں تکبر کرتا ہے تو یہ بڑائی کا ناحق اور جھوٹا دعویدار ہے اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی خاص رداء اپنے اوپر ڈالنے کی جسارت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حریف بننے کی کوشش کرتا ہے۔

اِسی حقیقت کی طرف ایک حدیثِ قدسی میں اشارہ کیا گیا ہے۔

چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي وَالْعَظَمَةُ إِزَارِي فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِداً مِّنْهُمَا اَدْخَلْتُهُ النَّارَ "کبریائی اور بڑائی (تمہارے اعتبار سے) میری چادر ہے اور عظمت (تمہارے اعتبار سے) میرا ازار (یعنی تہبند) ہے، پس جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی مجھ سے جھگڑا کرے گا تو میں اس کو جہنم میں ڈال دوں گا۔ (مشکوٰۃ ج۲/ص۴۳۴)

تکبر شرک ہے

مذکورہ بالا آیتوں اور حدیث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ متکبر حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا حریف ومدِ مقابل بنتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ تکبر شرک ہے۔

جس دل میں تکبر موجود ہو اس کو ہدایت نہیں ملتی

جس دل میں اس وقت تک تکبر کا یہ خطرناک مرض موجود ہو اس کو ہدایت نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی مزاحمت اور مخالفت انہیں لوگوں نے کی جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے تھے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا، لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے مسلسل اس لیے انکار کیا کہ ان کے دلوں میں کبر تھا اور وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۞ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَائِهٖ وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۞ "پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون (علیہما السلام) کو بھیجا اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس، تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ مغرور لوگ تھے۔"

(سورۃ المومنون: آیت ۴۵-۴۶)

مغرور کے دل پر اللہ تعالیٰ کی مہر لگ جاتی ہے

جو لوگ مسلسل غرور اور اپنے اوپر گھمنڈ کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں ان کے دلوں پر بالآخر سنتِ الٰہی کے مطابق مہر لگ جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۞ "اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے ہر مغرور اور سرکش کے دل پر۔" (سورۃ المؤمن: آیت ۵۳)

مغرور شیطان مردود کا بھائی ہے

جو شخص فخر و غرور میں مبتلا رہتا ہے، حقیقت میں وہ شیطان کی سنت کو اپنائے ہوئے ہے اور اس کا پیروکار و بھائی ہے کیوں کہ شیطان ہی پہلا مغرور ہے اور اسی غرور کے نتیجے میں وہ ملعون اور مردود ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان کا واقعہ بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا اور ان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی نافرمانی کی وجہ بھی بتلائی کہ: اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ ۞ "اس ابلیس نے انکار کیا اور تکبر (وغرور) کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔"

(سورۂ بقرہ: آیت ۳۰-۳۴)

مغرور لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم اور اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہوتے ہیں

جن لوگوں کے دلوں میں تکبر وغرور سمایا ہوا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم اور اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کی نشاندہی قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر مختلف اسلوب میں کی ہے۔ یہاں بطورِ نمونہ صرف ایک آیت پیش کی جاتی ہے:

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۞ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۞

"تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، پس جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے دل انکار کرنے والے ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یقیناً جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک وہ (اللہ تعالیٰ) تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" (سورۂ نحل: آیت ۲۲-۲۳)

ان آیتوں میں سے پہلی آیت میں منکرینِ حق کے انکار کا سبب استکبار بتایا گیا ہے اور دوسری آیت میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے اِس انکار کے باطنی محرک اور ان کے اس ظاہری انکار کو خوب جانتا ہے اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں استکبار اور غرور کا خنّاس سمایا ہوا ہے، اس وجہ سے وہ حق کو حق مانتے ہوئے جھٹلا رہے ہیں، اور آخر میں بتایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ متکبروں اور مغروروں کو دوست نہیں رکھتا۔ دوست نہ رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو مبغوض رکھتا ہے۔

مغرور اور متکبر کا ٹھکانا جہنم ہے

جو لوگ غرور اور تکبر کے شکار ہوتے ہیں ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس بارے میں بہت سی آیتیں موجود ہیں۔ یہاں صرف چند ایک پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ۝ "اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ مجھ کو پکارو، میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری بندگی سے تکبر (یعنی سرتابی) کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔" (سورۃ المؤمن: آیت ٦٠)

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے متکبرین اور مشرکین پر پڑنے والی سختیوں کا ذکر کیا ہے کہ ان کے گردنوں میں طوق ہوں گے، زنجیریں ہوں گی اور وہ کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹے جائیں گے وغیرہ، یہ تمام سختیاں بیان کر کے آخر میں فرمایا کہ ان مشرکین و متکبرین سے کہا جائے گا کہ ذَٰلِكُم بِمَا كُنتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَمْرَحُونَ۝ اُدْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ۝ "یہ اس سبب سے ہے کہ تم زمین میں ناحق اتراتے تھے اور اس سبب سے کہ تم غرور اور گھمنڈ کرتے تھے۔ (اب) داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے، پس کیا ہی برا ٹھکانا ہے تکبر اور غرور کرنے والوں کا۔" (سورۃ المؤمن: آیت ۷۵-۷۶)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ۝ "کہا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے، پس کیا برا ٹھکانا ہے تکبر و غرور کرنے والوں کا۔" (سورۂ زمر: آیت ۷۲)

ہر متکبر جہنم میں ہو گا

ایک حدیث کے آخر میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ النَّارِ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ ”کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اُکھڑا، بد خو اور مغرور شخص۔“

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ)

متکبر جنت میں داخل نہ ہو گا

تکبر اللہ تعالیٰ کو اس قدر ناپسند اور مبغوض ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کہ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ ”وہ شخص جنت میں داخل نہ ہو گا کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہو گا۔“ (مسلم ص ۵۴)

اس کا مطلب یہ ہے کہ تکبر اس قدر خطرناک مرض ہے کہ جب تک ذرہ برابر بھی دل میں موجود رہے گا اس وقت تک وہ بندہ سیدھا جنت میں داخل نہ ہو سکے گا، بلکہ اُس کو اس کی قلبی کھوٹ دور کرنے کے لیے جہنم میں پھینکا جائے گا اور جب وہاں آگ میں اس کا مادۂ تکبر پوری طرح جل جائے گا اور غرور کی گندگی سے بالکل پاک وصاف ہو جائے گا تو پھر اگر وہ صاحبِ ایمان ہے تو اس کے بعد جنت میں داخل ہو سکے گا۔

مغرور خنزیر سے بھی زیادہ ذلیل ہو گا

متکبر اور مغرور کو اللہ تعالیٰ دنیا میں خنزیروں سے بھی زیادہ ذلیل ورسوا کرے گا جیسا کہ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِي اَعْيُنِ النَّاسِ صَغِيْرٌ وَّفِي نَفْسِهٖ كَبِيْرٌ حَتّٰى لَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِمْ مِّنْ كَلْبٍ اَوْ خِنْزِيْرٍ ”اور جو کوئی تکبر اور غرور کا رویہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو نیچے گرا دے گا۔ چناں چہ وہ لوگوں کی نظروں میں تو حقیر و ذلیل ہو جائے گا اگرچہ وہ خود اپنے خیال میں اپنے آپ کو بڑا سمجھے گا۔ (لیکن دوسروں کی نظروں میں اس قدر گر جائے گا) کہ وہ ان کی نظروں میں کتوں اور خنزیروں سے بھی زیادہ حقیر ہو جائے گا۔ (مشکوٰۃ، بیہقی)

قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے متکبرین کی تصویر کو ثانی عطفہٖ کے ساتھ بیان کر کے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ: لَهٗ فِي الدُّنيَا خِزْيٌ وَّ نُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ "اس کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو جلتی ہوئی آگ کا عذاب چکھائیں گے۔"

(سورۂ حج: آیت ۹)

متکبر اور مغرور کی ذلت بروزِ محشر

متکبر اور مغرور کا اصل ٹھکانا جہنم ہے، لیکن موت کے بعد متکبر کو جس قدر ذلت آمیز مراحل پیش آنے ہیں ان میں سے ایک مرحلہ محشر بھی ہے۔ محشر کے دن اس کو جو عذاب اور تکلیف ہو گی وہ تو اپنی جگہ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کو ذلیل بھی کیا جائے گا۔

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْثَالَ الذَّرِ فِيْ صُوَرِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ يُسَاقُوْنَ اِلٰى سِجْنٍ فِيْ جَهَنَّمَ يُسَمّٰى بُوْلَسَ تَعْلُوْهُم نَارُ الْاَنْيَارِ يُسْقَوْنَ مِنْ عُصَارَةِ اَهْلِ النَّارِ طِيْنَةِ الْخَبَالِ

"قیامت کے دن فخر و غرور کرنے والوں کو چھوٹی چیونٹیوں کی طرح مَردوں (یعنی انسانوں) کی صورت میں جمع کیا جائے گا۔ ان پر ہر جانب سے ذلت چھائی ہوئی ہو گی پھر ان کو جہنم کے ایک قید خانے کی طرف، جس کا نام بُولَس ہے، ہانکا جائے گا۔ وہاں آگوں کی آگ ان پر چھا جائے گی، ان کو دوزخیوں کا نچوڑ (یعنی ان کے بدنوں سے بہنے والا خون، پیپ وغیرہ) طینۃ الخبال پلایا جائے گا"۔ (مشکوٰۃ، ترمذی ص ۵۹۰)

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن تکبر و غرور کرنے والے ایسے ذلیل و خوار ہوں گے کہ ان کے جسم تو چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی طرح چھوٹے ہوں گے، لیکن ان کی شکل و صورت اسی طرح ہو گی کہ جس شکل و صورت کے ساتھ وہ دنیا میں تھے۔ اور ان پر میدانِ حشر میں اس قدر ذلت و خواری چھائی ہو گی کہ ان کی ذلت و رسوائی تمام مخلوق کے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔ پھر ان کو جہنم کی گہرائیوں میں بولس نامی قید خانے میں ڈال دیا جائے گا جہاں آگ پر آگ ان پر چھا جائے گی، اور ان کو دوزخیوں کے بدنوں سے جو گر

شیرہ، خون، پیپ وغیرہ بہتا ہے جس کا نام طینۃ الخبال ہے وہی پلایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے تکبر وغرور سے بچائے اور بچائے رکھے۔ آمین

غریب متکبر کے بارے میں وعید

غرور اور تکبر کے انجام کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کافی ہے، لیکن یہاں اس شخص کے انجام کو بھی پڑھ لیجیے جو غریب اور نادار ہونے کے باوجود صرف خباثتِ نفس کی وجہ سے تکبر کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ثَلٰثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَلا يُزَكِّيهِمۡ۔ وَفِي رِوَايَةٍ۔ وَلَا يَنۡظُرُ اِلَيۡهِمۡ. وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ شَيۡخٌ زَانٍ وَمَلِكٌ كَذَّابٌ وعَائِلٌ مُسۡتَكۡبِرٌ ”تین آدمی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ان کا تزکیہ کرے گا اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اور نہ ان کی طرف (رحمت وعنایت کی نظر سے) دیکھے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔ ایک بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا بادشاہ (اور حکمران) اور تیسرا غریب متکبر۔“ (صحیح مسلم، مشکوۃ)

اس حدیث کو نقل کر کے حضرت مولانا محمد منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ نے اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ:

”بعض معصیتیں بذات خود بھی سنگین اور گناہِ کبیرہ ہوتی ہیں، لیکن بعض خاص حالات میں اور خاص اشخاص سے اگر ان کا صدور ہو تو ان کی سنگینی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے مثلاً چوری بذات خود بڑی معصیت ہے، لیکن اگر چوری کرنے والا کوئی دولت مند ہو جس کو چوری کی کوئی ضرورت نہ ہو یا سرکاری سپاہی اور چوکیدار ہو، تو پھر اس کا چوری کرنا اور بھی زیادہ سنگین جرم ہو گا اور اس کو قابلِ معافی نہیں سمجھا جائے گا۔“

اس حدیث میں اسی قسم کے تین مجرموں کے حق میں اعلان فرمایا گیا ہے کہ ان بدبختوں سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم کلام نہ ہو گا اور ان کا تزکیہ بھی نہ فرمائے گا اور آخرت میں یہ مجرم رب کریم کی نظر کرم سے بھی قطعی محروم رہیں گے۔ ایک بوڑھا زناکار، دوسرا جھوٹا فرمانروا اور تیسرا ناداری کی حالت میں تکبر کرنے والا۔ یہ اس لیے کہ جوانی کی حالت میں اگر کوئی شخص زنا کا مرتکب ہوا تو اس کا یہ گناہ کبیرہ

ہونے کے باوجود درگذر بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ جوانی کی حالت میں شہوت سے مغلوب ہونا ایک فطری کمزوری ہے، لیکن اگر کوئی بوڑھا بڑھاپے میں یہ حرکت کرے، تو یہ اس کی طبیعت کی سخت خباثت کی نشانی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بیچارہ عام آدمی اپنی ضرورت نکالنے کے لیے جھوٹ بول لے تو اس کا گناہ بھی کبیرہ ہونے کے باوجود قابلِ معافی ہو سکتا ہے، لیکن ایک صاحب اقتدار حکمران اگر جھوٹ بولتا ہے تو یہ اُس کی طبیعت کی انتہائی گندگی اور خدا سے بے خوفی کی نشانی ہے۔ ایسے ہی کوئی دولت مند اگر تکبر کرے تو انسان کی عام فطرت کے لحاظ سے کچھ زیادہ بعید نہیں،

"چو بدولت برسی مست نہ گردی مردی"

لیکن گھر میں فقر وفاقہ کے باوجود اگر کوئی شخص غرور وتکبر کی چال چلتا ہے تو بلاشبہ یہ اس کی انتہائی دنائت اور کمینہ پن ہے۔

الغرض تینوں قسم کے یہ مجرم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی سے اور اس کی نظر کرم سے محروم رہیں گے۔ تزکیہ نہ کیے جانے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ ان کے گناہ معاف نہیں کیے جائیں گے اور صرف عقیدہ یا بعض اعمالِ صالحہ کی بنیاد پر ان کو مومنین صالحین کے ساتھ شامل نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کو سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔ واللہ اعلم (دیکھیے معارف الحدیث:۲۸۴/۲ تا ۲۸۵)

متکبرانہ اعمال اور کردار کا بیان

جب تکبر اور غرور کی مذمت اور تباہیاں سامنے آئیں تو اب ضروری ہے کہ متکبرانہ اعمال، کردار اور صفات کی نشاندہی بھی کی جائے تاکہ ہم ایسے اعمال وصفات سے پرہیز کریں۔

جتنے رذائل اور برے اخلاق ہیں وہ تقریباً سب کے سب اسی تکبر سے پیدا ہوتے ہیں۔ کفر وانکارِ حق، حسد، بغض، ریا، بے جا غصہ، خود غرضی، بے وفائی، بخل، سنگدلی اور فخر کی نفسیات وغیرہ سب اسی خبیث مرض سے جنم لیتے ہیں۔ ان رذائل میں سے بعض کا تفصیلی بیان اس کتاب میں آچکا ہے اور بعض کا بیان ان شاء اللہ بعد میں آئے گا۔

متکبر اور مغرور شخص حقوق میں دھاندلی کرے گا

تکبر اور غرور کا سبب یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ نعمتیں ملی ہوئی ہوتی ہیں وہ ان نعمتوں میں کھو جاتا ہے اور اس خبط میں پڑ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو بجائے اللہ تعالیٰ کے اپنی طرف منسوب کرتا ہے کہ یہ سب کچھ میری صلاحیت اور قابلیت کا کرشمہ اور میرے استحقاق کا ذاتی ثمرہ ہے، اس لیے وہ اپنے اوپر کسی کا حق ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔

مثلاً: قارون کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر مال و دولت عطا فرمایا تھا کہ اس کے خزانوں کی چابیاں اس قدر تھیں کہ ایک طاقتور جماعت ان کے اٹھانے سے تھک جاتی تھی۔ جب اس کی قوم کے نیک لوگوں نے اس سے کہا کہ اتراؤمت! اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تم کو دیا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے اس طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان و بھلائی کرو تو اس نے جواب میں کہا کہ: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ "یہ مال تو مجھ کو ایک علم کی بنا پر ملا ہے جو میرے پاس ہے۔" (سورۂ قصص: آیت ۷۶ تا ۷۸)

قارون کے جواب کا مطلب یہی ہے کہ یہ مال و متاع جو مجھے حاصل ہے یہ میری حسنِ تدبیر، مہارتِ فن اور قابلیت کا ثمرہ ہے اور یہی تکبر کا وہ خناس ہوتا ہے جو ہر متکبر اور غاصبِ حقوق کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ خواہ اس کا کوئی اظہار کرے یا نہ کرے، خواہ اس کا اظہار بھونڈی صورت میں کرے، دنیاوی صورت میں کرے یا دینی صورت میں، بہر حال حقوق کی دھاندلی میں یہی خناس کام کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ:

احساس برتری اور خود غرضی ہی اصل میں معاشرے میں تمام تر فساد اور برائیوں کی جڑ ہے۔ اگر ایک آدمی دوسروں کو بھی اپنے برابر سمجھے اور خود غرض نہ ہو تو وہ ان کے حقوق کو تلف نہیں کرے گا اور ان کے اموال نہیں چھینے گا۔ یہی وہ برائیاں ہیں جو معاشرے میں فساد اور بدامنی، قتل وغارت گری، باہمی حسد اور نفرت کا موجب بنتی ہیں۔

اس کے برعکس صاحبِ ایمان کی نگاہ میں دنیا اور اس کے مال و متاع کی اہمیت اتنی کم ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی خاطر دوسرے کا حق سلب کرنے کا تصور بھی نہیں کرتا، بلکہ وہ تو عظمت کے اس مقام پر ہوتا

ہے کہ اپنا حق دوسرے کو دینے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ وہ اس طرح زندہ رہتا ہے کہ اس کی ذات سے دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فیض ملتا رہے نہ کہ اس طرح کہ وہ دوسروں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اللہ تعالیٰ ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تم صرف اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو کسی طرح بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، اور والدین کے ساتھ، قرابت داروں، رشتے داروں کے ساتھ اور یتیموں، مسکینوں اور رشتے دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور ہم نشین پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ اور اپنے مملوک (غلاموں اور خادموں) کے ساتھ اچھا سلوک (اور احسان کا معاملہ کیا) کرو۔

اس کے متصل بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا۟ ”بے شک اللہ تعالیٰ اترانے اور بڑائی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

(سورۂ نساء: آیت ۳۶)

ان الفاظ کو متصل ذکر کر کے جو بتانا مقصود ہے اس کو اگر کھول دیا جاتا تو پوری بات یوں بن جاتی ہے کہ:

”مذکورہ بالا حقوق وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جن کا سینے جوہرِ انسانیت سے معمور ہوں اور وہ کریمانہ اخلاق کے پیکر ہوں تو وہ لوگ اسباب ووسائل کو اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اندر شکر وتواضع کا جذبہ ابھرتا ہے اور یہ جذبہ ان کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے اسی طرح وہ دوسروں پر احسان کریں۔ چناں چہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے دلی خوشی کے ساتھ لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں اور ان کے ساتھ احسان کرتے ہیں اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لائق بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے متعلق خود فریبی میں مبتلا ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں اور وسائل واسباب کو اپنی قابلیت اور اپنی حسنِ تدبیر کا کرشمہ سمجھتے ہیں تو ان کے اندر شکر گزاری وتواضع کے بجائے گھمنڈ اور فخر وغرور پیدا ہو جاتا ہے اور پھر لوگوں پر احسان کرنے کے بجائے ان پر رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔“بے شک اللہ تعالیٰ اترانے اور بڑائی کرنے والوں کو پسند نہیں

کرتا۔" یعنی وہ ایسے لوگوں کو مبغوض رکھتا ہے اور ان سے نفرت کرتا ہے۔

مغروروں اور متکبروں کی چند مزید خصوصیات

اس کے بعد متصل اللہ تعالیٰ نے تکبر اور فخر کرنے والوں کی چند مزید بری صفات کو بیان کیا ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

اَلَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝ وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا ۝

"(یہ اترانے اور فخر کرنے والے لوگ ہیں) جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں (اور بخل سکھاتے ہیں) اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل و کرم سے دے رکھا ہے وہ اس کو چھپاتے ہیں (یہ لوگ سخت ناشکرے ہیں) اور ہم نے "ایسے" ناشکروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے، اور جو اپنے مالوں کو لوگوں کو دکھانے (اور نمائش) کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر (حقیقی معنوں میں) ایمان نہیں رکھتے۔ (بلکہ یہ لوگ شیطان کے جال میں پھنس کر اس کے ساتھی بن گئے ہیں) اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے تو نہایت برا ساتھی ہے۔"

(سورۂ نساء: آیت ۳۷-۳۸)

ان دو آیتوں میں فخر و غرور کرنے والوں کی پانچ مزید خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ خود بھی بخیل ہوتے ہیں۔

۲۔ دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں اور بخل سکھاتے ہیں۔

۳۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں۔

۴۔ مال و دولت اڑاتے ہیں، خرچ کرتے ہیں لیکن آخرت کے لیے نہیں، بلکہ دکھلاوے اور نام و نمود کے لیے۔

۵۔ ان کا حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ، اس کی صفات اور آخرت پر ایمان نہیں ہوتا، اس لیے انہوں نے غرور و تکبر کا رویہ اختیار کیا ہوتا ہے، اس لیے ان کا تعلق اور دوستی اللہ تعالیٰ کے بجائے شیطان کے

ساتھ استوار ہے۔

اب ان پانچ خصوصیات کی ضروری تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیں۔

بخل کسے کہتے ہیں؟

فخر و غرور کرنے والوں کی جو اضافی خصوصیات بیان ہوئی ہیں ان میں پہلی خصوصیت بخل ہے اس لیے یہاں پہلے بخل کی تشریح پیش کرتے ہیں۔

"بخل" اس جگہ روکنے کو کہتے ہیں جہاں روکنا مناسب نہ ہو، یعنی جو چیزیں حاصل ہیں ان کو اُن مواقع سے روکنا جہاں انہیں روکنا درست نہ ہو، بالفاظ دیگر جہاں دینے کا حق بنتا ہو وہاں سے چیزوں کو روکنا۔ بخیل اس شخص کو کہا جاتا ہے جو لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں تنگدل ہو، اس کا دل وہاں مال واسباب خرچ کرنے سے تنگ ہوتا ہو جہاں خرچ کرنا چاہیے اور جہاں خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو۔

"بخل" کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مال واسباب اور حاصل کردہ چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل کے بجائے اپنی تدبیر و قابلیت اور محنت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کمائی کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے، اس لیے اُس کے اندر تواضع اور شکر گزاری کا وہ جذبہ ختم ہو جاتا ہے جو جُود و کرم اور سخاوت کا اصل محرک ہوتا ہے اور جو شخص حقیقی معنوں میں حاصل شدہ چیزوں کو صرف اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھتا ہے۔ وہ ایک طرف اللہ تعالیٰ سے اس بات سے لرزتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر یہ نعمتیں مجھ سے سلب نہ کر لے اور دوسری طرف وہ اللہ تعالیٰ کا دل سے احسان مند اور شکر گزار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ احسان کا معاملہ فرمایا ہے۔ اس تواضع اور شکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص دوسروں کے حقوق کو کشادہ دلی سے ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اس کے بندوں کے ساتھ احسان کرتا ہے۔ پھر وہ اپنی ذات پر اتنی فیاضی سے خرچ نہیں کرتا جتنی فیاضی سے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے محتاجوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کرتا ہے۔

(۲) دوسروں کو بخل کی ترغیب دینا

بخل کے مشورہ میں بخل والے قوانین اور رسوم بنانا بھی شامل ہیں، جیسا کہ سودی نظام، یا جودے

اُس کو دو، جو احسان کرے صرف اُسی کے ساتھ احسان کرو وغیرہ۔

بخل کا مشورہ دینا یہ بھی ہے کہ جو شخص حقوق العباد کے معاملہ میں فیاضی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے، مسکینوں اور محتاجوں کے ساتھ خوب اچھی طرح احسان کا معاملہ کرتا ہے تو یہ اُس سے کہتا ہے کہ اتنا زیادہ دینے کی کیا ضرورت ہے، یہ لوگ محتاج نہیں، بلکہ ان کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے، تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو تنگی میں ڈالتے ہو۔ اس طرح مختلف انداز اور مختلف طریقوں سے، بلکہ اپنے عمل سے بھی یہی ترغیب دیتا ہے کہ دیکھیے! اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے، لیکن ان لوگوں کو اس لیے اتنا زیادہ نہیں دیتا کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ ان کے پاس ضرورت کی چیزیں موجود ہیں۔ بہر حال بخیل اور متکبر کا یہ دستور ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح دوسروں کو بھی بخل پر آمادہ کرتا ہے۔ بخیل شخص دوسروں کو بخل کا مشورہ اس لیے دیتا ہے کہ اس کی بخل پر پردہ پڑا رہے۔

آپ ان ممالک کی طرف نظر اٹھایئے جہاں عام معاشرہ بخل کی راہ پر چل پڑا ہے۔ اپنے ماں باپ سے مکان کا کرایہ وصول کرنا، ان کو دودھ فروخت کرنا اور ان کو ضروریاتِ زندگی مثلاً کھانے پینے کے لیے سود پر قرض دینا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا، ایسے معاشرے میں سخت سے سخت بخیل کی بخل کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

بہر حال عرض یہ کرنی تھی کہ بخیل دوسروں کو بخل کی ترغیب اس لیے دیتا ہے کہ دوسروں کی فیاضی اور سخاوت سے خود اس کی بخل کا راز فاش ہوتا ہے۔ اس عیب پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھا ہے اسی طرح دوسرے بھی حقوق کو دبائے بیٹھے رہیں تاکہ خود اس کی بخل اور ظلم کا بھانڈا نہ پھوٹے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے فضل وانعام کو چھپانے کا مطلب

فخر وغرور کرنے والوں کی تیسری خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل واحسان کو چھپاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کیا ہے۔

چھپانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے پہچاننے والے محتاجوں اور پڑوسیوں وغیرہ کے سامنے اپنے وسیع اخراجات اور اس پر جو کاروباری قرضہ جات ہوتے ہیں وہ بیان کرتا ہے کہ فلاں کو اتنے لاکھ

دیتے ہیں اور فلاں کو اتنے، اور اس کا جو لوگوں پر قرض ہوتا ہے اور اس کے پاس جو کروڑوں کا سرمایہ ہوتا ہے اس کا وہ ذکر ہی نہیں کرتا۔

ذیل میں اللہ تعالیٰ نے ان بخیل مالداروں کے ایک نہایت پوشیدہ نفسیاتی پہلو کی طرف اشارہ فرمایا جس کی تفصیل یہ ہے:

ان بخیل مالداروں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص پر ان کی عزت، سیادت وریاست کی دھونس جمی رہے اور دوسری طرف وہ یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ کوئی شخص ان کو بخیل اور کنجوس نہ ٹھہرائے، اس لیے وہ ہر ملنے جلنے والے اور ہر جاننے پہچاننے والے کے سامنے اپنے اخراجات اور قرضہ جات بیان کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ محتاجوں اور سائلوں کو جو کچھ دیا ہے اس کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ واہ! یہ شخص کس قدر سخی اور دریا دل ہے کہ اس قدر اخراجات اور قرضوں کے باوجود پھر بھی کچھ نہ کچھ کسی سائل کو دے دیتا ہے۔

(۴) مغرور لوگ نمائش کی جگہوں میں خوب خرچ کرتے ہیں

مغروروں کی چوتھی صفت یہ بیان ہوئی تھی کہ وہ نام ونمود اور نمائش کے مواقع میں مال کو خوب خرچ کرتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کے بیٹے یا بیٹی کی شادی ہو، اس کی نمائش یا اس کی اپنی مصلحتوں کی تسکین ہو یا جہاں مال خرچ کرنے میں اس کی شہرت ہو رہی ہو تب تو اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے، لیکن خاموش دینی مواقع پر خرچ کرنے میں بخیل ہوتا ہے کیوں کہ اِس میں اُس کو دنیا کا کوئی مفاد نظر نہیں آتا، وہاں اگر دیتا بھی ہے تو شرما شرمی میں بہت تھوڑا سا دے کر احسان جتلاتا ہے۔

(۵) مغرور کا حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں ہوتا

مغروروں اور متکبروں کی پانچویں برائی یہ بیان ہوئی ہے کہ ان کا حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں ہوتا۔

یہی وہ سبب ہے جس کی وجہ سے ان کے دل شکر کے جذبے سے خالی ہوتے ہیں، تکبر وغرور میں مبتلا ہو چکے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بجائے شیطان کے دوست اور ساتھی بن گئے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ

جس شخص کا حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان اور روزِ آخرت پر یقین ہو وہ کبھی بھی ناشکری، تکبر اور غرور کے مرض میں مبتلا نہیں ہو سکتا جیسا کہ اس کا بیان گزر چکا ہے۔

اکڑ کر چلنا اور مغروروں کا سارویہ

جن اشخاص کے اندر تکبر و غرور کا زہر موجود ہوتا ہے اُن کی چال ڈھال، گفتار اور ہر ادا سے غرور اور تکبر کی گندگی ٹپکتی رہتی ہے۔ جب وہ لوگوں میں چلتے پھرتے ہیں تو اکڑتے ہوئے چلتے ہیں اس لیے شریعت نے اکڑ کر چلنے پر پابندی لگا دی ہے اِلّا یہ کہ جہاں ضرورت ہو، جیسا کہ جہاد کے موقع پر اس کی اجازت ہے۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا "اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔"

(سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۳۷)

اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی زمین پر پاؤں مارتا ہوا، سینہ تان کر گردن کو اٹھا کر چلتا پھرے۔ یہی مغرور اور متکبر کی چال ہے۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ مغروروں اور متکبروں کی چال نہ چلو۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو چند زریں نصیحتیں کی تھیں، اُن میں سے چند یہ ہیں:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝

"اور لوگوں سے بے رخی نہ کرو اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو (کیوں کہ یہ مغروروں کی چال اور رویہ ہے)، بے شک اللہ تعالیٰ ہر اترانے، اکڑنے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا، اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو پست کرو، بے شک سب سے بُری آواز گدھے کی آواز ہے۔"

(سورۂ لقمان: آیت ۱۸-۱۹)

ان آیتوں میں چار چیزوں کی ہدایت کی گئی ہے:

ایک یہ کہ لوگوں سے بے رخی نہ کرو۔ دوسری یہ کہ زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ تیسری یہ کہ اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔ اور چوتھی یہ کہ اپنی آواز کو پست رکھو۔

ان چاروں ہدایات میں جن دو چیزوں سے منع کیا گیا ہے وہ متکبرانہ رویہ ہے اور جن دو کا حکم ہوا ہے وہ متواضعانہ رویہ ہے۔ زمین پر اکڑ کر چلنے کا بیان تو پہلے گزر چکا ہے اس لیے باقی تین ہدایات کی ضروری تفصیل پیش خدمت ہے۔

لوگوں سے بے رخی کی ممانعت

ان آیتوں میں لوگوں سے بے رخی کی ممانعت کی گئی ہے۔

لوگوں سے بے رخی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ غرور و تکبر کی وجہ سے لوگوں سے بے رخی و بے پروائی اختیار کی جائے۔

تصغر عربی میں ایک بیماری کو کہتے ہیں جو اونٹ کی گردن میں ہوتی ہے، اس کی وجہ سے اس کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور منہ ایک طرف کو مڑ جاتا ہے۔ اس سے محاورہ نکلا فُلاں صَعَّرَ خدَّہٗ فلاں شخص نے (اونٹ کی طرح) اپنا رخسار پھیر لیا، یعنی تکبر کے ساتھ پیش آیا اور منہ پھیر کر بات کی۔

مغرور اور متکبر لوگوں کا یہ رویہ ہمیشہ فقیروں، غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ ہی ہوا کرتا ہے، ان کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ان کے ساتھ بات چیت اور ملنے جلنے میں متکبرانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور تکبر کی وجہ سے گردن ٹیڑھی اور رخسار کو جھکائے رکھتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کو حقیر سمجھ کر متکبروں کی طرح صورت وشان نہ اپناؤ، بلکہ ان کے ساتھ متواضعانہ طریقہ اور خندہ پیشانی کے ساتھ بات چیت اور ملاقات کیا کرو۔

اور اکڑ کر چلنے اور بے رخی سے منع کر کے یہ وعید بھی سنائی گئی کہ یہ چال ڈھال اور رویہ متکبرانہ و مغرورانہ ہے اس سے بچو، کیوں کہ مغرور اور متکبر لوگ اللہ تعالیٰ کو ناپسند اور مبغوض ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں۔

درمیانی اور تواضع کی چال چلنے کی ہدایت اور حکم

ان آیتوں میں یہ ہدایت اور حکم بھی ہوا ہے کہ "درمیانی چال چلو"۔

یہ تواضع اور انکساری کی تعلیم مثبت انداز میں دی گئی ہے کہ اپنی چال میں اکڑاہٹ کے بجائے تواضع اور انکساری پیدا کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تیز بھی نہ چلو اور آہستہ بھی نہ چلو، بلکہ متوسط چال

اختیار کرو، کیوں کہ آہستہ چلنا یا تیز چلنا کوئی اخلاقی چیز نہیں اور نہ اس کے لیے کوئی مقدار مقرر کی جا سکتی ہے۔ نبی کریم ﷺ سر جھکائے اس قدر تیز چلتے تھے کہ جیسے کوئی پہاڑ کی بلندی سے اتر رہا ہو۔ نیز کبھی کہیں جلدی پہنچنا ہو تو ظاہر ہے کہ وقت پر پہنچنے کے لیے تیز چلنا ہو گا اور جو شخص محض تفریح کے لیے اپنے باغ یا کھیتی وغیرہ میں نکلا ہے تو وہ آہستہ چال چلے گا، بلکہ کبھی عجلت کی وجہ سے آدمی کو دوڑنا بھی پڑتا ہے جیسا کہ دشمن کے تعاقب یا چور اور ڈاکوؤں کو پکڑتے وقت ان کے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

غرض یہ کہ یہاں میانہ روی سے رفتار کی سستی یا تیزی مراد نہیں، بلکہ عاجزی وانکساری کی چال کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

البتہ یہ بات صحیح ہے کہ بلا ضرورت دوڑنا آدمی کے وقار اور سنجیدگی کو ختم کر دیتا ہے اور جب کہیں جانا ہو تو گن گن کر قدم رکھنا عیب ہے اور سر اٹھا کر سینہ تان کر پاؤں زمین پر مار کر چلنا متکبروں اور مغروروں کی چال ہے، جو کہ سخت مذموم ہے، یہ تمام چالیں اعتدال کے خلاف اور شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ اور ممانعت میں داخل ہیں۔

اپنی آواز کو پست رکھیں

ان آیتوں میں چوتھی ہدایت یہ ہوئی کہ اپنی آواز کو پست رکھیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ہی قسم کی آواز پر پیدا نہیں کیا، بلکہ اس کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ اپنی آواز کو پست بھی کر سکتا ہے اور بلند بھی، آدمی کو چاہیے کہ وہ موقع محل کے مطابق اس صلاحیت کو استعمال کرے اور موقع و محل کے مطابق اپنی آواز نکالے۔

متکبر اور مغرور لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو ذلیل اور مرعوب کرنے کے لیے چلاتے اور کرخت آواز نکالتے ہیں، اس لیے یہاں نصیحت کی گئی ہے کہ سخت لب ولہجہ اور خشونت کے بجائے اپنی آواز میں لینت اور نرمی پیدا کرو۔

نہ تو مغروروں اور متکبروں کی طرح کرخت اور سخت لہجہ میں بات کرو اور نہ بلا ضرورت گدھے کی طرح ہمیشہ اپنی آواز سے لوگوں کے کانوں کے پردے پھاڑنے کی کوشش کرو۔

إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ۝ کے الفاظ اسی کرخت اور سخت لب ولہجہ سے نفرت دلانے کے لیے ہیں۔ اگر ہر وقت تیز بولنا اور کرخت لہجہ کوئی کمال ہوتا تو سب سے تیز اور کرخت آواز تو گدھے کی ہے، حالاں کہ وہ سب سے بُری ہے۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس کو حسنِ کلام اور حسنِ بیان کی صلاحیت اور نعمت دے رکھی ہے تو اس مقام کو چھوڑ کر گدھوں کی صف میں شامل ہونے کی کوشش نہ کی جائے کہ ہمیشہ کرخت اور سخت لب ولہجہ استعمال کرکے گدھے کی طرح لوگوں کے کانوں کو پھاڑے اور ان کو لب ولہجہ سے ڈرائے یا کم سے کم ستائے۔

یادرہے کہ جب انسان ہمیشہ کرخت اور سخت لب ولہجہ استعمال کرتا ہے اور زور سے بولتا ہے تو بسا اوقات اس کی آواز بھی بے ڈھنگی اور بے سری ہو جاتی ہے۔ اب ذیل میں نبی کریم ﷺ کی رفتار وغیرہ سے متعلق بھی اختصار کے ساتھ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ کی کتاب "شمائل ترمذی مع خصائل نبوی" میں سے کچھ پیش کرتا ہوں، اس کو بھی ملاحظہ فرمایئے:

نبی کریم ﷺ کی رفتار کا بیان

نبی کریم ﷺ کی رفتار کے بارے میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں: إِذَا مَشٰى تَكَفَّأَ تَكَفُّؤًا كَأَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ "جب حضور اقدس ﷺ چلتے تھے تو ایسے کہ گویا کسی اونچی جگہ سے نیچے کو اتر رہے ہوں۔ (خصائل نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام:۱۴)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ: إِذَا مَشٰى تَقَلَّعَ كَأَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ "جب آپ ﷺ چلتے تھے، ہمت اور قوت سے پاؤں اٹھاتے (عورتوں کی طرح پاؤں کو زمین پر گھسیٹ کر نہیں چلتے تھے۔ چلنے میں تیزی اور قوت کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ) گویا اونچائی سے اتر رہے ہوں۔"
(خصائل نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام:۱۷)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "حضور اقدس ﷺ کی رفتار تینوں صفتوں کے ساتھ متصف ہوتی تھی اور لفظ يَتَكَفَّأُ بھی تینوں معنوں کو محتمل ہے۔

حضور اقدس ﷺ تیز رفتاری کے ساتھ چلتے تھے، محبوبینِ زمانہ کی طرح عورتوں کی چال نہیں چلتے تھے، نیز حضور ﷺ کی عادت جھک کر چلنے کی تھی، متکبرانہ رفتار سینہ نکال کر نہیں چلتے تھے۔" نیز

مردانہ رفتار کہ پاؤں زمین سے اٹھا کر چلتے تھے نہ یہ کہ زمین پر پاؤں گھسیٹ کر چلیں۔"
(شائل ترمذی مع خصائل نبوی علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام: ۱۳ تا ۱۴)

نبی کریم ﷺ لوگوں کے ساتھ کس طرح ملتے تھے؟

نبی کریم ﷺ لوگوں کے ساتھ کس طرح ملتے تھے اس کا بیان حدیثوں میں یوں آیا ہے: اِذَا الْتَفَتَ اِلْتَفَتَ مَعاً "جب آپ ﷺ کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن مبارک کے ساتھ توجہ فرماتے۔"

یعنی یہ کہ صرف گردن پھیر کر کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے، اس لیے کہ اس طرح دوسرے کے ساتھ لاپرواہی ظاہر ہوتی ہے اور بعض اوقات متکبرانہ حالت ہو جاتی ہے، بلکہ سینہ مبارک سمیت اس کی طرف توجہ فرماتے۔ (خصائل نبوی ۱: ۱۸)

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کا اپنی اہل مجلس کے ساتھ طرزِ عمل پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ دَائِمَ الْبِشْرِ سَهْلَ الْخُلُقِ لَيِّنَ الْجَانِبِ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ وَلَا سَخَّابٍ وَلَا فَحَّاشٍ وَلَا عَيَّابٍ وَلَا مَشَّاحٍ يَتَغَافَلُ عَمَّا لَا يَشْتَهِيْ وَلَا يُؤْيِسُ مِنْهُ رَاجِيَهِ "آپ ﷺ ہمیشہ خندہ پیشانی اور خوش خلقی کے ساتھ متصف رہتے تھے (یعنی چہرہ انور پر تبسم اور بشاشت کا اثر نمایاں ہوتا تھا)۔ آپ ﷺ نرم مزاج تھے (یعنی کسی بات میں لوگوں کو آپ ﷺ کی موافقت کی ضرورت ہوتی تھی تو آپ ﷺ سہولت کے ساتھ موافق ہو جاتے تھے) نہ آپ ﷺ سخت گو تھے اور نہ سخت دل تھے۔ نہ آپ ﷺ چلا کر بولتے تھے، نہ فحش گوئی اور نہ فحش کلامی فرماتے، نہ عیب گیر تھے کہ دوسروں کے عیب پکڑیں اور وہ توجہ نہیں فرماتے ایسی بات پر جو ان کو پسند نہ ہوتی اور امید رکھنے والے ان سے مایوس نہیں ہوتے تھے......
(شائل ترمذی: باب ماجاء فی خُلقِ النبی ﷺ)

حسب نسب پر فخر کرنا تکبر ہے

حسب نسب پر فخر کرنا اور دوسرے خاندانوں کو حقیر سمجھنا بھی غرور و تکبر، شریعت کی رو سے ناجائز اور شیطان کی سنت ہے۔

جب ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں نے تجھ کو حکم دیا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روک دیا؟ ابلیس شیطان نے جواب میں کہا : اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۞ "میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس (آدم علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا۔" (اعراف: آیت ۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کی سرکشی کی بنیاد اس فخر و غرور پر تھی کہ شرف و عزت کا تعلق نسل و نسب پر ہے۔ قرآن مجید نے یہاں یہ رہنمائی فرمائی کہ شرف و عزت کو نسب و نسل سے متعلق سمجھنا اور اس بنیاد پر یہ جذبہ رکھنا کہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ "میں اس سے بہتر ہوں" ابلیس کی سنت اور اس کی ایجادات میں سے ہے اور جہاں کہیں بھی یہ جذبہ پایا جاتا ہے تو یہ ایک شیطانی جذبہ ہے اور ابلیس و شیطان کے راستے پر چلنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو چیز سبب عزت و سرخروئی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت اور تقویٰ ہے، اس کے سوا کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت پانے کا سبب نہیں بن سکتی۔

کسی کا مذاق اڑانا، طعنہ دینا وغیرہ جیسے امور جذبۂ غرور سے پیدا ہوتے ہیں

چوں کہ کسی کا مذاق اڑانا طعنہ دینا وغیرہ جیسے امور بھی جذبۂ غرور سے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں دوسروں کی تحقیر و تذلیل مقصود ہوتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے تمام امور کو ممنوع فرمایا ہے جن سے تکبر و غرور کی بدبو ٹپکے یا کسی بندے کی بلاوجہ ذرہ برابر بھی تحقیر و تذلیل ہو۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۞

"اے ایمان والو! نہ کوئی قوم و جماعت دوسری قوم و جماعت کا مذاق اڑائے ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ ایک

دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد فسق کا تو نام ہی برا ہے اور جو لوگ (اس کے بعد بھی) توبہ نہ کریں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔" (سورۂ حجرات: آیت ۱۱)

اس آیتِ کریمہ میں چند چیزوں سے سختی سے منع کیا گیا ہے:

ایک یہ کہ کوئی کسی کا مذاق نہ اڑائے۔ دوسری یہ کہ کوئی کسی کو طعنہ نہ دے۔ تیسری چیز یہ کہ ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو۔ یہ تینوں ایسی ہیں کہ جو کوئی ان چیزوں کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے اور بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کیا وہ فی الواقع بڑی عزت اور شرفت والا بن گیا؟ ہر گز نہیں! عزت و شرفت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔

شرافت وعزت کا معیار

اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرافت اور رذالت کا انحصار آدمی کے ایمان و تقویٰ پر ہے اور ایمان و تقویٰ کا صحیح وزن آخرت کے دن اللہ تعالیٰ کے میزانِ عدل سے معلوم ہو گا۔ ایک شخص اپنے آپ کو بڑا دین دار، پاکباز اور بہت بڑا انسان سمجھ رہا ہو گا، لیکن آخرت کے دن جب اس کا راز کھل جائے گا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا وزن پرِ کاہ کے برابر بھی نہ ہو گا۔ اسی طرح اس کا بھی امکان ہے کہ کسی کی دنیا والوں کی نظر میں کوئی وقعت نہ ہو لیکن قیامت کے دن پتا چلے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو مقام اس کا ہے وہ اُن لوگوں کا نہیں جنھوں نے اس کو حقیر اور ذلیل جانا تھا۔

کسی کا مذاق اڑانا، طعنہ دینا اور برے القاب چسپاں کرنا فسق ہے

اللہ تعالیٰ نے کسی کا مذاق اڑانے، طعنہ زنی اور کسی پر برے القاب چسپاں کرنے کو فسق قرار دیا اور ان کے مرتکب کو ظالم قرار دیا۔ بلاشبہ یہ چیزیں تکبر کے مرض اور " میں دوسروں سے بہتر ہوں " کی شاخیں ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے آیت کے آخر میں ان چیزوں پر سخت تنبیہ فرمائی ہے۔

چناں چہ فرمایا: بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ "ایمان کے بعد فسق کا تو نام بھی برا ہے، اور جو لوگ (اس وضاحت کے بعد بھی) توبہ نہ کریں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ایمان سے آشنا نہ ہوتے اور پھر تم سے کوئی فسق و گناہ کی بات صادر ہو جاتی تو یہ زیادہ تعجب انگیز نہ ہوتی، لیکن جب تم کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت نصیب کی تو اب تمہیں فسق کا نام بھی برا لگنا چاہیے اور اس کے نام ہی سے تمہیں بدبو محسوس کرنی چاہیے، چہ جائیکہ تم میں سے کسی سے فسق کا صدور ہو۔ لہٰذا مذکورہ بالا کام بھی فسق کے کام ہیں، ان سے سخت اجتناب کرو اور ان چیزوں سے توبہ کرو اور آئندہ کے لیے پرہیز کرو، اور اس قدر وضاحت کے بعد بھی جو لوگ توبہ نہیں کریں گے تو وہی ظالم لوگ ہیں اور وہ لازماً ظلم کی سزا اور عذاب سے دوچار ہوں گے۔

یاد رکھیں! غیبت، بدگمانی اور حسد وغیرہ جیسے گناہ بھی اسی کبر و غرور سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا بیان تفصیل کے ساتھ اپنے مقام پر آجائے گا۔

اسی طرح شلوار اور تہبند کو ٹخنوں سے نیچے کرنا، لباس اور کھانے وغیرہ جیسی چیزوں میں غرور و تکبر کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ لباس اور کھانے پینے کے آداب میں آئے گا۔

یہاں صرف اتنی بات سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو صرف کبر و غرور سے منع نہیں فرمایا ہے بلکہ مغروروں کی چال ڈھال اور اداؤں سے بھی منع فرمایا ہے۔ یہ اس لیے کہ ایک تو مغرورانہ چال ڈھال اور ادائیں قبیح و قابلِ نفرت ہیں، دوسری بات یہ کہ اگر دل میں تکبر و غرور نہ بھی ہو تب بھی یہی چال ڈھال اور ادائیں آہستہ آہستہ تکبر پر ڈالنے کا سبب بن جاتی ہیں اور پھر انسان کے اندر تکبر و غرور کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔

لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ تکبر و غرور کے تمام طور طریقوں، چال ڈھال، گفتار اور اداؤں سے دور رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی کبر و غرور کے مرض سے حفاظت فرمائے اور جو کبر و غرور ہے اسے دور فرما کر ہم کو حقیقی معنوں میں تواضع اور بندگی کی صفت سے نوازے۔

اب ذیل میں بطورِ خلاصہ تکبر و غرور کی چند علامتیں پیش کرتا ہوں اور آخر میں ان شاء اللہ تعالیٰ تکبر و غرور کا علاج بھی لکھ دوں گا۔

تکبر کی علامتیں

تکبر اپنے معنی اور تعریف کی رو سے تو بالکل واضح ہے یعنی خود کو اوروں سے اونچا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا، لیکن انسان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ جس کو اپنے تکبر کا احساس ہوتا ہے اس میں تواضع موجود ہوتی ہے اس لیے جب اس سے کوئی متکبرانہ فعل سرزد ہوتا ہے تو وہ اپنے اوپر متکبر کا فتویٰ لگاتا ہے جو کہ آثارِ تواضع میں سے ہے۔ جتنا کسی کے اندر یہ مرض ہوتا ہے اُتنا ہی وہ اپنے آپ میں اس کی نفی کرتا ہے اور بے فکر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی چند علامات ذکر کی جاتی ہیں، تاکہ تکبر کو اپنے اندر تلاش کرنے میں سہولت ہو، وہ علامتیں یہ ہیں:

۱۔ متکبر کو اپنی رائے یا اعتقاد کے مقابلہ میں امر حق کو قبول کرنے سے نفرت ہوتی ہے۔

۲۔ دوسروں کے اعتقاد و خیال، رائے و قیاس اور صورت ولباس کو حقیر سمجھتا ہے۔

۳۔ شرعی ضرورت کے بغیر دوسروں کی برائی یا عیب ونقصان کی بات کرتا ہے یا رغبت سے سنتا ہے، کبھی ظاہر میں کہہ بھی دیتا ہے کہ غیبت نہ کرو، مجھے اچھی نہیں لگتی، لیکن دل کی چاہت ہوتی ہے کہ یہ میری بات نہ مانے بلکہ اپنی بات سنائے۔

۴۔ تواضع کا کوئی کام کر کے یہ خیال کرنا کہ میں نے تواضع اختیار کی ہے، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں لیکن میں نے یہ کام تواضع اختیار کرنے کی وجہ سے اپنی حیثیت سے کم درجے کا کیا ہے، اور یہی کبر ہے۔ اگر اندر بڑائی کا تصور نہ ہوتا تو وہ کام تواضع کا معلوم نہ ہوتا جیسے کوئی فقیر آدمی زمین پر بیٹھے تو اس کو کوئی متواضع نہیں کہے گا اور نہ وہ اپنے آپ کو متواضع کہلا سکتا ہے۔ متواضع کو اپنی تواضع کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی۔

۵۔ اپنے تقویٰ اور دینداری کی مجموعی حالت کے لحاظ سے غیر متوازن طور پر چھوٹی چھوٹی جزوی باتوں، پاک، ناپاک، حلال وحرام کا بہت شور کرنا، اسی طرح فرائض اور حقوق سے غفلت کے باوجود مستحبات پر زور وشور دکھانا، اسی طرح نفلی عبادات میں مسارعت کرنا اور واجبات کی بجاآوری میں سستی کرنا۔

۶۔ ایسے شخص میں غصہ، حسد، بغض، ریا، بد گمانی وغیرہ امراض بہت زیادہ ہوں گے۔

۷۔ جن دینداروں یا علما کو کسی ایک چیز کے علم میں شہرت ہو جاتی ہے اور وہ بڑے عالم یا دین دار مشہور ہو جاتے ہیں اور ان سے کوئی آدمی مسئلہ پوچھے تو خواہ یاد ہو یا نہ ہو، وہ ضرور اپنی عقل سے بلا تکلف جواب دے دیتے ہیں۔ ان کے لیے یہ کہنا بہت گراں ہوتا ہے کہ مجھے معلوم نہیں، کسی اور سے پوچھ لیں۔

تنبیہ

ان مثالوں میں غور کرنے سے تکبر سے واقفیت ہو سکتی ہے، لیکن یہ بات نہایت ضروری ہے کہ اس طرح کا غور و فکر صرف اپنے بارے میں کریں۔ دوسروں میں یہ علامتیں تلاش نہ کریں اور نہ اُن کو ان علامات کی وجہ سے متکبر سمجھیں، کیوں کہ یہ علامات اپنے حق میں تو یقینی ہیں کہ آپ ان کو اپنے اندر دیکھ رہے ہیں، لیکن دوسروں کے حق میں یہ علامتیں مشتبہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں میں تکبر کی صرف صورت ہوتی ہے اس کی حقیقت ان میں بالکل نہیں ہوتی، بلکہ ان کی طبعی عادت یا کسی جسمانی مرض کی وجہ سے ان سے متکبر کی طرح حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ مثلاً: ممتاز جگہ پر بیٹھنا یا جلد بازی کے سبب اپنا کام دوسروں کے کام سے پہلے کرانے کی کوشش کرنا، طبعی وضع داری اور شرم کی وجہ سے بازار نہ جانا اور سودا اٹھا کر نہ لانا، اسی طرح کبھی اعصابی کمزوری کی وجہ سے غصہ میں بے قابو ہو جانا وغیرہ۔ غرض دوسروں کے اندر تکبر کی علامت کو نہ ڈھونڈنا چاہیے، ورنہ اس صورت میں خود ہی اس خطرناک مرض کا شکار ہونے کا اندیشہ ہے۔ پس عیوب کو صرف اپنے اندر تلاش کر کے علاج کیا جائے۔

البتہ بعض لوگوں میں عیب تلاش کرنا جائز ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

۱۔ آل و عیال تا کہ ان کی اصلاح ہو۔

۲۔ شاگرد۔

۳۔ وہ دوست جس کی اصلاح کا حق دوسرے پر عائد ہوتا ہے۔

۴۔ مرید جس نے اپنی اصلاح کا کام صدقِ دل سے شیخ کے سپرد کر رکھا ہو۔

ان صورتوں میں بغرضِ اصلاح ان کے عیبوں کو کریدنا اور ان کی غیبت سن لینا درست ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ دل سے ان کو حقیر و ذلیل اور اپنے آپ کو ان سے افضل تصور نہ کیا جائے۔

تکبر کا علاج

۱۔ تکبر کے بارے میں وعیدیں اور اس کی مذمت میں آنے والی احادیثِ مبارکہ اور آیاتِ کریمہ بار بار پڑھیں اور سنیں، متواضع اور خاکسار لوگوں کے قصے اور متکبرین کا انجام اور قصے پڑھیں اور سنیں، تکبر کی علامات کو ذہن میں پوری طرح حاضر کر کے اپنے اندر جستجو کریں، پھر جو جو علامتیں تکبر کی اپنے اندر معلوم ہو جائیں، اُن کا علاج شروع کریں اور یقین کر لیں کہ میں بیمار ہوں اور علاج کا محتاج ہوں۔

۲۔ روزانہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائیں کہ یا اللہ! مجھ سے تکبر و غرور کے مرض کو دور فرما اور میرے اندر تواضع پیدا فرما۔

۳۔ ایک جگہ سب سے یکسو ہو کر اپنی پیدائش، موجودہ حالت اور انجام، ان تینوں میں غور و فکر کیا کریں، یعنی یہ سوچا کریں کہ میرا اصل کیا ہے؟ ناپاک پانی کے قطرے سے بنا، پھر ناپاک خون سے پرورش پائی وغیرہ۔ اسی طرح باطنی اور معنوی گندگیاں جیسے تکبر، بخل اور دوسری شہوات کی نجاست کو سوچیں ،جو کہ لاکھ درجہ ظاہری نجاست سے بڑھ کر ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی ستاری پر نظر دوڑائیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ستاری فرما رکھی ہے، ورنہ ہمارا باطنی حال اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے تو نفرت کر کے کوئی قریب بھی نہیں آئے گا۔

۴۔ امیر لوگوں کے بجائے فقرا اور حاجت مندوں کی صحبت اختیار کریں، فقرا کی دعوت قبول کریں اور ان کی خدمت کریں۔

۵۔ اپنے ہاتھ سے جتنا کام ہو سکے کریں۔

۶۔ عوام میں سے ہر کسی کو پہلے خود ہی سلام کریں۔

۷۔ اپنی غیبت اور برائی سن کر اپنے باطنی عیوب کے پیش نظر یوں شکر کریں کہ میری برائیوں میں سے بہت تھوڑی برائیاں بیان ہوئی ہیں اور اس میں بھی میرا ہی فائدہ ہے کہ تکبر ٹوٹ جائے گا اور کچھ گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔

۸۔ متکبرانہ اعمال اور رویہ چھوڑ دیں اور تواضع کی چال ڈھال اختیار کریں۔

۹۔ کسی وقت کسی پر غصہ اتاریں تو چھوٹے اور کم منصب والے سے بھی معافی مانگ لیا کریں۔

۱۰۔ اس مرض کا آسان علاج یہ ہے کہ کسی روحانی ماہر علاج یعنی شیخ وصوفی کی طرف رجوع کیا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ وہ تشخیص کر کے آسان علاج بتائے گا۔ اگر مذکورہ بالا تجاویز پر عمل کیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ تکبر دب جائے گا اور تواضع پیدا ہو گی۔

.....☆.....☆.....☆.....

عُجب کا بیان

عُجب یعنی خود بینی اور خود پسندی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہی تکبر کی بنیاد بن جاتی ہے۔ کِبر اور عُجب میں فرق یہ ہے کہ تکبر وغرور میں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور بہتر سمجھا جاتا ہے اور عُجب اور خود پسندی میں یہ ضروری نہیں، بلکہ اس میں مبتلا شخص اپنے آپ کو اچھا سمجھتا ہے۔ یہ بھی بہت خطرناک بیماری ہے اور اس سے تکبر کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔

عُجب اور خود بینی تھوڑی دیر کے لیے بھی زیادہ نقصان دہ ہے

عُجب اور خود بینی بہت ہی مہلک مرض ہے، اس لیے اس سے بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے، یہ جذبہ اگر تھوڑی سی دیر کے لیے بھی سر اٹھائے تو بھی اس کے نتائج بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں۔

غزوۂ حنین میں مسلمانوں کی تعداد کافروں کی تعداد سے زیادہ تھی۔ یہ دیکھ کر بعض مسلمانوں کے دل میں کچھ اس طرح کا خیال آیا کہ جب ہم کفار ومشرکین سے تعداد اور اسلحہ دونوں اعتبار سے بہت کم تھے تب ہم نے ان کو شکست دی تھی، اب تو الحمد للہ ہم بہت زیادہ ہیں، اسلحہ بھی کافی ہے، اب ہمارا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ اب تو یہ کفار چند لمحوں کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکیں گے۔ غرض یہ کہ جب بعض مسلمانوں میں تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنی کثرت پر عُجب وناز کی شان پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ کو ایمانی پہاڑوں کی یہ شان پسند نہ آئی اور نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہوئے مسلمان تتر بتر ہو کر شکست کھا گئے۔ پھر جب مسلمانوں کے دلوں سے عُجب وناز کی ہلکی سی گرد شکست نے جھاڑ دی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے پاؤں کو جما دیا اور بالآخر کفار کی فتح کو شکست میں تبدیل کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو قرآن مجید میں یوں پیش کیا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْــٴًـا وَّضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ۝

”بے شک اللہ تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت نے تم میں عُجب (اور ناز) پیدا کیا، پھر وہ (کثرت) تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مؤمنین پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور ایسے لشکر اتارے جن کو تم نہیں دیکھتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو (شکست کا ذلت آمیز) عذاب اور سزا دی اور یہی کافروں کا بدلہ ہے“۔

(سورۂ توبہ: آیت ۲۵-۲۶)

اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرو تو سرخرو اور کامیاب ہو گے

کامیابی و ناکامی اللہ تعالیٰ ہی کے دستِ قدرت میں ہے۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور طاقت پر بھروسہ کرے گا اور اس کے حکم کے مطابق چلے گا وہ کامیاب اور سرخرو ہو گا۔ اس کے برعکس اپنی ذات پر بھروسہ آدمی کے اندر گھمنڈ کا جذبہ ابھارتا ہے اور بالآخر انسان کو خود پسندی اور خود پرستی کے مرض میں مبتلا کر دیتا ہے۔

جب آدمی کے اندر عُجب و خود بینی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے غفلت طاری ہوتی ہے

بلاشبہ عُجب، خود بینی اور غلط قسم کی خود اعتمادی بہت مُہلک جذبہ ہے۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے بے پروائی اور بے توجہی و غفلت پیدا ہوتی ہے اور یہی چیز مسلمانوں کے لیے شکست اور ناکامی کا پہلا سبب بن جاتی ہے۔ جب اسباب و وسائل موجود نہ ہوں تو اکثر یہی ہوتا ہے کہ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اُسی پر اعتماد و بھروسہ کرتا ہے اور اُسی سے مانگتا رہتا ہے، لیکن جب اسباب و وسائل کی فراوانی ہو جاتی ہے تو اُس وقت آدمی کی نظر اللہ تعالیٰ کے بجائے اسباب و وسائل پر چلی جاتی ہے، اس وقت مسلمان کو چاہیے کہ اپنے آپ کو خوب سنبھالے رکھے اور اسباب و وسائل کے باوجود اپنے آپ کو ہر طرح سے اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھے اور اسباب و وسائل کے بجائے اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھے۔

عُجب کی ہلاکت

عُجب اور خود رائی بہت ہی باعثِ ہلاکت مرض ہے۔ یہ جس گھر والوں میں پیدا ہوتا ہے اس گھر والوں کو برباد کر کے چھوڑتا ہے، جس قوم کے اندر یہ مرض عام ہو جائے تو پوری قوم افتراق و انتشار کا شکار

ہو جاتی ہے اور بالآخر تباہ ہو جاتی ہے، اور جب یہ مرض کسی جماعت کے اندر پھیل جاتا ہے تو اس جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے مشورہ اور ایک دوسرے کی رائے سے استفادہ کرنا بند ہو جاتا ہے اور جب یہ مرض پوری دنیا کو لپیٹ میں لے لے گا تو اس وقت تمام لوگ غافل ہو جائیں گے اور ہر شخص عُجب اور خود بینی کے مرض میں مبتلا ہو جائے گا اور اختیاری طور پر ذکر کرنے والا ایک شخص بھی نہیں رہے گا تو دنیا کی روح نکل جائے گی، دنیا مر جائے گی، اور چاند، سورج، پہاڑ وغیرہ درہم برہم ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ قیامت کی پیشگوئیوں میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرکے نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ:

"جب ہر شخص کو اپنی رائے بھلی معلوم ہوگی اور اسی پر عُجب وناز کرے گا اور اترائے گا، اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے۔"

نیز نبی کرم ﷺ نے فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ:

"اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی جب تک ایک شخص بھی۔ "اللہ اللہ" کہنے والا موجود ہو"۔

ظاہری پرہیز گاری کی وجہ سے آدمی کا عُجب وناز میں مبتلا ہونا

بعض لوگ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچتے رہتے ہیں اور دینی لحاظ سے ان کی حالت اچھی ہوتی ہے وہ اپنے نفس سے خوش ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو بڑے پرہیز گار سمجھتے ہیں۔ اس طرح وہ عُجب اور ناز کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے عُجب وناز کو بھی سختی سے منع فرمایا ہے۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۞ "وہ تم کو خوب جانتا ہے جب اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں تھے، پس تم اپنے آپ کو پاکیزہ نہ سمجھو، وہی خوب جانتا ہے ان لوگوں کو جنہوں نے (حقیقی معنوں میں) تقویٰ اختیار کیا ہے۔"

(سورۂ نجم: آیت ۳۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی کو زیبا نہیں کہ اپنے آپ کو پاکیزہ اور مقدس سمجھے، اللہ تعالیٰ سب کی پاکیزگی کو خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری اس حالت کو تو جانتا ہی ہے، وہ تو تمہاری اس حالت کو بھی

جانتا ہے جب اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس مرحلے کو بھی خوب جانتا ہے جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں تھے، لہٰذا پانی، کیچڑ اور مٹی سے وجود میں آنے والی مخلوق، اور پھر ذلیل گندے پانی کی ایک بوند سے ماں کے رحم کے اندر پرورش پانے والی ہستی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ خود اپنے آپ کو متقی اور پرہیز گار ٹھہرائے اور اس کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑے بڑے رتبوں کا مستحق قرار دے۔

اس میں شک نہیں کہ عزت وشرف کا حصول ایمان وتقویٰ کی بنیاد پر ہے، لیکن کسی شخص میں کس قدر ایمان وتقویٰ ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔ وہی رحم وعدل والی ذات اپنے میزانِ عدل میں تولے گی، اور جس شخص کو جس مرتبے کا مستحق پائے گی اس کو اُسی رتبے پر فائز کر دے گی، یہ فیصلہ روزِ آخرت میں ہو گا، لہٰذا کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مقدّس ٹھہرائے اور از خود اپنے لیے عالی مقامات کا مدعی بن بیٹھے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے لرزاں وترساں رہے، اُسی سے حسن ظن اور اچھی امید رکھے، اسی کے حکم کی دل وجان سے اطاعت کرے اور اس کی اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگا کرے، بندے کا کام صرف اسی قدر ہے، نتائج اور مراتب اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہیں اور وہی ان کو خوب جانتا ہے۔

عُجب کے نقصانات کا خلاصہ

عُجب کے بہت ہی زیادہ نقصانات ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ عُجب سے تکبر پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ ایسے شخص کو اپنی برائیاں بہت کم دکھائی دیتی ہیں، اس لیے وہ متکبر کی طرح اپنی غلطیوں اور اپنی اصلاح سے محروم رہتا ہے۔

۳۔ چوں کہ اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ میں تو بخشا بخشایا ہوں، اس لیے وہ قیامت اور آخرت سے بے فکر ہو جاتا ہے۔

۴۔ عُجب کی وجہ سے دل غافل ہو جاتا ہے اور اسباب ووسائل پر نظر چلی جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان نفس اور اسباب ووسائل کے حوالے ہو کر اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت سے محروم رہ جاتا ہے۔

۵۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تدبیروں سے نڈر اور بے خوف ہو جاتا ہے اور اپنی عبادات اور اپنی خدمات پر نازاں رہتا ہے۔

۶۔ خودرائی اور خود بینی کے مرض میں مبتلا شخص کسی سے پوچھتا نہیں، اگر پوچھتا بھی ہے تو چوں کہ وہ دوسروں کی رائے کو اہمیت نہیں دیتا اس لیے دوسروں کی رائے سے استفادہ نہیں کر سکتا، اس وجہ سے ہمیشہ ناقص رہتا ہے۔

۷۔ عُجب کا اصل نقصان آخرت کا نقصان ہے۔ اس کا بیان تکبر کے باب میں گزر چکا ہے۔

عُجب کا علاج

اپنے عیبوں کو سوچا کریں، ہر نعمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں، اپنے آپ کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھیں، اس سے ڈرتے رہیں اور ہر وقت اپنے عجز اور درماندگی کا اعتراف کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور بے نیازی کو سوچیں اور تکبر کے علاج میں جو کچھ گزرا ہے وہ بھی پڑھیں اور اس کے مطابق عمل کریں، ان شاء اللہ تعالیٰ عُجب جاتا رہے گا۔

☆☆☆☆☆

تواضع کا بیان

تواضع تکبر کی ضد ہے جو اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے شعور اور اس کی بے انتہا عظمتوں کا ثمرہ ہوا کرتی ہے۔ جس شخص کے دل میں جس قدر زیادہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا احساس ہوتا ہے اور جو جس قدر زیادہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر گزار ہوتا ہے، اسی قدر اس کے اندر تواضع کی صفت بھی زیادہ ہوا کرتی ہے۔

"تواضع" کے معنی ہیں اپنے آپ کو کم سمجھنا، اور یہ ٹھیک تکبر کی ضد ہے کیوں کہ تکبر کے معنی ہیں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنا۔ جس طرح تکبر سارے رذائل اور بہت سے گناہوں کی جڑ ہے (جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے) اسی طرح تواضع ایک ایسی صفت ہے جس سے ہر خوبی جنم لیتی ہے۔ دراصل بندگی کی روح بھی حقیقی تواضع ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ تواضع تکبر کی ضد ہے، تو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب تک تکبر یعنی اَنا (میں) کا بُت دل میں موجود رہتا ہے اس وقت تک آدمی کے اندر کامل تواضع اور بندگی پیدا نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کے سچے بندے متواضع ہی ہوتے ہیں

اللہ تعالیٰ کے سچے بندے وہی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں انکساری اور تواضع ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

:وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْناً وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰماً ۝ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَاماً ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاماً ۝ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَاماً ۝

"اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں تو ان کو سلام کہہ کر رخصت ہوتے ہیں، اور جو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں،

اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! جہنم کا عذاب ہم سے دور رکھ، بے شک اس کا عذاب پوری تباہی ہے، بے شک وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے اور برا مقام ہے۔" (سورۃ الفرقان: آیت ۶۳-۶۶)

اس پورے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کے اخلاق و خصوصیات اور کردار کو بیان فرمایا ہے اور اس کی ابتدا ہی تواضع اور فروتنی کی صفت سے کی ہے۔

هَوْن کے معنی فروتنی اور خاکساری کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے بندوں کے بارے میں شروع میں یہ بات واضح کی کہ ان کے دلوں میں تواضع وانکساری ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کی چال ڈھال اور ہر کام سے تواضع، فروتنی اور خاکساری کا عطر ٹپکتا ہے اور وہ زمین میں اکڑتے اور اتراتے نہیں، بلکہ نہایت تواضع اور فروتنی کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے صرف چلنے کا ذکر کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں صرف ان کی باطنی کیفیت کو سامنے لانا مقصود ہے اور آدمی کا چلنا پھرنا اس کی باطنی کیفیت کا عکس اور اس کی پوری شخصیت سے عبارت ہوتی ہے۔ یہاں اصل بات یہ بتائی جارہی ہے کہ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی ایسی ہیبت طاری رہتی ہے کہ جس کی وجہ سے ان سے اپنی بڑائی، انا "میں" کا احساس ختم ہوجاتا ہے اور ان کے دل کبر وغرور کی گندگی سے پاک وصاف ہوجاتے ہیں، ان کے اندر تواضع اور عبدیت کی روح پوری طرح سماجاتی ہے اور یہ تواضع اور عبدیت ان کے ہر اس قدم سے نمایاں ہوتی ہے جو وہ زمین پر رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیتوں میں جو دوسری صفت بیان ہوئی وہ یہ ہے کہ:

جب ان سے جاہل لوگ الجھ جاتے ہیں تو وہ ان کو سلامتی والی بات کہہ کر ان سے رخصت ہوجاتے ہیں، یہ بھی فروتنی اور بندگی کا رویہ ہے کہ وہ لوگوں کو حق کی طرف دعوت دیتے ہیں اور دلائل کے ساتھ ان پر حق کو بھی واضح کردیتے ہیں، لیکن جب وہ سمجھ جاتے ہیں کہ مخاطب جذبات سے مغلوب ہورہا ہے اور بات کو سمجھنے کے بجائے بدتمیزی اور الجھنے پر اُتر آیا ہے تو پھر وہ حسن وخوبی کے ساتھ اس سے علیحدگی اختیار کرلیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ وہی شخص کرسکتا ہے جو تواضع اور فروتنی کا پیکر ہو اور یہی لوگ داعیانِ

حق ہو سکتے ہیں۔

خدائے رحمٰن کے بندوں کی تیسری خصوصیت یہ بیان ہوئی کہ وہ اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار سے دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ یہاں ایک طرف رحمان کے بندوں کی اللہ تعالیٰ سے محبت اور ذوق و شوق کا بیان ہے کہ وہ نرم نرم بستروں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے آگے قیام اور سجدوں میں راتیں گزارتے ہیں اور دوسری طرف تواضع، عبدیت اور خوفِ الٰہی کو سامنے لایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے راتیں گزارنا یا قیام اور سجود کرنا ان کے اندر فخر اور اپنی پاکیزگی کی نفسیات پیدا نہیں کرتا، اور نہ وہ از خود اپنے لیے مقامات و مراتبِ عالیہ کے مدعی بن بیٹھتے ہیں، اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے لاڈلے بن کر اس پر جری ہوتے ہیں اور نہ وہ تہجد کی نماز کی وجہ سے آخرت سے بے فکر ہو جاتے ہیں، بلکہ راتوں میں اٹھ اٹھ کر اللہ تعالیٰ اور جہنم کے عذاب سے بچنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے حقیقی ایمان داروں اور نیکوکاروں کے اوصاف کے بارے میں اسی حقیقت کو ایک اور انداز میں یوں بیان فرمایا ہے کہ: وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّ قُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ " اور وہ لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل لرزتے ہیں (اس خیال سے) کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔"

(سورۂ مؤمنون: آیت ۶۰)

اس آیت میں ایمان والوں اور نیکوکاروں کی ایک صفت یہ بتائی گئی کہ وہ نیک کام کر کے فخر نہیں کرتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس پر فخر اور نمائش نہیں کرتے بلکہ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت اس قدر چھائی ہوتی ہے کہ نیک کام اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کر کے بھی ان کے دل کانپتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم نے کیا ہے اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں، اللہ تعالیٰ اس کو کہیں رد نہ فرما دے۔ ایک دن اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا اور اس کو منہ دکھانا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا کہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں، چوری کرتے ہیں اور اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

يَا بِنْتَ الصِّدِّيْقِ وَلٰكِنَّهُمُ الَّذِيْنَ يَصُوْمُوْنَ وَيُصَلُّوْنَ وَيَتَصَدَّقُوْنَ وَهُمْ يَخَافُوْنَ اَنْ لَّا تُقْبَلَ مِنْهُمْ اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ۔۔۔ الخ

”اے صدیق کی بیٹی! ایسا نہیں، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں (یعنی نیک کام کرتے ہیں) اور پھر بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کہ ان کے یہ اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کہیں نامقبول ونامنظور نہ ہو جائیں۔“ (ترمذی، احمد، ابن ماجہ)

تواضع، چاپلوسی ودنائت اور احساس کمتری میں فرق

یادرہے کہ تواضع، چاپلوسی اور احساس کمتری؛ ان تینوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

چاپلوسی، ذلت نفس اور دنائت اس کیفیت کا نام ہے جس میں آدمی اپنی خواہش کی خاطر اپنی ذلت اور رسوائی اختیار کرتا ہے۔

جیسے ایک شخص کسی نوکری کا امیدوار ہے اور نوکری دینے کا اختیار زید کے پاس ہے۔ اب یہ شخص زید کی چپلیں سیدھی کرتا ہے، اُس کے منہ پر اس کی تعریف کرتا ہے اور اس کے سامنے جھک جھک کر سلام کرتا ہے۔ زید اس کو بھگانے کی کوشش کرتا ہے، دھتکارتا ہے، لیکن وہ برابر اس کی چاپلوسی اختیار کیے ہوئے ہے۔

یا کسی سے مال ودولت ملنے کی توقع ہو، یا کسی رشتہ کی امید ہو، یا کسی سے اور کوئی دنیوی غرض ہو تو اس دنیوی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو کسی کے سامنے رسوا کرنے اور اپنی عزت اور خودداری ختم کرنے کا نام چاپلوسی ہے۔ چاپلوسی نفس پرستی اور دنیا پرستی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ صرف اس شخص کی ہوتی ہے جس سے کوئی نفسانی خواہش یا کوئی دنیاوی مفاد وابستہ ہو۔

اس کے برعکس تواضع اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی کبریائی اور عظمت کے احساس اور اپنے نفس کے عیوب ونقائص کے دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ متواضع شخص کا دل مخلوق کے بجائے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کرتا ہے اور ان کے ساتھ رحم واحسان کا معاملہ کرتا ہے، جہاں سے اللہ تعالیٰ کا قُرب اور اس کی رضا حاصل ہونے کی توقع ہو وہاں وہ انتہائی عاجزی و انکساری کا رویہ اختیار کرتا ہے اور جہاں کہیں کسی کے غرور و تکبر پر ضرب لگانے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا

ہو وہاں وہ سینہ تان کر اس متکبر ومغرور کے غرور پر ضرب بھی لگا دیتا ہے۔ کہاں متواضع شخص کا اعلیٰ کردار اور کہاں چاپلوس کے کرتوت، دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

احساس کمتری کسے کہتے ہیں؟

احساس کمتری اس بیماری کا نام ہے جس میں آدمی کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے محروم اور پیچھے رکھا گیا ہے، یہ بیماری اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور اس کی تخلیق وتقدیر پر شکوہ وشکایت سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ مجھے بدصورت پیدا کیا گیا ہے، مجھے کم دولت دی گئی ہے، دوسرے لوگوں کو زیادہ عزت مل گئی ہے اور مجھے پیچھے رکھا گیا ہے، دوسرے لوگوں کو تندرست اور مجھے بیمار پیدا کیا گیا ہے، میں تو بڑے رتبے اور مال کا مستحق تھا، لیکن مجھے کم مرتبہ ملا، وغیرہ۔

یہ ہے احساس کمتری، جو کہ ایک مرض ہے۔ اس میں مبتلا شخص دوسرے لوگوں سے حسد بھی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کہاں تواضع اور کہاں یہ احساس کمتری؛ دونوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ ایک عظیم اور بہترین صفت ہے اور دوسری بیماری ہے، ایک شکر کا نتیجہ اور دوسری ناشکری کا نتیجہ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنوں میں متواضع بنادے اور ہر قسم کے ظاہری وباطنی امراض سے حفاظت فرمائے۔ آمین

تواضع اور تواضع کے دکھاوے میں فرق

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیں! کہ ایک ہے تواضع اور ایک ہے تواضع کا دکھاوا۔ تواضع کا دکھاوا یہ ہے کہ صرف زبان سے تواضع کا اظہار ہو اور دل میں تواضع کا جوہر موجود نہ ہو۔ مثلاً بعض اوقات ہم زبان سے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ "میں کچھ بھی نہیں ہوں، میں ناچیز ہوں" کوئی اپنے نام کے ساتھ خاکسار لکھتا ہے کوئی ضعیف وغیرہ، لیکن بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ صرف دکھاوے کے لیے ہوتے ہیں یا صرف رسم ورواج کے طور پر لکھے جاتے ہیں یا بولے جاتے ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ یہ الفاظ کہتے ہیں یا لکھتے ہیں تو یہ ان کے دل کی صدا ہوتی ہے، لیکن عام طور پر یہ ایک رسم سی بن گئی ہے، جیسا کہ لوگ تحریر کی ابتدا میں یوں ہی بغیر سوچے سمجھے بسم اللہ لکھتے ہیں اور کوئی ۷۸۶۔ اسی طرح یہ الفاظ بھی اکثر بغیر سوچے سمجھے کہے اور لکھے جاتے ہیں بلکہ بعض تو ان کو صرف اپنی تواضع کی دھونس جمانے کی خاطر لکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

غرض یہ کہ تواضع کے الفاظ اور تواضع میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اپنے لیے تواضع کے الفاظ لکھنے اور بولنے والا لازماً متواضع ہو گا۔ بلکہ تواضع دل کی ایک صفت ہے جس میں انسان اپنے آپ کو کم درجہ سمجھتا ہے، ایسے شخص کے ہر قدم، ہر بول اور ہر حرکت وسکون سے تواضع کی خوشبو مہکتی ہے۔

متواضع شخص کا متواضعانہ کردار

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیں! کہ بعض لوگ جب یہ جان لیتے ہیں کہ تواضع دل کی صفت ہے تو پھر وہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کی بول چال اور چال ڈھال متواضعانہ ہوتی ہے، اور وہ ان پر اپنی طرف سے تواضع کے دکھلاوے کے فتوے لگادیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ تواضع کوئی ایسی قلبی صفت ہے جس کا عکس واثر اس ظاہر جسم پر نمایاں ہونا ضروری نہیں۔ یہ بات اور سوچ بالکل غلط، بلکہ متکبرانہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل تواضع تو دل کی صفت ہے لیکن دل کی ہر صفت اور ہر حالت کا عکس واثر انسان کے ظاہر پر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح تواضع کا عکس اور اس کا اثر بھی انسان کی وضع قطع، بول چال، چال ڈھال اور ہر حرکت وسکون سے نمایاں ہوتا ہے۔

اس کی دلیل میں قرآن مجید کی آیتوں کو نقل کرچکا ہوں اور اس کا مفصل بیان تکبر کے باب میں آچکا ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے متکبروں اور مغروروں کی چال ڈھال اور وضع قطع سے بھی منع فرمایا ہے۔

تواضع اور انکساری کی علامتیں

اب ذیل میں تواضع کی چند موٹی موٹی علامتوں کو ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ ان کے مطابق اپنے آپ کو بنایا جاسکے۔

۱۔ متواضع شخص کی بول چال، چال ڈھال کسی چیز سے بھی تکبر وغرور ظاہر نہیں ہوتا، وہ کسی کا مذاق نہیں اڑاتا، طعنہ نہیں دیتا، کسی پر فقرے چسپاں نہیں کرتا اور نہ کسی کی غیبت کرتا ہے۔

۲۔ وہ تصنّع اور تکلّف سے بھی پاک ہوتا ہے اور حسد سے بھی۔

۳۔ وہ کبھی اپنی بڑائی جتلانے کی خاطر بحث مباحثہ اور مناظرہ نہیں کرتا۔

۴۔ وہ لوگوں کی رضا کارانہ خدمت کرتا ہے، والدین، اپنے بڑوں، مشائخ، علمائے دین اور بزرگانِ دین کا ادب کرتا ہے۔

۵۔ وہ یتیموں، بے کسوں اور تمام لوگوں کے ساتھ حسن وخوبی کے ساتھ ملتا ہے، ان کی باتوں اور حاجتوں کو غور سے سنتا ہے اور جو تعاون اور احسان اس سے ہو سکے اس کو کر گزرتا ہے۔

۶۔ بغیر کسی شدید ضرورت کے کرخت لب ولہجہ سے پرہیز کرتا ہے۔

۷۔ اگر کسی کو جائز کام میں اس کی موافقت کی ضرورت ہو تو وہ آسانی سے اس کے ساتھ موافق ہو جاتا ہے۔

۸۔ ہر حق دار کو اس کا حق حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔

۹۔ وہ دین کے بہت سے کام اور خدمت کرے یا غریبوں اور مسکینوں کی غیر معمولی امداد کرے یا کوئی اور بڑا کارنامہ انجام دے تو اس کی گردن اللہ تعالیٰ کے سامنے پہلے سے زیادہ جھک جاتی ہے اور اس کی وجہ سے وہ کبھی تکبر وغرور میں مبتلا نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے کہ کہیں اس کی دی ہوئی توفیق اور فضل مجھ سے چھن نہ جائے۔

۱۰۔ متواضع شخص لوگوں کا خیر خواہ اور سخی ہوتا ہے، وہ کبھی کسی پر کسی طرح کا احسان نہیں جتلاتا۔

۱۱۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر، اس کے دین کی خاطر اپنے مال، جان غرض ہر چیز کو قربان کرکے بھی تشنہ لب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت، کبریائی اور عظمت کے احساس کی وجہ سے وہ یہی سمجھتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔

رضاء جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تواضع کے فضائل

تواضع کے بہت ہی زیادہ فضائل وفوائد بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ تواضع سے ہر خیر اور خوبی پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ تواضع بندگی کی روح بھی ہے اور بندگی کا مظہر بھی۔

۳۔ متواضع شخص ہمیشہ خوشی اور راحت میں ہوتا ہے، وہ حسد وغیرہ کے غم وحُزن اور جلن سے محفوظ ہوتا ہے۔

۴۔ متواضع شخص سے خیر پھیلتی ہے اور ہر خیر اسی کی طرف لوٹ آتی ہے۔

۵۔ جس بندے میں جس قدر تواضع اور عبدیت ہوتی ہے اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوتا ہے اور اسی قدر اللہ تعالیٰ کا مقُرب بن جاتا ہے۔

۶۔ تواضع اور خاکساری دنیا میں بھی رفعت اور بلندی کا سبب ہے اور آخرت میں بھی درجات کی بلندی کا سبب ہے۔

۷۔ متواضع شخص شر وفساد سے محفوظ رہتا ہے، مصائب اور مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے اور اس کے لیے آسانی کی راہ نکال دیتا ہے۔

۸۔ متواضع شخص چوں کہ اللہ تعالیٰ کا شاکر بندہ ہوتا ہے اور اس کے دل پر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کی ہیبت طاری رہتی ہے اس لیے اس پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور شفقتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔

۹۔ متواضع شخص لوگوں کی نظروں میں اونچا اور بڑا ہوتا ہے اور اس کے اعمال اور دعاؤں کو اللہ تعالیٰ حسن وخوبی کے ساتھ قبول فرماتا ہے۔

۱۰۔ اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع کا صلہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور جنت ہے۔

تواضع اختیار کرنے والوں کے جنت میں عالی مقامات

تواضع اختیار کرنے والوں کو جنت میں عالی مقامات پر فائز کیا جائے گا، چناں چہ اللہ تعالیٰ، خدائے رحمان کے بندوں کی بندگی اور تواضع والے بول چال، چال ڈھال اور کردار واخلاق کو ذکر کرکے آخر میں فرماتا ہے کہ: اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ۞ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۞ ”یہ لوگ ہیں کہ ان کو ان کی ثابت قدمی کے صلے میں بالاخانے ملیں گے اور ان میں ان کا استقبال دعا وسلام کے ساتھ ہوگا۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، وہ خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی اور خوب جگہ ہے رہنے کی۔“ (سورۂ فرقان: آیت ۷۵-۷۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو مذکورہ بالا صفات سے متصف ہیں، جنہوں نے اپنے آپ کو حق کی خاطر نیچے کر لیا اور تواضع و فروتنی کی زندگی گزاری اور اسی عبدیت اور متواضعانہ و خدا پرستانہ زندگی پر استقامت اختیار کی تو اس وجہ سے یہ لوگ جنت کے عالی مقامات کے مستحق ٹھہریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو بڑی سرفرازی عطا فرمائے گا۔

تواضع رفعت وبلندی کا ذریعہ ہے

بلاشبہ تواضع بہت ہی عظیم انسانی خصوصیت ہے، جس کو یہ نعمت نصیب ہو جائے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے اور اسی میں دنیا و آخرت کی رفعت و بلندی ہے۔

چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَانَقَصَت صَدَقَةٌ مِّن مَّالٍ وَّمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفوٍ اِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ "صدقہ مال کو کم نہیں کرتا (یعنی صدقہ دینے سے کسی کے مال کو کم نہیں کیا جاتا) اور اللہ تعالیٰ معاف کر دینے کی وجہ سے (معاف کرنے والے) بندے کی عزت کو ہی بڑھاتا ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو رفعت و بلندی نصیب کرتا ہے۔" (مسلم، مشکوۃ: باب فضل الصدقۃ)

نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"اے لوگو! تواضع اور انکساری کو اختیار کرو کیوں کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے (لوگوں کے ساتھ) تواضع کا رویہ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بلندی سے نوازتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی نظر میں تو حقیر ہوتا ہے (کیوں کہ اس کی نظر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اپنے عیوب و نقائص پر ہوتی ہے) لیکن لوگوں کی نظر میں بلند ہوتا ہے، اور جو شخص تکبر و غرور کا رویہ اختیا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیچے گرا دیتا ہے، لہٰذا وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے خیال میں اپنے آپ کو بلند سمجھتا ہے، لیکن لوگوں کی نظروں میں کتے اور خنزیر سے بھی زیادہ بدتر ہوتا ہے۔"
(مشکوۃ: باب الغضب والکبر)

تواضع اور اتفاق واتحاد کے واقعات

جہاں تکبر، غرور اور فخر کی فضا ہو گی وہاں اتفاق واتحاد ہو ہی نہیں سکتا، اگرچہ بظاہر اتفاق واتحاد ہی نظر آئے، مگر دراصل وہ اتفاق واتحاد نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہو گی کہ وہ لوگ کسی دنیاوی مفاد پر اکھٹے ہوں گے، یا پھر وہ ایک دوسرے کی جبری غلامی میں مبتلا ہوں گے۔ چوں کہ تواضع وانکساری ہی ایسا مسالہ ہے جو لوگوں کو جوڑے رکھتا ہے، اس لیے یہاں تواضع اور (اور اختلاف رائے کے باوجود) اتفاق واتحاد کے واقعات کو ایک ساتھ نقل کرتا ہوں۔

حضور ﷺ کا تواضع

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ گدھے پر سوار ہوتے تھے اور اون پہنتے تھے، اور بکری کی ٹانگوں کو قابو کر کے اس کا دودھ نکالتے اور مہمان کی خاطر مدارت خود کرتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ زمین پر بیٹھا کرتے تھے، زمین پر کھایا کرتے تھے اور بکری کی ٹانگ باندھ کر دودھ نکالا کرتے تھے، اور کوئی غلام جَو کی روٹی کی دعوت کرتا تو اسے بھی قبول فرمالیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (مدینہ سے باہر کی آبادی) عوالی کا کوئی آدمی حضور ﷺ کو آدھی رات کے وقت جَو کی روٹی پر بلاتا تو بھی آپ ﷺ اسے قبول فرمالیتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کو کوئی آدمی جَو کی روٹی اور بدذائقہ چربی کی دعوت دیتا تو آپ ﷺ اسے قبول فرمالیا کرتے تھے (اور اپنا سب کچھ دوسروں پر خرچ کرنے کا یہ عالم تھا کہ) آپ کی ایک زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی اور انتقال تک آپ کے پاس اتنا مال جمع نہ ہو سکا کہ اسے دے کر اس زرہ کو یہودی سے چھڑا لیتے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ کو تین مرتبہ آواز دی۔ حضور ﷺ ہر مرتبہ جواب میں لبیک لبیک فرماتے۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت مردوں سے بے حیائی کی باتیں کیا کرتی تھی اور بہت بے باک اور بدکلام تھی۔ ایک مرتبہ وہ حضور ﷺ کے پاس سے گزری۔ حضور ﷺ ایک اونچی

جگہ پر بیٹھے ہوئے ثرید کھا رہے تھے۔ اس پر عورت نے کہا: انہیں دیکھو! ایسے بیٹھے ہوئے ہیں جیسے غلام بیٹھتا ہے، ایسے کھا رہے ہیں جیسے غلام کھاتا ہے۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: کون سا بندہ مجھ سے زیادہ بندگی اختیار کرنے والا ہوگا؟ پھر اس عورت نے کہا: یہ خود کھا رہے ہیں اور مجھے نہیں کھلا رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تو بھی کھالے۔ اس نے کہا: مجھے اپنے ہاتھ سے عطا فرمائیں۔ حضور ﷺ نے اسے دیا تو اس نے کہا: جو آپ کے منہ میں ہے اس میں سے دیں۔ حضور ﷺ نے اس میں سے دیا جسے اس نے کھا لیا۔ (اس کھانے کی برکت سے) اس پر شرم وحیا غالب آگئی اور اس کے بعد اس نے اپنے انتقال تک کسی سے بے حیائی کی بات نہ کی۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی سامنے سے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تسلی رکھو! میں بادشاہ نہیں ہوں، میں تو قریش کی ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت بھی کھالیا کرتی تھی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی فتح مکہ کے دن حضور ﷺ سے بات کرنے لگا تو اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ آگے پچھلی حدیث جیسا مضمون ہے۔ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ مسجد کی طرف نکلا۔ آپ ﷺ کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ میں نے ٹھیک کرنے کے لیے حضور ﷺ سے جوتی لے لی۔ حضور ﷺ نے میرے ہاتھ سے جوتی لے کر فرمایا: تسمہ تو میرا ٹوٹا اور ٹھیک تم کرو، اس سے فوقیت نظر آتی ہے اور میں دوسروں پر اپنی فوقیت پسند نہیں کرتا (بلکہ میں تو سب کے برابر بن کر رہنا چاہتا ہوں)۔

حضرت عبد اللہ بن جبیر خزاعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ اپنے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جا رہے تھے۔ کسی نے کپڑے سے آپ ﷺ پر سایہ کر دیا۔ جب آپ ﷺ کو زمین پر سایہ نظر آیا تو آپ ﷺ نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک صاحب چادر سے آپ پر سایہ کر رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: رہنے دو، اور کپڑا اُس سے لے کر رکھ دیا اور فرمایا: میں بھی تم جیسا آدمی ہوں (اپنے لیے امتیازی سلوک نہیں چاہتا)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے دل میں کہا: معلوم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزید کب تک ہم میں رہیں گے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! اگر آپ سایہ کے لیے ایک چھپر بنالیں تو بہت اچھا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو لوگوں میں ایسے گھل مل کر رہنا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ میری ایڑیاں روندتے رہیں اور میری چادر کھینچتے رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (دنیا سے اٹھا کر) مجھے ان لوگوں سے راحت دے (میں اپنے لیے الگ جگہ بنانا نہیں چاہتا)۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں پتا چلاؤں گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں اور کتنا رہیں گے تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ عام لوگوں کے ساتھ رہنے سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے، ان کا سارا گردو غبار آپ پر آجاتا ہے اس لیے اگر آپ اپنے لیے ایک تخت بنالیں جس پر بیٹھ کر آپ لوگوں سے بات کیا کریں تو یہ بہتر ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی جواب دیا جو پچھلی حدیث میں گزر گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جواب سے میں سمجھ گیا کہ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں تھوڑا عرصہ ہی رہیں گے۔

حضرت اسود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لاتے تو کیا کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ گھر والوں کے کام کاج میں لگ جاتے اور جب نماز کا وقت آجاتا تو باہر تشریف لے جاتے اور نماز پڑھاتے۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کچھ کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ہاں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جوتی خود گانٹھ لیا کرتے اور اپنے کپڑے سی لیا کرتے۔ آپ گھر میں اسی طرح کام کیا کرتے تھے جس طرح آپ لوگ کرتے ہیں۔

حضرت عمرہ رحمۃ اللہ علیہا کہتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی انسان تھے تو اور انسانوں کی طرح آپ اپنے کپڑوں میں سے (شبہ کی وجہ سے) جوئیں نکال لیتے تھے اور اپنی بکری کا دودھ نکالتے تھے اور اپنے کام خود کیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وضو کا پانی کسی کے

سپرد نہ فرماتے (بلکہ خود وضو فرماتے) اور جب آپ ﷺ کوئی صدقہ دینا چاہتے تو خود دیتے تھے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ آپ ﷺ نہ خچر پر سوار تھے اور نہ ترکی گھوڑے پر (بلکہ پیدل تشریف لائے تھے)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے پُرانے کجاوے پر حج فرمایا اور کجاوے پر ایک چادر تھی جس کی قیمت چار درہم بھی نہیں تھی، اس کے باوجود آپ نے یہ دعا مانگی: اے اللہ! مجھے ایسے حج کی توفیق عطا فرما جس میں نہ ریا ہو اور نہ شہرت۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ مکہ میں (فاتحانہ) داخل ہوئے تو لوگ اونچی جگہوں پر چڑھ چڑھ کر حضور ﷺ کو دیکھ رہے تھے لیکن تواضع اور عاجزی کی وجہ سے آپ کا سر کجاوے کو لگا ہوا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتح کے دن جب حضور ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تھے تو آپ ﷺ کی ٹھوڑی تواضع کی وجہ سے کجاوے پر تھی۔ حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ ذی طویٰ مقام پر پہنچے تو اپنی سواری پر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت آپ نے سرخ یمنی دھاری دار چادر سر پر باندھی ہوئی تھی اور اُس کا ایک کنارہ منہ پر ڈالا ہوا تھا۔ جب حضور ﷺ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ سے سرفراز فرمایا ہے تو حضور ﷺ نے اللہ کے سامنے عاجزی ظاہر کرنے کے لیے اپنا سر جھکا لیا، یہاں تک کہ آپ کی داڑھی کجاوے کے درمیانی حصے کو لگ رہی تھی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں حضور ﷺ کے ساتھ بازار گیا۔ حضور ﷺ کپڑا بیچنے والوں کے پاس بیٹھ گئے اور چار درہم میں ایک شلوار خریدی۔ بازار والوں نے ایک (سونا چاندی) تولنے والا رکھا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے اس سے فرمایا: تولو اور جھکتا ہوا تولو، اور حضور ﷺ نے وہ شلوار لے لی۔ میں نے حضور ﷺ سے شلوار لے کر اٹھانی چاہی۔ حضور ﷺ نے اس پر فرمایا: چیز کا مالک خود اسے اٹھانے کا زیادہ حق دار ہوتا ہے، ہاں اگر وہ مالک اتنا کمزور ہو کہ اپنی چیز کو اٹھا نہ سکتا ہو تو پھر اس کا مسلمان بھائی اس کی مدد کرے۔ میں نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ یہ شلوار پہنیں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! دن رات، سفر و حضر میں پہنوں گا کیوں کہ مجھے ستر ڈھانکنے کا حکم دیا گیا ہے اور مجھے اس سے زیادہ ستر ڈھانکنے والی کوئی چیز نہ ملی۔ (حیاۃ الصحابہ: ۲/۷۰۳ تا ۷۰۷)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز پڑھ لیتے تو مدینہ کے خادم یعنی غلام اور باندیاں اپنے برتنوں میں پانی لے کر آتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو بھی برتن لایا جاتا آپ (برکت کے لیے) اپنا ہاتھ اس میں ڈال دیتے۔ بعض دفعہ یہ لوگ سردیوں کی صبح میں ٹھنڈا پانی لاتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں بھی ہاتھ ڈال دیتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے مصافحہ فرماتے یا کوئی اور آپ سے مصافحہ کرتا تو آپ اس سے اپنا ہاتھ نہ چھڑاتے، بلکہ وہی دوسرا آدمی اپنا ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے علیحدہ کرتا، اور اگر کوئی آدمی آپ کی طرف منہ کرکے بات کرتا تو آپ اس کی طرف متوجہ ہی رہتے یہاں تک کہ فارغ ہو کر وہی آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چہرہ پھیر لیتا، اور کبھی کسی نے یہ منظر نہیں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاؤں اپنے پاس بیٹھنے والے کی طرف پھیلا رکھے ہوں (یعنی ایسا کبھی نہیں ہوا)۔

(حیاۃ الصحابہ: ج۲، ص۶۷۷)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مدینہ والوں کی باندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیتی اور اپنی ضرورت کے لیے جہاں چاہے لے جاتی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت کی عقل میں کچھ خلل تھا، اس نے کہا: یارسول اللہ! مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اُمِ فلاں! تم جونسی گلی چاہو دیکھ لو، میں وہاں تمہارا کام کردوں گا (گلی اس لیے مقرر کی تاکہ اس کا کام بھی کردیں اور اجنبی عورت سے خلوت بھی نہ ہو، گلی تو عام گزرگاہ ہوتی ہے) چناں چہ اس نے ایک گلی بتائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گلی میں جاکر اُس کی طرف ہو کر علیحدگی میں اس کی بات سنی، یہاں تک کہ اس نے اپنی ضرورت کی ساری بات کہہ لی۔

حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک سفر سے واپس آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چھوڑا نہیں، آخر میں نے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ چھوڑا۔ (حیاۃ الصحابہ: ج۲، ص۶۷۸)

حضرت شیخ الحدیث ''شمائل ترمذی'' کی شرح خصائل نبوی میں لکھتے ہیں کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا سے زیادہ متواضع تھے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ حقیقۃً تواضع تجلی شہود کے دوام کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تواضع کے واقعات ایک دو نہیں ہزاروں سے زائد ہیں، اس لیے اُن کا احاطہ تو کیسے ممکن ہو سکتا ہے تاہم نمونۃً کچھ مصنف نے ذکر فرمائے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی سفر میں چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک بکری ذبح کرنے کا ارادہ فرمایا اور اس کا کام تقسیم فرمالیا۔ ایک نے اپنے ذمہ ذبح کرنالیا، دوسرے نے کھال نکالنا، کسی نے پکانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پکانے کے لیے لکڑی اکٹھی کرنا میرے ذمے ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ حضور یہ کام ہم لوگ خود کرلیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تم لوگ اس کو بخوشی کرلوگے لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں کہ مجمع میں ممتاز ہوں اور اللہ جل جلالہ بھی اس کو پسند نہیں فرماتے۔ ایسے ہی اور سینکڑوں واقعات ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ میری ایسی تعریف مبالغہ آمیز حد سے فزوں نہ کرو جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا (کہ اللہ کا بیٹا ہی بنا دیا)، میں حق جل شانہ کا بندہ ہوں اس لیے مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

(خصائل نبوی: ۱۹۴ تا ۱۹۵)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تواضع

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تاجر آدمی تھے، روزانہ صبح بازار جاکر خرید و فروخت کرتے۔ ان کی بکریوں کا ایک ریوڑ بھی تھا جو شام کو ان کے پاس واپس آتا۔ کبھی ان کو چرانے خود جاتے اور کبھی کوئی اور چرانے جاتا۔ اپنے محلے والوں کی بکریوں کا بھی دودھ نکال دیا کرتے۔ جب یہ خلیفہ بنے تو محلے کی ایک لڑکی نے کہا: (اب تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے ہیں لہٰذا) ہمارے گھر کی بکریوں کا دودھ اب تو کوئی نہیں نکالا کرے گا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا: نہیں! میری عمر کی قسم! میں آپ لوگوں کے لیے دودھ ضرور نکالا کروں گا اور مجھے امید ہے کہ خلافت کی ذمہ داری جو میں نے اٹھائی ہے یہ مجھے ان اخلاق کریمانہ سے نہیں ہٹائے گی جو پہلے سے مجھ میں ہیں۔ چناں چہ خلافت کے بعد بھی محلہ والوں کی بکریوں کا دودھ نکالا کرتے اور بعض دفعہ ازراہِ مذاق محلہ کی لڑکی سے کہتے: اے لڑکی! تم کیسا دودھ نکلوانا چاہتی ہو؟ جھاگ والا نکالوں یا بغیر جھاگ کے۔ کبھی وہ کہتی جھاگ والا اور کبھی کہتی بغیر جھاگ کے، بہر حال جیسے وہ کہتی ویسے یہ کرتے۔ (حیاۃ الصحابہ: ج ۲، ص ۱۸۲ تا ۱۸۳)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تواضع

حضرت زِرّ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عید گاہ ننگے پاؤں جارہے ہیں۔ حضرت عمر مخزومی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اعلان کروایا الصلاۃ جامعۃ سب نماز میں جمع ہو جائیں، ضروری بات کرنی ہے۔ جب لوگ کثرت سے جمع ہوگئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد فرمایا: اے لوگو! میری چند خالائیں تھیں جو قبیلہ بنو مخزوم کی تھیں، میں ان کے جانور چرایا کرتا تھا، وہ مجھے مٹھی بھر کشمش اور کھجوردے دیا کرتی تھیں، میں اس پر سارادن گزارا کرتا تھا اور وہ بہت ہی اچھادن ہوتا تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اے امیر المؤمنین! آپ نے اور تو کوئی خاص بات کہی نہیں، بس اپنا عیب ہی بیان کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے ابن عوف! تیرا بھلا ہو میں تنہائی میں بیٹھا ہوا تھا، میرے نفس نے مجھ سے کہا: تو امیر المؤمنین ہے، تجھ سے افضل کون ہو سکتا ہے؟ تو میں نے چاہا کہ اپنے نفس کو اس کی حیثیت بتادوں۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! میں نے اپنا حال دیکھا ہے کہ میرے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی، میں اپنے قبیلہ بنو مخزوم کی خالاؤں کو میٹھا پانی لا کر دیا کرتا تھا، وہ مجھے کشمش کی چند مٹھیاں دے دیا کرتی تھیں۔ بس یہ کشمش ہی کھانے کی چیز ہوتی تھی۔ آخر میں یہ بھی فرمایا: مجھے اپنے نفس میں کچھ بڑائی محسوس ہوئی تو میں نے چاہا کہ اسے کچھ نیچے جھکاؤں۔ (حیاۃ الصحابہ: ۲/۷۰۸تا۷۰۹)

حضرت جُبَیر بن نُفَیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا اے امیر المؤمنین! ہم نے آپ سے زیادہ انصاف کا فیصلہ کرنے والا اور حق بات کہنے والا اور منافقوں پر آپ سے زیادہ سخت آدمی کوئی نہیں دیکھا، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ تمام لوگوں سے زیادہ بہتر ہیں۔ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: تم لوگ غلط کہہ رہے ہو، ہم نے وہ آدمی دیکھا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی بہتر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے عوف! وہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت عوف رضی اللہ عنہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، تم سب غلط کہہ

رہے ہو۔ اللہ کی قسم! حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مشک سے زیادہ پاکیزہ خوشبو والے تھے اور میں تو اپنے گھر والوں کے اونٹ سے زیادہ بچلا ہوا ہوں۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے آکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ کچھ لوگ فلاں جگہ جمع ہیں اور وہ آپ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے افضل بتا رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہت غصہ آیا اور آدمی بھیج کر ان سب کو بلایا۔ جب وہ آگئے تو ان سے فرمایا: اے بدترین لوگو! اے قبیلے کے شریرو! اے پاکدامن عورت کو بگاڑنے والو! انہوں نے کہا: اے امیر المؤمنین ! آپ ہمیں ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ ہم سے کیا غلطی ہوگئی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین مرتبہ یوں ہی یہ سخت کلمات کہے پھر فرمایا: تم لوگوں نے مجھ میں اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں کیوں فرق ڈالا؟ (اور مجھے ان سے بہتر کیوں بتایا؟) اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے میری دلی تمنا ہے کہ مجھے جنت میں ایسی جگہ ملے جہاں سے مجھے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تاحدِ نگاہ نظر آتے رہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس امت کے نبی کے بعد ان میں سب سے افضل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں لہٰذا جو بھی میری اس بات کے بعد کوئی اور بات کہے گا وہ بہتان باندھنے والا شمار ہوگا اور اسے بہتان باندھنے والے کی سزا ملے گی۔

(حیاۃ الصحابہ: ۲-/۵۹۰ تا ۵۹۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تواضع

حضرت مالک رحمۃ اللہ کے دادا بیان کرتے ہیں کہ میں نے کئی بار دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب مکہ سے مدینہ واپس آتے تو مدینہ سے ذرا (پہلے) معرّس مسجد (ذوالحلیفہ) میں قیام فرماتے اور جب مدینہ منورہ میں داخل ہونے کے لیے سوار ہوتے تو سواری پر پیچھے کسی کو ضرور بٹھاتے اور کوئی نہ ملتا تو کسی لڑکے کو ہی بٹھا لیتے اور اسی حال میں مدینہ میں داخل ہوتے۔ راوی کہتے ہیں کہ کیا حضرت عمر و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اپنے پیچھے تواضع کے خیال سے بٹھایا کرتے تھے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں! تواضع کے خیال سے ہی بٹھاتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ پیدل آدمی کو سواری مل جائے، اس کا بھی فائدہ ہو جائے، اور یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ اور بادشاہوں جیسے نہ ہوں (کہ وہ تو کسی عام آدمی کو اپنے پیچھے بٹھاتے

نہیں)۔ پھر وہ بتانے لگے اب تو لوگوں نے نیا طریقہ ایجاد کر لیا ہے، خود تو سوار ہو جاتے ہیں اور غلام اور لڑکوں کو اپنے پیچھے پیدل چلاتے ہیں، یہ بہت ہی عیب کی بات ہے۔

حضرت میمون بن مہران رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ مجھے ہمدانی نے بتایا کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ خچر پر سوار ہیں اور ان کا غلام نائل ان کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے حالاں کہ آپ اس وقت خلیفہ تھے۔ (حیاۃ الصحابہ: ۲/۷۱۰)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تواضع

حضرت صالح کمبل فروش رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ میری دادی جان نے یہ بیان کیا کہ میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک درہم کی کھجوریں خریدیں اور انہیں اپنی چادر میں ڈال کر اٹھانے لگے تو میں نے ان سے کہا یا کسی مرد نے ان سے کہا: اے امیر المؤمنین! آپ کی جگہ میں اٹھالیتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں! (میں نے یہ کھجوریں بچوں کے لیے خریدی ہیں اس لیے) بچوں کا باپ ہی ان کے اُٹھانے کا زیادہ حق دار ہے۔ (حیاۃ الصحابہ)

حضرت زاذان رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بازار میں تشریف لے جاتے، حالاں کہ آپ امیر المؤمنین تھے۔ جسے راستہ معلوم نہ ہوتا اسے راستہ بتاتے، گمشدہ چیز کا اعلان کرتے، کمزور کی مدد کرتے اور دکاندار اور سبزی فروش کے پاس سے گزرتے تو اسے قرآن کی یہ آیت سناتے: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا "یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لیے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔" (سورۂ قصص: آیت ۸۳)

اور فرماتے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جو لوگوں کے حاکم ہیں اور انہیں تمام لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اور وہ عدل وانصاف اور تواضع والے ہیں۔

حضرت جرموز رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر سے باہر آرہے ہیں اور انہوں نے قطر کی بنی ہوئی دو سرخی مائل چادریں اوڑھی ہوئی ہیں۔ ایک لنگی آدھی پنڈلی تک اور دوسری اتنی ہی لمبی چادر اپنے اوپر لپیٹی ہوئی ہے، ہاتھ میں کوڑا بھی ہے جسے لے کر وہ بازاروں میں جایا کرتے اور بازار والوں کو اللہ سے ڈرنے کا اور عمدہ طریقہ سے بیچنے کا حکم دیا کرتے اور فرماتے: پورا تولو اور پورا ناپو، اور

یہ بھی فرماتے کہ گوشت میں ہوا نہ بھرو (اس طرح گوشت موٹا نظر آئے گا اور لوگوں کو دھوکہ لگے گا)۔
(حیاۃ الصحابہ:۷/۱۱۱ ۲تا۷/۱۱۲)

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا تواضع

حضرت ابو قلابہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ آٹا گوندھ رہے تھے۔ اس آدمی نے کہا: یہ کیا ہے؟ (کہ آپ خود ہی آٹا گوندھ رہے ہیں) انہوں نے فرمایا: (آٹا گوندھنے والے) خادم کو ہم نے کسی کام کے لیے بھیج دیا اس لیے ہم نے اسے اچھا نہ سمجھا کہ ہم اس کے ذمے دو کام لگا دیں۔ پھر اس آدمی نے کہا کہ فلاں صاحب آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔ حضرت سلمان نے پوچھا کہ تم کب آئے تھے؟ اس نے کہا کہ اتنے عرصے سے آیا ہوا ہوں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم اس کا سلام نہ پہنچاتے تو پھر یہ وہ امانت شمار ہوتی جو تم نے ادا نہیں کی (تمہارے ذمے باقی رہتی)۔ (حیاۃ الصحابہ:۲/۱۴۰)

حضرت ثابت رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ مدائن کے گورنر تھے۔ ایک دفعہ قبیلہ بنو تیم کا ایک شامی آدمی آیا، اس کے پاس بھوسے کا ایک گٹھڑ تھا۔ اسے راستے میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ملے، انہوں نے گھٹنے تک کی شلوار اور چغہ پہن رکھا تھا۔ اس آدمی نے ان سے کہا: آؤ میرا بھی گٹھڑ اٹھالو۔ وہ آدمی ان کو پہچانتا نہیں تھا۔ حضرت سلمان نے وہ گٹھڑ اٹھالیا۔ جب اور لوگوں نے حضرت سلمان کو دیکھا تو انہوں نے انہیں پہچان لیا اور اس آدمی سے کہا: یہ تو (ہمارے) گورنر ہیں۔ اس آدمی نے حضرت سلمان سے کہا: میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ حضرت سلمان نے فرمایا: میں تمہارے گھر تک اسے پہنچاؤں گا۔ دوسری سند کی روایت میں یہ ہے کہ حضرت سلمان نے فرمایا کہ میں نے (تمہاری خدمت کی) نیت کی ہے اس لیے میں جب تک اسے تمہارے گھر تک نہیں پہنچادوں گا اسے (سر سے اتار کر) نیچے نہیں رکھوں گا۔

حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اپنے ہاتھوں سے کام کر کے کوئی چیز تیار کیا کرتے تھے۔ جب انہیں اس کام سے کچھ رقم مل جاتی تو گوشت یا مچھلی خرید کر اسے پکاتے اور پھر کوڑھ کے مریضوں کو بلاتے اور ان کے ساتھ کھاتے۔ (حیاۃ الصحابہ:۲/۱۷۶)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا تواضع

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بازار میں گزر رہے تھے اور ان کے سر پر لکڑیوں کا ایک گٹھا ہوا تھا۔ کسی نے ان سے کہا: آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ حالاں کہ اللہ نے آپ کو اتنا دے رکھا ہے کہ کو خود اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے، آپ تو دوسروں سے اٹھوا سکتے ہیں۔ فرمایا: اپنے دل سے تکبر نکالنا ہوں، کیوں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ آدمی جنت میں نہیں جا سکے گا جس دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو گا۔ (حیاۃ الصحابہ: ۲/۷۱۷ تا ۷۱۸)

☆......☆......☆

دنیا کی محبت کا بیان

دنیا کی محبت اور اس کی حرص ایک بدترین خصلت ہے اور یہی خصلت طرح طرح کے فسادات فتنوں اور برائیوں کا سبب بن جاتی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مذموم محبت ہے جو ہر گناہ اور خطا کی بنیاد ہوا کرتی ہے۔

دنیا کی محبت کیا چیز ہے؟

انسان دنیا میں رہتا ہے، اس کو دنیا کی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، نیز انسان دوسرے انسانوں کے کام بھی آتے ہیں، مثلاً کوئی طبیب اور ڈاکٹر ہے، کوئی کاریگر ہے، کوئی مخدوم ہے، کوئی خادم ہے اور کوئی نوکر ہے، کوئی بادشاہ ہے، کوئی رعایا ہے، اس طرح انسانوں کی ضروریات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس لیے وہ دنیا کی چیزوں کی فراوانی سے خوش ہو جاتا ہے کہ زیادہ مال و دولت ہو، کھانے پینے، رہنے سہنے کا زیادہ سے زیادہ اور اچھے سے اچھا سامان ہو اور لوگوں میں میری عزت ہو، شان و شوکت ہو، مختصر یہ کہ انسان دنیا میں خوش رہنے کے لیے دو چیزوں کو بہت ہی اہم سمجھتا ہے: ایک یہ کہ اس کے پاس دنیا کا مال و دولت اور سامان ہو اور دوسرے لوگوں کی نظروں میں معزز اور مقبول بھی ہو۔

پہلی کو حُبِّ مال "یعنی مال واسباب کی محبت" اور دوسری کو حُبِّ جاہ "یعنی اپنی جان اور شان و شوکت و مقبولیت کی محبت" کہتے ہیں۔ جب ان دونوں کی یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی محبت اس قدر غالب ہو جاتی ہے کہ وہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے احکامات سے غافل کر دے، یا اللہ تعالیٰ کی بندگی میں رکاوٹ ڈال دے، یا اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں سستی پیدا کر دے تو اسی کو دنیا کی محبت کہا جاتا ہے اور اسی کو دنیا بھی کہتے ہیں۔ دنیا کی محبت میں لوگوں کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجات بن جاتے ہیں اور محبت کی کمی و بیشی کے مطابق زہد اور دنیا پرستی کے درجات کو تقسیم کیا جاتا ہے۔

دنیا کی چیزوں سے کس درجہ میں محبت ہونی چاہیے؟

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان کو دنیا کی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اپنی عزت کا خیال بھی اس کو رہتا ہے اور یہ مشاہدہ بھی ہے، کوئی لاکھ بار کہے اور سوچے کہ مجھے دنیا کے ساتھ کوئی بھی دلچسپی

نہیں لیکن پھر بھی عارضی طور پر اس کو ضرور بضرور کسی نہ کسی درجے میں دنیا کی چیزوں کی تلاش رہتی ہے اور ان کو استعمال میں لاتا ہے، مثلاً سخت پیاس کی وجہ سے اس کو پانی سے عارضی محبت ہونا اور اس کو تلاش کرنا، جب کہ یہی حالت بھوک میں بھی پیش آتی ہے۔

انسان کو قضائے حاجت کی ضرورت پڑتی ہے، اس وقت ایسی جگہ کو تلاش کرتا ہے جہاں وہ اپنا تقاضا پورا کرے اور یہی تلاش دلچسپی کی دلیل ہے۔ اسی طرح بعض اوقات وہ دشمن کی تلاش میں رہتا ہے، اس وقت بھی اس کے دل میں ایک خواہش اور ایک محبت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اپنے دشمن کو ایذا اور تکلیف پہنچائے یا اس کے مارنے سے دلچسپی اور محبت ہوتی ہے، غرض انسان کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اور جس چیز کی خواہش کرتا ہے اور اس کو تلاش کرتا ہے تو اس کو اس سے محبت ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر وہ تلخ دوا یا آپریشن سے اپنا علاج کراتا ہے تو اس علاج کو اختیار کرنے کی محبت اس کے اندر موجود ہوتی ہے، اگرچہ وہ اس کو بظاہر ناپسند کرے، اس سے روئے، چیخ وپکار کرے، کیوں کہ ایسی صورت میں اس کو اپنی صحت سے زیادہ محبت ہوا کرتی ہے، اس لیے وہ اس مرض سے نجات پانے کی خاطر اس عارضی تکلیف کو قبول کرلیتا ہے اور ڈاکٹر کو دوا کی قیمت اور آپریشن کی مزدوری (فیس) بھی دے دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو کہا جائے کہ ایک گھنٹہ یا ایک دن جیل میں گزارو تو بادشاہ بنادئے جاؤ گے تو وہ بادشاہی کی محبت میں جیل سے بھی محبت کرے گا۔

زہد کسے کہتے ہیں؟

اگر یہ بات ذہن نشین ہوگئی ہو تو اس سے خود بخود زہد کا مفہوم بھی سمجھ میں آجائے گا۔ زہد کے لغوی معنی کسی چیز سے بے رغبت ہوجانے کے ہیں اور دینِ اسلام کی خاص اصطلاح میں اللہ تعالیٰ اور آخرت کے لیے دنیا سے بے رغبت ہوجانے کو زہد کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت یا جنت کی محبت اس قدر غالب ہو کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی عزت اور دنیا کا مال و دولت حقیر نظر آئے۔

دنیاکا کاروبار نہ کرنا زہد نہیں

جب زہد کی تعریف معلوم ہوئی تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دنیا کا کاروبار چھوڑنا یا دنیا سے اس قدر متنفر ہونا کہ خودکشی کرلی جائے یا دنیا کی ساری نعمتوں، راحتوں اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کرلینا یا مال اُڑانا زہد نہیں، بلکہ یہ سب کچھ ایسی صورت میں بھی پیش آتا ہے جب انسان سخت قسم کا دنیا پرست یا آرام پرست ہوتا ہے۔ ایک بے ہمت اور بے کار آدمی اس لیے کاروبار چھوڑ کر بظاہر تارک الدنیا بن جاتا ہے کہ اس کو مال و دولت سے زیادہ اپنی راحت و آرام کی فکر دامن گیر رہتی ہے، ایسی صورت میں یہ شخص مال و دولت سے بے رغبت ہے، لیکن اس کی یہ بے رغبتی صرف بے ہمتی اور اپنے آرام کی خاطر ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور دینِ اسلام کی خاطر۔

ایک آدمی خودکشی کرلیتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت ہے، بلکہ جو شخص خودکشی کرتا ہے تو اس کی وجہ یا لوگوں کے طعنوں کا خوف اور ان کے سامنے ذلیل ہونے کا تصور ہوتا ہے جو اس کے لیے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے یا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی ذہنی پریشانی و بے چینی یا جسمانی درد و تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ اس کو ناقابلِ برداشت سمجھ کر خودکشی کرلیتا ہے، تو خودکشی کرنے والا زندگی پر موت کو ترجیح اس لیے نہیں دیتا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کو حاصل کرلے، بلکہ وہ صرف اپنی جسمانی راحت اور سکون وغیرہ کے خیال سے اس سنگین جرم کو اختیار کرلیتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی شان و شوکت بنانے کی خاطر اپنا مال و دولت اڑاتا ہے اور کسی چیز کو اپنے پاس رہنے نہیں دیتا تو وہ بھی زاہد نہیں، بلکہ یہ لوگوں میں بڑا بننے کا شوق و محبت ہے جسے وہ دنیا کی چیزوں کو قُربان کرکے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح ایک فقیر نادار جس کے پاس کوئی مال و دولت نہیں اسے بھی اس وقت تک زاہد نہیں کہا جاسکتا جب تک اس کے دل میں مال جمع کرنے کی حرص و لالچ موجود ہو، بلکہ زاہد تو وہی ہوتا ہے جو دنیا، اس کی لذتوں، راحتوں اور مال و متاع پر قدرت و اختیار حاصل ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اور آخرت کی خاطر دنیا کے مال و متاع، اس کے عیش و تنعُّم، اس کی لذتوں اور راحتوں کو قُربان کردیتا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی محبت اور آخرت کی محبت اس قدر غالب آچکی ہو کہ جس کے

مقابلہ میں دنیا کی عزت، دنیا کا مال و دولت، دنیا کی لذتیں اور راحتیں وغیرہ ساری چیزیں بالکل بے قیمت اور حقیر بن جائیں۔

مذکورہ بالا بحث سے زہد اور فقر میں فرق واضح ہو گیا، وہ یہ کہ زاہد وہی ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ اور آخرت کی محبت اس قدر غالب آچکی ہو کہ دنیا کے مال وجاہ کو حاصل کرنے کے باوجود دنیا سے بے التفات ہو، دنیا اس کے پیچھے بھاگے وہ اس سے دامن چھڑائے۔ اگر معاملہ بر عکس ہو کہ دنیا کو حاصل کرنا تو چاہتا ہے مگر دنیا اس کے ہاتھ نہ آئے تو یہ زاہد نہیں، بلکہ اسے فقر کہا جاتا ہے۔ اگرچہ فقر کی فضیلت آئی ہے لیکن یہ زہد نہیں جو انسان کی بلند ترین صفات میں سے ہے۔

زہد کی اساس اور بنیاد

زہد کی اصل ،اساس اور بنیاد یہ ہے کہ آدمی کو دنیا کے عیش کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کی فکر زیادہ دامن گیر ہو جائے۔ یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر (جن میں وعدۂ آخرت، جنت اور دوزخ بھی ہے) مکمل بھروسہ اور اطمینان ہو، جیسا کہ اس کا بیان "توکل" کے باب میں موجود ہے۔ جس شخص کا سینہ کھل جاتا ہے اور اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا ایک حقیر اور ایک بے قیمت چیز ہے تو اس کی کوشش دنیا کے بجائے آخرت کے لیے ہو جاتی ہے، جیسا کہ یہ قاعدہ ہے کہ انسان اُس چیز کو حاصل کرتا ہے اور اسی چیز کو تلاش کرتا ہے جو اس کے نزدیک اہم، قیمتی اور محبوب و مرغوب ہو۔

دیکھیے! کاشتکار کو گندم سے محبت ہوا کرتی ہے تو وہ صرف غالب گمان کی بنا پر اس کو زمین میں پھینک دیتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس کو زیادہ مل سکے۔ ایک آدمی کو کسی شخص کے ساتھ کچھ محبت ہوتی ہے لیکن وہی شخص جب اس کے ایک محبوب دوست یا اس کے محبوب بیٹے یا بھائی کا مخالف ہو جاتا ہے تو اب وہ اس محبوب کے مقابلے میں کم محبت والے شخص سے متنفر ہو جاتا ہے، اس نفرت اور بے رغبتی کی وجہ یہی دوسری غالب محبت ہوا کرتی ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو اپنے ماں باپ سے محبت ہوا کرتی ہے لیکن جب وہ شادی کر لیتے ہیں اور ان کی ماں ان کی بیوی سے لڑتی ہے تو ان پر ماں کے مقابلہ میں بیوی کی محبت غالب آ جاتی ہے اور وہ اپنی بیوی کے مقابلے میں اپنی ماں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ان صورتوں میں نفرت اور حقیر جاننے کی وجہ ایک محبوب پر دوسرے محبوب کی محبت کا غالب آ جانا ہوتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی چیزیں اور دنیا میں عزت وآرام سے رہنا ہی انسان کی محبوب چیزیں ہیں، لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر مکمل اعتماد وبھروسہ اور یقین ہو تو جو چیز بھی آخرت کے حصول اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں رخنہ ڈالتی ہو، رکاوٹ بن جاتی ہو یا اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی بندگی اور فرمانبرداری میں سستی پیدا کرتی ہو اُس سے اُن کو نفرت ہو جاتی ہے اور وہ اُس چیز کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی اللہ تعالیٰ اور آخرت کی محبت اور فکر ہے جو زہد کی بنیاد اور توکل کا ثمرہ اور پھل ہے۔ جس شخص کا توکل اور فکر جس قدر زیادہ ہو گی اسی قدر وہ زاہد اور دنیا سے بے رغبت ہو گا اور دنیا کو آخرت پر قُربان کرنے والا ہو گا۔

اصل زہد کیا ہے؟

زہد کے سلسلے میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

الزَّهَادَةُ لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَّا تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِيْ يَدِاللّٰهِ وَاَنْ تَكُوْنَ فِيْ ثَوَابِ الْمُصِيْبَةِ اِذَا اَنْتَ اُصِبْتَ بِهَا اَرْغَبَ فِيْهَا لَوْ اَنَّهَا اُبْقِيَتْ لَكَ

”دنیا سے زہد اور بے رغبتی اختیار کرنا (صرف) یہ نہیں ہے کہ حلال چیزوں کو (اپنے اوپر) حرام کر لیا جائے اور اپنے مال واسباب کو برباد کر دیا جائے، بلکہ دنیا سے زہد اختیار کرنا یہ ہے کہ جو کچھ تیرے پاس اور تمہارے ہاتھ میں ہے اس سے زیادہ بھروسہ تم کو اُس پر ہو جو اللہ تعالیٰ کے قبضہ اور اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اور یہ کہ جب تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو اس سے اخروی ثواب کی طلب ورغبت تمہارے دل میں زیادہ ہو بہ نسبت اس خواہش کے کہ وہ مصیبت تم کو پیش ہی نہ آتی۔“ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

بہت سے لوگ ناواقفی سے زہد کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی دنیا کی ساری نعمتوں، راحتوں اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لے، نہ کبھی لذیذ کھانے کھائے، نہ ٹھنڈا پانی پیے، نہ اچھا کپڑا پہنے وغیرہ۔

آپ ﷺ نے اس روایت میں اس غلط خیال کی اصلاح فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ زہد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جن نعمتوں کا استعمال بندوں کے لیے حلال کیا ہے آدمی ان کو حرام کرلے، اگر روپیہ پیسہ اور مال ہاتھ آئے تو اسے برباد کردے، بلکہ زہد کا اصل معیار اور تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں اپنے پاس اور اپنے ہاتھ میں ہو اس کو فانی اور ناپائیدار یقین کرتے ہوئے اس پر اعتماد و بھروسہ نہ کرے اور اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے غیر فانی غیبی خزانوں اور اس کے فضل و کرم پر زیادہ اعتماد اور بھروسہ کرے۔

دوسرا معیار اور دوسری علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب کوئی تکلیف اور مصیبت پہنچ جائے تو اس کے اخروی اجر و ثواب کی چاہت اور رغبت اس کے دل میں اس مصیبت اور تکلیف کے نہ پہنچنے کی خواہش سے زیادہ ہو، یعنی بجائے اس کے کہ اس کا دل اُس وقت یہ کہے کہ کاش! یہ تکلیف مجھے نہ پہنچتی ،اس کے دل کا احساس یہ ہو کہ آخرت میں مجھے اس تکلیف کا جو اجر و ثواب ملے گا وہ ان شاء اللہ تعالیٰ تکلیف نہ پہنچنے کے مقابلہ میں میرے لیے ہزاروں درجے بہتر ہوگا۔ ①

بہر حال اگرچہ زہد کا مفہوم یہی ہے کہ دنیا سے بے رغبتی ہو لیکن نبی کریم ﷺ نے زاہد کی دو صفات اور بیان فرمائیں اور بتایا کہ اگر کسی شخص میں یہ دونوں صفات موجود ہوں تو یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ وہ زہد کے حقیقی مقام پر فائز ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیبی خزانوں ہی پر بھروسہ واعتماد ہو، دوسری یہ کہ آخرت کی طرف رغبت واشتیاق اس حد تک پہنچے کہ اس دنیا میں جو مصیبتیں، بلائیں اور تکلیفیں پہنچیں اُن پر آخرت میں عظیم اجر و ثواب ملنے کی تمنا محبوب و پسندیدہ بن جائے اور ان کا پہنچنا ان کے نہ پہنچنے سے زیادہ مرغوب ہو۔ اگر صبر و توکل کا یہ مقام حاصل ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ حقیقی زہد حاصل ہو گیا۔

---

① اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ بندہ اس دنیا میں مصائب اور تکالیف کی دعا کرے یا تمنا کرے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی مصیبت یا تکلیف بندہ کو پہنچ جائے تو پھر مومن کا مقام اور زہد کا تقاضا یہ ہے کہ اس مصیبت یا تکلیف کا جو اجر و ثواب آخرت میں ملنے والا ہے وہ اجر اس مصیبت و تکلیف کے نہ پہنچنے سے زیادہ محبوب و مرغوب ہو۔

زہد کی علامتیں

دنیا کی محبت گویا تمام گناہوں اور غلطیوں کی اساس اور بنیاد ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ اور آخرت کے لیے دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے انسان ان تمام گناہوں اور بداخلاقیوں سے نجات پالیتا ہے جو دنیا کی محبت سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہاں زہد کی صرف چند موٹی موٹی اور اہم علامات ذکر کرتے ہیں تا کہ ان علامتوں کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۔ زاہد آدمی دنیوی عیش اور لذتوں میں زیادہ مشغول نہیں ہوتا اور نہ وہ اپنے پاس زیادہ لذت اور عیش کا سامان جمع کرتا ہے۔

۲۔ جب اور جہاں دنیا کی چیزوں کے ترک کر دینے اور چھوڑنے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کی خوشنودی کی خاطر دنیا کی چیزوں، لذتوں اور راحتوں سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور جہاں اور جس جگہ اللہ تعالیٰ کا حکم اور خوشنودی ہو کہ دنیا کی چیزوں کو اختیار کر لیا جائے تو اس وقت اور اس جگہ وہ اس کو اختیار کر لیتا ہے۔

۳۔ وہ سخی ہوتا ہے لیکن سخی بھی ایسا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں، یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر دنیا کا اپنا تمام مال ومتاع مسکینوں وغیرہ کو دے کر بھی اس کے دل میں یہ نہیں آتا کہ اس نے کوئی بہت بڑی یا اہم چیز اللہ تعالیٰ کے نام پر قربان کر دی ہے۔ وہ جس کے ساتھ کوئی احسان کرتا ہے تو ایسے انداز میں کرتا ہے کہ گویا اُسی کے ساتھ احسان کیا جا رہا ہے، یعنی وہ احسان کر کے بھی احسان جتلانے کے بجائے خود احسان مند ہوتا ہے۔

۴۔ بادشاہوں کے خزانے اور عیش وعشرت میں پلنے والے لوگوں کا ساز وسامان اس کی نظر میں مکھی کے پر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

۵۔ اس میں قناعت ہوتی ہے، دنیا کے مال وعزت کے بارے میں قانع ہوتا ہے، یعنی مال وعزت کے حصول کا لالچی اور حریص نہیں ہوتا، بلکہ قناعت کی زندگی گزارتا ہے۔

۶۔ وہ متکبر نہیں ہوتا بلکہ متواضع، منکسر المزاج اور خاکسار ہوتا ہے کیوں کہ اس کی نظر میں دنیا کا مال ومتاع اور دنیا کی چیزیں اور دنیا کی عزت کوئی اہمیت نہیں رکھتی، ان چیزوں کا ہونا اور نہ ہونا اس کے

نزدیک برابر ہوتا ہے۔ اس لیے ان چیزوں کے وجود سے اس میں تکبر پیدا نہیں ہوتا اور اگر یہ چیزیں اس کے بجائے دوسروں کے پاس ہوں تو وہ دوسروں کے ساتھ حسد نہیں کرتا اور نہ ان سے جلتا ہے۔

۷۔ اس کے دل میں مال وجاہ کی محبت نہیں ہوتی۔ مال کی محبت کی علامتیں " حُبِّ مال " اور جاہ کی محبت کی علامتیں "حُبِّ جاہ" کے باب میں پڑھ لیجیے۔

۸۔ اس کی کوشش اور بھاگ دوڑ دنیا کے بجائے صرف آخرت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہوتی ہے۔

قناعت کسے کہتے ہیں؟

زہد کی علامتوں میں سے بعض علامتیں تو سمجھ میں آچکی ہوں گی، البتہ ان میں تکبر، حسد اور قناعت کا ذکر ہے جو قدرے تفصیل چاہتے ہیں۔ ان میں سے قناعت کو ذکر کیا جاتا ہے، تکبر کا بیان گذر چکا ہے اور حسد کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ مناسب جگہ میں بیان کی جائے گی۔ اب قناعت کے معنی سمجھ لیجیے۔

قناعت کے معنی ہیں کہ جو کچھ حصہ (یا قسمت) میں آئے اس پر صبر کرکے راضی رہنا (یعنی اس سے زیادہ کی حرص ولالچ نہ کرنا)۔ دنیا کے بارے میں قناعت کا مطلب یہ ہوا کہ بقدرِ ضرورت جس قدر دنیوی مال ومتاع اس کو کوشش وغیرہ کے نتیجے میں میسر آئے اور جو کچھ حصہ اس کو مل جائے اس پر صبر کرکے اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش رہتا ہے۔ وہ اس سے زیادہ کی حرص ولالچ میں گرفتار نہیں ہوتا اور نہ اپنے سے زیادہ آسودہ حال اور عزت والے لوگوں سے حسد کرتا ہے، نیز قناعت کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کو جو صورت بھی پیش آئے، صحت مند، قوت والا، اولاد والا ہونا یا نہ ہونا وغیرہ جیسی ہر تقدیر وتقسیم پر راضی ہوتا ہے اور اس کا نفس کبھی ناممکنات کی طلب کے درپے نہیں ہوتا۔

غرض یہ کہ قانع شخص اللہ تعالیٰ کی تقدیر وتقسیم اور دنیاوی نتائج کو صبر وشکر اور خوشی سے قبول کرلیتا ہے۔ قناعت کی ضد حرص ولالچ ہے۔

قناعت کی علامتیں

۱۔ قانع شخص چوری، ڈاکہ، حرام خوری، حرص اور لالچ سے پاک ہوتا ہے۔

۲۔ خود دار ہوتا ہے، کسی کے سامنے ذلیل ہو کر دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔

۳۔ جو کچھ بقدرِ ضرورت اس کو مل جاتا ہے اس پر اکتفا کرتا ہے اور اس پر خوش ہوتا ہے۔

۴۔ وہ لوگوں سے طمع نہیں رکھتا۔

۵۔ وہ اپنے سے آسودہ حال، دولت منداور عزت مند لوگوں سے جلتا نہیں۔

۶۔ اپنے مؤقف پر ڈٹ جانے والا ہوتا ہے۔

زہد و قناعت کا اندرونی عمل

زہد و قناعت انسان کے اندر مستعدی پیدا کرتا ہے، احساس و ضمیر کو زندہ رکھتا ہے اور پوشیدہ طاقتوں کو ابھارتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان میں وہ عظیم صلاحیتیں بیدار ہوتی اور بڑھتی ہیں جن کی وجہ سے انسان عظیم کارنامے سرانجام دیتا ہے اور آخرت کی دائمی زندگی کو بہترین بنالیتا ہے۔ اس کے برعکس عیش وآرام پرستی، ضمیر واحساس کی شدت کو کند کرکے فراست سے محروم کردیتی ہے، روح کو کمزور کرتی اور سُلادیتی ہے اور دل کو زنگ آلود اور مردہ کردیتی ہے۔

زہد میں افراط و تفریط

آج کل جس طرح دوسرے دینی امور میں سخت افراط و تفریط آچکی ہے اور حق کو باطل سے ملاکر باطل کو حق قرار دیا جاتا ہے، اسی طرح زہد کے بارے میں بھی یہ افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ بعض تو اس معاملہ میں اس قدر بڑھ گئے کہ رہبانیت (جو شریعتِ مطہرہ میں ممنوع ہے) کو زہد کا نام دینے لگیں اور بعض نے زہد کا حلیہ ایسا بگاڑا کہ خالص دنیا پرستی کو عین زہد باور کرانے لگیں۔ انہوں نے قرآن وحدیث کی تعلیم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم واسلاف کی زندگی نظر انداز کرکے اپنی دنیا پرستی کی دلیل کے لیے کچھ روایتیں ڈھونڈھ نکالیں جن کی وہ اپنا من مانا مفہوم بناکر دنیا پرستی کو عین زہد اور زہد کو رہبانیت قرار دیتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ وہ کون سی رہبانیت ہے جو شریعتِ مطہرہ میں ممنوع ومذموم ہے؟ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کیسی تھی؟ نیز یہ کہ کیا وقتی خلوت اور اعتکاف وغیرہ جیسے امور شریعتِ مطہرہ میں محمود ومطلوب ہیں یا مکروہ؟

رہبانیت کیا ہے؟

"رہب" عربی میں خوف اور ڈر کو کہتے ہیں اور رہبانیت اُس مسلک اور طرزِ حیات کو کہتے ہیں جس کی بنیاد خوف اور ڈر پر ہو۔ اصطلاح میں دنیا کی لذتوں اور حلال و پاکیزہ چیزوں کو عبادت کی نیت سے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا رہبانیت کہلاتا ہے۔

رہبانیت کی ابتدا

جب شر و فساد، ظلم واستبداد اور سرکشی اس درجہ بڑھ جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی جان اور ایمان خطرے میں پڑ جائے تو ایسی صورت میں اگرچہ عزیمت اور بڑی مردانگی کی بات تو یہ ہے کہ کلمۂ حق پر پہاڑ کی طرح جم کر رہا جائے اور باطل کے طوفان کے ساتھ ٹکرلی جائے، لیکن ایسی عظیم شخصیتیں زیادہ تعداد میں نہیں ہوتیں اور عام لوگ اتنی عظیم قربانی والے نہیں ہوتے۔ تاہم پھر بھی ایسے سخت جابرانہ، ظالمانہ، بدکارانہ اور بے ایمان ماحول و معاشرہ میں بعض لوگ اتنی ہمت کرلیتے ہیں کہ وہ لوگوں کے ساتھ بے ایمانی وغیرہ میں شریک نہیں ہوتے اور اس خطرے کی وجہ سے کہ ان کو کہیں بے ایمانی وغیرہ پر مجبور نہ کیا جائے وہ ایسی اضطراری اور سخت مجبوری کی صورت میں لوگوں کو بالکل چھوڑ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں مثلاً جنگل میں چلے جاتے ہیں یا کہیں گوشہ نشین ہو جاتے ہیں تو یہ بھی ان کی ہمت ہوتی ہے اور ایسی مجبوری اور اضطراری حالت میں اگرچہ عزیمت مقابلہ اور ڈٹ جانے میں ہے، لیکن دوسرے درجہ پر یہی کچھ ہو سکتا ہے کہ فساق وفجار، ظالموں اور بدکاروں کو چھوڑا جائے اور ان سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔

یہ رخصت صرف پہلوں کے لیے نہ تھی، بلکہ یہ تعلیم تو اسلام میں بھی ہے جو کہ ابدی بھی ہے اور تمام جہانوں کے لیے بھی۔ چناں چہ جب حالات اس درجہ نازک ہو جائیں کہ لوگوں کے ساتھ رہنے کی صورت میں جان دینی پڑے یا باطل پر مجبور ہونا پڑے تو ایسی صورت میں یہ جائز اور رخصت ہے کہ کوئی اپنے دین وایمان کی حفاظت کے لیے دنیا کے علائق سے کٹ کر عزلت نشینی اور جدائی اختیار کرلے۔ جب یہ بات سمجھ آگئی تو اب رہبانیت کی ابتدا کو پڑھ لیجیے۔

حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کے بعد جب بنی اسرائیلیوں اور بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں بے دینی، بے ایمانی، ظلم واستبداد اور تشدد اس قدر بڑھ گیا کہ ان مظالم اور بدکاریوں سے روکنے والوں کو بھی قتل کیا جانے لگا، تو ایسے سخت اور نازک وقت میں بعض دیندار عیسائیوں نے لوگوں سے کنارہ کش ہو کر پہاڑوں وغیرہ میں سکونت اختیار کی۔ اصحابِ کہف کا مشہور و معروف واقعہ ہے جس کا بیان قرآن مجید میں موجود ہے، وہ بھی ان لوگوں میں سے تھے جو ظالموں اور جابروں سے تنگ آکر پہاڑ کے غار میں رہنے پر مجبور ہو گئے تھے اور یہ وقت کے لحاظ سے جائز اور مناسب عمل تھا کیوں کہ انہوں نے تو یہ سب کچھ دین کی حفاظت کی خاطر کیا تھا، لیکن ان کے بعد آنے والے لوگوں نے بلا مجبوری کے کنارہ کشی کے ساتھ دوسری چیزوں کو بھی شامل کر کے مسلکِ رہبانیت کی ایک مستقل بنیاد ڈالی۔ ان کے مسلکِ رہبانیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے اوپر یہ لازم کر دیا کہ دنیا کی تمام جائز لذتیں اور راحتیں چھوڑ دی جائیں، نہ نکاح کیا جائے نہ اچھا لباس پہنا جائے نہ ماں باپ وغیرہ جیسے رشتہ داروں سے تعلق و محبت رکھی جائے، نہ رہنے سہنے کے لیے مکان اور گھر کا اہتمام کیا جائے، بلکہ لوگوں سے دور کسی پہاڑ وغیرہ میں زندگی بسر کی جائے یا خانہ بدوشوں کی طرح اپنی زندگی سیاحت میں گزار دی جائے۔

رہبانیت میں مزید تشدد اور غلو

یوں جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس رہبانیت میں کچھ اور اضافے کیے گئے اور لوگوں نے اپنے اوپر اور پابندیوں کا اس قدر بوجھ لاد لیا کہ بالآخر وہ اس کو نباہ نہ سکے، چناں چہ انہوں نے روحانی مدارج طے کرنے کے لیے اول شرط یہ رکھی کہ ازدواجی زندگی کو خیر باد کہا جائے۔ ماں باپ، بہن بھائی اور اولاد وغیرہ کے ساتھ مرتے دم تک کسی قسم کا تعلق نہ رکھا جائے، نہ ان کے ساتھ ملاقات کی جائے اور نہ ان کو اپنا چہرہ دکھایا جائے، نیز یہ کہ میلا کچیلا پراگندہ حال ہو، نہ صفائی کا اہتمام کیا جائے نہ اچھے لباس کا استعمال، نہ عطر و خوشبو استعمال کی جائے اور نہ عمدہ طعام کھایا جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ جان کو بلاوجہ سخت سے سخت تکلیف پہنچانے کو روحانی ترقی کا واحد راستہ سمجھتے تھے۔ ان میں کوئی سخت سردی میں اپنے جسم کو ننگا کرتا، کوئی سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا یا سالہا سال تک بیٹھا رہتا تھا اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا۔

اسی طرح اپنی جانوں کو مختلف قسم کی تکلیفیں دینے کو وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور روحانی ترقیات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ لیکن انسانی فطرت کے ساتھ جنگ کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ان کے کلیسا کا نظام حرام کاری کے اڈوں میں تبدیل ہو گیا اور جس قدر دنیا پرستی اور مال وجاہ کی پرستش اس نظام کے اپنانے والوں کی اکثریت کے اندر آگئی تھی وہ اس نظام سے باہر نہیں پائی جاتی تھی۔ قرآن مجید نے جگہ جگہ اس نظام ومسلک کو اپنانے والوں کا ذکر فرمایا ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض رہبانوں یعنی پادریوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

یعنی ”(غیر مسلموں میں سے) تمام لوگوں سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی رکھنے میں یہود ومشرکین کو پاؤ گے، اور تم مسلمانوں کے ساتھ دوستی میں (دوسرے غیر مسلموں کی بہ نسبت) قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ (یعنی عیسائی) ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں علما اور رہبان (یعنی تارک الدنیا درویش) موجود ہیں اور اس لیے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔“ (سورۃ المائدہ: آیت ۸۲)

مذکورہ بالا آیت میں نصاریٰ کے بعض علما اور بعض اچھے تارک الدنیا درویش راہبوں کی مدح فرمائی گئی ہے کہ ان میں تکبر نہیں اس لیے وہ حق پرستی اور اسلام دوستی میں دوسرے غیر مسلموں سے زیادہ مسلمانوں کے قریب ہیں اور ان میں دوسروں کی بہ نسبت حق اور اسلام کی دشمنی کم پائی جاتی ہے، اس لیے وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حق اور اسلام کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

اور ایک دوسری جگہ بعض راہبوں کی کمزوری کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ

یعنی ”بہت سے عالم راہب لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ (یعنی دینِ اسلام سے) سے روکتے ہیں۔“ (سورۃ التوبہ: آیت ۳۴)

نیز قرآن مجید ایک جگہ رہبانیت اور اس مسلک کو اختیار کرنے والے راہبوں کے متعلق بیان فرماتا ہے کہ:

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةَ ِۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۞

یعنی "پھر ان کے بعد ہم یکے بعد دیگرے اپنے اور رسولوں کو بھیجتے رہے اور عیسیٰ ابن مریم کو بعد میں بھیجا اور اسے ہم نے انجیل دی اور جن لوگوں نے ان کی اتباع اختیار کی تھی ان کے دلوں میں رحم ڈال دیا اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کی ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا مگر انہوں نے رضائے الٰہی کو حاصل کرنے کے لیے اسے اختیار کیا تھا اور پھر (ان راہبوں میں زیادہ تر لوگ ایسے ہوگئے کہ) وہ اس کو (یعنی رہبانیت کو جو انہوں نے خود ایجاد کر کے اپنے اوپر لازم کرلی تھی) نباہ نہ سکے جیسے کہ اس کے نباہنے کا حق تھا، تو ان میں سے جو ایمان لائے تھے ہم نے انہیں ان کا اجر دے دیا اور ان میں اکثر فاسق (فاجر اور نافرمان) ہیں۔" (سورۃ الحدید: آیت ۲۷)

اسلام فطری دین ہے، اس میں نصاریٰ کی طرح رہبانیت کی گنجائش نہیں

اسلام ایک فطری اور تمام دنیا کے لیے ابدی دین اور ضابطۂ حیات ہے۔ اس نے ہر معاملہ میں صحیح توازن وتناسب کے ساتھ اعتدال کا راستہ بتلایا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت، نماز ونوافل وغیرہ کی خوب ترغیب دی، خواہشاتِ نفس کی پیروی سے سختی سے روکا، دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں غرق ہونے سے منع فرمایا، لیکن اسلام نے نفس کُشی اور روحانی ترقی کے اس طریقہ سے منع کردیا جو عیسائیوں نے ایجاد کردیا تھا اور جس کا نام رہبانیت ہے۔ اسلام نے بتلادیا کہ ازدواجی زندگی اور شادی اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان رکاوٹ نہیں اور نہ کھیتی باڑی، تجارت اور صنعت وغیرہ روحانی ترقی میں رخنہ پیدا کرتی ہیں، بلکہ ان ساری چیزوں کو سچائی سے اختیار کرنے اور نباہنے کی ترغیب دی اور صفائی وطہارت کو ایمان کا جز قرار دیا۔ ماں باپ، بہن بھائیوں، اور بیوی بچوں کے حقوق کی ادائیگی کو لازم کردیا بلکہ اس نے تو ہر

انسان پر یہ بھی فرض کیا کہ وہ اپنی جان کا حق بھی ادا کرے اور اسے ایسی ریاضتوں اور ایسی مشقتوں میں مبتلا نہ کرے جو صحت کے لیے مضر اور نقصان دہ ہوں۔

ناجائز رہبانیت کی ممانعت قرآن مجید کی رو سے

چناں چہ قرآن مجید نے صفائی اور طہارت پر خوب زور دیا ہے، نیز جائز لذتوں اور راحتوں کے متعلق قرآن مجید کا بیان یہ ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝

یعنی ”اے ایمان والو! ان ستھری اور پاک چیزوں کو حرام نہ کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں، اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اور جو کچھ حلال اور پاکیزہ رزق اللہ تعالیٰ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ (اور پیو) اور اس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔“ (سورۃ المائدہ: آیت ۸۷ تا ۸۸)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۝ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝

یعنی ”اے آدم کی اولاد! ہر نماز کے وقت (یعنی ہر عبادت کے موقع پر، خواہ نماز ہو یا طواف وغیرہ) اپنا لباس پہن لیا کرو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ حد (یعنی حدودِ شرعی) سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ آپ فرما دیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی اس زینت (یعنی لباس وغیرہ) کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہے، کس نے حرام کیا ہے؟ اور (کس نے اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی) پاکیزہ

(اور لذیذ) کھانوں کو (حرام کر دیا ہے)؟ آپ فرما دیجیے: یہ (ساری پاک حلال) چیزیں (اس) دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز (تو ساری نعمتیں) خاص (مسلمانوں کے لیے) ہوں گی، یونہی ہم آیتوں کو ان لوگوں کے لیے مفصل (کھول کر) بیان کرتے ہیں جو جاننے والے ہیں۔"
(سورۃ الاعراف: آیت ۳۱ تا ۳۲)

مذکورہ بالا آیتوں میں غور کریں، ان سے صاف صاف جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ دنیا کی ساری جائز زینتیں اور ساری حلال، پاکیزہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، تاکہ وہ صبر و شکر کے ساتھ دنیا کی چیزوں کو ٹھیک اور مناسب طریقہ سے استعمال کر کے ان سے فائدہ اٹھا سکیں، تاکہ ان چیزوں میں اور باہمی تعلقات میں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات، اس کی حدود اور اس کے عائد کردہ حقوق کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ کی بندگی کو کامل طریقے پر اپنا سکیں، بلکہ دنیا میں جو نعمتیں ہیں وہ بھی حقیقت کے اعتبار سے مسلمانوں اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور شکر گزار بندوں کے لیے ہی پیدا ہوئی ہیں، لیکن چوں کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے آزمانا ہے اس لیے تمام لوگ خواہ کافر ہوں یا مسلمان، فرمانبردار ہوں یا نافرمان؛ سب کے سب ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور آخرت میں تو ساری خالص پاکیزہ نعمتیں صرف اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں اور مسلمانوں کے لیے ہوں گی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کی رو سے جائز زینت اور حلال، پاکیزہ اور عمدہ چیزوں کو بلا کسی ضرورت کے خواہ مخواہ چھوڑنا کوئی نیکی نہیں، اور نہ دنیا کی جائز چیزوں کا استعمال روحانی ترقی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول میں رکاوٹ بنتا ہے، البتہ روحانی ترقی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول میں رکاوٹ اور خلل ڈالنے والی چیز، دنیا کی چیزوں کا نامناسب استعمال اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کرنا ہے۔

رہبانیت کی ممانعت رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور عمل کی رو سے

قرآن مجید کی چند آیتوں کے بعد نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور آپ ﷺ کے عمل (جو کہ قرآن مجید کی تشریح اور اس کا بیان ہے) کو بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ یہ بات خوب واضح ہو جائے کہ اسلام میں عیسائی رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔

۱۔ حضرت جابر صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ایک پراگندہ آدمی پر پڑی جس کے سر کے بال بالکل منتشر تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَمَا کَانَ یَجِدُ ھٰذا مَا یُسَکِّنُ بِہٖ رَأْسَہٗ "کیا یہ آدمی کوئی ایسی چیز نہیں پا سکتا جس سے اپنے سر کے بال ٹھیک کر لیتا؟"

نیز اسی مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور آدمی کو دیکھا جو بہت میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا تو اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ: اَمَا کَانَ یَجِدُ ھٰذا مَا یَغْسِلُ بِہٖ ثَوْبَہٗ "کیا اس آدمی کو ایسی کوئی چیز نہیں مل سکتی جس سے یہ اپنے کپڑے دھو کر صاف کر لیتا؟" (مسند احمد ونسائی)

۲۔ عطاء بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی مسجد میں آیا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس کو اشارہ فرمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے سر اور داڑھی کے بالوں کو ٹھیک کر آئے، لہٰذا اس نے ایسا ہی کیا اور (سر اور داڑھی کو ٹھیک کر کے) پھر لوٹ کر آ گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلَیْسَ ھٰذَا خَیْرٌ مِنْ اَنْ یَّاتِیَ اَحَدُ کُمْ وَھُوَ ثَائِرُ الرَّأسِ کَاَنَّہٗ شَیْطَانٌ "کیا یہ (تمہارا سر اور داڑھی کے بالوں کو ٹھیک کر کے آنا) اس سے بہتر نہیں کہ تم میں سے کوئی پراگندہ بال ایسی (بدنما اور قبیح) صورت میں آئے کہ گویا وہ شیطان ہے۔" (موطا امام مالک)

۳۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ: "معلوم ہو چکا ہے کہ تم نے یہ معمول بنا رکھا ہے کہ تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور رات بھر نوافل پڑھتے ہو۔" میں نے عرض کیا کہ: "ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! (ایسا ہی کرتا ہوں)" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ طریقہ چھوڑ دو، روزے بھی رکھا کرو اور ناغہ بھی کیا کرو، اسی طرح رات کو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو، کیوں کہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتیوں اور مہمانوں کا بھی تم پر حق ہے (اور یہ تمہارے لیے جائز نہیں کہ جن جن کا حق تجھ پر عائد ہوتا ہے ان کی حق تلفی کر کے سارا دن اور ساری رات نماز اور روزے میں مشغول رہو اور یاد رکھو) جو ہمیشہ روزے رکھتا ہے اس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں، ہر مہینہ میں تین دن کے نفلی روزے رکھ لینا ہمیشہ

روزہ رکھنے کے حکم میں ہے اس لیے تم ہر مہینے میں تین روزے رکھا کرو اور مہینے میں ایک قرآن مجید (تہجد میں) ختم کرلیا کرو۔“

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ:

” میں تو اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں (اس لیے زیادہ کی اجازت دے دی جائے)۔“

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

” تو پھر تم داؤد علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے روزوں کا طریقہ اختیار کرلو اور وہ یہ کہ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار (یعنی روزہ نہ رکھا) کرو اور سات راتوں میں ایک قرآن مجید ختم کرلیا کرو اور اس سے زیادہ نہ کرو۔“ (بخاری ومسلم)

۴۔ تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا کہ ان میں سے ایک نے ہمیشہ ساری رات نماز پڑھنے کا اور دوسرے نے ہمیشہ روزہ رکھنے کا اور تیسرے نے ہمیشہ نکاح سے پرہیز کرنے کا عہد کرلیا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ: ” تم لوگوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟“ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اَمَا وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ

وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ

”خبردار! میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سے زیادہ متقی ہوں (لیکن اس کے باوجود) میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار (یعنی روزے میں ناغہ) بھی کرتا ہوں، (رات میں تہجد کی) نماز بھی پڑھتا ہوں اور (رات کو) سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہی میرا طریقہ ہے لہٰذا) جو شخص میرے طریقہ سے انحراف کرتا ہے وہ مجھ سے نہیں (یعنی میری جماعت میں سے نہیں)۔“

(دیکھیے مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم)

نیز حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا کہ وہ سارا دن اور ساری رات عبادت میں مشغول رہتے ہیں، بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزہ رکھتے ہیں رات کو سوتے نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بلا کر پوچھا: کیوں عثمان! تم میرے طریقے سے ہٹ گئے ہو؟ انہوں نے

عرض کیا: اللہ تعالیٰ کی قسم! میں نہیں ہٹا ہوں، آپ کے طریقہ کا طلب گار ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں سوتا بھی ہوں اور رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار (یعنی روزے میں ناغہ) بھی کرتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، اے عثمان! اللہ تعالیٰ سے ڈرو کہ تمہارے اہل وعیال کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تم (نفلی) روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو، (رات کو) نماز بھی پڑھو اور (رات کو) سوؤ بھی۔ (دیکھیے ابوداؤد: کتاب الصلوٰۃ)

۵۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ فَيُشَدِّدَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ فَيُشَدَّدُ عَلَيْهِمْ

فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ

”تم اپنے اوپر سختی نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر سختی کرے گا، ایک قوم (یعنی بنی اسرائیل) نے اپنے اوپر یہی تشدد اور سختی کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر تشدد اور سختی کی (اور آج بھی) ان کے بقایا راہب خانوں اور کنیسوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کی تھی ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی۔“ (ابوداؤد)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ غیر شرعی اور غیر فطری مشقتوں میں اپنی جانوں کو مبتلا نہ کرو ورنہ پکڑے جاؤ گے جیسا کہ بنی اسرائیل نے اختیار کر کے رہبانیت اور سخت مشقتوں میں اپنے آپ کو مبتلا کیا، بالآخر ان کو نباہ نہ سکے اور پکڑے گئے۔ لہٰذا شرعی حدود کے اندر اندر اپنی زندگی گزارو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے جو فرائض اور حدود مقرر کیے ہیں ان کی پابندی کرو۔ اپنی طرف سے ریاضتوں اور مشقتوں کو ایجاد کر کے اپنے آپ کو بلاوجہ سختی اور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں نہ ڈالو۔

۶۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھ کو خصی (نامرد) ہونے کی اجازت دیجیے (تاکہ گناہوں کا خدشہ بھی نہ رہے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو (لوگوں کو) خصی کرتا ہے یا خود خصی بن جاتا ہے، بلکہ میری اُمت کے لیے خصی ہونا روزہ رکھنا ہے (کیوں کہ روزہ رکھنے سے نفس اور خواہشات قابو میں ہو جاتے ہیں)۔ انہوں نے پھر عرض کیا: مجھے سیر وسیاحت کی اجازت دے دی جائے (جیسا کہ بعض فقیر اور درویش لوگ ہمیشہ پھرتے رہتے ہیں)

تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: میری اُمت کی سیاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا جائے۔ انہوں نے تیسری بار پھر عرض کیا: مجھے یہ اجازت دیجیے کہ رہبانیت کو اختیار کر لوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: میری امت کی رہبانیت یہ ہے کہ مسجدوں میں نماز کے انتظار میں بیٹھا جائے۔“

(دیکھیے مشکوٰۃ: باب المساجد)

۷۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک لشکر میں تھے تو ایک آدمی ایک غار کے پاس سے گزرا، وہاں کچھ پانی اور سبزی (بھی) تھی تو اس شخص کے دل میں یہ خیال گزرا کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر اسی جگہ ٹھکانا بنائے۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ بِالْیَھُوْدِیَّةِ وَلَا بِالنَّصْرَانِیَّةِ وَلٰکِنِّیْ بُعِثْتُ بِالْحَنِیْفِیَّةِ السَّمْحَةِ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَغَدْوَةٌ اَوْ رَوْحَةٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ خَیْرٌ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا وَلَمَقَامُ اَحَدِکُمْ فِی الصَّفِّ خَیْرٌ مِنْ صَلٰوتِهٖ سِتِّیْنَ سَنَةً

”(یاد رکھو!) نہ تو میں یہودیت کے ساتھ (اس دنیا میں) بھیجا گیا ہوں اور نہ عیسائیت کے ساتھ (کہ میں تمہیں رہبانیت کی تعلیم دوں) بلکہ میں تو ایک سیدھا آسان دین حنیف لے کر آیا ہوں، اور قسم ہے اس پاک ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، دن کے صرف ابتدائی یا آخری حصے میں (یعنی صبح و شام) کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد) میں چلے جانا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے، اور تم میں سے کسی کا (میدان جنگ کی) صف میں کھڑا ہونا اس کی ساٹھ سال کی پڑھی جانے والی نماز سے بہتر ہے۔“

(مشکوٰۃ ج ۲/ ۱۱۵)

۸۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ: اِنَّ الرَّھْبَانِیَّةَ لَمْ تُکْتَبْ عَلَیْنَا ”بے شک رہبانیت ہم پر فرض نہیں کی گئی ہے۔“ (مسند احمد: ج ۶، ص نمبر ۲۲۶)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ: لِکُلِّ نَبِیٍّ رَھْبَانِیَّةٌ وَرَھْبَانِیَّةُ ھٰذِہِ الْاُمَّةِ الْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ”یعنی ہر نبی کے لیے ایک (طرح) کی رہبانیت ہوتی ہے اور اس امت (یعنی امت مسلمہ) کی رہبانیت اللہ عزوجل شانہ کی راہ میں جہاد ہے۔“ (مسند احمد، الفتح الربانی: ج ۱۴، ص ۶)

ایک روایت میں لِکُلِّ نَبِیٍّ رَھبَانِیَّۃ کے بجائے لِکُلِّ اُمَّۃٍ رَھبَانِیَّۃ ہے یعنی ہر اُمت کے لیے ایک (قسم کی) رہبانیت ہوتی ہے اور میری اُمت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ امتِ مسلمہ روحانی ترقی کے لیے عیسائیوں کی طرح جان بچانے اور مصیبتوں سے بچنے کی خاطر رہبانیت کو اختیار نہیں کرتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتی ہے، اور اُمتِ مسلمہ فتنوں اور مصیبتوں سے گھبرا کر لوگوں سے نہیں بھاگتی، بلکہ ان کے ساتھ مقابلہ کر کے حق کا بول بالا کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ میں مجاہدہ اور مشقت بھی ہوتی ہے، حق کا بول بالا بھی اور روحانی ترقی بھی، بلکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان جب میدانِ جہاد کی طرف قدم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے نفس، اپنے اہل وعیال اور ہر قسم کی دنیاوی لذتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اُس وقت اُس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اس لیے اس وقت اس کی وہ روحانی ترقی ہوتی ہے جو کسی دوسرے عمل سے نہیں ہوتی۔

مذکورہ بالا قرآن مجید کی آیتوں اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور آپ ﷺ کے طریقۂ حیات سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے طالبوں اور ان سے محبت رکھنے والوں کو اپنی صورت اور لباس وغیرہ سے بے پروائی ہوتی ہے، وہ میلے کچیلے پراگندہ ہوتے ہیں اور جنگلوں میں رہتے ہیں یا مخلوق سے کٹ کر ہمیشہ کے لیے خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں۔ صفائی ستھرائی، خوبصورت لباس پہننا، لوگوں سے ملنا جلنا اور حسنِ معاشرت وغیرہ گویا یہ سب کے سب دنیاداری کے کام ہیں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں اور ایسی سوچ وفکر رکھتے ہیں وہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی تعلیم وہدایت اور دینِ اسلام کے مزاج سے ناواقف ہیں۔

نبی کریم ﷺ سر مبارک میں تیل لگاتے تھے، عطر کے ساتھ محبت تھی، معطر وجود اور عطر سے زیادہ خوشبودار پسینے کے باوجود عطر کثرت سے استعمال فرماتے تھے، آنکھوں مبارک میں سرمہ لگاتے تھے، صاف ستھرا رہتے تھے، اگر عمدہ کھانا ملتا تو تناول فرماتے، عمدہ لباس میسر آجاتا تو پہن لیتے، متعدد شادیاں کیں اور ازواجِ مطہرات کے حقوق کا پورا خیال رکھا۔ یہی انسانیت کا کمال ہے کہ دنیا والوں سے تعلق رکھا جائے اور ہر حق دار کا حق اچھی طرح ادا کیا جائے، نہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کوتاہی کی جائے اور

نہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض اور حقوق میں کسی طرح کا نقص آنے پائے۔ بے دینی اور ظلم کا سیلاب آجائے تو بھی حق پر جم کر رہا جائے اور ہر باطل کے سامنے سینہ سپر رہا جائے اور باطل کو ختم کرنے اور حق کا بول بالا کرنے میں اپنی جان ومال کی بازی لگائی جائے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے لوگوں کو پوری بندگی کی ترغیب دی ہے جس میں عبادات اور حقوق العباد وغیرہ سب کے سب شامل ہیں (اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے)، اور اسلام نے نفلی نمازوں، روزوں اور کسی قدر خلوت واعتکاف کی ترغیب بھی دے دی ہے، اور نفسانی خواہشات کی پیروی سے بھی روکا ہے، لیکن ترکِ دنیا اور نفس کشی کے اس طریقے کو ممنوع قرار دیا جو عیسائی رہبانیت کا خاصہ ہے۔ عیسائی رہبانیت ایک ایسی چیز ہے جس کو اختیار کرنے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی اور معاشرے کا شیرازہ بکھر جائے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ حقوق وفرائض میں کوتاہی ہوگی، اللہ تعالیٰ کی بندگی کا جو اصل حق ہے وہ ادا نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی نہ رہے گی۔

پچھلے صفحات میں جو کچھ گزر گیا وہ اس لیے لکھا گیا کہ یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اسلام میں عیسائی رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کی غلطی کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے مذکورہ بالا حدیثوں اور اس طرح کی اور روایات کو جمع کر کے اسلام کو ایسے رنگ میں پیش کیا کہ گویا اسلام میں زہد کا کوئی تصور ہی نہیں، چناں چہ جو بھی اپنی اصلاح کی خاطر وقتی طور پر لوگوں سے کٹ کر خلوت میں بیٹھ گیا، یا جس نے نفلی روزے رکھنے شروع کیے، یا اعتکاف کیا تو اس پر رہبانیت کی مہر لگا دی۔

یہ لوگ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ (اسلام میں رہبانیت نہیں) کی غلط تعبیر کر کے اس کی آڑ میں غیر اسلامی لباس، وضع قطع اور خالص دنیا پرستی کو عینِ اسلام اور روحِ اسلام باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں، اور آج کل یہ فتنہ عام ہو رہا ہے کہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی ایک روایت یا کسی غیر متعلقہ اور مجمل آیت کو ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور اس کے مقابلے میں قرآن مجید کی واضح آیتوں، صحیح اور واضح حدیثوں کو دریا برد کر دیتے ہیں، اس لیے یہاں خلوت، عزلت نشینی اور زہد وقناعت کے متعلق قرآن وحدیث میں سے بھی مختصر طور پر کچھ نقل کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

وقتی طور پر خلوت، عزلت نشینی اور نفلی عبادات

وقتی طور پر خلوت نشینی سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا اور نفلی نماز، نفلی روزوں اور اعتکاف کا پورا بیان نماز، روزہ اور اعتکاف کے باب میں موجود ہے، یہاں بھی بطورِ نمونہ کچھ نقل کیا جاتا ہے۔

روحانی ترقی اور خلوت و عزلت نشینی

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو عظیم شخصیتیں آچکی ہیں، جنہوں نے لوگوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور یاد سے گرمایا اور آشنا کیا، وہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے وقتی طور پر ابتدا میں خود گوشہ نشینی اختیار کی تھی، یا ان کو حکم ہوا تھا کہ وہ گوشہ نشینی اختیار کریں، یا ان کے ایسے حالات بنائے گئے تھے کہ وہ ایک عرصہ تک لوگوں کے اژدہام سے ایک طرف رہیں۔ اس کے متعلق چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے چند سال بکریاں چرائیں، پھر نزولِ تورات سے قبل ان کے متعلق قرآن مجید کا بیان ہے کہ: وَوٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَۃً وَّاَتۡمَمۡنٰهَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِیۡقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً یعنی "ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں (کی خلوت نشینی و گوشہ نشینی اور اعتکاف) کا وعدہ کیا تھا اور (پھر) دس راتیں بڑھا کر ان کو (چلہ) پورا کیا تو (اس طرح) اس کے رب کی میعاد چالیس راتیں پوری ہو گئیں۔" (سورۃ الاعراف: آیت ۱۴۲)

مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پر اپنا کلام نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس کے لیے یہ شرط لگائی کہ تیس رات، جو کہ پھر چالیس رات کر دی گئی، کوہِ طور پر آکر خلوت نشینی اور اعتکاف کریں تا کہ تمام لوگوں اور تمام مشاغل سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر میں وقت گزر جائے اور روح و دل کو وہ قوت و توانائی حاصل ہو جائے جو اس بارِ گراں کو اٹھانے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

۲۔ حضرت مریم علیہا السلام، جو ایک بہت ہی نیک عورت تھیں اور جن کے بطن کو اللہ تعالیٰ نے اس حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے چنا تھا جن کی پیدائش خلافِ عادت بن باپ کے ہوئی تھی اور جن کے پاس جبرئیل علیہ السلام کو آنا تھا اور انہوں نے روح بھی پھونکنی تھی، ان ساری چیزوں کے لیے بہت ہی

بڑی ہمت اور قوت درکار تھی۔ چوں کہ یہ بھی ایک بہت بڑا بارِ گراں تھا جس کو حضرت مریم علیہا السلام نے اٹھانا تھا، اس لیے اس کے لیے تکوینی طور پر پہلے سے بندوبست کیا گیا کہ پہلے اس کو ایک پیغمبر یعنی زکریا علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی تربیت میں دے دیا گیا جنہوں نے ان کو سب سے کاٹ کر گوشہ نشینی میں رکھا جیسا کہ قرآن مجید کا بیان ہے کہ: وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ "اور اُس (مریم) کی کفالت تو زکریا (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) نے کی، جب بھی اس (یعنی مریم کے پاس) زکریا (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) عبادت گاہ میں داخل ہوتے تو اس کے پاس کھانے کی چیزیں موجود پاتے۔ زکریا نے کہا: یہ تمہارے پاس کہاں سے آئیں؟ مریم نے کہا: یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔" (سورۃ آل عمران: آیت ۳۷)

اور جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ: وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ "اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے تجھے برگزیدہ کر دیا اور خوب پاک کر دیا ہے اور دنیا کی عورتوں کے مقابلہ میں تجھے منتخب کر لیا ہے۔"
(سورۃ آل عمران: آیت ۴۲)

نیز جبرئیل علیہ السلام نے آکر حضرت مریم علیہا السلام سے کہا: قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ "فرشتے نے کہا: میں تو تیرے پروردگار کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں (اور اس لیے نمودار ہوا ہوں) کہ تجھے ایک پاکیزہ فرزند عطا کر دوں۔" (سورہ مریم: آیت ۱۹)

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعثت سے پہلے غار حراء میں خلوت نشینی کو اختیار کیا تھا چناں چہ:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وحی سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سچے خوابوں کا سلسلہ شروع ہوا، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی خواب دیکھتے اُس کی سچائی اس طرح ہوتی جس طرح سپیدہ صبح نمودار ہوتا ہے، پھر خلوت اور عزلت نشینی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب کر دی گئی چناں چہ آپ غارِ حراء میں گوشہ نشین ہو کر کئی کئی رات تک عبادت میں مشغول رہتے اور ساتھ اپنے کھانے پینے کا سامان بھی لے جاتے (اور جب خورد و نوش کا سامان ختم ہو جاتا تو واپس حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آجاتے

اور اتنی ہی راتوں کے لیے پھر سامانِ خوردونوش لے جاتے، (یہی سلسلہ جاری رہا) حتی کہ آپ ﷺ کے پاس ایسے حال میں حق آگیا جب کہ آپ غارِ حراء میں (خلوت نشین) تھے، چناں چہ فرشتہ آپ ﷺ کے پاس آگیا اور آپ ﷺ سے کہا: اِقْرَأْ یعنی پڑھو۔ آپ ﷺ نے جواب میں کہا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر اس فرشتے (یعنی جبرئیل علیہ السلام) نے مجھے پکڑ لیا اور مجھے اس قدر بھینچا کہ میری طاقت انتہا کو پہنچ گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور کہا: اِقْرأ پڑھو۔ پھر میں نے جواب میں کہا: مَا أَنَا بِقَارِئٍ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر فرشتے نے مجھے پکڑا اور دبایا یہاں تک کہ اس کا دباؤ میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور مجھے کہا کہ اِقْرأ پڑھو، میں نے پھر جواب دیا مَا أَنَا بِقَارِئٍ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر اس نے مجھے پکڑا اور تیسری بار دبوچ لیا اور پھر چھوڑ کر کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۞ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۞ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۞ ”پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا عزت والا ہے۔“

یہ آیات لے کر آپ ﷺ گھر تشریف لے آئے۔ (دیکھیے صحیح بخاری، صحیح مسلم: کتاب الوحی)

مذکورہ بالا حدیث کا خلاصہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ پر پہلے سچے خوابوں کا سلسلہ شروع ہوا، پھر آپ ﷺ کی طبیعت مبارک میں یکسوئی اور الگ ہونے، تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر وفکر کا جذبہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے آپ ﷺ مسلسل کئی مہینے غارِ حراء میں خلوت نشینی اختیار کیے رہے اور اس حالت میں آپ ﷺ پر وحی کی ابتدا ہوئی۔

لہٰذا نبی کریم ﷺ کی طرزِ حیات اور مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ وقتی خلوت نشینی پسندیدہ ہے نہ کہ غیر پسندیدہ۔ جو لوگ جوشِ بیان میں یہ کہتے ہیں کہ غارِ حراء میں گوشہ نشینی اور خلوت گزینی اللہ تعالیٰ کو پسند نہ تھی اس لیے آپ کو حکم ہوا کہ يَآ اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۞ قُمْ فَاَنْذِرْ ۞ ”اے مدثر! اُٹھیے لوگوں کو ڈرائیے۔“ ان لوگوں کا یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے، آخر وہ اتنی سیدھی سادھی بات کو بھی نہ سوچ سکے کہ غارِ حراء میں پہلے ہی اِقْرأ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۞ اور اس کے بعد والی آیتیں نازل ہو چکی تھیں (جیسا کہ اس کا بیان اوپر والی حدیث میں موجود ہے) اور سورۃ مدثر تو بعد میں نازل

ہوئی، نیز وہ اس کو بھی نہیں دیکھتے کہ اگر غارِ حراء اور اس میں آپ ﷺ کی خلوت گزینی اللہ تعالیٰ کو پسند نہ ہوتی تو ایسی جگہ میں اللہ تعالیٰ اپنے اس عظیم، کامل، مکمل، ابدی اور عالمی ہدایت وکتاب کی ابتدا نہ فرماتے۔

جب ایسی جگہ میں ایک لمبی گوشہ نشینی کے بعد قرآن مجید جیسی عظیم کتاب کی ابتدا اور افتتاح بلا کسی تنبیہ کے بہت ہی محبت کے پیرائے میں کیا گیا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۝ تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کی یہ حالت پسند تھی نہ کہ غیر پسند، بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ خلوت نشینی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو محبوب کردی تھی جیسا کہ حدیث کے الفاظ ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ (پھر آپ کو خلوت نشینی محبوب کردی گئی) سے واضح ہے اور بالآخر یہی خلوت نشینی تھی جس کی وجہ سے خصائص اور ثمراتِ نبوت پوری طرح پک گئے اور آپ دائمی، ابدی اور عالمی نبوت کے بارِ گراں کو اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے، اس کی پوری تفصیل "وحی ورسالت" کے بیان میں لکھ چکا ہوں۔

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ وقتی طور پر گوشہ نشینی اور خلوت، شریعتِ مطہرہ میں ممنوع نہیں، بلکہ نبی کریم ﷺ نے خود بھی وقتی طور پر لمبی گوشہ نشینی اختیار کی تھی اور پھر اس لمبی گوشہ نشینی کے بعد ہمیشہ آپ ﷺ رات کی تہجد کا خوب اہتمام فرماتے تھے اور فرصت کے اوقات میں لوگوں سے الگ ہو کر عبادت میں مصروف ہو جاتے تھے، نیز مسلسل رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے اور اُمت کو بھی اعتکاف اور خصوصاً آخری عشرہ کے اعتکاف کی خوب ترغیب دی ہے۔

اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ خلوت گزینی اختیار کرے اور نہ میرا مطلب یہ ہے کہ بغیر خلوت گزینی کے روحانی ترقی ناممکن ہے کیوں کہ بعض لوگوں کی صحبت ایسی زود اثر اور مبارک ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ ملتے رہنے یا ان کے ساتھ رہتے ہوئے انسان کو وہ روحانی ترقی نصیب ہوتی ہے جو کسی اور مجاہدہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً نبی کریم ﷺ کی صحبتِ مبارکہ اور آپ ﷺ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت اور ان کے بعد دوسرے اولیائے کرام کی صحبت، بلکہ یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ اسلام میں یہ ممنوع نہیں کہ کچھ عرصہ کے لیے خلوت گزینی اور اعتکاف کو اختیار کیا جائے، تاکہ لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر کچھ عرصہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی

عبادت میں مشغول ہو اجائے اور خلوص اور احسانی کیفیت کو بڑھایا جائے، کیوں کہ یہی خلوص اور احسانی کیفیت اعمال کی روح ہے اور اسی کی وجہ سے اعمال کے اندر قوت آتی ہے، اس لیے جو شخص اعتکاف کرتا ہے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: هُوَ يَعْتَكِفُ الذُّنُوبَ وَيُجْرِيْ لَهُ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا" وہ (یعنی معتکف) گناہوں سے بچتا رہتا ہے اور اس کی نیکیوں کا حساب نیکیاں کرنے والے بندے کی طرح جاری رہتا ہے۔" (ابن ماجہ)

مطلب یہ کہ وہ مسجد میں خلوت گزینی کی وجہ سے گناہوں سے بچا رہتا ہے اور اس کے صحیفۂ اعمال میں وہ ساری نیکیاں لکھی جاتی ہیں جن کا وہ پہلے عادی تھا مثلاً مریضوں کی عیادت، یتیم اور بیوہ کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ اور تعلیم و تدریس وغیرہ جو یہ پہلے کرتا تھا لیکن اعتکاف کی وجہ سے مجبور ہو کر وہ ان اعمال کو نہیں کر سکتا تو یہ سارے اعمال اس کے لیے برابر لکھے جاتے ہیں کیوں کہ اس کے اس عملِ اعتکاف سے تمام اعمال میں خلوص اور احسانی کیفیت بڑھ جائے گی، جیسا کہ اس کا بیان کتاب الصوم[1] اعتکاف کے بیان میں گزر چکا ہے۔

حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ تبلیغی کام کو جدید طرز پر شروع کرنے سے پہلے خلوت گزینی کو پسند کرتے تھے اور تبلیغی مصروفیتوں کے باوجود بھی وقتی خلوت نشینی کا خوب اہتمام فرماتے تھے، چناں چہ حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ کے متعلق حالات میں لکھا گیا ہے کہ:

۱۔ گنگوہ کے قیام میں خانقاہ کی مسجد کے قریب ایک تنگ گلی میں جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ تھی گھنٹوں آنکھیں بند کیے مراقب رہتے تھے۔ (ذکر و اعتکاف کی اہمیت: ص ۱۱)

۲۔ بستی نظام الدین میں حضرت کے بڑے بھائی حضرت مولانا محمد صاحب کا قیام تھا۔ ان کی وفات کے بعد خاندانی محبین و معتقدین نے حضرت سے اصرار کیا کہ آپ نظام الدین میں قیام فرمالیں مگر حضرت نے اپنی آمد کو حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ کی اجازت سے معلق کیا۔ چناں چہ حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ کی اجازت و مشورہ کے مطابق نظام الدین میں قیام فرمایا۔ یہ زمانہ حضرت کے بڑے مجاہدے و ریاضت کا تھا۔ ہمایوں کے مقبرے کے شمال میں عبد الرحیم خان کے مقبرے اور حضرت مرزا مظہر جان

---

[1] کتاب الصوم ان شاء اللہ تعالیٰ عن قریب چھپ جائے گی۔ (زین)

جاناں رحمہ اللہ کے شیخ سید نور محمد بدایونی رحمہ اللہ کے مزار کے قریب پہروں خلوت میں رہتے، دوپہر کا کھانا وہیں چلا جاتا اور رات کا مکان میں آکر کھاتے، نماز سب وقتوں کی جماعت کے ساتھ پڑھتے جس کی صورت یہ ہوتی کہ چند طلبا نماز کے اوقات میں ایک ایک لوٹا پانی لے کر وہاں پہنچ جاتے، حضرت وضو وغیرہ کر کے باجماعت نماز پڑھتے، طلبا واپس آجاتے اور حضرت وہیں بیٹھے رہتے۔

یہ تو ابتدائی دور تھا لیکن تبلیغی کام شروع ہونے کے بعد ذکر کے اہتمام میں ذرا فرق نہیں آیا۔ حضرت شیخ زید مجدہم سے بارہا سنا کہ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اپنی شدت علالت سے پہلے تک دوازدہ تسبیح (سلسلہ چشتیہ کی بارہ تسبیح کا ذکر بالجہر) کا بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ماہ مبارک میں عصر کے بعد ذکر کرتے تھے، اس وقت پاس بیٹھنے والے کو بھی تراوٹ آجاتی تھی۔

(دیکھیے ذکر واعتکاف کی اہمیت: ص ۱۱)

حضرت مولانا خود فرماتے ہیں:

مجھے جب بھی میوات جانا ہوتا ہے تو ہمیشہ اہل خیر اور ذاکرین کے مجمع کے ساتھ جاتا ہوں، پھر بھی عموماً اختلاط سے قلب کی حالت اس قدر متغیر ہو جاتی ہے کہ جب تک اعتکاف کے ذریعہ اس کو غسل نہ دوں یا چند روز کے لیے سہارن پور (جہاں عربی مدرسہ اور اہل ذکر مشائخ کا ماحول ہے) یا رائے پور (جہاں ذکر وشغل کے لیے خانقاہ ہے) کے خاص مجمع اور خاص ماحول میں جاکر نہ رہوں قلب اپنی حالت پر نہیں آتا۔

دوسروں سے بھی کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ دین کے کام کرنے والوں کو چاہیے کہ گشت اور چلت پھرت کے طبعی اثرات کو خلوت کے ذکر وفکر کے ذریعہ دھویا کریں۔ اسی ملفوظ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت شیخ زید مجدہم نے ایک گرامی نامہ لکھوایا کہ جب شیخ المشائخ کا یہ حال تھا تو میرا تمہارا کیا حال ہوگا۔اس سے بھی بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں التباس پیدا ہوا۔ سلام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ اچھی طرح وضو کر کے نہیں آتے، ہماری نماز میں گڑبڑ کرتے ہیں۔

(ذکر واعتکاف کی اہمیت: ص نمبر ۱۶ تا ۱۷)

حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کے مفصل حالات اور ان کی دینی دعوت کی تفصیل کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ اور ان کی دینی دعوت" کا مطالعہ کریں۔

سخت مجبوری کے وقت لوگوں سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنا

وقتی طور پر خلوت نشینی کے جواز بلکہ مستحب ہونے میں تو کسی کا اختلاف نہیں، البتہ بغیر سخت مجبوری کے لوگوں سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنا اور دائمی طور پر خلوت نشینی اختیار کرنا اسلامی تعلیمات میں سے نہیں۔ ہاں دو صورتیں ایسی ہیں جن میں لوگوں سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنا صرف جائز نہیں بلکہ بہتر اور اچھا ہے۔ ایک صورت یہ کہ کسی شخص کا مزاج بہت ہی سخت ہو اور وہ لوگوں میں رہ کر لوگوں کو تکلیف پہنچاتا ہو، ایسے شخص کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ لوگوں سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارے۔ دوسری صورت یہ کہ فتنہ وفساد اس قدر بڑھ جائے کہ اس کی اصلاحِ حال سے وہ عاجز آجائے اور مقابلے کی ہمت نہ رہے، یا کوئی شخص طبعاً کمزور ہے تو ایسی صورت میں بھی اپنے دین وایمان کو اور اپنے آپ کو فتنہ وفساد میں مبتلا ہونے سے بچانے کی خاطر کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ اچھا ہے۔ ایسی صورتوں کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو پڑھ لیجیے:

۱۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی (یعنی بدوی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے بہتر شخص کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: رَجُلٌ جَاهَدَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ وَرَجُلٌ فِيْ شِعْبٍ مِّنَ الشِّعَابِ يَعْبُدُ رَبَّهٗ وَيَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهٖ "یعنی ایک تو وہ شخص جو اپنی جان ومال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قُربان کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے۔"

(صحیح بخاری: ج ۲، کتاب الرقاق، باب العزلہ راحۃ من خلاط السوء)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی دو قسمیں بتلائیں۔

ایک وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق اور یہ جذبہ عطا فرمایا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے بندوں کی خدمت کرنے اور ان کے ساتھ نیکی اور مہربانی کا برتاؤ کرنے اور ان کو راہِ راست پر لانے کی

کوشش کریں ، ایسے لوگوں کی ذمہ داری تو یہی ہے کہ وہ لوگوں میں رہ کر ان کے ساتھ بھلائی اور مہربانی کا معاملہ کریں اور اپنے مال و جان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر کے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کا مزاج بہت سخت ہے اور وہ لوگوں کے اژدہام میں رہ کر لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں ، ایسے لوگوں کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی میں ہے کہ لوگوں سے الگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں اپنا وقت خرچ کریں۔ ان کے اس طریقہ کار سے ایک تو خود ان لوگوں کو فائدہ ہو گا کہ ظلم اور لوگوں کی دل آزاری کے گناہ اور بے اطمینانی و بے چینی سے بچ جائیں گے اور دوسرا فائدہ لوگوں کو ہو گا کہ وہ ان کی ایذا رسانیوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

۲۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: يُوْشِكُ اَنْ يَّكُوْنَ خَيْرُ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَّتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِيْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ یعنی ”عنقریب (ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں) ایک مسلمان کے لیے بہترین مال بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جائے تا کہ وہ بھاگ کر اپنے دین و ایمان کو (فتنوں سے) بچا سکے۔“ (صحیح بخاری: ج ۲، کتاب الرقاق)

مطلب یہ ہے کہ جب معاشرہ زیادہ بگڑ جائے اور ایک شخص بذاتِ خود نیک اور صالح ہے لیکن اپنی طبعی کمزوری کی وجہ سے معاشرہ کی اصلاح پر قادر نہیں تو اس کے لیے بھی لوگوں سے الگ ہو کر زندگی گزارنا اچھا ہے۔

تو یہ تین قسم کے لوگ ہو گئے۔

۱۔ ایک وہ شخص جو برائیوں کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے اور جس کا وجود لوگوں کے لیے نفع مند ہے، ایسے شخص کو لوگوں کے اژدہام میں رہ کر ان کی خدمت اور ان کی اصلاح اور برائیوں کو مٹانے کا فریضہ بہر حال انجام دینا چاہیے۔ اُس کے لیے قطعاً یہ صحیح نہیں کہ وہ دائمی طور پر لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی گزارے۔

۲۔ وہ شخص جس کی سختی کی وجہ سے لوگوں کو فائدے کے بجائے نقصان زیادہ ہو اُس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ زندگی گزارے، تاکہ اپنے ضرر سے لوگوں کو بچا سکے۔

۳۔ وہ شخص جو خود نیک وصالح ہو، لیکن طبعاً کمزور ہو اور برے معاشرہ اور فتنہ وفساد کے وقت لوگوں کی اصلاح سے عاجز ہو تو ایسے شخص کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ وہ فساد کے وقت لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر زندگی گزارے، آخر کی تیسری اور دوسری دونوں صورتیں اگرچہ ان حضرات کے حق میں اچھی اور بہتر ہیں، لیکن بذاتِ خود یہ دونوں قسمیں کمزور اور ضعیف ہیں۔ دوسری قسم میں صبر وحلم کا فقدان ہے، جبکہ تیسری قسم اور صورت میں جرأت وشجاعت اور استقامت کی کمی اور فقدان ہے۔

اسلام سادگی، بے تکلفی اور زہد وقناعت کی تعلیم دیتا ہے

انسان کا وجود اس کا اپنا نہیں، بلکہ یہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایک امانت ہے۔ اس کی حفاظت انسان کا فرض ہے، چناں چہ جن چیزوں کے اختیار کرنے سے انسانی صحت تباہ ہو جاتی ہے ان کے چھوڑنے کو اور جو چیزیں انسان کی صحت وبقا کے لیے ضروری ہیں اُن کے اختیار کرنے کو دینِ اسلام نے لازم اور ضروری قرار دیا ہے۔

لہٰذا جو شخص باوجود قدرت کے کھانے پینے کی چیزوں کو اس طرح چھوڑ دے کہ جس کی وجہ سے وہ مر جائے یا اتنا کمزور ہو جائے کہ جو واجبات اور ذمہ داریاں شریعتِ مطہرہ کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں ان کو بھی وہ ادا نہ کر سکے تو یہ شخص دینِ اسلام کی رو سے مجرم اور سخت گناہ گار ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان صبح وشام کھانے پینے، لباس وغیرہ جیسی چیزوں کے دھندے میں لگا رہے اور کھانے پینے وغیرہ کو اپنا مقصد اولین بنالے اور اس کی پوری زندگی کا محور اور مدار یہی خوش خوراکی اور خوش لباسی بن کر رہ جائے۔ کھانے وغیرہ تو اس لیے ہیں کہ انسان کی صحت اور زندگی قائم رہے، تاکہ زندگی میں پوری قوت کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرے اور اس کے احکامات پورا کرے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی کا مقصد کھانا پینا اور لباس وغیرہ کو بنا کر پوری زندگی اس میں صرف کی جائے۔

کھانے پینے اور زینت وغیرہ میں اسراف ممنوع ہے

اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں لباس اور کھانے پینے کا حکم دیا ہے وہاں اسراف سے بھی روکا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ "کھاؤ پیو اور اسراف مت کرو۔ یادرکھو کہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

(سورۂ اعراف: آیت ۳۱)

اسراف کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے اور یہ اسراف کی تمام صورتوں کو شامل ہے۔ جائز اور حلال کی حد سے نکل کر ناجائز اور حرام کی حد میں پہنچنا اسراف ہے، حلال کو حرام کرنا اسراف ہے، کھانے پینے میں اعتدال کو چھوڑنا بھی اسراف ہے، مثلاً: سیر ہو جانے کے بعد بھی کھاتے رہنا یا فضول خرچی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہنا، بلکہ جس چیز کو بھی جی چاہے اس کو ضرور حاصل کر کے کھانا یہ بھی اسراف میں داخل ہے۔ چناں چہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ مِنَ السَّرَفِ اَنْ تَأْكُلَ كُلَّ مَا اشْتَهَيْتَ يعنی "بلاشبہ اسراف میں سے یہ بھی ہے کہ جس چیز کو بھی تیرا جی چاہے وہ (ضرور) کھائے۔" (سنن ابن ماجہ: ابواب الاطعمة)

تجاوز کی کئی قسمیں ہیں۔ قرآن مجید میں وَلَا تُسْرِفُوْا "اسراف مت کرو۔" کے چند حروف میں کھانے، پینے، لباس اور استعمال کی تمام چیزوں میں اسراف کی تمام قسموں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اسراف اور حد سے تجاوز کی صورتوں اور قسموں کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:

۱۔ پاک اور حلال سے تجاوز کر کے گندے اور حرام تک پہنچ جانا، یعنی جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع قرار دیا ہے ان کو کھانا، پینا اور استعمال کرنا اسراف میں داخل ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو بلا وجۂ شرعی حرام سمجھ کر چھوڑ دینا، ان دونوں صورتوں میں حد سے تجاوز کرنا اور ان کا حرمت اور جرم ہونا تو بالکل ظاہر ہے کہ پہلی صورت ممنوع اور حرام ہے اور دوسری صورت میں اللہ تعالیٰ کے قانون کی مخالفت ہے۔

۳۔ کھانے پینے اور استعمال کی دیگر چیزوں کو بلا وجہ ضائع کرنا، مثلاً: بچا ہوا سالن بلا وجہ پھینک کر ضائع کرنا۔

۴۔ سیر ہو جانے کے بعد کھانا کھاتے رہنا۔

۵۔ اتنا کم کھانا کہ صحت بگڑ جائے اور واجبات کی ادائیگی پر قدرت نہ رہے۔

۶۔ ہر قسم کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کی دُھن سوار کرلینا اور ان کی درستگی کی فکر میں لگے رہنا۔

۷۔ ہر وقت اپنے نفس کی خواہش پوری کرنا، یعنی جب اور جس چیز کو جی چاہے کہ فلاں چیز کو کھایا، پیا یا پہنا جائے تو ضرور بضرور اس چیز کو حاصل کرنا اور ضرور اس خواہش کو پورا کرنا۔

۸۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ناجائز کاموں میں مال ومتاع خرچ کرنا، اگرچہ بہت تھوڑا ہی کیوں نہ خرچ کیا جائے، یہ بھی اسراف ہے۔

۹۔ ریاکاری اور نام ونمود کی خاطر مال ودولت خرچ کرنا۔

۱۰۔ جائز کاموں میں مال ودولت حد سے زیادہ خرچ کرنا، یا اپنی استطاعت اور حیثیت سے زیادہ خرچ کرنا، یہ سب صورتیں اسراف میں داخل ہیں۔

اسراف کی تمام صورتوں کے متعلق شریعتِ مطہرہ کی تفصیلی ہدایات اور تنبیہات موجود ہیں۔ ان میں سے بعض کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور بعض کا بیان یہاں لکھا جاتا ہے چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝ ”بے شک بے جا خرچ کرنے والے لوگ شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔“

(سورۂ اسراء: آیت ۲۷)

ایک دوسری جگہ اپنے محبوب ومقبول بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ ”اور جب وہ خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ کنجوسی (اور تنگی) کرتے ہیں، بلکہ ان کا خرچ کرنا دونوں (اسراف اور تنگی) کے درمیان اعتدال (میانہ روی) پر قائم رہتا ہے۔“ (سورۂ فرقان: آیت ۶۷)

اسراف کا مطلب اور اس کی صورتیں تو اوپر ذکر کی گئیں۔ بخل کا مطلب یہ ہے کہ بھلائی اور نیکی کے کاموں میں مال ودولت کو خرچ نہ کیا جائے اور اپنے اہل وعیال اور خدام وغیرہ پر اپنی حیثیت کے مطابق خرچ نہ کیا جائے۔

مختصر یہ کہ جو مال و دولت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے حکم کے مطابق خرچ نہ کیا جائے تو وہ بخل ہے اور جو مال وغیرہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حکم کے بغیر خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے۔

واللہ اعلم

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں جس طرح یہ تعلیم و ترغیب دی گئی ہے کہ صاف ستھرا رہنا چاہیے اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہیں اُن میں بخل اور کنجوسی سے کام نہیں لینا چاہیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے ہوئے ان کو استعمال کرنا چاہیے اور کام میں لانا چاہیے، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ تعلیم بھی دی ہے کہ اپنی زیب وزینت اور لباس وغیرہ میں زیادہ مشغول نہیں ہونا چاہیے، اور نہ ان چیزوں کو حد سے زیادہ اہمیت دی جائے، چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح کنگھی اور بالوں کو درست کرنے کا حکم فرمایا ہے اسی طرح ہر وقت کنگھی کرنے سے منع بھی فرمایا ہے، جن لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنی شکل وصورت کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے اور قدرت کے باوجود کنجوسی یا لاپرواہی سے پھٹے پرانے کپڑے پہنتے ہیں اُن کو تو صفائی، بال وغیرہ درست کرنے اور اچھا لباس پہننے کی ہدایت فرمائی، اور جن کو دیکھا کہ وہ اس معاملہ میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور اپنے بناؤ سنگار ہی میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں تو ان کو اعتدال پر لانے کے لیے بھی ہدایت فرمائی۔ یہاں بطورِ نمونہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ حضرت مقداد بن معد یکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا مَلَأَ آدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِّنْ بَطْنٍ بِحَسْبِ ابْنِ آدَمَ أُكُلَاتٌ يُقِمْنَ صُلْبَهُ فَإِنْ كَانَ لَا مَحَالَةَ فَثُلُثٌ لِطَعَامِهِ وَثُلُثٌ لِشَرَابِهِ وَثُلُثٌ لِنَفَسِهِ

یعنی ”انسان (اگر اپنے پیٹ کو حد سے زیادہ بھر لے تو اس) نے پیٹ سے بُرا کوئی برتن نہیں بھرا۔ بنی آدم کے لیے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو قائم رکھ سکیں (یعنی جسمانی توانائی کو برقرار رکھنے کے لیے کافی ہوں)، اگر پیٹ بھرنا ہی ضروری (اور مقصود) ہو تو (اس کو چاہیے کہ پیٹ کے تین حصے کرے): ایک حصہ کھانے کے لیے، ایک حصہ پینے کے لیے اور ایک حصہ سانس کے لیے (خالی چھوڑ دے)۔“

(ترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ)

۲۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلَا تَسْمَعُوْنَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ اِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِيْمَانِ اِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِيْمَانِ "کیا تم نہیں سنتے؟ کیا تم نہیں سنتے؟ (یعنی سنو اور غور سے سنو) کہ سادگی اور خستہ حالی بھی ایمان میں سے ہے، سادگی اور خستہ حالی بھی ایمان میں سے ہے۔" (ابوداؤد کتاب الترجل)

یعنی ظاہری سادگی وخستہ حالی اور بناؤ سنگار کی طرف زیادہ فکر نہ کرنا بھی اندرونی ایمانی کیفیت سے پیدا ہو جاتی ہے۔

۳۔ حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ تَرَكَ اللِّبَاسَ تَوَاضُعاً لِّلّٰهِ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَيْهِ دَعَاهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رُءُوْسِ الْخَلَائِقِ حَتّٰى يُخَيِّرَهٗ مِنْ اَيِّ حُلَلِ الْاِيْمَانِ شَاءَ يَلْبَسُهَا "جو شخص تواضع اور انکساری کی وجہ سے عمدہ لباس استطاعت اور حیثیت کے باوجود استعمال نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ساری مخلوقات کے سامنے بلا کر اس کو اختیار دے گا کہ وہ ایمان کے جوڑوں میں سے جو جوڑا بھی پسند کرے اس کو پہن لے۔" (ترمذی)

۴۔ حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہر وقت) کنگھی کرنے سے منع فرمایا الّا یہ کہ ایک روز چھوڑ کر کنگھی کی جائے۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، مشکوٰۃ)

۵۔ حضرت عبد اللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن حضرت فضالہ بن عبیدہ رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں آپ کو (بعض اوقات) پراگندہ بال (یعنی بغیر کنگھی کیے ہوئے) دیکھتا ہوں تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَنْهَانَا عَنْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاِرْفَاهِ یعنی "بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں زیادہ عیش و آرام کی چیزوں سے منع فرماتے تھے۔"

اس شخص نے پھر پوچھا کہ میں آپ کے پاؤں میں جوتا نہیں دیکھ رہا ہوں۔ تو انہوں نے جواب میں فرمایا: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَاْمُرُنَا اَنْ نَّحْتَفِيَ اَحْيَانًا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں یہ حکم دیتے تھے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی پھرا کریں۔" (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

خوراک، پوشاک اور خلوت گزاری وغیرہ امور میں جائز وناجائز کا خلاصہ

مذکورہ بالا بحث سے بھی اور اس کے بعد آنے والی زہد کی فضیلت اور دنیا کی مذمت سے بھی چند باتیں ثابت ہو جاتی ہیں، جن کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ کسی یقینی حلال چیز کو اعتقادی طور پر حرام سمجھ کر ترک کر دینا کفر اور سنگین جرم ہے۔

۲۔ اگر اعتقادی طور پر حرام نہ سمجھی جائے، بلکہ حلال اور جائز سمجھی جائے مگر بلا کسی ضرورت ومصلحت کے قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کر دی جائے، مثلاً: یوں کہہ دے "واللہ دودھ نہ پیوں گا" تو یہ گناہ ہے اور اس طرح کی قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔

۳۔ اگر کسی ضرورت اور مصلحت کی وجہ سے قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کر دی تو جائز ہے، مگر پھر بھی بہتر یہی ہے کہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کیا جائے۔ اس کا مفصل بیان "قسم کے بیان"[1] میں موجود ہے۔

۴۔ کسی حلال اور جائز چیز کو نہ اعتقادی طور پر حرام سمجھے اور نہ قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کرے، مگر ثواب کی نیت سے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا دل میں عزم کر لے تو یہ وہ رہبانیت ہے جو شریعتِ مطہرہ میں ممنوع اور مذموم ہے۔

۵۔ اگر حلال اور جائز کے چھوڑ دینے میں ثواب کی نیت بھی نہیں، بلکہ صرف جسمانی مرض کے علاج کے طور پر کوئی حلال چیز کو وقتی طور پر چھوڑ دی جائے تو یہ بلا کراہت جائز بلکہ بعض اوقات ضروری بھی ہو جاتا ہے۔

۶۔ کسی حلال چیز کو وقتی طور پر اس لیے چھوڑ دینا کہ نفسانی خواہشات اعتدال پر لائے جائیں، یہ بھی بلا کراہت جائز بلکہ بعض حالات میں ضروری ہے، مثلاً: کوئی شخص دنیوی لذتوں میں غرق ہو چکا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وقتی طور پر لذتوں کو چھوڑ دے تاکہ اعتدال پر آجائے، بعض حقانی صوفیا کے متعلق جو روایتیں ایسی نقل کی گئی ہیں کہ انہوں نے بعض یقینی حلال چیزیں چھوڑ دی تھیں ان کو اسی قسم پر محمول کرنا چاہیے۔

---

[1] کتاب القسم کے نام سے چھپ چکا ہے۔

اسی طرح صوفیائے کرام اپنے شاگردوں کے ساتھ اختلاط یا کم کھانے یا خوش خوراکی کم کرنے اور کم سونے کی تاکید کرتے ہیں، وہ بھی صرف ابتدا ہی میں ہوتا ہے اور یہ ایک مجاہدہ ہوتا ہے تاکہ نفس کو اعتدال پر لایا جائے، اور جب یہ گمان ہو جاتا ہے کہ اس کا نفس قابو ہو گیا ہے اور ناجائز تک پہنچنے کا خطرہ دور ہو گیا تو پرہیز کو چھڑا دیا جاتا ہے۔

یہ در حقیقت رہبانیت نہیں، بلکہ تقویٰ اور ورع ہے جو دینِ اسلام میں مطلوب اور صحابہ و تابعین وائمہ متبوعین سے ثابت ہے۔

۷۔ بہت کم کھانا کہ واجبات بھی ادا نہ ہو سکیں جرم اور گناہ ہے۔ اسی طرح بہت زیادہ کھانے اور ہر وقت جی چاہی چیزوں کے حصول میں لگے رہنا بھی مذموم اور ممنوع ہے۔

۸۔ کنجوسی اور لااُبالی پن کی وجہ سے عمدہ لباس ترک کرنا مناسب نہیں۔

۹۔ اگر نہ کنجوسی ہے اور نہ لاپرواہی، لیکن تواضع وانکساری کی وجہ سے زیادہ عمدہ لباس کا استعمال ترک کیا جائے تو یہ جائز بلکہ اچھا ہے۔

۱۰۔ دنیا کی نعمتیں بے شک جائز ہیں، مگر ان سے بے دریغ فائدہ اٹھانا اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالنا ہے کہ آدمی کے نازک احساسات مردہ ہو جائیں اور آخرت طلبی کی اعلیٰ کیفیات سے خالی ہو کر محض اسلام کا ایک ریکارڈر بن جائے جو خارج سے ملی ہوئی کچھ آوازوں کو اپنے اندر محفوظ کر دیتا ہے، پھر اس محفوظ ریکارڈ کو بجا کر فضا میں نشر کر دیتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو نعمتیں حاصل تھیں، لیکن انہوں نے بقدرِ کفایت استعمال کر کے باقی خلق خدا کے لیے وقف کر دی۔

۱۱۔ اسلام میں اگرچہ عیسائیت کی طرح رہبانیت نہیں، مگر زہد ایک محمود اور مطلوب چیز ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی نکاح کیے، دوسروں کو بھی ترغیب دی، عمدہ لباس بھی پہنا، عمدہ کھانا بھی اگر مل گیا تو تناول فرمایا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کو حاصل کرنے کا اہتمام نہیں کیا، بلکہ کھانے پینے کے لیے جو کچھ آسانی سے مل گیا تناول فرمایا اور جو لباس میسر آیا پہن لیا اور یہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔

اس لیے عمدہ لباس، عمدہ کھانا اور پہننا ممنوع نہیں ، مگر انسان آرائش و تجملات وغیرہ کے حاصل کرنے میں عمرِ گراں برباد کرے، لذائذ و شہوات میں غرق ہو جائے، یہ اسلام میں ناجائز اور ممنوع ہے۔

۱۲۔ وقتی طور پر گوشہ نشینی بھی عیسائی رہبانیت نہیں، بلکہ روحانی ترقی کا ذریعہ اور شریعتِ مطہرہ میں محمود ہے۔

۱۳۔ دائمی گوشہ نشینی صحیح نہیں، البتہ فتنہ وفساد کے وقت کمزور شخص کے لیے یا طبعی طور پر سخت مزاجوں کے لیے اچھا یہ ہے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ زندگی گزاریں ۔

دین ودنیا کا فرق

عام لوگ دینی اور دنیاوی کاموں کے الگ الگ شعبے بنا لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ جیسی چیزیں دینی امور ہیں، جبکہ تجارت، سلطنت، سپہ سالاری وغیرہ دنیاوی کام ہیں، حالاں کہ اسلام اس تفریق کی قطعاً نفی کرتا ہے۔ اسلام میں ہر مباح کام بھی دین کا کام ہے اور کارِ ثواب ہے جبکہ اُس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اور اچھی نیت سے کیا جائے۔ اس کے برعکس ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو یا جس میں بری نیت شامل ہو جائے وہ دنیا ہے۔

لہٰذا اگر تجارت اور سلطنت وغیرہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے لیے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصول اور قانون کے مطابق کیے جائیں تو یہ دین اور کارِ ثواب بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر نماز اور روزہ میں ریاکاری ہو تو یہ دینی کام بھی دنیا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایک زمانہ ہمارے اسلاف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا کہ ان کا سپہ سالار اور سلطان ان کا امام بھی ہوتا تھا، لیکن آج ہمارے اندر پورے دین پر عمل کرنے کا جذبہ مٹ گیا اور اسلام کے مطابق اپنی پوری زندگی گزارنا بھول گئے، اس لیے ہم میں یہ تخیل آگیا ہے کہ ہنر، کسب وتجارت، سپہ سالاری اور بادشاہی وغیرہ سب دنیاوی کاروبار ہیں، اس لیے ان کے ذمہ دار اہلِ دنیا اور امرا وبادشاہ ہیں، اور نماز، روزہ وغیرہ کے ذمہ دار مسجد کا امام، مفتی اور فقیہ الزمان ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے مدعی (بظاہر دیندار) لوگ سپہ سالاری اور سلطنت وغیرہ جیسے کسی کام کے اہل نہ رہے اور مسلمانوں کے اقتدار کی باگیں (یعنی مسلمانوں کی حکومتیں) ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت سے بالکل عاری اور خالی ہیں اور جنھوں نے دنیا کو آخرت کے

بدلے لے کر مسلمانوں پر پوری طرح کفریہ احکامات نافذ کر رکھے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ دنیاوی کام اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق انجام دینا بھی دین ہے۔

ایک تنبیہ

البتہ اس بات کو یاد رکھیں کہ دین میں اصل عبادات ہی ہیں۔ یہی وہ کام ہیں جن کو اپنانے سے اللہ تعالیٰ کا صحیح اور قوی تعلق اور اللہ تعالیٰ کا عشق و محبت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان کی پوری زندگی خواہ وہ دینی کام ہوں یا دنیاوی کام، سب کے سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو کر رہ جاتے ہیں، اس لیے عبادات کو دین کی بنیاد کہا جاتا ہے۔ اسلام کی پوری عمارت عبادات پر ہی استوار کی جاتی ہے اور ان بنیادی چیزوں میں کمزوری کی وجہ سے اسلام کی پوری عمارت ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ گزشتہ اُمتوں کی گمراہی اور بربادی کی ابتدا اور سبب کو بیان فرماتے ہیں کہ: فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۝ ”پھر ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز ضائع کی اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے، پس عنقریب وہ گمراہی کی سزا سے دوچار ہوں گے۔“ (سورۂ مریم: آیت ۵۹)

اس آیتِ کریمہ میں بتایا کہ جب انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں میں سے بعد میں آنے والوں نے نماز ضائع کی اور ان کی نمازیں خشوع و خضوع کی روح سے خالی ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق اور رابطہ ختم ہوا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے بجائے نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ آج کل بھی بہت سے مفکرینِ اسلام بن گئے ہیں جن کے نزدیک نماز و تسبیح کی اہمیت نہیں، وہ اپنے دلچسپ نعروں سے قوم کو اپنی طرف متوجہ کر کے نماز، تسبیح اور ذکر و اذکار کی ناقدری کرتے ہیں اور ان چیزوں کی حفاظت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ان چیزوں میں کوتاہی اور کمزوری کی وجہ سے ان کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے مسلمانوں کی جماعتیں خالص دنیا پرست تنظیمیں ہو کر رہ جاتی ہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دلچسپ نعروں کے پیچھے نہ چلیں، عبادات اور ذکر و اذکار کی خوب پابندی کریں اور ان کی خوب حفاظت کے ساتھ ساتھ دنیاوی کام کو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اُصولوں کے

مطابق سر انجام دیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی میں گزر جائے گی اور پورے دین پر عمل نصیب ہو گا۔

دنیادار اور دین دار کی علامات

مذکورہ بالا بحث سے دنیادار اور دیندار کے پرکھنے کے لیے دونوں کی علامات بھی واضح ہو گئیں، جو یہ ہیں:

دین دار شخص پورے دینِ اسلام پر عمل کرنے والا ہوتا ہے، اس کے معاملات درست ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں دونوں کے حقوق کی پوری رعایت کرتا ہے، غریبوں اور فقیروں سے محبت رکھتا ہے، حسد، ریاکاری، جھوٹ اور غیبت وغیرہ جیسی بیماریوں سے اور گندی چیزوں سے پاک ہوتا ہے، موت سے نہ ڈرنے والا، سخی، بہادر اور امانت دار ہوتا ہے، کبھی بھی دنیوی عزت اور جاہ و منصب کے حصول کے پیچھے نہیں پڑتا۔ اس کے سامنے آخرت ہوتی ہے اور اس کی پوری زندگی کی گاڑی اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور آخرت کی سڑک پر دوڑتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس دنیادار شخص یا تو حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کوتاہی کرتا ہے یا حسد، جھوٹ، ریاکاری اور مال وجاہ کے حصول کی محبت جیسے امراض میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی عارضی لذتوں کا اس قدر عادی ہوتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں وہ آخرت کے کاموں کو نظر انداز کرتا ہے۔

غرض یہ کہ جس شخص کے دل میں دنیا کی محبت بھری ہوتی ہے، اُس کی پوری زندگی دنیا کی سڑک پر دوڑتی رہتی ہے۔ ایسا شخص اگرچہ بظاہر دین کے کام بھی کرتا ہے، تقریریں کرتا ہے، تبلیغ و تدریس کرتا ہے لیکن چوں کہ مقصود و مطلوب دنیا ہوتی ہے اس لیے اس کے اندر بغض، عناد اور حسد جیسی اخلاقی برائیاں ہوتی ہیں، نیز معاملات اور کسی کی خلاف وغیرہ جیسے امور کی حدود پر قائم نہیں رہ سکتا اور اُس کی محبت فقیروں کے بجائے مال داروں سے ہوتی ہے۔

دنیا کی محبت کا خلاصہ

پس دنیا کی محبت کا خلاصہ یہ ہوا کہ جو بھی چیز انسان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے احکامات سے غافل کر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں رکاوٹ بنتی ہے یا اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں سستی پیدا کرتی ہے وہ دنیا ہے، خواہ مال کی صورت میں ہو یا اولاد کی صورت میں ،لوگوں سے اپنی تعریف سننے کی خواہش کی صورت میں ہو یا آرام پسندی وغیرہ کی صورت میں یا کسی اور صورت میں ہو۔

دنیا کی محبت بدترین خصلت اور تمام برائیوں کی جڑ ہے

دنیا کی حرص ومحبت ایک بدترین خصلت ہونے کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے فسادات، برائیوں اور فتنوں کا ذریعہ ہے۔ دنیا کی لذتوں، شہوتوں اور مال وجاہ کا دلدادہ ہونا دل ودماغ کو گندہ کرتا ہے اور انسان کے اعمال وکردار کو خبیث اور پلید کر کے رکھ دیتا ہے۔

قرآن مجید کی سینکڑوں آیات میں دنیا کی ناپائیداری اور اس میں پڑنے والوں کے برے انجام کو ذکر کیا گیا ہے، نیز نہایت موثر اور لطیف انداز میں دلائل وحقائق بتلائے گئے ہیں کہ بہت ہی عارضی زندگی ہے اور اس قدر ناپائیدار ہے جیسا کہ پانی پر نقش یا پانی کے بلبلے کی حیثیت ہے ۔ قرآن مجید کی ذکر کردہ آیتوں سے بطورِ نمونہ چند آیتوں کو پیش کرتے ہیں:

ا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝

”اور آپ بیان کر دیجیے ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی مثال، کہ بس اس کی حالت ایسی ہے کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی کے ذریعے زمین کے نباتات وسبزے خوب گنجان ہو گئے، پھر وہ (بعد اس کے کہ تروتازہ اور شاداب تھے خشک ہو کر) ریزہ ریزہ ہو گئے جس کو ہوائیں لیے اُڑے پھرتی ہیں (یہی حال بس دنیوی زندگی کا ہے۔ آج یہ حیاتِ دنیا سرسبز وشاداب اور ہری بھری نظر آرہی ہے لیکن کل اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا جس طرح آج لہلہاتی ہوئی کھیتی شاداب اور نظروں کو بھلی

معلوم ہوتی ہے مگر خشک ہونے پر کٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور ہوائیں اس کے ریزوں کو اُڑائے پھرتی ہوں گی) اور بے شک اللہ رب العزت تو ہر چیز پر بڑی ہی قدرت والا ہے۔" (سورۃ الکہف: ۴۵)

دنیا کی اسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے آنحضرت ﷺ نے یہ نصیحت فرمائی: كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَو عَابِرُ سَبِيلٍ" دنیا میں اس طرح زندگی بسر کر کہ گویا تو ایک مسافر ہے یا راستہ طے کرنے والا۔" (دیکھیے صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی ﷺ کن فی الدنیا الخ)

۲۔ اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ

"(اے لوگو! یہ بات) جان لو کہ دنیا کی زندگی بس ایک کھیل اور تماشا ہے اور بناؤ سنگار اور ایک دوسرے سے بڑائی اور شیخی اور ایک دوسرے سے مال واولاد میں بڑھنے کی خواہش۔"

(سورۂ حدید: ۲۰)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

۳۔ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ

"اے میری قوم! یہ دنیا کی زندگی صرف چند روزہ مزہ ہے اور ہمیشہ رہنے کا گھر تو آخرت ہے۔"

(سورۂ مومن: آیت ۳۹)

۴۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ

"یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں مگر ایک کھیل تماشا ہے، اصل زندگی تو آخرت کا گھر ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔"

(سورۂ عنکبوت: آیت ۶۴)

جس طرح بچے تھوڑے سے وقت کے لیے گھر بنا لیتے ہیں، اس پر خوش ہوتے ہیں اور ہم ان کو کھیل تماشا سمجھتے ہیں، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ وہ ہمارے نزدیک عارضی اور کمزور چیز ہوتی ہے۔ اسی طرح آخرت دیکھنے والوں کے نزدیک یہ دنیا بچوں کا ایک کھیل تماشا اور عارضی چیز ہے، بلکہ بچوں کے کھلونے اور مٹی سے بنائے ہوئے گھر کو ہم صرف اس لیے کھیل کہتے ہیں کہ ان کا مقابلہ ہم ساٹھ یا سو سال

تک رہنے والی عمارتوں سے کرتے ہیں اور یہ بات تو معلوم ہے کہ آخرت کے ٹھکانے میں تو ہمیشہ رہنا ہے، لامحدود زندگی ہے، تو یہاں کی سو سالہ زندگی اس کے مقابلہ میں کوئی بھی حقیقت نہیں رکھتی۔

دنیا کی کوئی بھی شکل پائیدار نہیں۔ یہاں کی ہر چیز عارضی ہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا، غمی، خوشی، مال وغیرہ ہر چیز عارضی ہی ہے۔ تو مذکورہ بالا آیتوں میں اللہ تعالیٰ انسان کو یہ نصیحت فرماتا ہے کہ مال واولاد وغیرہ صرف دنیوی زینت ہیں اور دنیا کی کوئی چیز پائیدار نہیں۔ دنیا کے یہ سارے مزے آخرت کی دائمی زندگی کے مقابلہ میں ایک کھیل، فضول اور بے فائدہ ہیں۔ دراصل پائیدار زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، لہٰذا دنیا کی زندگی تو صرف ایک مہلت اور امتحان ہے اور انسان کے لیے اصل زندگی جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے وہ آخرت کی زندگی ہے، تو یہاں امتحان کی مدت کو لھو و لعب یعنی کھیل تماشوں میں ضائع کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔ اس دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بہت ہی قیمتی ہے، اس کو تو آخرت کی فکر اور ان کاموں میں استعمال کرنا چاہیے جو آخرت اور ہمیشہ رہنے والی زندگی میں بہترین نتائج پیدا کریں۔

حق وباطل کا معیار نہ مال ومتاع اور دنیا کی فراوانی ہے نہ تنگی

عام لوگ جب کسی شخص کو دیکھتے ہیں کہ اس کو دنیا، مال ودولت اور اولاد زیادہ مل چکی ہے، یا یہ کہ جب یا جس کو دنیا میں کوئی اچھا منصب مثلاً: حکومت کی سربراہی مل گئی ہے تو وہ اپنی جہالت وحماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ اللہ تعالیٰ کا محبوب اور صاحبِ مقام ہے اس لیے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انعام واکرام ہے اور یہ انعامات جو اس کو مل چکے ہیں یہ اس کی دلیل وعلامت ہے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کا مقرّب اور مقبول بندہ ہے۔ دوسری طرف بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب بھی وہ کسی کے پاس مال ودولت اور اولاد کی فراوانی یا کوئی منصب دیکھتے ہیں تو وہ بھی اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دولت وغیرہ کی فراوانی یا اس کا یہ منصب اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بندہ باطل پر ہے اور اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اس لیے اسے دنیا کا مال ومتاع مل رہا ہے تاکہ اس کو آخرت میں مبتلائے عذاب کردے۔ یہ دونوں طرح کے خیالات قطعاً غلط ہیں۔

حق وباطل کا معیار اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی اخلاص کے ساتھ اختیار کر چکا ہے وہ حق پر ہے اور جو بندگیٔ الٰہی کو نظر انداز کرتا ہے وہ اللہ کے نزدیک مغضوب ومردود ہے

اور باطل پر ہے۔ باقی رہی دنیا اور رزق کی تنگی یا کشادگی جو کچھ بھی ہوتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کی بنا پر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو کون جان سکتا ہے۔ وہاں تک ہماری رسائی نہیں ہو سکتی البتہ اتنی بات ہر صاحبِ عقل سمجھ لیتا ہے کہ مشاہدہ یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کہ بہت ہی زیادہ ناپاک، گندے اور بہت گھناؤنے کردار والے ہوتے ہیں، مگر ان کے پاس مال ومتاع کی فراوانی ہوتی ہے اور ان کے مقابلہ میں بہت سے نیک وشریف لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی اچھائی اور حسن اخلاق وکردار کی خوبی کا ہر شخص معترف ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ نادار اور تنگ دست ہوتے ہیں، تو آخر کون سا صاحبِ عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ پاکیزہ کردار اور پاک لوگ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں اور شریر وخبیث لوگ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ کیا قارون کے پاس دولت کی فراوانی نہیں تھی؟ نمرود اور فرعون بادشاہ وحکمران نہ تھے؟ غرض یہ کہ کسی کو زیادہ رزق دیے جانے کا لازماً یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش یا ناراض ہے، بلکہ بسا اوقات ایک شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت مغضوب اور مردود ہوتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اس کو بہت زیادہ مال ومتاع دے دیتا ہے اور بالآخر یہ دولت اس کے اوپر مزید عذاب لے آتی ہے، جیسا کہ پنجروں میں چوہوں کے لیے ان کا محبوب طعام رکھ دیا جاتا ہے ، لیکن یہی طعام ان پر بالآخر مصیبت ڈھا دیتا ہے۔

اس کے برعکس اگر کسی کا رزق تنگ ہے تو اس کا بھی لازماً یہی مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہے اور اسے سزا دے رہا ہے، بلکہ اکثر مقربینِ بارگاہ اور نیک لوگوں کی روزی تنگ ہوا کرتی ہے اور اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں۔ اس تنگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کے خزانے کھول دیتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے دیندار اور مقربینِ بارگاہ دنیا میں بادشاہ ہو کر گزرے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مال ومتاع بہت زیادہ عطا فرمایا تھا ، اس کے برعکس بہت سے کفار ومشرکین اور ملعون ومغضوب لوگ ایسے بھی رہے ہیں جو دنیا میں بھی تنگی ومصیبت کی زندگی گزار کر چلے گئے ہیں۔ اس تمہید کے بعد قرآن مجید اور احادیثِ شریف میں سے کچھ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۞ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۞ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۞ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۞

” اور ہم نے کسی بستی میں ڈرانے والا (اور خبر دار کرنے والا یعنی پیغمبر) نہیں بھیجا، مگر اس بستی کے آسودہ حال (یعنی صاحبِ مال واولاد اور صاحبِ اقتدار) لوگوں نے یہی کہا کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں، اور وہ یہی کہتے کہ ہم مال واولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور ہمیں ہرگز عذاب نہیں دیا جاسکتا۔(اے نبی!) آپ ان سے کہہ دیجیے: میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے مگر اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے (اور یاد رکھیں!) تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایسی نہیں ہیں کہ تمہیں ہمارا مقرب بنادیں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتا رہے (اسی کو ہمارا قُرب نصیب ہوگا)، پس یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے اعمال کا دُگنا صلہ ہے، وہی بلند وبالا عمارتوں میں امن وچین سے رہیں گے۔“ (سورۂ سبا: آیت ۳۴ تا ۳۷)

مذکورہ بالا آیتوں میں اس بات کی پوری وضاحت موجود ہے کہ مال ودولت یا عزت وجاہ کی کمی بیشی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول یا مردود ہونے کی علامت نہیں، بلکہ اس کے نزدیک مقبولیت کا مدار صرف ایمان اور عملِ صالح پر ہے، جس کو یہ حاصل ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے اور جس کو یہ حاصل نہ ہو وہ مردود۔

۲۔ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۞

”پس ان کے مال ودولت اور (کثرت) اولاد تمہیں تعجب میں نہ ڈال دیں، اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا ہے کہ ان کو انہی چیزوں کے ذریعہ دنیوی زندگی میں عذاب دیں اور ان کا سانس اس حال میں نکلے کہ وہ کافر ہوں۔“ (سورۂ توبہ: آیت ۵۵)

مذکورہ بالا آیت میں یہ بات بتلائی گئی کہ مال و دولت اور کثرتِ اولاد کی وجہ سے وہ دنیا و آخرت میں مبتلائے عذاب ہو جاتے ہیں۔

۳۔ حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کو کفر و شرک اور جرائم سے روکا اور اس کے بدلے میں دنیا میں خوشحال رہنے، ستھری اور مطمئن زندگی ملنے کا یقین بھی دلایا۔ حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس تعلیم کو قرآن مجید نے یوں ذکر کیا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝

"(حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کہتے ہیں کہ) میں نے (اپنی قوم سے) کہا کہ اپنے رب سے معافی مانگ لو (یعنی گناہوں کو چھوڑ دو۔ اے قوم!) بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا اور تمہارے اموال اور اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لیے باغات پیدا کرے گا، تمہارے لیے نہریں جاری فرمائے گا اور تمہیں کیا ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ سے وقار (یعنی عظمت و بڑائی) کی اُمید نہیں رکھتے۔" (سورۂ نوح: آیت ۱۰ تا ۱۳)

اللہ تعالیٰ سے وقار و بڑائی کی اُمید رکھنے کا مطلب یہ بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی سے اُمید رکھنا چاہیے کہ تم اس کی فرمانبرداری کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو عزت و وقار عطا فرمائے گا۔
واللہ اعلم

مذکورہ بالا آیتوں میں توبہ و استغفار، اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے اور گناہوں کے چھوڑنے پر جس مال و دولت، اولاد اور عزت وغیرہ کی یقین دہانی ہے وہ بلاشبہ ایسا مال اور ایسی اولاد ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت و نعمت ہو اور جو دنیا و آخرت میں پریشانی اور مصیبت کے بجائے چین و سکون کا باعث بن سکتی ہے۔

یہاں ایک بات یاد رکھیں! جو شخص گناہوں اور نافرمانی کی زندگی کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور کامل زندگی اختیار کر لیتا ہے اس کی زندگی پرسکون اور چین و اطمینان سے گزرے گی۔ اس

کو کبھی فقر وفاقہ اور دوسری چیزوں کا غم اور ڈر نہ ہوگا، خواہ اس کے پاس دنیا کا مال ومتاع زیادہ ہو یا کم، جیسا کہ اس کا بیان اپنی جگہ میں کر چکا ہوں۔ یہاں صرف یہ بتلانا مقصود تھا کہ مال ودولت یا اولاد کی کثرت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول یا مردود ہونے کی علامت نہیں ،بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے تکوینی مصالح کے تحت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے تکوینی مصالح کے مطابق کسی کو زیادہ مال ومتاع اور اولاد عطا فرماتے ہیں اور کسی کو کم۔ وہ رحیم، کریم اور حکیم ذات ہے، وہی اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے رحیم وکریم اور حکیم پروردگار اللہ رب العزت کی صحیح اور کامل بندگی نصیب فرمائے۔ آمین

جو نعمت اللہ سے غافل کرے وہ دنیا ہے

بس جو مال ومتاع اور عزت وغیرہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کی یاد میں رکاوٹ ڈال دے وہ دنیا ہے، جو کہ مذموم اور مردود ہے۔ چناں چہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”خبردار! دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت وپھٹکار ہے اور اس کی رحمت سے محرومی ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی یاد کے، اور ان چیزوں کے جن کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق اور واسطہ ہے، اور سوائے عالم اور متعلم کے (کہ یہ چیزیں ملعون اور مردود نہیں ہیں)۔“

(ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

دنیا میں جو اعمال وافعال ہوتے ہیں، وہ عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں:

ایک قسم تو وہ ہے جن کا ظاہر وباطن گناہ ہے، جیسے: سود، حرام خوری، زنا وغیرہ۔ ان کی خرابی میں تو کسی کو کلام نہیں۔

دوسری قسم ان چیزوں اور کاموں کی ہے جو بظاہر تو نیک اور اچھے ہیں، لیکن نیت کی خرابی سے گناہ بن جاتے ہیں، جیسے: نماز، روزہ، خواہشات سے احتراز، صدقات وغیرہ۔ اگرچہ یہ نیک کام ہیں اور بہت اجر وثواب رکھتے ہیں، لیکن اگر ریا وشہرت اور مقبولیتِ خلق کے لیے کیے جائیں تو یہی نیک کام نیت کی خرابی کی وجہ سے فاسد ہو کر باعثِ لعنت وپھٹکار بن جاتے ہیں، البتہ اگر اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے لیے کیے

جائیں تو پھر یہی چیزیں ذکر بن جاتی ہیں۔

تیسری قسم میں وہ اعمال وافعال شامل ہیں جو بظاہر دنیا اور حظِ نفس کے لیے معلوم ہوتے ہیں، لیکن صحیح نیت اور ارادے سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کا سبب بن جاتے ہیں، جیسے: نکاح کرنا، کھانا کھانا اور اس لیے مال کمانا کہ مخلوق سے طمع وسوال نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے نام پر خرچ ہو۔ اسی طرح وہ تمام کام جو گناہ سے خالی ہوں، یہ کام اگر صحیح نیت سے کیے جائیں تو دنیا نہیں رہتے بلکہ باعثِ اجر ہو جاتے ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ اس دنیا میں صرف وہی چیزیں اور وہی اعمال اللہ تعالیٰ کی رحمت کے لائق ہیں جن کا اللہ تعالیٰ سے اور دین سے کوئی تعلق ہو، خواہ بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ۔ اور جن اعمال وافعال کا اللہ تعالیٰ اور دین سے کوئی تعلق نہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور، محروم اور قابلِ لعنت ہیں۔ جو مال ومتاع اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق حاصل ہو اور ان کے مطابق خرچ ہو اور وہ یادِالٰہی میں رکاوٹ بن جانے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کی کمائی میں ترقی کا سبب بن جائے تو وہ دنیا نہیں، بلکہ دین بن جاتا ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَاقُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْافِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْامِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوااللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞ ”پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔“

(سورۂ جمعہ: آیت ۱۰)

مطلب یہ ہے کہ نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد تجارت وغیرہ کی اجازت ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں رزق حاصل کرنے کے لیے جو یہ الفاظ استعمال کیے گئے کہ وَابْتَغُوْامِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ”اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔“ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مال اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جائز طریقے سے حاصل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کا فضل ہے۔ دوسری تعلیم اس آیت میں یہ دے دی گئی ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو“ جس کا مطلب یہ ہے کہ روزی کی تلاش میں بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا خیال رہے اور کام، مزدوری وغیرہ کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل وزبان کو تازہ اور تر رکھو۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رِجَالٌ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوۡنَ يَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِيۡهِ الۡقُلُوۡبُ وَالۡاَبۡصَارُ ۝" وہ (جوان) مرد (لوگ) جنہیں کوئی تجارت (اور دھندا) اور کوئی خرید وفروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز کے (اہتمام و) قیام سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی، اور وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں (بہت سے لوگوں کے) دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گی۔" (سورۂ نور: آیت ۳۷)

یہاں مومنین کی صفات ہی میں یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے کہ ان کے دل اللہ کے عشق و محبت سے اس قدر لبریز ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی یاد ان کے دلوں میں اس قدر رچی بسی ہوتی ہے کہ دنیا کی کوئی مصروفیت ان کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری، اس کی بندگی اور اس کی یاد سے غافل نہیں کر سکتی۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اس دنیوی زندگی کے طلب گار نہیں ہوتے، بلکہ اُن کی نظریں ہر وقت آخرت کی ابدی زندگی پر لگی رہتی ہیں اور وہ ہر وقت قیامت کے روز آخرت کی بربادی سے لرزہ براندام رہتے ہیں۔

اچھے اور بُرے مال ومتاع کی پہچان

مذکورہ بحث کے بعد اب اچھے اور برے مال ومتاع کی علامات ذکر کر دی جاتی ہیں:

۱۔ جو مال ومتاع غلط اور ناجائز راستوں سے ملتا ہے، مثلاً: چوری، ڈکیتی وغیرہ سے، وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے۔

۲۔ جو مالدار اپنے مال کو اُڑاتا یا اپنی اولاد پر فخر کرتا اور اس کی وجہ سے لوگوں کو ڈراتا اور دباتا ہے، وہ مال واولاد وبال ہے۔

۳۔ جو مال وعزت جائز طریقہ سے حاصل ہوا ہو، لیکن اس میں زکوٰۃ، صدقات نہ ہوں وہ مال بھی بالآخر مبتلائے عذاب کر دے گا۔

۴۔ جس مال ومتاع اور اولاد کو ناجائز امور میں استعمال کیا جاتا ہے یا جس مال ومتاع اور اولاد میں اس قدر مشغولیت ہو جو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے احکامات سے غافل کر دے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ مال واولاد اس پر وبال اور عذاب لائے گا۔ یہ مال و دولت وغیرہ اگرچہ بظاہر نعمت معلوم ہو، لیکن ان کے اندر دنیوی پریشانی، بے اطمینانی کے انگارے اور آخرت کا عذاب و پھٹکار چھپا ہوا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو مال، اولاد اور عزت جائز ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں اور جن کے حصول میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہ ہو، تو ایسا مال ومتاع اچھا اور نعمتِ الٰہی ہے، بشرطیکہ اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق استعمال اور خرچ بھی کر دیا جائے، نیز وہ مال ومتاع کے حصول میں اس قدر مشغول نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کی یاد میں رکاوٹ ڈال دے تو یہ مال ومتاع اور عزت نہ یہ کہ صرف دنیا میں مفید ہے، بلکہ اس مال ومتاع کی وجہ سے انسان کے لیے آخرت کے درجات، ترقیات اور خوشیوں میں بھی اضافہ کر دیا جائے گا۔

آخرت کی فکر کرو

یہ دنیا جس میں ہم بستے ہیں، جس کو اپنی آنکھوں، کانوں وغیرہ سے محسوس کرتے ہیں، جس طرح یہ ایک واقعی حقیقت ہے، اسی طرح آخرت بھی ایک قطعی اور یقینی حقیقت ہے۔ یہاں اِس دنیا میں ہمارا اُس دنیا کو نہ دیکھنے اور محسوس نہ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ماں کے پیٹ میں ہونے کے دوران ہم اِس دنیا کو نہیں دیکھتے۔ پھر جس طرح ہم نے یہاں آکر اس دنیا کو دیکھ لیا، زمین وآسمان کی وسعتیں اور اس میں کروڑوں اشیا ہمارے مشاہدے میں آگئیں اور کھانے پینے کی مختلف چیزیں اور دوسری لذتیں دیکھ لیں اور چکھ لیں، اور دنیا میں ایسی تکالیف، مصائب اور دُکھ درد بھی دیکھے یا ان میں مبتلا ہوئے جن کا ماں کے پیٹ میں ہم تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، اسی طرح اِس دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کے مقابلے میں آخرت کی نعمتیں، لذتیں اور خوشیاں بے نہایت اور لامحدود ہیں۔

یہی حال آخرت کی تکالیف اور مصیبتوں کا بھی ہے کہ دنیا کا سخت غم، تکلیف اور بڑے سے بڑا دکھ بھی دوزخ کے ہلکے سے ہلکے درجہ کے عذاب سے کوئی مشابہت یا نسبت نہیں رکھتا۔ آخرت کی ابدی نعمتیں، لذتیں اور تکالیف ومصائب ایسی ہیں جن کا اس دنیا میں ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ یہاں جو نعمتیں، خوشیاں اور غم، یا دکھ درد ہیں گویا یہ آخرت میں آنے والی حقیقتوں کے نمونے اور تصاویر ہیں، حقیقی زندگی، حقیقی نعمتیں اور حقیقی مصائب تو آخرت کے ہیں جن کو (یعنی جنت ودوزخ کو اور عالمِ آخرت کی ان تمام چیزوں کو) یہاں نہیں، بلکہ مرنے کے بعد عالمِ آخرت میں پہنچ کر دیکھ لیں گے اور پالیں گے جن کی اطلاع اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے اور اللہ جل شانہ کی کتابوں نے دی ہے۔

پس انسان کی بڑی خوش بختی یہ ہوتی ہے اور سینکڑوں برائیوں سے بچنے کی اساس اور بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کے دل کا رخ آخرت کی طرف ہو، اس کا اصل مقصد اور مطمح نظر آخرت کی زندگی رہے اور اس کی بڑی بد بختی اور سینکڑوں بدکاریوں کی جڑ اور بنیاد بھی یہی ہے کہ وہ آخرت کے انجام سے غافل اور بے فکر ہو کر زندگی گزارتا رہے، احکاماتِ الٰہی کے بجائے اپنی خواہشات کی پیروی کرتا رہے اور ان خواہشات کی فانی لذتوں کو اپنا مقصودِ اصلی بنالے۔

انسان کیوں دنیا کو آخرت پر مقدم کرتا ہے؟

عام انسانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے نزدیک دنیا کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے وہ آنکھوں کے سامنے ہے اور آخرت اور اس کی حقیقتیں آنکھوں سے اوجھل اور غائب ہیں، اس لیے اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ آخرت اور اس میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کے ماننے والوں پر فکرِ دنیا اور اس کی طلب غالب رہتی ہے۔ زبانی طور پر وہ جو کچھ بھی کہہ دیا کریں، لیکن وہ اپنے اعمال سے اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک دنیا کی اہمیت جتنی ہے اتنی اہمیت آخرت کی نہیں۔

گویا یہ جلد بازی انسانوں کی فطری کمزوری ہے اور ان کا حال اس معاملہ میں ٹھیک ان چھوٹے بچوں جیسا ہے جن کو بچپن میں اپنے کھیل اور کھلونوں سے دلچسپی ہوتی ہے اور مستقبل کی زندگی کو خوشگوار اور شاندار بنانے والے تعلیمی اور تربیتی مشاغل ان کے لیے سب چیزوں سے زیادہ غیر دلچسپ، بلکہ انتہائی شاق ہوتے ہیں۔ ان کے شفیق ماں باپ ان کو سمجھا بجھا کر ان اچھے کاموں کی طرف راغب کرتے رہتے ہیں جن میں لگ کر وہ کامیاب انسان بن سکتے ہیں اور عزت وعافیت کی زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔

ہمیشہ انسانوں کی اس غلطی اور کمزوری کی اصلاح کی کوشش انبیاعلیہم السلام نے کی۔ انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے آخرت کی ابدی زندگی میں ان کو کامل مقام تک پہنچانے کے لیے جن چیزوں پر خاص طور پر بہت زور دیا ہے، اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان دنیا کو بالکل حقیر اور بے قیمت سمجھے، اس سے زیادہ جی نہ لگائے اور اس کو اپنا مقصود نہ بنائے، بلکہ آخرت کو اپنی اصلی منزل اور اپنا دائمی وطن یقین کرتے ہوئے اور دنیا کے مقابلہ میں اس کی جو قدر و قیمت اور جو اہمیت ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہاں

کی کامیابی حاصل کرنے کی فکر اپنی تمام دنیوی فکروں پر غالب رکھے اور دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دے۔

چناں چہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۞ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ۞ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۞ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی ۞

یعنی (''تمہارا حال یہ ہے کہ) تم (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالاں کہ آخرت (دنیا سے بدرجہا) بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔ یہی بات اگلی کتابوں میں بھی آئی ہوئی ہے؛ ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں۔'' (سورۂ اعلیٰ: آیت ۱۹-۱۷)

اور ایک جگہ یوں ارشاد فرمایا: اِنَّ هٰٓؤُلَاۤءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَیَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا ۞ یعنی ''یہ لوگ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور اپنے آگے آنے والے بھاری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔'' (یعنی دنیا کی محبت نے ان کو ایسا اندھا کر دیا ہے کہ ان کو آنے والے انتہائی مصیبت کے دن کی پروا نہیں ہے)۔ (سورۂ دھر: آیت ۲۷)

اور مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ''دنیا کی مثال آخرت کے مقابلہ میں بس ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنی انگلی دریا میں ڈال کر نکال لے اور پھر دیکھے کہ پانی کی کتنی مقدار اس میں لگ کر آئی ہے۔'' (مسلم)

دراصل یہ مثال سمجھانے کے لیے دی گئی ہے ورنہ درحقیقت دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں یہ نسبت بھی نہیں، کیوں کہ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے یہ سب محدود اور آخرت لامحدود اور بے نہایت ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے دونوں مونڈھے پکڑ کر مجھ سے فرمایا کہ دنیا میں ایسی زندگی بسر کرو جیسے کہ تو پردیسی ہے یا راستہ چلتا ہوا مسافر۔ (بخاری)

اسی طرح بہت سی قرآنی آیات اور روایاتِ حدیث میں دنیا کی تحقیر اور مذمت بیان کی گئی ہے اور مختلف طریقوں سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور آخرت کے مقابلہ میں یہ دنیا

کس قدر حقیر اور بے قیمت ہے۔ تو یہاں فکر آخرت کو اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل کا رُخ آخرت کی طرف ہو، آخرت ہی پیش نظر رہے اور اس میں روز بروز ترقی کے لیے کوشاں رہیں۔ ①

فکرِ آخرت کیسے پیدا ہو؟

جب ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری فکر وسعی بس آخرت کے لیے ہو اور دنیا سے ہمارا تعلق صرف ناگزیر ضرورت کے بقدر ہو، تو اس فکر کے پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک تو قبر و حشر اور جنت ودوزخ کے متعلق آنے والی آیات وروایات کو سنیں، جہاں ایسی مجالس ہوں جن میں جنت ودوزخ کا تذکرہ ہو ان میں بیٹھیں اور ایسی کتابوں کو اپنے مطالعہ میں رکھیں جن میں جنت ودوزخ کے حالات، آیات اور روایات ہوں، جیسے کہ مولانا عاشق الٰہی دامت برکاتہم کی کتاب "مرنے کے بعد کیا ہوگا" اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ کی کتاب "موت کی یاد" ہیں۔

دوسرا کام یہ کرے کہ روزانہ کسی وقت بیٹھ کر یہ سوچیں کہ ایک دن مرنا ہے، میرے سامنے فلاں فلاں دوست اور رشتہ دار اس دنیا سے چل بسے، میں بھی ایک دن اس دنیا سے جاؤں گا، مجھے غسل دیا جائے گا، مجھ پر بھی نماز جنازہ پڑھایا جائے گا، دفنانے کے بعد منکر ونکیر آئیں گے، سوال وجواب ہو گا، میری قبر یا تو جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہو گی یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ دنیا ختم ہو جانے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے، طویل زمانہ تک حساب کتاب ہو گا، ہر کوئی اپنے برے اعمال کے مطابق تکلیف اور پسینہ میں ڈوبا ہوا ہو گا، میرے اعمال تولے جائیں گے، پوری دنیا کے اول تا آخر آنے والے لوگ میری رسوائی یا اعزاز واکرام کی نمائش دیکھیں گے، پھر پلِ صراط پر چلنا ہو گا، پھر جنت یا دوزخ میں جانا ہو گا۔ پھر جنت کی ان نعمتوں اور جہنم کی ان تکالیف کو سوچیں جو قرآن وحدیث میں آئی ہیں۔

---

① یاد رہے دنیا کی مذمت جو کی گئی ہے وہ وہی دنیا ہے جو آخرت کے مقابل والی ہو اور دنیا کی جس مشغولیت اور دنیا سے جو فائدہ فکر آخرت کے تحت ہو اور آخرت کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو وہ مذموم اور ممنوع نہیں بلکہ وہ تو جنت پہنچنے کا ذریعہ ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا اور آگے بھی ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

تیسرا کام یہ کریں کہ کم از کم ہفتہ میں ایک بار کسی قریبی قبرستان میں جایا کریں، خاص کر ان لوگوں کی قبروں کو دیکھا کریں جو آپ کے سامنے دنیا سے چل بسے ہیں۔ ان سے عبرت پکڑیں اور آخرت کی یاد تازہ کریں۔ فانی دنیا کی نعمتوں اور مصیبتوں کو سوچیں کہ یہ لوگ نعمتوں میں رہے یا مصیبتوں میں، اچھے دن گزارے یا برے، تنگی کے دن گزارے یا فراخی کے، بہر حال گزر گئے، اب ان کو صرف وہ اعمال کام آئیں گے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے کیے ہیں، آخرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیے ہیں۔ دنیا اور دنیا کے اسباب و سامان نے ان لوگوں کے ساتھ کس قدر وفاداری کی، کس حد تک ان کا ساتھ دیا، غرض اسی طرح بہت دور تک سوچا کریں۔

دوسرے انسانوں کو بربادی سے بچانے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کریں کہ ان کے سامنے دنیا کی حقیقت، اس کا بے قیمتی پن اور آخرت کی اہمیت اور برتری قوت کے ساتھ پیش کریں اور قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی، اعمال کی جزا و سزا اور جنت و دوزخ کے ثواب و عذاب کا یقین اُن کے دلوں میں اُتارنے کی کوشش کریں۔ کبھی ان کے سامنے اللہ تعالیٰ اور فکر آخرت کے فوائد اور فضائل بیان کریں اور کبھی اللہ تعالیٰ کے قہر و جلال اور آخرت کے ان سخت اعمال، اور کبھی جنت کی ان نعمتوں اور مزے والی ابدی زندگی ان کے سامنے پیش کی جائے جو قرآن مجید اور احادیث کے ذخیرہ میں موجود ہے۔ ان شاء اللہ اس طرح کرنے سے اپنے اندر بھی فکر آخرت بیدار ہو گی اور دوسرے کے اندر بھی۔

مال و متاع کی محبت کی علامتیں

مال و متاع کی محبت کی علامات اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مال کی محبت ذیل میں بیان کردہ آثار و علامات سے پہچانی جاسکتی ہے:

۱۔ مال کمانے اور حاصل کرنے میں حرام یا مشتبہ ذرائع سے اجتناب نہیں کرے گا۔

۲۔ زکوٰۃ کی ادائیگی اور دوسرے مالی واجبات سے دل تنگ پڑے گا اور بخل میں مبتلا ہو گا۔

۳۔ فقرا و مساکین کی رفاقت اور ان کی ملاقات سے دل میں تنگی ہو گی اور ان سے نفرت کرے گا، اگرچہ کچھ مال وغیرہ بظاہر دیا کرے، لیکن اس کی محبت مالداروں کے ساتھ ہو گی۔

۴۔ مال کماتے وقت اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم متوجہ ہو، مثلاً: نماز کا وقت ہوا، یا جہاد کے لیے اعلان ہوا تو ایسے حالات میں سستی دکھائے گا۔

۵۔ مال و دولت کی باتوں میں اس کو سرور اور دل لگی ہوگی۔

ایسے اور بھی قرائن ہوسکتے ہیں جن سے اپنے آپ کو معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مجھ میں مال کی کس قدر محبت رچ بس گئی ہے جن کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

حب الدنیا کی مذمت اور زہد و قناعت کی اہمیت وفضیلت

آخرت کے مقابلے میں دنیا سے محبت اور دنیا کی حرص ولالچ کی مذمت اور زہد و قناعت کی فضیلت اور مصائب پر صبر کی ترغیب قرآن مجید واحادیثِ شریفہ میں اتنی کثرت سے مختلف انداز میں ذکر کی گئی ہے کہ اگر ان سب کو مختصر بھی کیا جائے پھر بھی ایک اچھی خاصی کتاب بن جائے گی۔ یہاں اس کے متعلق مختصر طور پر کچھ آیات اور احادیث وغیرہ پیش کرتا ہوں وہ بھی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ کی کتاب ”فضائل صدقات“ سے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۞ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۞ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۞ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۞

”آراستہ کردی گئی لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت (مثلاً) عورتیں ہوئیں اور بیٹے ہوئے اور ڈھیر لگے ہوئے سونے اور چاندی کے، اور نشان لگے ہوئے (یعنی عمدہ اور اعلیٰ) گھوڑے اور دوسرے مویشی اور زراعت، (لیکن) یہ (سب چیزیں) دنیوی زندگی کی استعمالی چیزیں ہیں اور انجام کار کی خوبی (اور کام آنے والی چیز تو) اللہ ہی کے پاس ہے۔ (اے محمد) تم اُن سے کہہ دو: کیا میں تم کو ایسی چیز بتادوں جو (بدر

جہا) بہتر ہوا ان سب چیزوں سے (وہ کیا ہے؟ غور سے سنو!) ایسے لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ان کے رب کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اُن میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے اور (اُن کے لیے وہاں) ایسی بیبیاں ہیں جو ہر طرح پاک وصاف ستھری ہیں اور (ان سب سے بڑھ کر چیز) اللہ کی خوشنودی ہے، اور اللہ تعالیٰ بندوں (کے احوال) کو خوب دیکھنے والے ہیں۔ (یہ لوگ جن کے لیے یہ آخرت کی چیزیں ہیں ایسے لوگ ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں، پس آپ ہمارے گناہوں کو معاف کردیجیے اور ہم کو جہنم کے عذاب سے بچادیجیے۔ یہ لوگ (وہ ہیں جو مصیبتوں پر) صبر کرنے والے ہیں، سچ بولنے والے ہیں (اللہ تعالیٰ کے سامنے) عاجزی کرنے والے ہیں اور (نیک کاموں میں مال) خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلی رات میں گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔“

(سورۂ آل عمران: آیت ۱۴ تا ۱۷)

ف: حق تعالیٰ شانہ نے ان سب چیزوں کی محبت کو شہوتوں کی محبت سے تعبیر کیا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ شہوت کی افراط ہی کا نام عشق ہے جو بیماری ہے ایسے دل کی، جو تفکرات سے کالا ہو۔ اس کا علاج ابتدا ہی سے کرنا ضروری ہے کہ اس کی طرف نظر کم کردے، اس کی طرف التفات کم کردے، ورنہ جب التفات بڑھ جائے گا تو ہٹانا مشکل ہوجائے گا اور ابتدا میں بہت سہل ہے۔ یہی حال ہے ہر چیز کے عشق کا، مال ہو، جاہ ہو، جائداد ہو، اولاد ہو، حتیٰ کہ پرندوں (کبوتروغیرہ) سے کھیلنے کا اور شطرنج وغیرہ سے کھیلنے کا بھی یہی حال ہے کہ یہ سب چیزیں جب آدمی پر مسلط ہوجاتی ہیں تو اس کے دین اور دنیا دونوں کو برباد کردیتی ہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص سواری پر سوار ہے۔ اگر وہ جانور کی باگ اسی وقت دوسری طرف پھیر دے جب وہ بے جگہ جانے کا رخ کر رہا ہو، تو اُس وقت بہت آسانی سے وہ جگہ پر پڑ سکتا ہے۔ لیکن جب وہ جانور کسی دروازے میں گھس جائے اور سوار پھر دُم پکڑ کر پیچھے کو کھینچنا چاہے تو پھر بڑی سخت دشواری ہوجاتی ہے۔ اس لیے ان سب چیزوں کی محبت کو ابتدا ہی سے نگاہ میں رکھیں اور اعتدال سے نہ بڑھنے دیں۔ (احیاء)

علمانے فرمایا ہے کہ دنیا کی جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ تین قسم میں داخل ہیں۔ معدنیات، نباتات، حیوانات۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان آیات میں تینوں کی مثالیں ذکر فرما کر دنیا کی ساری ہی چیزوں پر متنبہ فرمادیا۔ بیویوں اور بیٹوں کو ذکر فرما کر آل واولاد، عزیز واقارب، احباب غرض انسانی محبوبوں پر تنبیہ فرمادی اور سونے چاندی کو ذکر فرما کر ساری معدنیات پر اور گھوڑے مویشی کو ذکر فرما کر ہر قسم کے جانوروں پر اور کھیتی سے ہر قسم کی پیداوار پر اور یہی چیزیں ساری دنیا کی کائنات ہیں۔(احیاء) اور ان سب کو گنوا کر اور ان پر تنبیہ فرما کر ارشاد فرمادیا کہ یہ سب کی سب اس چند روزہ زندگی کے گزران کی چیزیں ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی محبت کے قابل نہیں، دل لگانے کے قابل نہیں۔ دل لگانے کی چیزیں صرف وہی ہیں جو پائیدار ہیں، ہمیشہ رہنے والی ہیں، ہمیشہ کام آنے والی ہیں اور ان میں سب سے بڑھ کر اللہ کی رضا ہے، اس کی خوشنودی ہے، وہ دنیا اور آخرت کی ہر چیز پر فائق ہے، ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔

دوسری جگہ جنت کی نعمتوں کو ذکر فرما کر ارشاد ہے: وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ”کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی ان سب چیزوں سے بڑھی ہوئی ہے، یہ ہی وہ چیز ہے جو بڑی کامیابی ہے۔“

حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی برابری نہ دنیا کی کوئی چیز کر سکتی ہے، نہ آخرت کی کوئی نعمت اس کے برابر ہے۔ آیاتِ بالا میں دنیا کی ساری مرغوبات کو تفصیل سے ذکر فرما کر اس پر متنبہ کر دیا کہ یہ سب محض دنیوی زندگی کے اسباب ہیں اور پھر بار بار قرآن پاک میں اس چیز پر تنبیہ فرمائی گئی اور مختلف عنوانات سے نصیحت کی گئی۔ کہیں دنیا طلبی کی مذمت کی گئی تو کہیں دنیا کو ترجیح دینے والوں کی قباحت بیان کی گئی، کہیں اس کی بے ثباتی پر تنبیہ کی گئی، کہیں اس کو محض دھوکا بتایا گیا، تاکہ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے کہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز محض عارضی ہے، محض ضرورت پوری کرنے کی چیز ہے۔ نہ یہ دائمی ہے نہ دل لگانے کی چیز ہے۔ اس سلسلہ کی چند آیات پر اس جگہ تنبیہ کرتا ہوں:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ

عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

"یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلہ میں خرید لیا۔ پس نہ تو اُن کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی، نہ ان کی کسی قسم کی مدد کی جائے گی۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۸٦)

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۞

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۞ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا

"پس بعض آدمی تو ایسے ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں تو جو کچھ دینا ہے دنیا ہی میں دے دے (پس ان کو جو کچھ ملنا ہوگا دنیا ہی میں مل جائے گا) اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے حصہ ہے، اُس چیز سے جو انہوں نے (نیک اعمال سے) کمایا ہے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۰۰-۲۰۱)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞

"جو شخص (اپنے نیک اعمال سے) دنیاوی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہے (جیسے مال ومتاع یا شہرت ونیک نامی وغیرہ) ہم اُن لوگوں کے اعمال (کا بدلہ) اُن کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور اُن کے لیے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں ہے اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب کا سب بے کار ثابت ہو گا اور (حقیقت میں) یہ جو کچھ کر رہے ہیں سب باطل (بے کار) ہے۔" (سورۂ ہود: آیت ۱۵-۱٦)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۞ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۞ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ

مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۞ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۞

''جو شخص دنیا کا ارادہ کرتا ہے (اور اپنی کوشش اور اعمال کا ثمرہ صرف دنیا ہی میں چاہتا ہے) ہم اس کو دنیا میں جتنا چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں دیتے ہیں (نہ یہ ضروری ہے کہ ہر شخص کو دے دیں۔ جس کو ہم چاہتے ہیں، دیتے ہیں اور جس کو دیتے ہیں اس کو بھی یہ ضروری نہیں کہ جتنا وہ مانگے سب دے دیں۔ جتنا ہم چاہتے ہیں دیتے ہیں) پھر آخرت میں اس کے لیے جہنم تجویز کر دیتے ہیں کہ وہ اس میں بدحال راندہ ہو کر جلتا رہے گا، اور جو شخص آخرت کا ارادہ کرے اور اس کے لیے جیسی کوشش کرنا چاہیے، کرے، بشرطیکہ وہ مومن ہو، ایسے لوگوں کی کوشش اللہ کے یہاں مقبول ہے۔ ہر فریق کی (دنیا دار ہو یا دین دار) آپ کے رب کی عطا میں سے ہم مدد کرتے ہیں اور آپ کے رب کی (یہ دنیاوی) عطا کسی سے بھی بند نہیں کی گئی۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ اس دنیاوی عطا میں ہم نے ایک کو دوسرے پر (خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر) کیسی فوقیت دے رکھی ہے (آپ اس سے خود ہی اندازہ کر لیں گے، کہ عطا کسی اور کی طرف سے ہے کہ ایک شخص کو کوشش سے بھی بہت کم ملتا ہے اور دوسرا بغیر کوشش کے بھی بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے) اور آخرت (جو مخصوص ہے ایمان کے ساتھ) اس دنیا سے درجوں کے اعتبار سے بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔''

(سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۱۸ تا ۲۱)

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۞ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۞

"تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی (ہر گز ہر گز اس قابل نہیں کہ آدمی اسی میں لگ جائے، یہ تو) محض لہو ولعب اور ظاہری زیب وزینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے اور اموال واولاد میں ایک دوسرے پر بڑھوتری ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ مینہ برسا کہ اس کی وجہ سے پیداوار (ایسی بڑھی کہ وہ) کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہونے لگی، پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے کہ پھر تو اس کو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چُوراچُورا ہو جاتی ہے (یہی حالت دنیا کی زیب وزینت اور بہار کی ہے کہ آج زوروں پر ہے، پھر اضمحلال ہے، پھر زوال ہے) اور آخرت کی یہ حالت ہے کہ اس میں سخت عذاب ہے (جس سے بچنے کی انتہائی کوشش ہونا چاہیے) اور خدا تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے (جس کے حاصل کرنے کی کوشش اس کی شان کے مناسب ہونا چاہیے۔ اور یہ بات ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ) دنیا کی زندگی دھوکہ کاسامان ہے (جب دنیا کی یہ حالت ہے اور آخرت کی یہ کیفیت، تو سعادت کی بات یہ ہے کہ) تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑواور (اس کی شان کے مناسب کوشش کرو اور نہایت اہتمام سے دوڑو) ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین کی وسعت کے برابر ہے۔ جو ایسے لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل واحسان ہے، وہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازدیتا ہے اور اللہ تعالیٰ شانہ بہت زیادہ فضل والے ہیں (مگر کوئی اس کے فضل سے حصہ لینا بھی چاہے)۔" (سورۃ الحدید: آیت ۲۱تا۱۹)

امام غزالی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ بچہ، جب اس کو کچھ بھی سمجھ شروع ہوتی ہے تو وہ لہو ولعب کی طرف مشغول ہوتا ہے اور اس کے اندر اس کا ایسا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں اس کو کوئی چیز اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ پھر اس کے بعد جب وہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو اس میں زیب وزینت، اچھے کپڑوں کا پہننا، گھوڑے وغیرہ کی سواری کا شوق پیدا ہوتا ہے جس کے سامنے لہو ولعب کی لذت بھی لغو ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس میں جوانی کی لذتوں کا زور ہوتا ہے۔ شہوت پوری کرنے کے مقابلہ میں اس کی نگاہ میں کوئی چیز نہیں رہتی، نہ مال ومتاع کی وقعت رہتی ہے نہ عزت وآبرو کی۔ اس کے بعد پھر اس میں بڑائی اور تفاخر اور ریاست کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو پہلے جذبوں پر غالب آجاتا ہے۔ یہ سب دنیاوی لذات ہیں۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جس کے مقابلہ میں ہر چیز لغو بن جاتی ہے۔ یہی اصل جذبہ ہے جو سب سے زیادہ قوی ہے۔

پس ابتدائی زمانہ میں کھیل کود کی رغبت ہوتی ہے اور بلوغ کے شروع میں شہوت کا زور ہوتا ہے۔ بیس سال کی عمر کے بعد سے ریاست کا جذبہ شروع ہوتا ہے اور چالیس سال کی عمر کے قریب سے علوم اور معرفت کا جذبہ شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ بچپن میں بچہ کھیل کے مقابلہ میں عورتوں کے اختلاط اور ریاست کو لغو سمجھتا ہے، اسی طرح یہ دنیادار ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مشغول ہوتے ہیں اور یہ اللہ والے سمجھتے ہیں کہ یہ بچے ہیں، بلوغ کے لطف کو جانتے ہی نہیں۔ (احیاء)

اس آیتِ شریفہ میں دنیوی لذات کی سب انواع کو ذکر فرما کر اس پر تنبیہ فرمائی کہ ساری ہی لذتیں دھوکہ ہیں اور کام آنے والی صرف اور صرف آخرت کی زندگی ہے۔ دنیا کی ساری لذتیں اس کھیتی کی طرح ہیں جو لہلہا کر خشک ہو جائے، پھر اُس کو ہوا اُڑا کر فنا کر دے۔

میری امت کا فتنہ مال ہے اس بارے میں احادیث مبارکہ

عَنْ کَعْبِ بْنِ عِیَاضٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ لِکُلِّ اُمَّۃٍ فِتْنَۃٌ وَفِتْنَۃُ اُمَّتِیَ الْمَالُ

”حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے (جس میں مبتلا ہو کر وہ فتنہ میں پڑ جاتی ہے) اور میری اُمت کا فتنہ مال ہے۔“
(مشکوٰۃ)

ف: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد بالکل ہی حق ہے، کوئی اعتقادی چیز نہیں ہے۔ روزمرہ کے مشاہدہ کی چیز ہے کہ مال کی کثرت سے جتنی آوارگی، عیاشی، سود خوری، زناکاری، سینمابینی، جوابازی، ظلم وستم، لوگوں کو حقیر سمجھنا، اللہ کے دین سے غافل ہونا، عبادات میں تساہل، دین کے کاموں کے لیے وقت نہ ملنا وغیرہ وغیرہ ہوتے ہیں، ناداری میں ان کا تہائی چوتھائی بلکہ دسواں حصہ بھی نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ایک مثل مشہور ہے ”زر نیست عشق ٹیں ٹیں“ پیسہ پاس نہ ہو تو پھر بازاری عشق بھی زبانی جمع خرچ ہی رہ جاتا ہے۔ اور یہ چیزیں نہ بھی ہوں تو کم سے کم درجہ مال کی بڑھوتری کی ہر وقت فکر تو کہیں گئی ہی نہیں۔ صرف تین ہزار روپیہ کسی کو دے دیجیے، پھر ہر وقت اس کو کسی کام میں لگا کر بڑھانے کی فکر دامن گیر ہوگی تو کہاں کا سونا، کہاں کا راحت و آرام، کیسی نماز روزہ کیسا حج، زکوٰۃ، اب دن بھر، رات بھر دکان

بڑھانے کی فکر ہے۔ دکان کی مشغولی نہ کسی دینی کام میں شرکت کی اجازت دیتی ہے، نہ دین کے لیے کہیں باہر جانے کا وقت ملتا ہے کہ دکان کا حرج ہو جائے گا۔ ہر وقت یہ فکر سوار کہ کونسا کاروبار ایسا ہے جس میں نفع زیادہ اور کام چلتا ہوا ہو۔

اسی لیے حضور اقدس ﷺ کا پاک ارشاد جو کئی حدیثوں میں آیا ہے کہ اگر کسی آدمی کے لیے دو وادیاں (دو جنگل) مال کی حاصل ہو جائیں تو وہ تیسری کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ آدمی کا پیٹ (قبر کی) مٹی ہی بھر سکتی ہے۔ (مشکوۃ) ایک حدیث میں ہے کہ اگر آدمی کے لیے ایک وادی مال کی ہو تو دوسری کو تلاش کرتا ہے اور دو ہوں تو تیسری تلاش کرتا ہے، آدمی کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھرتی۔

ایک حدیث میں ہے کہ آدمی کے لیے ایک جنگل کھجوروں کا ہو تو دوسرے کی تمنا کرتا ہے اور دو ہوں تو تیسرے کی اور اسی طرح تمنائیں کرتا رہتا ہے۔ اس کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھرتی۔
(کنز)

ایک حدیث میں ہے کہ اگر آدمی کو ایک وادی سونے کی دے دی جائے تو وہ دوسری کو تلاش کرتا ہے اور دو ہوں تو تیسری کو تلاش کرتا ہے۔ آدمی کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔
(بخاری)

مٹی سے بھرنے کا مطلب یہ ہے کہ قبر کی مٹی میں جا کر ہی وہ اپنی اس هَلْ مِنْ مَّزِيْد کی خواہش سے رک سکتا ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے ہر وقت اس پر اضافہ اور زیادتی کی فکر رہتی ہے۔ ایک کارخانہ اچھی طرح چل رہا ہے، اس میں بقدرِ ضرورت آمدنی ہو رہی ہے، کہیں کوئی دوسری چیز سامنے آگئی، اس میں بھی اپنی ٹانگ اڑادی۔ ایک سے دو ہو گئیں، دو سے تین ہو گئیں۔ غرض جتنی آمدنی بڑھتی جائے گی، اس کو مزید کاروبار میں لگانے کی فکر رہے گی۔ یہ نہیں ہو گا کہ اس پر قناعت کرے کہ کچھ وقت اللہ کی یاد میں مشغولی کا نکل آئے۔

بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے: خدا کی قسم! مجھے تمہارے اوپر تمہارے فقر وفاقہ کا خوف نہیں ہے، بلکہ اس کا خوف ہے کہ تم پر دنیا کی وسعت ہو جائے جیسا کہ تم سے پہلی اُمتوں پر ہو چکی ہے، پھر تمہارا اس میں دل لگنے لگے جیسا کہ اُن کا لگنے لگا تھا۔ پس یہ چیز تمہیں بھی ہلاک کر دے جیسا کہ پہلی اُمتوں کو کر چکی ہے۔ (مشکوۃ)

مال خود سے ناپاک اور عیب کی چیز نہیں

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات میں مختلف عنوانات سے مختلف قسم کی تنبیہات سے مال کی کثرت اور اُس کے فتنہ پر متنبہ فرمایا۔ اس لیے نہیں کہ مال فی نفسہٖ کوئی ناپاک یا عیب کی چیز ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ ہم لوگوں کے قلوب کے فساد کی وجہ سے بہت جلد ہمارے دلوں میں مال کی وجہ سے تعفن اور بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اس کی مضرتوں سے بچتے ہوئے، اس کی زیادتی سے احتراز کرتے ہوئے شرائط کے ساتھ اس کو استعمال کرے تو مضر نہیں بلکہ مفید ہو جاتا ہے، لیکن چوں کہ عام طور سے نہ شرائط کی رعایت ہوتی ہے نہ اصلاح کی فکر ہوتی ہے اس بنا پر یہ اپنا زہریلا اثر بہت جلد پیدا کر دیتا ہے۔

اس کی بہترین مثال ہیضہ کے زمانہ میں امرود کا کھانا ہے کہ فی نفسہٖ امرود کے اندر کوئی عیب نہیں۔ اس کے جو فوائد ہیں وہ اب بھی اس میں موجود ہیں لیکن ہوا کے فساد کی وجہ سے اس کے استعمال سے، بالخصوص کثرت استعمال سے بہت جلد اس میں تغیر پیدا ہو کر مضرت اور ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے علی العموم ڈاکٹر ہیضہ کے زمانہ میں امرود کھانے کی سختی سے ممانعت کر دیتے ہیں۔ ٹوکرے کے ٹوکرے ضائع کرا دیتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اگر معمولی حکیم یا ڈاکٹر کسی چیز کو مضر بتاتا ہے تو طبعاً ہمارے قلوب اس سے ڈرنے لگتے ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹروں کے ان اعلانات کے بعد اچھے اچھے سورماؤں کی ہمت امرود کھانے کی نہیں رہتی۔ لیکن وہ ہستی جس کے جوتوں کی خاک تک بھی کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں پہنچ سکتا۔ جس کی تجویز نورِ نبوت سے مستفاد ہیں، اس کے اعلان، اس کی تجویز پر ذرا بھی خوف پیدا نہ ہو؟

حضور اقدس ﷺ جب بار بار اس کے فتنوں اور اس کی مضرتوں پر تنبیہ فرما رہے ہیں تو یقیناً ہر شخص کو بہت زیادہ اس کی مضرتوں سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ اس کے استعمال کے لیے شرعی قوانین کے ماتحت جو اُس کے لیے ایسے ہیں جیسا کہ امرود کے لیے نمک، مرچ، لیموں وغیرہ مصلحات ہیں۔ ان کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ کے حقوق کی ادائیگی کی بہت زیادہ فکر کرتے رہنا چاہیے۔ خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ غنیٰ میں اس شخص کے لیے نقصان نہیں جو اللہ سے ڈرتا رہے۔

(مشکوٰۃ)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں فتوحات

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں فتوحات کی کثرت سے عام طور پر ان حضرات کی مالی حالت اچھی ہوگئی۔ دنیا اور ثروت اُن کے جوتوں سے لپٹتی تھی، یہ اُس کو پھینکتے تھے اور وہ ان سے چمٹتی تھی، لیکن اس سب کے باوجود اس کے ساتھ ان کی وابستگی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغولی کیا تھی؟ ”فضائلِ نماز“ اور ”حکایاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم“ میں ان حضرات کے کچھ واقعات ذکر کیے گئے ہیں۔ ان کو عبرت اور غور سے پڑھیں۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بہت زیادہ دولت کے باوجود جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو جیسے ایک کیل کہیں گاڑدی ہو۔ سجدہ اتنا لمبا ہوتا کہ چڑیاں کمر پر آکر بیٹھ جاتیں اور حرکت کا ذکر نہیں۔ جس زمانہ میں خود اُن پر چڑھائی ہو رہی تھی اور اُن پر گولہ باری ہو رہی تھی، نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک گولہ مسجد کی دیوار پر لگا جس سے اس کا ایک حصہ گرا، اُن کی داڑھی کے پاس سے گزرا مگر اُن کو اس کا پتا بھی نہ چلا۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا باغ کھجوروں کا خوب پک رہا تھا، یہ اس باغ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز میں باغ کا خیال آگیا۔ اس کا رنج اور صدمہ اس قدر ہوا کہ نماز کے بعد فوراً باغ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں، جو اس وقت امیر المؤمنین تھے پیش کر دیا۔ انہوں نے پچاس ہزار میں اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت دینی کاموں میں خرچ کر دی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں دو بوریاں دراہم کی نذرانہ میں آئیں جن میں ایک لاکھ سے زیادہ درہم تھے۔ طباق منگا کر اور بھر بھر کر سب تقسیم کر دیں۔ اپنا روزہ تھا یہ بھی خیال نہ آیا کہ اپنے افطار کے لیے کچھ رکھ لیں یا کوئی چیز منگالیں افطار کے وقت جب باندی نے افسوس کیا کہ اگر ایک درہم کا گوشت منگالیتیں تو آج ہم بھی گوشت سے کھانا کھالیتے۔ تو فرمایا: اب افسوس سے کیا ہوتا ہے، جب یاد دلادیتی تو میں منگادیتی۔

یہاں ایک بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ ان حضرات میں متمول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان احوال سے مال کی کثرت کے جواز پر استدلال تو ہو سکتا ہے کہ خیر القرون اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں یہ مثالیں بھی ملتی ہیں، لیکن ہم لوگوں کو اس زہر کے اپنے پاس رکھنے میں ان کی اتباع کو

آڑ بنانا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی تپ دق کا بیمار کسی جوان، قوی تندرست کی اتباع میں روزانہ صحبت کیا کرے کہ وہ تین چار دن میں قبر کا گڑھا ہی دیکھے گا۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مال بمنزلہ ایک سانپ کے ہے جس میں زہر بھی ہے اور تریاق بھی ہے۔ اس کے فوائد بمنزلہ تریاق کے ہیں اور اس کے نقصانات بمنزلہ زہر کے، جو اس کے فوائد اور نقصانات سے واقف ہو جائے وہ اس پر قادر ہو سکتا ہے کہ اس کے فوائد حاصل کرے اور نقصانات سے محفوظ رہے۔ اس میں فوائد تو دو قسم کے ہیں دنیوی اور دینی۔ دنیوی فوائد تو ہر شخص جانتا ہے، انہی کی وجہ سے سارا جہان اس کے کمانے میں مرمٹ رہا ہے۔

دینی فوائد تین ہیں۔ اول یہ کہ بواسطہ یا بلاواسطہ عبادت کا سبب ہے۔ بلاواسطہ تو جیسے حج، جہاد وغیرہ کہ یہ روپیہ ہی سے ہو سکتے ہیں۔ اور بواسطہ یہ کہ اپنے کھانے پینے اور ضروریات میں خرچ کرے، کہ یہ ضرورتیں اگر پوری نہ ہوں تو آدمی کا دل اُدھر مشغول رہتا ہے جس کی وجہ سے دینی مشاغل میں اشتغال کا وقت نہیں ملتا۔ اور جب یہ بواسطہ عبادت کا ذریعہ ہے تو خود بھی عبادت ہوا۔ لیکن صرف اتنی ہی مقدار جس سے دینی مشاغل میں اعانت ملے، اس سے زیادہ مقدار اس میں داخل نہیں۔

دوسرا دینی فائدہ اس کو کسی دوسرے پر خرچ کرنے کے متعلق ہے اور یہ چار قسم پر ہے۔

الف۔ صدقہ جو غربا پر کیا جائے۔ اس کے فضائل بے شمار ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکے۔

ب۔ مروت جو اغنیا پر دعوت، ہدیہ وغیرہ میں خرچ کیا جائے کہ وہ صدقہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ صدقہ فقرا پر ہوتا ہے۔ یہ قسم بھی دینی فوائد لیے ہوئے ہے کہ اس سے آپس کے تعلقات قوی ہوتے ہیں، سخاوت کی بہترین عادت پیدا ہوتی ہے۔ بہت سی احادیث ہدیہ دینے اور کھانا کھلانے کے فضائل میں وارد ہوئی ہیں۔ اس قسم میں ان لوگوں کے فقر کی قید نہیں ہے جن پر خرچ کیا جائے۔

ج۔ اپنی آبرو کا تحفظ یعنی مال کا ایسی جگہ خرچ کرنا، جس میں اگر خرچ نہ کیا جائے تو کمینے لوگوں کی طرف سے بدگوئی و فحش گوئی وغیرہ مضرتوں کا اندیشہ ہے۔ یہ بھی صدقہ کے حکم میں آجاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے جو خرچ کرتا ہے، وہ بھی صدقہ کرتا ہے۔

د۔ مزدوروں کی اُجرت دینا کہ آدمی بہت سے کام خود اپنے ہاتھ سے نہیں کر سکتا اور بعض کام ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو آدمی خود تو کر سکتا ہے۔ لیکن ان میں بہت سا عزیز وقت صرف ہوتا ہے۔ اگر ان کاموں کو اُجرت پر کرالے، تو اپنا یہ وقت علم و عمل، ذکر و فکر وغیرہ ایسے اُمور میں خرچ ہو سکتا ہے جن میں دوسرا نائب نہیں ہو سکتا۔

تیسرا دینی فائدہ عمومی اخراجات خیر ہیں، جن میں کسی دوسرے معین شخص پر تو خرچ نہیں کیا جاتا کہ یہ دوسرے نمبر میں گزر چکے ہیں۔ البتہ عمومی فوائد اس سے حاصل ہوتے ہیں جیسا مساجد کا بنانا، مسافر خانے، پل وغیرہ بنانا، مدارس، شفاخانے وغیرہ ایسی چیزیں بنانا، جو اپنے مرنے کے بعد بھی اُن کے اجر و ثواب اور ان سے فوائد حاصل کرنے والے صلحاء کی دعائیں پہنچتی رہیں۔

یہ تو اجمال ہے اس کے فوائد کا اور سارے فوائد جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں، وہ ان میں آگئے۔ حضرت اقدس شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ مال کا خرچ کرنا سات طرح سے عبادت ہے۔

(۱) زکوٰۃ، جس میں عشر بھی داخل ہے۔(۲) صدقۂ فطر۔ (۳) نفل خیرات، جس میں مہمانی بھی داخل ہے اور قرضداروں کی اعانت بھی۔(۴) وقف، مساجد، سرائے، پل وغیرہ بنانا۔(۵) حج فرض ہو یا نفل یا کسی دوسرے کی حج میں مدد ہو، توشہ سے یا سواری سے۔(٦) جہاد میں خرچ کرنا کہ ایک درہم اس میں سات سو درہم کے برابر ہے۔(۷) جن کے اخراجات اپنے ذمہ ہیں، اُن کو ادا کرنا جیسا کہ بیوی کا اور چھوٹی اولاد کا خرچ ہے اور اپنی وسعت کے بعد محتاج رشتہ داروں کا خرچ وغیرہ۔

(تفسیر عزیزی)

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مال کے نقصانات بھی دو قسم کے ہیں، دینی اور دنیوی۔ دینی نقصانات تین قسم پر ہیں۔

(الف) معاصی کی کثرت کا سبب ہوتا ہے کہ آدمی اکثر و بیشتر اسی کی وجہ سے شہوتوں میں مبتلا ہوتا ہے اور ناداری اور فقر ان کی طرف متوجہ بھی نہیں ہونے دیتا۔ جب آدمی کو کسی معصیت کے حصول سے نااُمیدی ہوتی ہے تو دل اس طرف زیادہ متوجہ بھی نہیں ہوتا اور جب اپنے کو اس پر قادر سمجھتا ہے تو

کثرت سے ادھر توجہ رہتی ہے اور مال، قدرت کے بڑے اسباب میں سے ہے۔ اسی وجہ سے مال کا فتنہ فقر کے فتنہ سے بڑھا ہوا ہے۔

(ب) جائز چیزوں میں تنعّم کی کثرت کا سبب ہے۔ اچھے سے اچھا کھانا، اچھے سے اچھا لباس وغیرہ وغیرہ۔ بھلا مالدار سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ جو کی روٹی کھائے اور موٹا کپڑا پہنے، اور ان تنعمات کا حال یہ ہے کہ ایک چیز دوسرے کو کھینچتی ہے اور شدہ شدہ اخراجات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور آمدنی جب ان کو کافی نہیں ہوتی تو ناجائز طریقوں سے مال حاصل کرنے کی فکریں پیدا ہونے لگتی ہیں اور جھوٹ، نفاق وغیرہ بُری عادات کی بنیاد اسی سے پڑتی ہے کہ مال کی کثرت کی وجہ سے ملاقاتی بھی کثیر ہوں گے اور اُن کے تعلقات کی بقا اور حفاظت کے واسطے اس قسم کے اُمور کثرت سے پیدا ہوں گے اور تعلقات کی کثرت میں بغض وعداوت، حسد، کینہ وغیرہ اُمور طرفین میں کثرت سے پیدا ہوں گے۔ اور ایسے بے انتہا عوارض آدمی کے ساتھ لگ جائیں گے جن سے مال کے ہوتے ہوئے خلاصی دشوار ہے، اور غور کرنے سے یہ مضرتیں وسیع پیمانہ پر پہنچ جاتی ہیں اور ان سب کا پیدا ہونا مال ہی کے سبب سے ہوتا ہے۔

(ج) کم سے کم اس بات سے تو کوئی بھی مال دار خالی نہیں ہو سکتا کہ اس کا دل مال کی صلاح وفلاح کے خیال میں اللہ کے ذکر وفکر سے غافل رہے گا اور جو چیز اللہ جل شانہ سے غافل کر دے وہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ اسی واسطے حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ مال میں تین آفتیں ہیں۔ اول یہ کہ ناجائز طریقہ سے کمایا جاتا ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ اگر جائز طریقہ سے حاصل ہو، تو آپ نے فرمایا کہ بے جگہ خرچ ہوتا ہے۔ کسی نے عرض کیا اگر اپنے محل ہی پر خرچ کیا جائے، تو آپ نے فرمایا کہ اس کی اصلاح کی فکر اللہ جل شانہ سے تو مشغول کر ہی دے گی، اور یہ لاعلاج بیماری ہے کہ ساری عبادات کا لبِ لباب اور مغز اللہ جل شانہ کا ذکر وفکر ہے اور اس کے لیے فارغ دل کی ضرورت ہے، جبکہ صاحبِ جائداد شخص دن بھر، رات بھر کاشتکاروں کے جھگڑوں کی سوچ میں رہتا ہے۔ ان سے وصولی کے حساب کتاب میں رہتا ہے۔ شریکوں کے معاملات کی فکر میں رہتا ہے۔ کہیں اُن کے حصوں کا جھگڑا ہے، اُن سے پانی کی بانٹ پر جھگڑا ہے، کہیں ڈول بندیوں میں لڑائی ہے اور حکام اور اُن کے ایلچیوں کا قصہ علیحدہ ہر وقت کا ہے، نوکروں مزدوروں کی خبر گیری، ان کے کام کی نگرانی ایک مستقل مشغلہ ہے۔

اسی طرح تاجر کا حال ہے کہ اگر تجارت میں شرکت ہو تو شرکاء کی حرکتیں ہر وقت کی ایک مستقل مصیبت اور مستقل مشغلہ ہے اور تنہا تجارت ہو تو نفع کے بڑھانے کی فکر، ہر وقت اپنی محنت میں کوتاہی کا خیال، تجارت میں نقصان کی فکر، ایسے اُمور ہیں جو ہر وقت مسلط رہتے ہیں۔ مشاغل کے اعتبار سے سب سے کم وہ خزانہ ہے جو نقدی کی صورت میں اپنے پاس ہو، لیکن اس کی حفاظت اور اضاعت کا اندیشہ، چوروں کی فکر اور اس کے خرچ کرنے کے مصارف کی فکر، اور جن لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف لگی رہتی ہیں اُن کا خیال، ایسے تفکرات ہیں کہ جن کی کوئی انتہا نہیں ہے، اور یہی وہ سب دنیوی مضرات ہیں جو مال کے ساتھ لگی رہتی ہیں اور جس کے پاس بقدر ضرورت ہو وہ ان سب افکار سے فارغ۔

لنگی زیر لنگی بالا   نے غم دِزد نے غم کالا

''ایک لنگی نیچے ایک لنگی اوپر، نہ چور کا ڈر نہ پونجی کا۔'' (کہ اس کی کس طرح حفاظت کروں، روز افزوں اخراجات کس طرح پورے کروں) پس مال کا تریاق اس میں سے بقدر ضرورت اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کرنے کے بعد جو کچھ بچے، اس کو خیر کے مصارف میں خرچ کر دینا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ زہر ہی زہر ہے، آفت ہی آفت ہے۔ اس کی مثال بالکل سانپ کی سی ہے کہ جو لوگ اس کے پکڑنے کے ماہر ہیں، اس کے طریقوں سے واقف ہیں، اُن کے لیے اس کے پکڑنے میں کوئی نقصان نہیں، بلکہ وہ اس سے تریاق بنا سکتے ہیں اور دوسرے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن کوئی ناواقف ان ماہروں کی حرص کر کے سانپ کو پکڑے گا تو ہلاک ہو گا۔ اسی طرح متمول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حرص کر کے ہم لوگ اگر اس زہر کا استعمال کثرت سے کریں تو ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان حضرات کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق محض اعتقادی بات نہیں، اُن کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اس کی کھلی شہادت دیتا ہے کہ ان کے یہاں اس کی وقعت ایندھن سے زیادہ نہ تھی، ان کے لیے اس کا وجود حق تعالیٰ شانہ سے ذرا سی توجہ بھی ہٹانے والا نہ تھا اور اس کے باوجود اس سے ڈرتے تھے جیسا کہ اُن کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے۔

مال کی مثال دیتے ہوئے حضرت امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''مال میں نفع بھی ہے اور نقصان بھی ہے۔ اس کی مثال سانپ کی سی ہے کہ جو شخص اس کا منتر جانتا ہے وہ سانپ کو پکڑ کر اس کے دانت نکال دیتا ہے۔ پھر اس سے تریاق تیار کرتا ہے، اور اس کو دیکھ

کر کوئی ناواقف شخص اس کو پکڑ لے تو وہ سانپ اس کو کاٹ لے گا اور وہ ہلاک ہو گا اور اس کے زہر سے وہ شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو پانچ چیزوں کا اہتمام کرے۔

۱۔ یہ غور کرے کہ مال کا مقصد کیا ہے، کس غرض سے یہ پیدا کیا گیا، تا کہ صرف وہی غرض اس سے وابستہ رکھی جائے۔

۲۔ مال کے آنے اور حاصل کرنے کے طریق کی سختی سے نگرانی کرے، کہیں اس میں ناجائز طریقہ شامل نہ ہو جائے، مثلاً: ایسا ہدیہ جس میں رشوت کا شائبہ ہو، یا ایسا سوال جس میں ذلت کا اندیشہ ہو۔

۳۔ حاجت کی مقدار سے زائد اپنے پاس نہ رہنے دے۔ جتنی مقدار کی واقعی ضرورت ہے وہ تو مجبوری ہے، اس سے زیادہ کو فوراً خرچ کر دے۔

۴۔ خرچ کے طریق کی نگرانی کرے، کہیں بے محل خرچ نہ ہو جائے، ناجائز موقع پر خرچ نہ ہو جائے۔

۵۔ مال کی آمد میں، خرچ میں، اور بقدرِ ضرورت روکنے میں، ہر چیز میں نیت خالص رہے۔ محض اللہ کی رضا مقصود ہو۔ جو رکھے یا استعمال میں لاوے وہ محض اس نیت سے کہ اس سے اللہ کی اطاعت میں قوت ہو، جو ضرورت سے زائد ہو اس کو لغو و بے کار سمجھ کر جلد خرچ کر دے۔ اس کو ذلیل سمجھ کر خرچ کرے، وقیع نہ سمجھے۔

ان شرائط کے ساتھ مال کا ہونا مضر نہیں ہے۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص ساری دنیا کا مال محض اللہ تعالیٰ کے واسطے لیتا ہے (اپنی غرض سے نہیں) تو وہ زاہد ہے۔ اور اگر بالکل ذرا سا بھی نہیں لیتا اور یہ نہ لینا اللہ کے واسطے نہیں ہے (بلکہ کسی دنیوی غرض، حبِ جاہ وغیرہ کی وجہ سے ہے) تو وہ دنیادار ہے۔" (احیاء)

غرض بہت سی روایات میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ مال فی حدِ ذاتہ بری چیز نہیں ہے، اچھی چیز ہے، کار آمد ہے اور بہت سے دینی اور دنیوی فوائد اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی لیے روزی کے کمانے کی، مال کے حاصل کرنے کی ترغیبات بھی احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ لیکن چوں کہ اس میں ایک زہریلا اور سمی مادہ ہے اور قلوب عام طور سے بیمار ہیں اس لیے کثرت سے قرآن پاک کی آیات اور احادیثِ شریفہ

میں اس کی زیادتی اور کثرت سے بچنے کی ترغیبیں آئی ہیں۔

مال کی کثرت سے عموماً نقصانات زیادہ پہنچتے ہیں، اور یہ اس وجہ سے ہے کہ ہمارے قلوب ایسے صاف نہیں ہیں کہ وہ اس کے نشہ سے متاثر نہ ہوں۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا ہے جو پانی پر چلے اور اس کے پاؤں پانی میں تر نہ ہوں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہی حال دنیا دار کا ہے کہ اُس کا گناہوں سے بچنا مشکل ہے (مشکوٰۃ)۔

اور مشاہدہ بھی یہی ہے کہ بخل، حسد، کبر، عجب، کینہ، ریا، تفاخر وغیرہ قلبی امراض اور گناہ جتنے ہیں وہ مال کی وجہ سے بہت جلد اور بہت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح آوارگی، شراب نوشی، قمار بازی، سود خوری وغیرہ اور مختلف قسم کے شہوانی گناہ بھی اس کی وجہ سے بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔

پھر اس کی طبعی محبت قلوب میں اس درجہ جگہ پکڑے ہوئے ہے کہ آدمی کے پاس جتنا بھی مال زیادہ سے زیادہ ہو جائے، اس پر ہمیشہ زیادتی کا طالب اور اس کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اور تجربہ ہے کہ کوئی شخص کسی مقدار پر بھی قناعت کرنے والا نہیں ہے، الّا ماشاءاللہ۔ اسی وجہ سے قرآن پاک اور احادیث میں کثرت سے قناعت کی ترغیبات دی گئی ہیں کہ یہ جوع البقر کچھ کم ہو۔ اسی وجہ سے دنیا کی حقیقت اور اس کی گندگی اور ناپائیداری واضح کی گئی کہ اس سے محبت میں کمی ہو، کہ جو چیز ہے بہر حال بہت جلد زائل ہونے والی ہے، اس سے آدمی کیا دل لگائے۔ دل لگانے کی چیز صرف وہی ہے جو ہمیشہ رہنے والی اور ہمیشہ کام آنے والی ہو اور اسی وجہ سے صبر کی تاکید اور ترغیب کثرت سے وارد ہوئی کہ آدمی اس کی کمی کو مطلقاً مصیبت نہ سمجھے، بلکہ اس میں بھی بسا اوقات اللہ کی بڑی حکمتیں مضمر ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے: وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ ”اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے رزق کی زیادتی (وسعت) فرمادے تو لوگ زمین میں سرکشی شروع کر دیں۔“ (سورۂ شوریٰ: آیت ۲۷)

چناں چہ تجربہ بھی یہی ہے کہ جہاں اس کی کثرت ہے وہیں حد سے زیادہ فسادات ہیں اور چوں کہ اس کی فراوانی مقصود نہیں اور لوگوں کے دل اس کی طرف طبعاً متوجہ ہوتے ہیں، اسی وجہ سے سوال کرنے کی ممانعت، اس کی قباحت کثرت سے ذکر کی گئی کہ آدمی مال کی محبت اور کثرت کی فکر میں

بلا مجبوری بھی سوال کرنے لگتا ہے کہ اس میں محنت تو کچھ کرنی نہیں پڑتی، ذرا سی زبان ہلانے سے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے، جس سے مال میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بندگی سے قلبی غنیٰ حاصل ہوتا ہے

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ

ابْنَ اٰدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِیْ اَمْلَاْ صَدْرَكَ غِنًی وَاَسُدَّ فَقْرَكَ وَاِنْ لَّا تَفْعَلْ

مَلَاْتُ یَدَكَ شُغْلًا وَلَمْ اَسُدَّ فَقْرَكَ

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ شانہ عم نوالہ کا فرمان ہے کہ اے آدم کی اولاد! تو میری عبادت کے لیے فارغ ہو جا، میں تیرے سینہ کو غنا سے پر کر دوں گا اور تیرے فقر کو زائل کر دوں گا اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو میں تجھے مشاغل میں پھانس دوں گا اور تیرا فقر زائل نہیں کروں گا۔"

(رواہ احمد وابن ماجہ کذا فی المشکوٰۃ. وزاد فی الترغیب الترمذی وابن حبان والحاکم صححہ وفی الباب عن عمران وغیرہ فی الترغیب)

ف: متعدد احادیث میں مختلف الفاظ سے یہ مضمون وارد ہوا ہے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص ہمہ تن اللہ جل شانہ کی طرف متوجہ ہو جائے، اُسی کا بن جائے تو حق تعالیٰ شانہ، اُس کی ہر ضرورت کو خود پورا فرماتے ہیں اور ایسی جگہ سے اُس کو روزی عطا فرماتے ہیں کہ اُس کو گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو شخص دنیا کے پیچھے پڑ جاتا ہے، اُسی کی فکر میں ہر وقت رہتا ہے، حق تعالیٰ شانہ اُس کو دنیا کے حوالے کر دیتے ہیں کہ تو دنیا سے نبٹ لے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جس شخص کی پوری توجہ اور آخری مقصد دنیا کمانا ہو، اسی کے لیے سفر کرتا ہے، اُسی کا خیال دل میں رہتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ فقر و فاقہ (کا خوف) اس کی آنکھ کے سامنے کر دیتے ہیں (ہر وقت اس سے ڈرتا رہتا ہے کہ آمدنی تو بہت کم ہے، کیا ہو گا، کیونکر گزر چلے گا) اور اس کے اوقات کو (اسی فکر و تردد میں) پریشان کر دیتے ہیں، اور ملتا اتنا ہی ہے جتنا کہ مقدر ہوتا ہے۔ اور جس شخص کی توجہ اور حقیقی مقصد آخرت ہوتی ہے، اُسی کے کاموں کے لیے سفر کرتا ہے، اُسی کا خیال دل میں رہتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ اُس کو دنیا سے بے نیازی، بے فکری اور استغنا کی صفت عطا فرما دیتے ہیں اور اس کے احوال کو مجتمع کر دیتے ہیں، اور دنیا خود بخود ذلیل ہو کر اُس

کے پاس آتی ہے۔ (ترغیب)

خود بخود ذلیل ہو کر آنے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز مقدر ہے وہ تو آکر رہے گی۔ اس لیے کہ بہت سی احادیث میں یہ مضمون گزر چکا ہے کہ روزی خود آدمی کو ایسے تلاش کرتی ہے جیسے کہ موت آدمی کو تلاش کرتی ہے۔ جب وہ خود اس کی تلاش میں ہے، اس کے پاس آنے پر مجبور ہے اور اس کی طرف سے استغنا ہے تو وہ بہر حال اس کے پاس آکر رہے گی۔ اس سے زیادہ ذلت کیا ہو گی کہ وہ خود اس کے پاس آئے اور یہ لا پروائی برتے۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ارشاد فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد خیف (منیٰ کی مسجد) میں وعظ فرمایا۔ اس میں حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ جس شخص کا مقصد دنیا بن جائے، حق تعالیٰ شانہ اس کے احوال کو پریشان اور منتشر کر دیتے ہیں اور فقر (کا خوف) ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور دنیا تو جتنی مقدر ہے اس سے زیادہ ملتی نہیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص دنیا کے پیچھے پڑ جائے اُس کا حق تعالیٰ شانہ سے کوئی واسطہ نہیں، اور جس کو مسلمانوں کی (ان کی بھلائی اور خیر خواہی کی) فکر نہ ہو، اس کو مسلمانوں سے کوئی واسطہ نہیں، اور جو (دنیوی اغراض کے لیے) اپنے آپ کو خوشی سے ذلیل کرے اُس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں (محض چار پیسے کے واسطے یا کسی اور دنیوی غرض کے لیے اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے ذلیل کرنا، یقیناً اپنی قدر وقیمت کا نہ پہچاننا ہے اور اپنے اُن بزرگوں کے نام پر دھبہ لگانا ہے جن کی طرف اس کی نسبت ہے اور سب سے اونچی نسبت فخر الرسل کی امت میں ہونا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ چار چیزیں بد بختی کی علامت ہیں:

آنکھوں کا خشک ہونا (کہ اللہ کے خوف سے کسی وقت بھی آنسو نہ ٹپکے)، دل کا سخت ہونا (کہ اپنی آخرت کے لیے یا کسی دوسرے کے لیے کسی وقت بھی نرم نہ پڑے)، آرزؤوں کا لمبا ہونا اور دنیا کی حرص۔ (ترغیب)

دنیا سے محبت رکھنے والا اپنی آخرت کو برباد کرتا ہے

عَنْ اَبِیْ مُوْسیٰ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ اَحَبَّ دُنْیَاہُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِہٖ

وَمَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَہٗ اَضَرَّ بِدُنْیَاہُ فَاٰثِرُوْا مَا یَبْقٰی عَلٰی مَا یَفْنٰی

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص دنیا سے محبت رکھتا ہے وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے، اور جو اپنی آخرت سے محبت رکھتا ہے وہ (صورت کے اعتبار سے) دنیا کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پس (جب یہ ضابطہ ہے تو) جو چیز ہمیشہ رہنے والی ہے (یعنی آخرت) اس کو ترجیح دو، اس چیز پر، جو بہر حال فنا ہو جانے والی ہے۔" (مشکوٰۃ)

ف: دنیا کی زندگی چاہے کتنی ہی زیادہ ہو جائے، بہر حال ختم ہونے والی ہے اور اس کا مال و متاع چاہے کتنا ہی زیادہ سے زیادہ ہو جائے ایک دن چھوٹنے والا ہے۔ موت سے چھوٹ جائے چاہے ضائع ہو جانے سے چھوٹ جائے، اور آخرت کی زندگی کبھی بھی ختم ہونے والی نہیں ہے، اس کی نعمتیں ہمیشہ، ہمیشہ رہنے والی ہیں۔

ایسی حالت میں کھلی ہوئی بات ہے کہ آدمی میں اگر ذرا سی بھی عقل ہو تو ایسی چیز کو اختیار کرے جو ہمیشہ اس کے پاس رہے۔ ایسی چیز کے پیچھے پڑنا جو کسی طرح بھی اپنے پاس ہمیشہ نہیں رہ سکتی، بے وقوفی کی انتہا ہے۔ مگر ہم لوگوں کی عقل پر غفلت کا پردہ پڑا ہوتا ہے۔ اس اسٹیشن کے ویٹنگ روم کی زیب وزینت پر دل لگائے بیٹھے ہیں اور قیام صرف اتنا ہے کہ جب ریل گاڑی آجائے، اس پر سوار ہو جانا ہے۔ اتنے ذرا سے وقت میں اگر آدمی اپنے سفر کی تیاری میں مصروف رہے، اپنے سامانِ سفر کو تیار کرلے، جو چیزیں وطن میں پہنچ کر کام آنے والی ہیں اُن کو فراہم کرلے تو یقیناً اس کے لیے کار آمد ہیں اور اگر وہ اپنا یہ قیمتی وقت اور تھوڑی سی فرصت وہاں کے سیر سپاٹے میں خرچ کردے، اپنا سامان بکھرا پڑا رہے اور خود ویٹنگ روم کی صفائی اور اس کے فرنیچر کو قرینہ سے رکھنے میں لگ جاوے یا اس سے بڑھ کر حماقت یہ کرے کہ اس میں لٹکانے کے واسطے آئینے اور نقشے خریدنے میں لگ جائے تو اپنا سامان بھی کھوئے گا اور اپنی متاع بھی ضائع کرے گا۔

اس حدیثِ پاک میں دنیا سے محبت نہ کرنے پر تنبیہ ہے کہ محبت ایسی سخت چیز ہے کہ جس کے ساتھ بھی لگ جائے، رفتہ رفتہ آدمی کو اُسی کا بنا دیتی ہے۔ اسی لیے آخرت کے ساتھ محبت پیدا کرنے کی ترغیب فرمائی ہے اور دنیا سے محبت پر تنبیہ ہے کہ دنیا سے محبت رکھنے والا اگرچہ آخرت کے اعمال اس وقت کرتا ہو لیکن اس ناپاک دنیا کی محبت رنگ لائے بغیر نہ رہے گی اور آہستہ آہستہ آخرت کے کاموں میں تساہل، حرج اور نقصان پیدا کر دے گی۔ بزرگوں کا ارشاد ہے کہ جو شخص دنیا کو محبوب رکھتا ہے، سارے پیر و مرشد مل کر بھی اس کو ہدایت نہیں کرسکتے، اور جو شخص دنیا کو ترک کر دیتا ہے(اُس سے نفرت کرتا ہے)اُس کو سارے مفسد مل کر بھی گمراہ نہیں کرسکتے۔ (مظاہر حق)

حضرت براء رضی اللہ عنہ، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص دنیا میں اپنی شہوتوں کو پورا کرتا ہے وہ آخرت میں اپنی خواہشات کے پورا کرنے سے محروم ہوتا ہے، اور جو شخص دنیا میں ناز پروردہ(رئیس)لوگوں کی زیب وزینت کی طرف(للچائی ہوئی) آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ آسمانوں کی بادشاہت میں ذلیل سمجھا جاتا ہے، اور جو شخص کم سے کم روزی پر صبر و تحمل کرتا ہے وہ جنت الفردوس میں اعلیٰ ٹھکانا پکڑتا ہے۔ (درمنثور)

حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ لَآ اِلٰہ اِلّا اللہ کا کلمہ اللہ کی ناراضگی سے بندوں کو محفوظ رکھتا ہے، جب تک کہ دنیا کی تجارت کو آخرت کی تجارت پر ترجیح نہ دیں، اور جب دنیا کی تجارت کو آخرت کی تجارت پر ترجیح دینے لگیں، پھر لَآ اِلٰہ اِلّا اللہ کہیں تو یہ کلمہ اُن پر یہ کہہ کر لوٹا دیا جاتا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو(یعنی تمہارا اِقرار جھوٹا ہے، محض زبانی جمع خرچ ہے)۔

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دنیا اُس شخص کا گھر ہے جس کا(آخرت میں)گھر نہیں اور دنیا اُس شخص کا مال ہے جس کا(آخرت میں)مال نہیں، اور دنیا کے لیے وہ شخص مال جمع کرتا ہے جس کو بالکل عقل نہیں ہے۔ (درمنثور)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دنیا خود ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب ملعون ہے، بجز اس کے کہ جو حق تعالیٰ شانہ کے لیے ہو۔ (جامع الصغیر)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ بعض لوگ قیامت کے دن اتنے زیادہ اعمال لے کر آئیں گے جیسا کہ ملک عرب کے پہاڑ، لیکن وہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ کسی نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ کیا یہ لوگ نمازی ہوں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نمازی بھی ہوں گے، روزہ دار بھی ہوں گے بلکہ تہجد گزار ہوں گے، لیکن جب دنیا کی کوئی چیز (دولت، عزت وغیرہ) اُن کے سامنے آجائے تو ایک دم اس پر کود پڑتے ہیں (جائز ناجائز کی بھی پروا نہیں کرتے)۔

حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحت اپنے بیٹے کو

بیٹا! جاہل سے دوستی نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ اس کی جہالت کی باتیں تمہیں اچھی معلوم ہونے لگیں، اور حکیم سے دشمنی مول نہ لو، ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے اعراض کرنے لگے (اور پھر اُس کی حکمتوں سے تم محروم ہو جاؤ)۔ بیٹا! اپنا کھانا متقی لوگوں کے سوا کسی کو نہ کھلاؤ۔

۱۔ دنیا میں اپنے آپ کو فقط اتنا ہی مشغول رکھنا جتنی زندگی باقی ہے (اور وہ آخرت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں)۔

۲۔ حق تعالیٰ شانہ کی طرف جتنی تمہیں احتیاج ہے اتنی ہی اس کی عبادت کرنا (اور ظاہر ہے کہ آدمی ہر چیز میں اسی کا محتاج ہے)۔

۳۔ آخرت کے لیے اس مقدار کے موافق تیاری کرنا جتنی مقدار وہاں قیام کا ارادہ ہو (اور ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد تو وہاں کے علاوہ کوئی مقام ہی نہیں)۔

۴۔ جب تک تمہیں جہنم سے خلاصی کا یقین نہ ہو جائے اس وقت تک اس سے خلاصی کی کوشش کرتے رہنا (ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی سنگین مقدمہ میں ماخوذ ہو تو جب تک اس کو مقدمہ کے خارج ہو جانے کا یقین نہ ہو، ہر وقت کوشش میں لگا رہتا ہے)۔

۵۔ گناہوں پر اتنی جرأت کرنا جتنا جہنم کی آگ میں جلنے کا حوصلہ اور ہمت ہو (کہ گناہوں کی سزا ضابطہ کی چیز ہے اور مراحم خسروانہ کی خبر نہیں)۔

۶۔ جب کوئی گناہ کرنا چاہو، ایسی جگہ تلاش کر لینا جہاں حق تعالیٰ شانہ اور اس کے فرشتے نہ دیکھیں (کہ خود حاکم کے سامنے، سی آئی ڈی کے عملہ کے سامنے بغاوت کا انجام معلوم ہے)۔ (تنبیہ الغافلین)

یہ چند نصائح حضرت لقمان علیہ السلام کی تبعاً ذکر کر دی گئیں۔ مقصود ان کی نصائح میں سے بھی وہی مضمون ہے جو پہلے سے میں لکھ رہا تھا کہ جو شخص دنیا سے محبت رکھتا ہے وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے۔

دنیا حضرات اولیائے کرام کی نظر میں

مالک بن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تو جس قدر دنیا کا غم کرے گا اتنا ہی آخرت کا غم تیرے دل سے نکل جائے گا، اور جتنا تو آخرت کا غم کرے گا اتنا ہی دنیا کا غم تیرے دل سے نکل جائے گا۔

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو حق تعالیٰ شانہ کی بندگی کرنے کے باوجود صرف دنیا کی محبت نے بت پرستی تک پہنچادیا تھا۔ اُن کا یہ بھی ارشاد ہے کہ آدمی اپنے مال کو تو ہمیشہ کم سمجھتا ہے مگر اپنے عمل کو کبھی کم نہیں سمجھتا۔ دین میں کوئی مصیبت آجائے تو خوش رہتا ہے، دنیا میں کوئی مصیبت پیش آجائے تو گھبرا جاتا ہے۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ دنیا میں داخل ہونا تو بہت آسان ہے، لیکن اس سے نکلنا بہت مشکل ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں: تعجب ہے اس شخص پر جس کو موت کا یقین ہو کہ وہ بہر حال آنے والی ہے، نہ معلوم کب آجائے، پھر بھی کسی بات سے کیونکر خوش ہوتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص پر جس کو اس کا یقین ہو کہ جہنم حق ہے (اور اپنا حشر معلوم نہیں) پھر کس طرح وہ کسی بات پر ہنستا ہے۔ تعجب ہے اس شخص پر جو دنیا کے ہر وقت کے انقلابات دیکھتا ہے، پھر کیسے دنیا کی کسی بات پر مطمئن ہوتا ہے۔ تعجب ہے اُس شخص پر جس کو یقین ہے کہ تقدیر برحق ہے (جو کچھ مقدر میں ہے، وہ مل کر رہے گا) پھر کیوں مصیبتیں اُٹھاتا ہے۔

وہب بن منبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو شخص دنیا کی کسی چیز سے خوش ہوتا ہے وہ حکمت کے خلاف کرتا ہے، اور جو شخص شہوتوں کو اپنے قدم کے نیچے دبالیتا ہے کہ اُن کو سر بھی نہیں اُٹھانے دیتا، شیطان ایسے شخص کے سایہ سے بھی ڈرتا ہے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے ایک دینی بھائی کو نصیحت فرمائی کہ دنیا ایسا کیچڑ ہے جس میں پاؤں پھسل جاتے ہیں (لہٰذا بچ بچ کر قدم رکھنا چاہیے اور پاؤں کی لغزش سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے)۔ دنیا ذلت کا گھر ہے۔ اس کی آبادی کا منتہا بربادی ہے۔ اس میں رہنے والوں کو تنہا قبروں تک جانا ہے۔ اس کا اجتماع، افتراق پر موقوف ہے۔ اس کی وسعت فقر کی طرف لوٹا دی گئی۔ اس کی کثرت مشقت میں پڑنا اور اس کی تنگی سہولت میں پہنچنا ہے۔ پس ہمہ تن اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف متوجہ رہو اور اللہ جل شانہ نے جتنا رزق عطا فرما دیا، اس پر راضی رہو۔ اپنی آخرت میں سے دنیا کے لیے قرض نہ لو۔ (یعنی ایسی چیزیں اختیار نہ کرو جن کا بدلہ آخرت میں ادا کرنا پڑ جائے اور وہاں ضرورت کے موقع پر کمی پڑ جائے) اس لیے کہ یہاں کی زندگی بمنزلہ ایک سایہ کے ہے جو عنقریب ختم ہونے والا ہے، اور بمنزلہ ایک دیوار کے ہے جو جھک گئی اور عنقریب گرنے والی ہے۔ نیک عمل کثرت سے کرتے رہو اور اُمیدیں بہت کم باندھو۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ تمہیں اگر خواب میں کوئی شخص ایک درہم (ساڑھے تین آنے) دے، وہ زیادہ پسند ہے یا کوئی شخص تمہیں جاگنے کی حالت میں ایک دینار (اشرفی) دے وہ زیادہ پسند ہے۔ اُس نے عرض کیا کہ (یہ تو کھلی بات ہے) جاگتے ہوئے دینار زیادہ محبوب ہے۔ حضرت ابراہیم رحمہ اللہ نے فرمایا: تم جھوٹ کہتے ہو، اس لیے کہ جس چیز کو تم دنیا میں محبوب رکھتے ہو، اس کو تم گویا خواب میں پسند کر رہے ہو، اور آخرت کی جس چیز کو پسند نہیں کر رہے ہو، اس سے گویا جاگنے میں اعراض کر رہے ہو۔

یحییٰ بن معاذ کہتے ہیں کہ تین آدمی عقل مند ہیں۔ ایک وہ شخص جو دنیا کو اس سے پہلے خود چھوڑ دے کہ دنیا اس کو چھوڑے۔ دوسرا وہ شخص جو اپنی قبر کی تیاری اس سے پہلے کر لے کہ اُس میں داخل ہونے کا وقت آ جائے۔ تیسرا وہ شخص جو اپنے مولیٰ کو اس سے پہلے پہلے راضی کر لے کہ اُس سے ملاقات کرے۔

امام غزالی رحمہ اللہ مذمت دنیا کی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ تمام تعریفیں اور حمد ایسی پاک ذات کے لیے ہیں جس نے اپنے دوستوں کو دنیا کے مہلکات اور اُس کی آفات سے واقف کر دیا اور دنیا کے عیوب اور اس کے رازوں کو اپنے دوستوں پر روشن کر دیا۔ یہاں تک کہ ان حضرات نے دنیا کے احوال کو

پہچان لیا اور اس کی بھلائی اور برائی کا موازنہ کر کے یہ جان لیا کہ اس کی برائیاں اس کی بھلائی پر غالب ہیں اور جو اُمیدیں دنیا سے وابستہ ہیں وہ اُن اندیشہ ناک چیزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو اُس پر مرتب ہیں۔

دنیا ایک چٹ پٹی عورت کی طرح سے لوگوں کو اپنے حسن و جمال میں گرفتار کرتی ہے اور اپنی بدکرداری سے اپنے وصال کے خواہشمندوں کو ہلاک کرتی ہے۔ یہ اپنے چاہنے والوں سے بھاگتی ہے، اُن کی طرف توجہ کرنے میں بڑی بخیل ہے اور اگر متوجہ بھی ہوتی ہے تو اس کی توجہ میں بھی آفت اور مصیبت ہے، امن نہیں ہے۔ اگر ایک دفعہ احسان کرتی ہے تو ایک سال تک برائیاں کراتی رہتی ہے۔ جو اس کے دھوکہ میں آجاتا ہے اس کا انجام ذلت ہے اور جو اس کی وجہ سے تکبر کرتا ہے وہ آخر کار حسرت وافسوس کی طرف چلتا ہے۔ اس کی عادت اپنے عشاق سے بھاگنا ہے اور جو اُس سے بھاگے، اُس کے پیچھے پڑنا ہے۔ جو اس کی خدمت کرے اس سے علیحدہ رہتی ہے اور جو اس سے اعراض کرے اس سے ملاقات کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی صفائی میں بھی تکدر ہے، اس کی خوشی میں بھی رنج و غم لازم ہیں۔ اس کی نعمتوں کا پھل حسرت وندامت کے سوا کچھ نہیں۔ یہ بڑی دھوکہ دینے والی مکار عورت ہے۔ بڑی بھگوڑی اور ایک دم اُڑ جانے والی ہے۔ یہ اپنے چاہنے والوں کے لیے نہایت زیب وزینت اختیار کرتی ہے اور جب وہ اچھی طرح اس میں پھنس جاتے ہیں تو دانت دکھانے لگتی ہے اور اُن کے منظم احوال کو پریشان کر دیتی ہے اور اپنی نیرنگیاں اُن کو دکھاتی ہے، پھر اپنا زہر قاتل اُن کو چکھاتی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی دشمن ہے، اس کے دوستوں کی دشمن ہے۔ اُس (اللہ) کے دشمنوں کی دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دشمنی اس طرح سے کہ اس کی طرف چلنے والوں کی رہزنی کرتی ہے۔ اس کے دوستوں کے ساتھ دشمنی اس طرح کرتی ہے کہ اُن کے دل لبھانے کے لیے طرح طرح کی زینتیں اپنے اوپر لادتی ہے جس سے وہ اس کی طرف ملتفت ہو کر اس سے قطع تعلق پر صبر کا کڑوا گھونٹ پیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے دشمنی اس طرح کرتی ہے کہ اپنے مکر وفریب سے اُن کو شکار کرتی ہے اور جب وہ اس کی دوستی پر بھروسہ کرنے لگتے ہیں تو یہ ایسے وقت اُن کو ایک دم اَدھر (لٹکی ہوئی) میں چھوڑ دیتی ہے جس وقت کہ وہ اس کے سخت محتاج ہوں، جس سے وہ دائمی حسرت اور دائمی عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

قرآن پاک کی آیاتِ کریمہ اور احادیثِ شریفہ میں کثرت سے اس کی مذمت وارد ہوئی ہے۔ بلکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت اسی پر تنبیہ کے لیے ہوئی ہے کہ اس سے دل نہ لگایا جائے۔ حضور اقدس ﷺ ایک مرتبہ ایک مردہ بکری کے پاس سے گزرے۔ حضور اقدس ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطاب فرماکر ارشاد فرمایا: کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اس مری ہوئی بکری کی کوئی وقعت اس کے مالک کے یہاں ہوگی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اس کی بے وقعتی اسی سے معلوم ہوتی ہے کہ اس کو پھینک دیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ ذلیل اور بے وقعت ہے جتنی یہ مردہ بکری اپنے مالک کے نزدیک ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ شانہ کے نزدیک دنیا کی وقعت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ ملتا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ دنیا کی محبت ہر خطا کی اساس اور بنیاد ہے۔

دنیا کی محبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نظر میں

حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ ایک حقیقی بات تم سے کہتا ہوں کہ جیسے بیمار آدمی کو تکلیف کی شدت کی وجہ سے کھانے میں لذت نہیں آتی، اسی طرح دنیادار کو عبادت میں لذت نہیں آتی، اور جس طرح جانور پر اگر سواری کرنا چھوڑ دیا جائے تو اس سے اس کا مزاج سخت ہو جاتا ہے اور سواری کی عادت اس کو نہیں رہتی۔ اسی طرح اگر موت کے ذکر اور عبادت کی مشقت کے ساتھ دلوں کو نرم نہ کیا جائے تو وہ سخت ہو جاتے ہیں، ان میں قساوت پیدا ہو جاتی ہے، اور ایک حق بات کہتا ہوں کہ مشکیزہ جب تک پھٹے نہیں، وہ شہد (پانی وغیرہ) کا برتن بنتا ہے، لیکن جب وہ پھٹ جاتا ہے تو پھر شہد اس میں نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح دل کو جب تک شہوتوں سے پھاڑا نہ جائے یا طمع سے اس کو خراب نہ کیا جائے یا نعمتوں سے اس کو سخت نہ کیا جائے تو وہ حکمت کا برتن بنتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ دنیا کی شہوتیں اس وقت بڑی لذیذ معلوم ہوتی ہیں لیکن منتہا کے اعتبار سے موت کے وقت اتنی ہی مکروہ اور ناگوار ہوں گی۔

حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ دنیا کو اپنا سردار نہ بناؤ وہ تمہیں اپنا غلام بنالے گی۔ اپنا خزانہ ایسی پاک ذات کے پاس محفوظ کر دو، جہاں ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ دنیا کے خزانوں میں اضاعت کا اندیشہ ہر وقت ہے اور اللہ تعالیٰ شانہ کے خزانہ پر کوئی آفت نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ دنیا کی خباثت کے آثار میں سے یہ بات بھی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی ہے، اور اس کی خباثت کی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ آخرت اس کو چھوڑے بغیر نہیں ملتی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیا کی محبت ہر خطا کی جڑ ہے، اور تھوڑی دیر کی خواہش بہت طویل زمانہ کے رنج وعذاب کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ان کا یہ بھی ارشاد ہے کہ دنیا بعضوں کی طالب ہوتی ہے، بعضوں کی مطلوب ہوتی ہے۔ جو آخرت کے طالب ہیں اُن کی تو یہ خود طالب ہوتی ہے کہ جھک مار کر اُن کی روزی اُن کو پہنچاتی ہے، اور جو اس کی طلب میں لگ جاتے ہیں آخرت اُن کو خود طلب نہیں کرتی حتیٰ کہ موت آ کر اُن کی گردن دبالیتی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ

حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام ایک مرتبہ اپنے لشکر کے ساتھ تشریف لے جارہے تھے۔ پرند اُن پر سایہ کیے ہوئے تھے اور جن وانس دائیں بائیں تھے۔ ایک عابد پر گزرے۔ اُس نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے بہت بڑی سلطنت آپ کو عطا فرمارکھی ہے (کہ جن وانس، چرند وپرند سب پر آپ کی حکومت ہے)۔ حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ مسلمان کے اعمال نامہ میں ایک مرتبہ سبحان اللہ سلیمان کے سارے ملک سے زیادہ افضل ہے اس لیے کہ یہ ساری سلطنت بہت جلد ختم ہوجائے گی اور سبحان اللہ کا ثواب ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

زہد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے ارشادات

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام برائیوں کو ایک کوٹھڑی میں بند کررکھا ہے اور دنیا کی محبت کو اس کی کنجی بنایا ہے اسی طرح تمام نیکیوں کو ایک کوٹھڑی میں بند کررکھا ہے جس کی چابی زہد مقرر کی ہے۔

مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے تھے دنیا کی محبت ایمان کی چاشنی کو دل سے نکال دیتی ہے۔

وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے تھے "جو دنیا کا مالک ہوا وہ مصیبت میں گرفتار ہوگیا اور جس نے اس سے محبت کی وہ اس کا غلام بن گیا۔"

ابو حازم رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جس نے حلال طریق سے دنیا کمائی اور اس کو رضائے الٰہی میں خرچ کیا اس نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو راضی کر لیا۔

یحییٰ بن معاذ فرماتے تھے کہ دنیا شیطان کی دکان ہے پس تم اس کی دکان سے کچھ نہ چراؤ ورنہ وہ تجھے تلاش کر کے پکڑ لے گا۔

مروی ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام فوت ہوئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان سے سوال کیا: اے تمام انبیا سے لمبی عمر والے! آپ نے دنیا کو کیسا پایا؟ آپ نے فرمایا: ایسے گھر کی طرح جس کے دو دروازے ہیں کہ ایک میں گھسا ہوں اور دوسرے سے نکل آیا ہوں۔

یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ دنیا ایک دلہن ہے اور اس کا محِب اس کو کنگھی کرتا ہے مگر زاہد اس کے بالوں کو نوچتا ہے، اس کے منہ کو سیاہ کرتا ہے، اس کے کپڑے پھاڑتا ہے اور اس کے زیور کو توڑتا ہے۔

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت یہ ہے کہ جس سے اللہ جل جلالہ ناراض ہو اس سے وہ بھی ناخوش ہو، پس جو اللہ کی محبت کا مدعی ہو اور پھر دنیا سے محبت رکھے وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا ناپسند ہے۔

رابعہ عدویہ رحمہا اللہ تعالیٰ کے پاس کچھ لوگ آئے اور دنیا کی خوب مذمت کرنے لگیں۔ رابعہؒ نے کہا: دنیا کا ذکر چھوڑو، اگر تمہارے دلوں میں اس کی عزت نہ ہوتی تو تم اس کا اتنا ذکر ہی کیوں کرتے۔

مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر جسم میں بیماری پورے طور پر مستحکم ہو جائے تو اسے کھانا پینا اچھا نہیں لگتا، یہی کیفیت دل کی ہے کہ اگر محبتِ دنیا سے پُر ہو جائے تو اس پر نصیحت کچھ اثر نہیں کرتی۔

(اولیا اللہ کے اخلاق:۱۷۰ تا ۱۷۲)

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے کانوں سے حضرت فضیل کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ طالب دنیا رسوا اور ذلیل ہے اور جب میں نے اپنے لیے کچھ نصیحت کرنے کے متعلق عرض کیا تو فرمایا کہ خادم بنو مخدوم نہ بنو، کیوں کہ خادم بننا ہی وجہ سعادت ہے۔

(تذکرۃ الاولیا:۵۷)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا وقت وفات قریب آیا تو وہ رونے لگے اور فرمایا رسول اللہ ﷺ نے وصیت کی تھی کہ تمہارا دنیاوی سامان اتنا ہونا چاہیے جتنا سوار کا توشہ، لیکن افسوس کہ میں نے اس قدر مال ومتاع جمع کر لیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو تمام اسباب کی قیمت صرف پندرہ درہم لگائی گئی۔ (اولیاء اللہ کے اخلاق:۴۶)

احمد بن حرب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ زمین دو آدمیوں پر تعجب کرتی ہے۔ ایک اس شخص پر جو اپنے سونے کے لیے بستر کرے اور اس کو گدگدا بنائے۔ زمین اسے کہتی ہے اے ابن آدم! تو اس بات کو کیوں یاد نہیں کرتا کہ تجھے میرے اندر زمانہ دراز تک بستر کے بغیر لیٹنا ہے، بوسیدہ ہو جانا ہے۔ دوسرے اس شخص پر تعجب کرتی ہے جو اپنے بھائی سے کسی قطعہ زمین پر تنازع کرتا ہے۔ زمین اسے کہتی ہے تو اس زمین کے پہلے مالکوں پر کیوں نہیں غور کرتا کہ کتنے لوگ اس کے مالک بن کر جا چکے ہیں اور اس میں قیام نہیں کر سکے۔ (اولیاء اللہ کے اخلاق:۴۸)

یونس بن عبید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے نزدیک ایک بار کی تسبیح و تہلیل دنیا ومافیہا سے بہتر نہ ہو وہ ان لوگوں سے ہے جس کے لیے دنیا آخرت سے مقدم ہے۔

سیدی شیخ ابو الحسن شاذلی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ دنیا ابلیس کی بیٹی ہے۔ جس نے اس سے نکاح کیا اس کے گھر اس کے باپ ابلیس کی آمد ورفت بڑھ جاتی ہے اور جب اس سے مجامعت کر لیتا ہے تو پھر اس کا باپ ابلیس بالکل وہیں قیام کر لیتا ہے۔ میں کہتا ہوں دنیا کی طرف پیغام نکاح بھیجنے سے مراد اس کی خواہش کرنا ہے اور مجامعت سے مراد اس کا جمع کرنا ہے یعنی ضرورت سے زیادہ مال کو سوائے غرضِ شرعی کے جمع کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یہ چاہے کہ وہ ابلیس کی بیٹی سے شادی بھی کرے اور ابلیس اس کے گھر میں نہ رہے وہ امر محال کا طالب ہے، اسی وجہ سے جن لوگوں کو نماز اور وضو میں اور دیگر تمام اعمالِ صالحہ میں شیطانی وساوس پیدا ہوتے ہیں ان میں سے اکثر وہ ہیں جو دنیا سے دل سے محبت کرتے ہیں، اور سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ (اولیاء اللہ کے اخلاق:۶۵تا۶۶)

یحیٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے تھے ہم دنیاوی ذلت اور مفلسی سے ڈرتے ہیں، لیکن آخرت کی ذلت اور خواری سے نہیں ڈرتے۔ حالاں کہ آخرت میں انسان کا اعمال صالحہ سے خالی ہونا لوگوں میں بڑی

شرمندگی کا باعث ہو گا۔ افسوس ہم بہت برا کر رہے ہیں، نیز فرماتے تھے کہ نان نفقہ اور کھانے پینے کی فکر نے غافلوں کے قلوب کو ہر طرح کی نیکی سے روک رکھا ہے ورنہ آدمی کے لیے اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرنا ان ہزار دیناروں سے بہتر ہے جو مرنے کے بعد چھوڑ جائے۔

حرص کی مذمت اور زہد و قناعت کی فضیلت

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ لَایَزَالُ قَلْبُ الْكَبِیْرِ

شَابًّا فِیْ اثْنَیْنِ فِیْ حُبِّ الدُّنْیَا وَطُوْلِ الْاَمَلِ

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بوڑھے آدمی کا دل ہمیشہ دو چیزوں میں جوان رہتا ہے۔ ایک دنیا کی محبت میں، دوسرے آرزوؤں اور اُمیدوں کے طویل ہونے میں۔" (مشکوٰۃ)

ف: پہلی حدیث شریف کے ذیل میں یہ مضمون تفصیل سے گزر چکا ہے کہ اصل دنیا جس کی برائی قرآن پاک اور احادیث وغیرہ میں بہت کثرت سے آئی ہے، وہ مال کی محبت ہے۔ اس حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سلسلہ کی ایک خاص چیز پر تنبیہ فرمائی ہے جو تجربہ سے بھی بہت صحیح ثابت ہوئی کہ بڑھاپے میں دنیا کی محبت اور لمبی لمبی اُمیدیں بہت بڑھ جاتی ہیں، اور جتنا بھی مرنے کا زمانہ بڑھاپے کے لحاظ سے قریب آتا جاتا ہے اتنی ہی اولاد کی شادیوں کی اُمنگیں، اچھے اچھے مکانات تعمیر کرنے کا ولولہ، جائیداد کے بڑھانے کا جذبہ وغیرہ وغیرہ زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ایسی حالت میں آدمی کو اپنے نفس کی خاص طور سے نگہداشت کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے اور دو چیزیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں۔ ایک مال کی حرص، دوسری زیادہ عمر ہونے کی حرص۔ (مشکوٰۃ)

زیادہ عمر ہونے کی حرص بھی وہی امیدوں کا طویل ہونا ہے کہ وہ مرنے کے قریب ہوتا جارہا ہے، لیکن مرنے کی تیاری کے بجائے دنیا میں ہمیشہ رہنے کی تیاری میں مشغول رہتا ہے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دے کر سمجھانے کے لیے ایک مربع (چار لکیروں والی) شکل کھینچی اور اس کے درمیان میں ایک دوسری لکیر کھینچی۔ جو اس مربع شکل سے آگے نکلتی چلی گئی۔ پھر اس مربع شکل کے اندر چھوٹی چھوٹی لکیریں بنائیں، جس کی صورت علما نے مختلف لکھی ہے۔ مجملہ ان کے یہ صورت واضح ہے۔

پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ درمیانی لکیر تو آدمی ہے اور جو لکیر (مربع) اس کو چاروں طرف سے گھیر رہی ہے وہ اس کی موت ہے کہ آدمی اس سے نکل ہی نہیں سکتا اور جو لکیر باہر نکل رہی ہے وہ اس کی اُمیدیں ہیں کہ اپنی زندگی سے بھی آگے کی لگائے بیٹھا ہے، اور یہ چھوٹی چھوٹی لکیریں جو اس کے دونوں طرف ہیں وہ اس کی بیماریاں اور حوادث وغیرہ ہیں جو اس کی طرف متوجہ ہیں۔ ہر ایک چھوٹی لکیر ایک آفت ہے۔ اگر ایک سے بچ جائے تو دوسری مسلط ہے، اور موت کے اندر تو گھرا ہوا ہے کہ وہ تو چاروں طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہے، لیکن اُمید کی لکیر موت سے بھی آگے نکلی ہوئی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اپنے سر مبارک کے پچھلے حصہ پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا کہ یہ تو آدمی کی موت ہے جو اس کے سر پر ہر وقت سوار ہے، اور دوسرے ہاتھ کو دور تک پھیلا کر ارشاد فرمایا کہ یہ دور تک اس کی اُمیدیں جارہی ہیں۔

ایک حدیث میں حضور ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ اس اُمت کی بھلائی کی ابتدا آخرت کے یقین اور دنیا سے بے رغبتی کے ساتھ ہوئی ہے اور اس کے فساد کی ابتدا مال کے بخل اور لمبی امیدوں سے ہوگی۔ (مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس امت کے ابتدائی حصہ نے اللہ کے ساتھ یقین اور دنیا سے بے رغبتی کے ساتھ نجات پائی اور اس کے آخری حصہ کی ہلاکت بخل اور امیدوں کی وجہ سے ہے۔ (ترغیب)

ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ عنقریب ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ تمہارے (مسلمانوں کے) کھاجانے کے واسطے ایک دوسرے کو اس طرح دعوت دیں گے جیسا کہ دستر خوان پر بیٹھنے والا دوسرے کی تواضع کرتا ہے (کہ ہر قوم دوسروں کو اس کی ترغیب اور دعوت دے گی کہ ان مسلمانوں کو کسی طرح پہلے ہلاک کردو) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! کیا اُس وقت ہماری تعداد بہت ہی کم ہوگی (جس کی وجہ سے کافروں کا یہ حوصلہ ہو گا)؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! تمہاری تعداد اُس زمانہ میں بہت زیادہ ہوگی لیکن تم لوگ اس زمانہ میں سیلاب کے جھاگ کی طرح سے (بالکل بے جان) ہوگے اور تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہارا خوف جاتا رہے گا اور تمہارے

اپنے دلوں میں "وھن" پیدا ہو جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! "وھن" کیا چیز ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے ڈرنا۔ (مشکوۃ)

اُم ولید رضی اللہ عنہا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی) فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم شام کے وقت اندر سے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا بات ہوئی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اتنی مقدار جمع کرتے ہو جتنا کھاتے نہیں ہو، اور اتنے مکانات بنالیتے ہو جن میں رہتے بھی نہیں ہو، اور ایسی اُمیدیں باندھ لیتے ہو جن کو پورا بھی نہیں کر سکتے؛ کیا ان باتوں سے تم شرماتے نہیں ہو۔ (ترغیب)

یعنی ضرورت سے زائد مکان بنالیتے ہو۔ مکان اتنا ہی بنانا چاہیے جتنے کی ضرورت ہو۔ اسی طرح خزانہ جمع کرتے جاتے ہو، جو اپنی حاجت سے زائد ہے وہ جمع کرنے کے لیے نہیں ہے، وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ سے حیا کرنا کیا ہے؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ منبر پر تشریف رکھتے تھے اور مجمع سامنے حلقہ بنائے ہوئے تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! اللہ تعالیٰ شانہ سے ایسی شرم کرو جیسا کہ اس سے شرم کرنے کا حق ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! حق تعالیٰ شانہ سے تو ہم حیا کرتے ہی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص تم میں سے حق تعالیٰ شانہ سے حیا کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی رات اس پر ایسی نہ گزرے کہ اس کی موت اس کی آنکھوں کے سامنے نہ ہو، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ حفاظت کرے پیٹ کی اور اس چیز کی جس کو پیٹ نے گھیر رکھا ہے اور حفاظت کرے سر کی اور اس چیز کی جس کو سر نے گھیر رکھا ہے، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ موت کو یاد رکھے اور اپنی بوسیدگی کو (کہ مرنے کے بعد یہ بدن سارا کا سارا شکستہ ہو کر خاک ہو جائے گا) اور ضروری ہے کہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دے۔ (ترغیب)

علما نے لکھا ہے کہ سر کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے علاوہ کسی کے سامنے نہ جھکے، نہ عبادت کے لیے نہ تعظیم کے لیے، حتیٰ کہ جھک کر سلام بھی نہ کیا جائے۔ اور "جن چیزوں کو

سر نے گھیر رکھا ہے" سے مراد آنکھ، کان، زبان یہ سب چیزیں ہیں جو سر کے تحت میں داخل ہیں، ان سب کی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح پیٹ کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ مشتبہ مال سے اس کی حفاظت کی جائے اور "جس چیز کو پیٹ نے گھیر رکھا ہے" سے مراد وہ چیزیں ہیں جو پیٹ کے قریب ہیں جیسے: شرمگاہ، ہاتھ، پاؤں اور دل کہ ان سب چیزوں کی حفاظت کی جائے۔ امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کو کثرت سے پڑھنا مستحب ہے۔ (مظاہر حق)

دنیا کی حرص کا علاج موت کی یاد ہے

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ شانہ سے ایسی حیا کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم لوگ حق تعالیٰ شانہ سے سب کے سب حیا کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں! یہ معمولی حیا نہیں، بلکہ حق تعالیٰ سے حیا کا حق یہ ہے کہ آدمی سر کی حفاظت کرے اور اس چیز کی جس کو سر نے گھیر رکھا ہے، اور پیٹ کی حفاظت کرے اور ان چیزوں کی حفاظت کرے جن پر پیٹ حاوی ہو رہا ہے (شرمگاہ وغیرہ)، اور ضروری ہے کہ موت کو کثرت سے یاد رکھا کرے، اور شکستگی (مرنے کے بعد سب ٹوٹ پھوٹ کر خاک ہو جانے) کو یاد رکھا کرے، اور جو شخص آخرت کا ارادہ کرتا ہے وہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دیتا ہے۔

چوں کہ موت کو کثرت سے یاد کرنے کو دنیا سے بے رغبتی اور امیدوں کے اختصار میں بہت زیادہ دخل ہے۔ اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کو کثرت سے یاد کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! سب سے بڑا زاہد کون شخص ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو موت کو اور اپنے مر گل کر پرانا ہو جانے کو نہ بھولے اور دنیا کی زینتوں کو چھوڑ دے اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دے اور آنے والے کل کی زندگی کو یقینی نہ سمجھے اور اپنے آپ کو مردوں میں سمجھتا رہے کہ عنقریب مر کر اُن میں شامل ہو جاؤں گا۔ (ترغیب)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ان لذتوں کو توڑنے والی چیز یعنی موت کو بہت کثرت سے یاد کیا کرو۔ جو شخص تنگی کی حالت میں اس کو یاد کرتا ہے تو یہ اُس پر وسعت

اور سہولت کا سبب ہوتی ہے (یہ اطمینان ہوتا ہے کہ موت بہر حال آنے والی ہے، اس سے ساری تکلیفوں کا خاتمہ ہے) اور جو شخص فراخ دستی میں اس کو یاد کرتا ہے اس کے لیے اخراجات میں تنگی کا سبب ہوتی ہے (کہ موت کی فکر سے زیادہ عیش وعشرت کو دل نہیں چاہتا)۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے، تو بعض لوگوں کے ہنسی کی وجہ سے دانت کھل رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم لذتوں کے توڑنے والی موت کو کثرت سے یاد کرتے تو وہ ان چیزوں میں مشغول ہونے سے روک دیتی جن سے ہنسی آئی۔ ہر شخص کی قبر روزانہ اعلان کرتی ہے کہ میں بالکل تنہائی کا گھر ہوں، میں سب سے علیحدہ رہنے کا گھر ہوں، میں کیڑوں کا گھر ہوں۔ جب نیک مومن دفن ہوتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے کہ تیرا آنا بڑا مبارک ہے، تیرے آنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ جتنے لوگ میری پشت پر چلتے تھے، اُن میں تو مجھے بہت پسند تھا۔ آج تو میری ماتحتی میں آیا ہے تو میں اپنا طرزِ عمل تجھے دکھاؤں گی۔ اس کے بعد وہ اتنی وسیع ہو جاتی ہے کہ جہاں تک مردہ کی نظر جائے وہاں تک زمین کھل جاتی ہے اور ایک کھڑکی جنت میں کھل جاتی ہے (جس سے وہاں کی خوشبوئیں، ہوائیں وغیرہ آتی رہتی ہیں)۔

اور جب کوئی بدکار یا کافر دفن ہوتا ہے تو زمین اس سے کہتی ہے کہ تیرا آنا بڑا نامبارک ہے، تیرے آنے سے بہت جی بُرا ہوا۔ جتنے لوگ میری پشت پر چلتے تھے، تو ان میں مجھے بہت ہی برا لگتا تھا۔ آج تو میری ماتحتی میں آیا ہے، تو میں اپنا طرزِ عمل تجھے دکھاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ ایسی ملتی ہے (یعنی اس کو بھینچتی ہے) کہ مردہ کی ہڈیاں پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ میں ڈال کر بتایا کہ اس طرح ہڈیاں پسلیاں ایک جانب کی دوسری جانب میں گھس جاتی ہیں، اور ستر اژدھے اس کو ڈسنا شروع کر دیتے ہیں اور وہ ایسے زہریلے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی زمین کے اوپر پھونک ماردے تو قیامت تک زمین پر گھاس اُگنا بند ہو جائے۔ یہ سب کے سب قیامت تک اس کو کاٹتے رہیں گے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ !سب سے زیادہ سمجھدار اور سب سے زیادہ محتاط آدمی کون ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص موت کو کثرت سے یاد رکھتا ہو اور موت کے لیے ہر وقت تیاری میں مشغول رہتا ہو۔ یہی لوگ ہیں جو دنیا کی شرافت اور آخرت کا اکرام حاصل کرنے والے ہیں۔ (ترغیب)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا مونڈھا پکڑ کر ارشاد فرمایا کہ دنیا میں اس طرح زندگی گزار دو جیسا کہ کوئی مسافر، کوئی راستہ چلنے والا ہے، اور ہر وقت اپنے آپ کو قبرستان والوں میں سمجھا کرو۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اے ابن عمر (اور بعض روایات میں ہے کہ یہ مقولہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ہے)! جب صبح ہو جائے تو شام تک کی زندگی کا یقین نہ کرو اور جب شام ہو جائے تو صبح تک کی زندگی کی اُمید نہ باندھو۔ اپنی صحت کی حالت میں بیماری کے زمانہ کے لیے نیک عمل کر رکھو (کہ بیماری کے زمانہ میں جو کوتاہی ہو اس کا جبیرہ پہلے سے ہو جائے، یا صحت میں جن اعمال کا عادی ہو گا، بیماری کی وجہ سے اُن کے نہ ہو سکنے پر بھی ان کا ثواب ملتا رہے گا) اور اپنی موت کے لیے اپنی زندگی ہی میں تیاری کر لو، کل کو معلوم نہیں کہ تمہارا نام کیا ہو جائے (یعنی کن لوگوں میں شمار ہو جائے، نیک لوگوں میں، یا بدلوگوں میں فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ! مجھے کچھ نصیحت فرما دیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ شانہ کی عبادت اس طرح کیا کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، وہ تمہارے سامنے ہے، اور اپنے آپ کو ہر وقت مردوں کی فہرست میں شمار کیا کرو، اور ہر پتھر اور درخت کے قریب اللہ تعالیٰ شانہ کا ذکر کیا کرو (تاکہ قیامت میں اس کی گواہی دینے والے بہت کثرت سے ہو جائیں)، اور جب کوئی بری حرکت ہو جائے تو اس کی تلافی کے لیے کوئی نیک عمل کرو۔ اگر برائی چھپ کر کی ہے تو اس کی تلافی میں نیک عمل بھی چھپ کر کرو اور برائی اعلانیہ ہوئی ہے تو اس کی توبہ اور تلافی بھی اعلانیہ کی جائے۔

زاہد اللہ تعالیٰ کو بھی محبوب ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ

إِذَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللَّهُ وَأَحَبَّنِيَ النَّاسُ قَالَ ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللَّهُ

وَازْهَدْ فِيمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ

"ایک صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جس سے اللہ جل شانہ بھی مجھ سے محبت فرماویں اور آدمی بھی مجھ سے محبت کرنے لگیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا سے بے رغبتی پیدا کرلو حق تعالیٰ شانہ تم کو محبوب رکھیں گے اور لوگوں کے پاس جو چیزیں ہیں (مال وغیرہ) اُن سے بے رغبتی پیدا کرلو، وہ بھی تم سے محبت کرنے لگیں گے۔" (مشکوٰۃ)

ف: دنیا سے بے رغبتی پر حق تعالیٰ شانہ کی محبت، آخرت کا اعزاز واکرام وغیرہ امور تو پہلی روایات میں بہت کثرت سے گزر ہی چکی ہیں۔

دوسرا مضمون کہ لوگوں کے اموال پر نگاہ نہ رکھی جائے، اسی سے اُن کے دلوں میں بھی محبت پیدا ہوتی ہے۔ بڑے تجربہ کی بات ہے، ہر شخص کو ہر وقت اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ جتنے بھی آپس میں بہترین تعلقات ہوں، لیکن جہاں کسی چیز کے سوال کا ذکر آجاتا ہے سارے ہی تعلقات اور عقیدتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابو خلاد رضی اللہ عنہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب تم کسی بندہ کو اس حال میں دیکھو کہ اس کو زہد اور کم بولنے کی صفت اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمائی ہے تو اس کے پاس اور اس کی صحبت میں رہا کرو کیوں کہ جس بندہ کا یہ حال ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت القا ہوتی ہے۔" (بیہقی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دو حریص آدمیوں کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ ایک وہ شخص جو علم کا حریص ہو (اس کو علمی چسکہ لگ گیا ہو، کسی وقت اس کا دل نہیں بھرتا)، دوسرا وہ شخص جو مال کا حریص ہو۔ اور چوں کہ آدمی کی جبلّت میں یہ مہلک چیز ہے، اسی بنا پر حق تعالیٰ شانہ نے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

نے قناعت کی بڑی تعریف فرمائی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ مبارک ہے وہ شخص جس کو حق تعالیٰ شانہ نے اسلام کی دولت سے نوازا ہو اور صرف ضرورت کے بقدر اس کی روزی ہو اور وہ اس پر قانع ہو۔ حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ قیامت کے دن کوئی شخص غریب ہو یا امیر، ایسا نہ ہوگا جو اس کی تمنا نہ کرتا ہو کہ کاش! دنیا میں اس کو صرف ضرورت کے درجہ کی روزی ملتی، اس سے زیادہ نہ ملتی۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے طمع سے اور مال کمانے میں زیادہ کوشش کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ لوگو! مال کے حاصل کرنے میں اچھا طریقہ اختیار کیا کرو (برے طریقوں سے نہ کماؤ) اس لیے کہ آدمی کو مقدر سے زیادہ تو ملتا نہیں اور جو مقدر ہے وہ بہر حال مل کر رہے گا۔ آدمی اُس وقت تک مر ہی نہیں سکتا، جب تک اس کا جو مقدر حصہ ہے وہ ذلیل اور مجبور ہو کر اس تک نہ پہنچ جائے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تو متقی بن جا، سب سے بڑا عبادت کرنے والا ہو جائے گا اور (کم سے کم مقدار پر) قناعت کرنے والا بن جا، تو سب سے زیادہ شکر گزار ہو جائے گا، اور اپنے بھائی کے لیے بھی اس چیز کو پسند کر جس کو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو کامل مومن بن جائے گا۔

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے مختصر سی نصیحت کر دیجیے (تاکہ میں اس کو مضبوط پکڑ لوں)۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جب نماز پڑھو تو ایسی پڑھو جیسے کہ عمر کی آخری نماز یہی ہو (جب آدمی کو یہ خیال ہو جائے کہ یہ بالکل آخری نماز ہے تو پھر جس قدر زیادہ اہتمام اور خشوع وخضوع سے پڑھے گا وہ ظاہر ہے) اور کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالو جس کی معذرت کرنا (اور معافی چاہنا) پڑے، اور اپنے دل کو پکے طور سے اس چیز سے مایوس کر لو جو دوسرے کے پاس ہو (کہ اس کی طرف ذرا سا بھی تمہیں التفات نہ ہو)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ طمع کرنا فقر (اور محتاجگی) ہے اور نااُمیدی غنا ہے۔ جو شخص ایسی چیزوں سے نااُمید ہو جائے جو دوسروں کے قبضہ میں ہیں وہ ان سے مستغنی رہتا ہے۔ ایک حکیم سے کسی نے پوچھا کہ غنا کیا چیز ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تمناؤں کا کم کرنا اور جو اپنے لیے کافی ہو جائے اس پر خوش رہنا۔

محمد بن واسع رحمہ اللہ سوکھی روٹی کو پانی میں بھگو کر کھالیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جو اس پر قناعت کرلے وہ کسی کا بھی محتاج نہیں۔

ایک حکیم سے کسی نے پوچھا: تمہاری مالیت کیا ہے؟ فرمانے لگے: ظاہر میں خوشحال رہنا، باطن میں اختصار اور میانہ روی اختیار کرنا اور دوسروں کے پاس جو چیزیں ہیں، اُن سے اُمید نہ رکھنا۔

علم کو ضائع کرنے والی چیزیں

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: علما کے قلوب سے علم کو کیا چیز ضائع کردیتی ہے، حالاں کہ پڑھتے وقت اُنہوں نے سمجھ کر پڑھا تھا، اس کو یاد رکھا تھا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: طمع اور حرص اور لوگوں سے اپنی حاجتوں کا مانگنا۔

کسی شخص نے حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ سے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے کلام کی شرح پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ جب عالم کسی چیز کی طمع کرنے لگتا ہے تو اس کی طلب میں لگ جاتا ہے جس سے اس کا دین برباد ہوجاتا ہے (کہ اس کی طلب کی مشغولی دین کی مشغولی کو کھودیتی ہے) اور حرص اُس کو ہر ہر چیز کی طرف کھینچتی ہے، حتیٰ کہ اس کا ہر چیز کو یہ دل چاہتا ہے کہ یہ بھی مجھے مل جائے، یہ بھی مل جائے، پھر لوگوں سے اس کے پورا کرنے کا طالب ہوتا ہے۔ جو شخص اس کی طلب کو پورا کردیتا ہے اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، اس کا مطیع ہونا پڑتا ہے، وہ جدھر چاہے کھینچ کرلے جائے۔ تمہیں جھک مار کر اُس کا کہنا ماننا پڑتا ہے۔ جب وہ گزرے تو اس کو سلام کرنا پڑتا ہے، بیمار ہوجائے تو عیادت کرنا پڑتی ہے اور یہ سلام اور عیادت اللہ کے واسطے نہیں ہوتی بلکہ دنیا کی محبت کی وجہ سے ہوتی ہے (اور جب دنیا کی وجہ سے ہوئی تو اس کا ثواب معلوم ہے)۔ اس کے بعد حضرت فضیل رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ حدیث (عمل کے لیے اور کار آمد ہونے کے لیے) سو حدیثوں سے بڑھ کر ہے۔ (احیاء)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے مختصر سی نصیحت فرمادیجیے (تاکہ میں اس کو مضبوط پکڑلوں)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو چیز دوسروں کے پاس ہے اس سے اپنے کو بالکل مایوس بنالو (ذرا بھی اس کی طرف التفات نہ کرو) اور طمع سے اپنے کو بالکل محفوظ رکھو، اس لیے کہ طمع فوری فقر ہے (یعنی اس چیز

کی ضرورت تو جب ہوگی، لیکن اس کی طرف احتیاج تو ابھی سے ہوگئی) اور اپنے آپ کو ایسی چیز سے بچاؤ جس کی معذرت کرنا پڑے۔ (ترغیب)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ زندگی

عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ مَاشَبِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مِنْ خُبْزِ شَعِيْرٍ يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ حَتّٰى قُبِضَ

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر میں اپنی وفات تک کبھی جو کی روٹی بھی دو دن لگ اتار پیٹ بھر کر نوش نہیں فرمائی۔" (شمائل ترمذی)

ف: یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تھی۔ دو چار حدیثوں میں نہیں سینکڑوں احادیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہی نقشہ موجود ہے۔ آج مسلمانوں کے فقر و فاقہ کا اس قدر شور ہے کہ حد نہیں، مگر کتنے آدمی ایسے ہوں گے جن کو عمر بھر میں دو دن بھی پیٹ بھر کر معمولی روٹی نہ ملی ہو۔ شمائل ہی کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے گھرانے کا یہی عمل نقل کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کبھی بھی دو دن لگ اتار جو کی روٹی سے پیٹ نہیں بھرا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی کئی راتیں مسلسل ایسی گزر جاتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو شام کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔ رات بھر سب کے سب فاقہ سے رہتے تھے اور جو کی روٹی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گزارہ تھا۔

حضرت سہل رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھانے کا تھا؟ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال تک چھنے ہوئے آٹے کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ پھر اُس نے پوچھا: کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ حضرات کے یہاں چھلنیاں نہیں تھیں؟ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چھلنیوں کا دستور نہیں تھا۔ اُنہوں نے (تعجب سے) پوچھا کہ بغیر چھنے جو کے آٹے کو کیونکر کھاتے تھے؟ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آٹے (کو حرکت دے کر اس) میں پھونک مار دیا کرتے تھے جس سے (موٹے موٹے) تنکے اُڑ جاتے تھے، باقی کو پکا لیا کرتے تھے۔ (شمائل ترمذی)

فائدہ: آج گیہوں کی روٹی بغیر آٹا چھنے کی کھانا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ یہ حضرات جو کے آٹے کی روٹی بغیر چھنے نوش فرماتے تھے اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہ ملتی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہوں تو میرا رونے کو (بے اختیار) دل چاہتا ہے، پس رونے لگتی ہوں۔ کسی نے عرض کیا: یہ کیا بات ہے؟ فرمانے لگیں: مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آجاتا ہے کہ گوشت سے یا روٹی سے کبھی بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو وصال تک دن میں دو مرتبہ پیٹ بھر کر تناول فرمانے کی نوبت نہیں آئی۔ (شمائل)

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ حق تعالیٰ شانہ سے روزی کی وسعت نہیں مانگ لیتے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں یہ کہہ کر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھوک کی شدت کو دیکھ کر رو پڑی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عائشہ! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میں اپنے رب سے یہ مانگوں کہ سونے کے پہاڑ میرے ساتھ ساتھ چلا کریں تو حق تعالیٰ شانہ ان کو بھی میرے ساتھ چلادیں، لیکن میں نے دنیا میں بھوکا رہنے کو پیٹ بھرنے پر ترجیح دے رکھی ہے۔ میں نے دنیا کے فقر کو اس کی ثروت پر ترجیح دی ہے، میں نے دنیا کے غم کو اس کی خوشی پر ترجیح دی ہے۔

عائشہ! دنیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کی آل کے لیے مناسب نہیں ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے اولوالعزم (یعنی ہمت والے اور اونچے درجہ کے) رسولوں کے لیے اسی کو پسند فرمایا ہے کہ دنیا کی تکلیفوں پر صبر کریں، دنیا کی راحتوں سے بچے رہیں، اور جو چیز ان کے لیے پسند فرمائی تھی اُسی کا مجھے حکم ہے چناں چہ ارشاد ہے: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ "آپ بھی اسی طرح صبر کیجیے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا۔" میرے لیے اللہ کے حکم کی تعمیل کے سوا چارہ نہیں ہے۔ خدا کی قسم! جہاں تک میری طاقت ہے میں ایسا ہی صبر کروں گا جیسا کہ انہوں نے کیا، اور طاقت تو اللہ تعالیٰ ہی کے دینے سے آتی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرزِ زندگی

حدیث میں آیا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتوحات کی کثرت ہوگئی تو ان کی صاحبزادی اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ اب تو آپ کے پاس بھی جب دوسرے ملکوں کے قاصد آئیں تو باریک کپڑا پہن لیا کریں، اور کسی کو کھانا پکانے کا حکم فرمادیا کریں تاکہ آپ ان لوگوں کو کھلائیں اور آپ بھی ان کے ساتھ کھالیا کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ آدمی کے حالات سے اس کے گھر والے ہی اچھی طرح واقف ہوا کرتے ہیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: بے شک۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تم کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد اتنے سال زندہ رہے۔ اس زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے اگر رات کو کھانا نوش فرمالیتے تھے تو دن میں بھوکے رہتے تھے اور دن میں کھالیتے تو رات کو بھوکے رہتے تھے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ نبوت کے بعد اتنے سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور اُن کے گھر والوں نے خیبر کے فتح ہونے تک کبھی پیٹ بھر کر کھجوریں بھی نہیں کھائیں۔ میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایک مرتبہ تم نے اونچے خوان پر (میز کی طرح) کھانا رکھ دیا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر تغیر آگیا تھا، یہاں تک کہ اس کو ہٹا کر زمین پر کھانا رکھا گیا (تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نوش فرمایا)۔

میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عبا (چادر کی ایک قسم) کو دوہرا کر کے اُس پر آرام فرمایا کرتے تھے، تم نے ایک مرتبہ اُس کو چوہرا (چار طے) کر کے بچھا دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے مجھے رات کے اُٹھنے سے روکا (کہ چار طے ہو جانے سے بستر نرم ہوگیا جس سے نیند اچھی طرح آگئی) اس کو دوہرا ہی کردو جیسا کہ روزانہ ہوا کرتا تھا۔ میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کپڑا دھونے کے لیے بدن مبارک سے اُتارتے اور اس کو دھوتے، ایسی حالت میں اگر بلال نماز کے لیے بلانے آجاتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دوسرا کپڑا نہ تھا جس کو پہن کر نماز پڑھاویں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو خشک کر کے پہن کر نماز پڑھایا کرتے تھے۔

میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بنو ظفر کی ایک عورت نے حضور ﷺ کے لیے دو کپڑے تیار کیے، ایک لنگی، ایک چادر۔ ان میں سے اُس نے ایک پہلے بھیج دیا، دوسرے کے بھیجنے میں دیر لگی تو حضور ﷺ اسی کو بدن پر اس طرح لپیٹ کر کہ دونوں کونوں میں گردن پر گرہ لگالی تھی (کہ بدن کھل نہ جائے) پہن کر نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ کے پاس دوسرا کپڑا نہ تھا جس کو پہن کر نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔

اسی طرح اور واقعات گنواتے رہے یہاں تک کہ ان واقعات کو یاد دلا کر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو بھی رلایا اور خود بھی اتنے روئے کہ چیخیں مارنے لگے۔ ہمیں یہ اندیشہ ہوا کہ اس غم میں کہیں ان کی جان نہ نکل جائے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے دو رفیق تھے (حضور اقدس ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ) وہ دونوں ایک ہی راستہ پر چلے۔ اگر میں اُن کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کروں تو میرے ساتھ بھی وہ معاملہ نہیں کیا جائے گا جو اُن کے ساتھ کیا گیا۔ میں خدائے پاک کی قسم! ان کی (دنیا کی) سخت زندگی پر اپنے آپ کو مجبور کروں گا تاکہ (آخرت کی) ان کی شاداب زندگی کو پاسکوں۔
(احیاء)

کم روزی اور اس پر قناعت حاصل کرنے کے لیے پانچ باتوں کا اہتمام

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ رَضِيَ مِنَ اللّٰهِ بِالْيَسِيْرِ مِنَ الرِّزْقِ رَضِيَ اللّٰهُ مِنْهُ بِالْقَلِيْلِ مِنَ الْعَمَلِ

”حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص حق تعالیٰ شانہ سے تھوڑی روزی پر راضی رہے، حق تعالیٰ شانہ بھی اس کی طرف سے تھوڑے عمل پر راضی ہو جاتے ہیں۔“ (مشکوٰۃ)

ف: اس حدیث پاک میں آمدنی کی کمی میں حق تعالیٰ شانہ کے ایک خاص احسان پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اس صورت میں آدمی کی طرف سے اگر نیکیوں میں کمی ہوتی ہے تو وہ مالک الملک بھی اس کمی کو بخوشی قبول فرمالیتے ہیں۔ اس کے بالمقابل جب اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے عطا میں افراط ہو اور آدمی کسی چیز میں کمی کو بھی گوارا نہ کرے تو اس مالک کی طرف سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ پھر اُس کے حقوق کی ادائیگی میں

تمہاری طرف سے بھی افراط ہونا چاہیے، اور ظاہر ہے کہ جس ملازم کو تنخواہ منہ مانگی دی جائے پھر وہ اپنی منصبی خدمت میں کوتاہی کرے تو اس کی نمک حرامی میں کیا تردُّد ہے۔ لیکن ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے کہ غربا کو تو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق بھی ہو جاتی ہے، ذکر اور نوافل کے لیے وقت بھی مل جاتا ہے، لیکن جہاں چار پیسے ہاتھ میں آئے یا اُن کے آنے کے اسباب پیدا ہوئے پھر فرض نمازوں کے واسطے بھی وقت نہیں ملتا، اور قلیل روزی پر قناعت تب حاصل ہو سکتی ہے جب آدمی پانچ باتوں کا اہتمام کرے:

۱۔ اپنے اخراجات میں کمی کرے۔ ضرورت کی مقدار سے زیادہ خرچ نہ کرے۔ علمانے لکھا ہے کہ تنہا آدمی ہو تو اس کو ایک جوڑا کافی ہے۔ کئی کئی جوڑے بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے ہی معمولی روٹی سالن پر گزر ہو سکتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو خرچ میں میانہ روی اختیار کرے وہ فقیر نہیں ہوتا۔

۲۔ اگر بقدرِ ضرورت میسر ہو تو آئندہ کی فکر میں نہ پڑے اور حق تعالیٰ شانہ کے وعدہ پر اعتماد کرے کہ حق تعالیٰ شانہ نے روزی کا ذمہ لے رکھا ہے۔ شیطان آدمی کو ہمیشہ آئندہ کی سوچ میں ڈالے رکھتا ہے کہ کچھ ذخیرہ فنڈ کے طور پر جمع رکھنا چاہیے، آدمی کے ساتھ حرج بھی لگا ہوا ہے، بیماری بھی لگی ہوئی ہے، وقتی اخراجات بھی پیش آتے رہتے ہیں، پھر تجھے دقت اور مشقت ہوگی، اور ان خیالات کی وجہ سے اس کو مشقت اور آئندہ کی فکر اور سوچ میں پریشان رکھتا ہے اور پھر آدمی کا مذاق اُڑایا کرتا ہے کہ یہ بے وقوف آئندہ کی تکلیف کے ڈر سے، جو موہوم ہے اس وقت کی یقینی مشقت اور تکلیف اُٹھا رہا ہے۔

حضور اقدس ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ اپنے اوپر زیادہ غم سوار نہ کرو، جو مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا اور جتنی روزی تمہاری ہے وہ آکر رہے گی۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اپنے مومن بندہ کو روزی اس جگہ سے عطا فرماتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو، اور قرآن پاک میں بھی یہ مضمون وارد ہے۔

۳۔ اس امر میں غور کیا کریں کہ تھوڑے پر قناعت میں لوگوں سے استغنا کی کتنی بڑی عزت حاصل ہے اور حرص و طمع میں لوگوں کے سامنے کتنا ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ اس پر بہت اہتمام سے غور کیا کریں کہ

ایک تکلیف ضرور برداشت کرنی ہے، یا لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت کی یا اپنے نفس کو لذیذ چیزوں سے روکنے کی۔ اور یہ دوسری تکلیف جو ہے اس پر اللہ کے یہاں ثواب کا وعدہ بھی ہے اور پہلی میں آخرت کا وبال ہے۔

اس کے علاوہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں آدمی اُن کو حق بات کہنے سے رک جاتا ہے۔ اکثر دین کے بارہ میں مداہنت کرنی پڑتی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی کی عزت اُس کا لوگوں سے استغنا ہے۔ اسی وجہ سے مشہور مقولہ ہے کہ جس سے تو استغنا کرے تو اس کا ہمسر ہے (یعنی اسے دینے پر مجبور نہیں ہے) اور جس کی طرف احتیاج پیش کرے اس کا قیدی ہے، اور جس پر احسان کرے اس کا حاکم ہے۔

۴۔ دنیا دار مالداروں کے انجام کو سوچا کریں۔ یہود، نصاریٰ اور بے دین ثروت والوں کا انجام سوچیں، اور انبیا اور اولیا کا انجام سوچیں، ان کے حالات کو غور سے پڑھیں اور تحقیق کریں۔ پھر اپنے نفس سے پوچھیں کہ اللہ کے مقُرب لوگوں کی جماعت میں شریک ہونا پسند کرتا ہے یا احمقوں اور بے دین لوگوں کی مشابہت پسند کرتا ہے۔

۵۔ مال کے زیادہ ہونے میں جو خطرات پہلے بیان ہو چکے ہیں ان میں غور کیا کریں کہ کتنے مصائب اس کے ساتھ ہیں۔

جب آدمی ان پانچوں چیزوں میں غور کرتا رہے گا تو تھوڑے پر قناعت آسان ہو جائے گی۔

(احیاء)

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما، حضور ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وہ شخص فلاح کو پہنچ گیا جو مسلمان ہو اور تھوڑی روزی دیا گیا ہو اور حق تعالیٰ شانہ نے اس کو اسی پر قناعت عطا فرما رکھی ہو۔ حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ، حضور ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ مبارک ہے وہ شخص جس کو اسلام لانے کی توفیق ہو گئی ہو اور اس کی آمدنی بقدرِ ضرورت ہو اور اس پر وہ قانع ہو۔ (ترغیب)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جب بھی سورج نکلتا ہے اس کے دونوں جانب دو فرشتے روزانہ یہ اعلان کرتے ہیں: اے لوگو! اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ جو

مال تھوڑا ہو اور وہ کفایت کر جائے وہ بہتر ہے اس کثیر مال سے جو اللہ تعالیٰ شانہ کے علاوہ دوسری طرف مشغول کرے۔

نیک بندے نازو نعم میں لگنے والے نہیں ہوتے

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ لَمَّا بَعَثَ بِہٖ اِلَی الْیَمَنِ قَالَ اِیَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰہِ لَیْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِیْنَ

"حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور اقدس ﷺ نے ان کو یمن (کا حاکم بنا کر) بھیجا تو یہ ارشاد فرمایا کہ اپنے آپ کو نازو نعم میں پرورش کرنے سے بچاتے رہنا اس لیے کہ اللہ کے نیک بندے نازو نعم میں لگنے والے نہیں ہوتے۔" (مشکوٰۃ)

ف: حاکم اور گورنر ہو جانے کے بعد راحت وآرام کے اسباب کثرت سے مہیا ہو ہی جاتے ہیں۔ ہر قسم کی نعمتیں بھی آسانی سے میسر ہو جاتی ہیں۔ اس لیے حضور ﷺ نے، جب کہ یہ حاکم بنا کر بھیجے جا رہے تھے، اس چیز سے بچنے کی خصوصی تنبیہ فرمائی۔ حضور ﷺ کے وصایا میں اور اسی طرح حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے وصایا اور احکام میں اس چیز پر خاص طور سے تنبیہیں بڑی کثرت سے کی گئی ہیں۔

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مصر کے قاضی تھے۔ ان کی خدمت میں ایک صحابی کسی حدیث کی تحقیق کے لیے تشریف لے گئے۔ انہوں نے جا کر دیکھا کہ قاضی صاحب کے بال بھی پراگندہ حال ہیں اور پاؤں بھی ننگے ہیں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ تم اس زمین کے حاکم ہو، میں تمہارے بالوں کو بکھرا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے ہمیں زیب وزینت کی کثرت سے منع فرمایا تھا۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ میں تمہیں ننگے پاؤں دیکھ رہا ہوں۔ حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد تھا کہ کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کریں۔ عبد اللہ بن مغفل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے بالوں میں روزانہ کنگھا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

غنا، دل کا ہے نہ کہ مال و دولت کی کثرت

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰکِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ

"حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی کا غنی ہونا مال کی کثرت سے نہیں ہوتا، بلکہ حقیقی غنا تو دل کا غنٰی ہونا ہے۔" (مشکوٰۃ)

جس دل کے اندر مال کی محبت نہ ہو وہی غنی ہے، وہی زاہد ہے، چاہے ظاہر میں اس کے پاس مال نہ ہو، اور جس دل میں دنیا کی محبت ہو وہ فقیر ہے، وہ دنیادار ہے چاہے کتنا ہی مال اس کے پاس ہو۔

فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ ایک حکیم کا مقولہ نقل کرتے ہیں کہ ہم نے چار چیزیں تلاش کیں اور اُن کی تلاش کا غلط راستہ اختیار کیا۔ ہم نے غنا کو مال میں تلاش کیا حالاں کہ وہ مال میں نہیں تھا، بلکہ قناعت میں تھا (ہم اس کو مال میں تلاش کرتے رہے۔ وہ جب وہاں تھا ہی نہیں تو کیسے ملتا)۔ ہم نے راحت کو (جان و مال کی) کثرت میں تلاش کیا حالاں کہ راحت ان کی کمی میں تھی۔ ہم نے اعزاز کو مخلوق میں تلاش کیا (کہ اُن کی خوشی کے اسباب اختیار کریں تاکہ اُن کے یہاں اعزاز ہو) مگر وہ تقویٰ میں ملا (اور بالکل صحیح ہے جس قدر آدمی میں تقویٰ زیادہ ہو گا اتنا ہی اس کا اعزاز زیادہ ہو گا)۔ ہم نے اللہ کی نعمت کو کھانے اور پہننے میں تلاش کیا (اور یہ سمجھا کہ یہ اللہ کے بڑے انعامات ہیں) حالاں کہ اللہ تعالیٰ شانہ کا بڑا انعام اسلام کی دولت اور گناہوں کی ستّاری ہے (جس کو یہ دو نعمتیں حاصل ہیں اُس پر اللہ کا بڑا انعام ہے)۔

حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا کہ جس شخص کا دنیا مقصد بن جائے، حق تعالیٰ شانہ اس کے دل پر تین چیزیں مسلط کر دیتے ہیں۔ ایسا غم جو کبھی ختم ہونے والا نہ ہو، ایسا مشغلہ جس سے فراغت نصیب نہ ہو اور ایسا فقر جس کا کبھی خاتمہ نہ ہو۔ (تنبیہ الغافلین)

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تم کسی ایسے شخص کو دیکھو جس کو حق تعالیٰ شانہ نے دنیا سے بے رغبتی اور کم بولنا عطا فرمایا ہو تو اس کے پاس رہا کرو، اس کو حکمت دی گئی ہے۔ (مشکوٰۃ)

دنیادار کے پاس جتنا بھی زیادہ مال ہو، وہ مال کے خرچ کرنے میں فقیروں سے زیادہ کم خرچ ہو گا، اور جتنا بھی مال اس کے پاس ہو وہ ہر وقت اس کے بڑھانے کی فکر میں محتاجوں سے زیادہ پریشان ہو گا، اور

اگر اس کا دل غنی ہے تو تھوڑا سا مال بھی اس کو بے فکر رکھے گا اور جتنا ہو گا اُس کے ہر وقت بڑھانے کی فکر سے آزاد ہو گا۔

امام راغب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ غنا کئی معنوں میں بولا جاتا ہے۔

ایک تو غنا کے معنی کسی قسم کی حاجت نہ ہونے کے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے تو صرف حق تعالیٰ شانہ غنی ہے کہ اس کو کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۞ "تم سب کے سب اللہ تعالیٰ شانہ کے محتاج ہو، وہ پاک ذات بے احتیاج ہے، ہر قسم کی تعریف والا ہے۔"

دوسرے معنی حاجات کی کمی کے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ شانہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سورۂ والضحیٰ میں ارشاد فرمایا: وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۞ "اور حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو فقیر پایا، پھر آپ کو غنی بنا دیا۔" اور اسی معنی کے اعتبار سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد حدیث بالا میں ہے کہ اصل غنا دل کا غنا ہوتا ہے۔

تیسرے معنی مال کی کثرت اور سامان کی فراوانی کے ہیں۔ جس کو قرآن پاک میں: یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (بقرہ:۲۷۳) میں ذکر فرمایا۔ اس آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ صدقات اصل حق ایسے لوگوں کا ہے جو اللہ کے راستہ میں گھر گئے ہوں اور ناواقف آدمی اُن کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے اُن کو مالدار سمجھتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا: ابوذر! کیا تمہارا خیال ہے کہ مال کی کثرت غنا ہے؟ میں نے عرض کیا: بیشک۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمہارا خیال ہے کہ مال کی قلت فقر ہے؟ میں نے عرض کیا: بیشک۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ غنا صرف دل کا غنا ہے اور فقر صرف دل کا فقر ہے۔ (ترغیب)

حقیقت یہی ہے کہ اصل غنا دل کا غنا ہے، جس خوش قسمت کو حق تعالیٰ شانہ نصیب فرمادیں۔

دنیا کی چیزوں میں اپنے سے کم پر نظر رکھو تو قناعت اور شکر گزاری نصیب ہو جائے گی

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا نَظَرَ اَحَدُكُمْ اِلٰى مَنْ فُضِّلَ

عَلَیْهِ فِی الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰى مَنْ هُوَ اَسْفَلُ مِنْهُ

"حضور اقدس ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ جب آدمی کسی ایسے شخص کی طرف دیکھے جو مال میں یا صورت میں اپنے سے اعلیٰ ہو تو ایسے شخص کی طرف بھی غور کرلے جو اُن چیزوں میں اپنے سے کم ہو۔"

(مشکوٰۃ)

ف: یعنی آدمی جب کسی لکھ پتی کو دیکھے اور اس کو دیکھ کر للچائے اور افسوس کرے کہ یہ تو ایسا مال دار ہے، میں نہیں ہوں۔ تو کسی ایسے آدمی پر بھی غور کرلے جس کو ناداری کی وجہ سے فاقے کرنے پڑرہے ہوں، تاکہ پہلے افسوس کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ کا اُس پر شکر ادا ہو سکے کہ اُس نے ایسا نہیں کر رکھا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ اپنے سے زیادہ مالداروں کی طرف نگاہیں نہ لے جایا کرو اپنے سے کم درجہ والوں کو سوچا کرو۔ اس سے اُس نعمت کی حقارت تمہارے دلوں میں نہیں ہوگی، جو اللہ جل شانہ نے تمہیں عطا کر رکھی ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے محبوب (ﷺ) نے سات نصیحتیں کی ہیں:

۱۔ مجھے اس کا حکم فرمایا ہے کہ مسکینوں سے محبت کیا کروں اور ان کے قریب رہا کروں۔

۲۔ مجھے اس کا حکم فرمایا ہے کہ میں اپنے سے اونچے لوگوں (زیادہ مالداروں پر) نگاہ نہ رکھا کروں، اپنے سے کم درجہ والوں پر نگاہ رکھوں (اُن پر غور کیا کروں)۔

۳۔ مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں صلۂ رحمی کیا کروں اگرچہ وہ مجھ سے منہ پھیرے (یعنی جس کے ساتھ صلۂ رحمی کروں وہ مجھ سے غائب ہو، دور ہو، یا یہ کہ وہ میرے ساتھ توجہ سے پیش نہ آئے، بلکہ مجھ سے روگردانی کرے۔ "ترغیب وترہیب" کے الفاظ یہ ہیں کہ اگرچہ وہ مجھ پر ظلم کرے۔ اس سے دوسرے معنیٰ کی تائید ہوتی ہے)۔

۴۔ مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں کسی شخص سے کوئی چیز نہ مانگوں۔

۵۔ مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں حق بات کہوں، چاہے کسی کو کڑوی ہی لگے۔

۶۔ مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ شانہ کی رضا کے مقابلہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروانہ کروں (یعنی جس چیز سے حق تعالیٰ شانہ راضی ہوں اس کو اختیار کروں، اگرچہ اس کے کرنے پر احمق لوگ ملامت کریں)۔

۷۔ مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ کثرت سے پڑھا کروں، اس لیے کہ یہ کلمات ایسے خزانہ سے اُترے ہیں جو خاص عرش کے نیچے ہے۔ (مشکوٰۃ)

لَاحَوْل کو کثرت سے پڑھنے کی ترغیب بہت کثرت سے روایات میں آئی ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ دو خصلتیں ایسی ہیں، کہ جس شخص میں یہ ہوں حق تعالیٰ شانہ اس کو صابرین اور شاکرین کی جماعت میں شمار کرتے ہیں۔ جو شخص دین کے بارے میں اپنے سے اونچے لوگوں کے احوال کو دیکھے اور ان کی اتباع کی کوشش کرے اور دنیا کے بارے میں اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کو دیکھے اور اس پر اللہ تعالیٰ شانہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے (محض اپنے فضل سے) اُس کو اس سے بہتر حالت میں رکھا ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کو صبر اور شکر کرنے والوں میں شمار فرمائیں گے۔ اور جو شخص دین کے بارے میں اپنے سے کم تر لوگوں کو دیکھے (کہ فلاں تو اتنا بھی نہیں کرتا جتنا میں کرتا ہوں) اور دنیا کے بارے میں اپنے سے اونچے لوگوں کو دیکھے اور اس پر افسوس کرے کہ میرے پاس اتنا نہیں ہے جتنا فلاں کے پاس ہے وہ نہ صبر کرنے والوں میں شمار ہے نہ شکر گزاروں میں۔ (مشکوٰۃ)

عون بن عبد اللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں اکثر مالداروں کے پاس بیٹھا کرتا تھا، تو میری طبیعت غمگیں رہتی۔ کسی کا کپڑا اپنے کپڑے سے بہتر دیکھتا (تو اپنے کپڑے کے ادنیٰ ہونے پر اپنی ذلت محسوس کرتا جس سے رنج ہوتا) کسی کا گھوڑا اپنے گھوڑے سے اعلیٰ دیکھتا۔ پھر میں نے فقرا کے پاس اپنی نشست شروع کر دی تو مجھے اس رنج سے راحت مل گئی (کہ ان لوگوں سے اپنی چیزوں کو افضل دیکھتا ہوں)۔

(احیاء)

علما نے لکھا ہے کہ نکاح بھی کسی غریب عورت سے کریں، مالدار عورت سے نہ کریں، اس لیے کہ مالدار عورت سے نکاح کرنے والا پانچ آفتوں میں گرفتار ہو گا۔

(۱) مہر زیادہ دینا پڑے گا۔(۲) رخصتی میں دیر اور ٹال مٹول ہوگی (کہ اس کے جہیز کی تیاری ہی نہ ختم ہوگی)۔(۳) اس سے خدمت لینا مشکل ہوگا۔(۴) خرچ زیادہ مانگے گی۔(۵) طلاق دینا چاہے گا تو اس کے مال کا لالچ طلاق نہیں دینے دے گا۔

کہتے ہیں کہ عورت چار چیزوں میں خاوند سے کم تر ہونی چاہیے، ورنہ خاوند اس کی نگاہ میں ذلیل ہوگا۔ عمر میں، قد کی لمبائی میں، مال میں، شرافت میں۔ اور چار چیزوں میں خاوند سے بڑھی ہوئی ہونی چاہیے۔ خوب صورتی میں، ادب میں، تقویٰ میں، عادتوں میں۔ (احیاء)

ایک بزرگ کی خدمت میں کسی شخص نے حاضر ہو کر اپنے فقر کی شکایت کی اور بڑی سخت پریشانی کا اظہار کیا کہ اس کے غم میں مرنے کی تمنا ظاہر کی۔ ان بزرگ نے دریافت کیا کہ تم اس پر راضی ہو کہ تمہاری آنکھیں ہمیشہ کیلیے لے لی جائیں اور تمہیں دس ہزار درہم مل جائیں؟ وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ پھر فرمایا۔ اچھا اس پر راضی ہو کہ تمہیں دس ہزار درہم دے کر تمہاری زبان لے لی جائے؟ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ اس پر راضی ہو کہ تمہارے چاروں ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں اور تم کو بیس ہزار درہم دے دیے جائیں؟ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ پھر فرمایا کہ اچھا اس پر راضی ہو کہ تمہیں مجنون بنادیا جائے اور دس ہزار درہم دے دیئے جائیں؟ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ وہ فرمانے لگے کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ تمہارے اقرار کے موافق پچاس ہزار سے زیادہ مالیت کا سامان تو حق تعالیٰ شانہ نے تمہیں عطا فرما رکھا ہے (اور یہ مثال کے طور پر چند چیزیں گنوائی ہیں) پھر بھی تم شکوہ کر رہے ہو۔

ابن سماک رحمہ اللہ ایک بادشاہ کے پاس گئے۔ بادشاہ کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ بادشاہ نے اُن سے درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ ابن سماک رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ گلاس پانی کا اُسی ساری سلطنت کے بدلہ میں مل سکتا ہے جو تمہارے پاس ہے اور نہ خریدا جائے تو پانی ملنے کی کوئی صورت نہیں، پیاسے ہی رہنا ہوگا کیا تم راضی ہو جاؤ گے کہ ساری سلطنت دے کر پانی خریدو، ورنہ پیاسے مر جاؤ۔ بادشاہ نے کہا۔ یقیناً راضی ہو جاؤں گا۔ ابن سماک رحمہ اللہ نے کہا: ایسی بادشاہت پر کیا خوش ہونا جس کی ساری قیمت ایک گلاس پانی ہو۔ ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی ایک ایک نعمت ہر شخص کے پاس ایسی ہے کہ لاکھوں کروڑوں اس کی قیمت نہیں ہو سکتی۔

یہ تو عام نعمتیں ہیں جن میں ہر شخص کی شرکت ہے۔ اگر گہری نگاہ سے غور کیا جائے تو ہر شخص کے پاس خصوصی نعمتیں حق تعالیٰ شانہ کی ایسی ہیں جن میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ تین چیزیں تو ایسی ہیں کہ ان میں ہر شخص کو اعتراف ہے کہ وہ اس نعمت میں ممتاز ہے، کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ ان میں سے ایک تو عقل ہے کہ ہر شخص چاہے کتنا ہی بے وقوف ہو، وہ یہ سمجھا کرتا ہے کہ میں سب سے زیادہ عقل مند ہوں۔ دوسرے اس بات کو نہیں سمجھتے جس کو میں سمجھتا ہوں۔ ایسی حالت میں چاہے واقعہ کے اعتبار سے صحیح ہو یا غلط، لیکن اُس کے اپنے اعتقاد اور اقرار کے اعتبار سے اُس پر حق تعالیٰ شانہ کا ایک ایسا انعام ہے کہ یہ انعام کسی دوسرے پر نہیں ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی اس نعمت میں سب سے زیادہ شکر گزار بنے (اور اگر کسی معمولی چیز روپیہ پیسہ وغیرہ میں کسی دوسرے سے کم ہو تو یہ سوچے کہ سب سے اشرف چیز عقل میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہوں)۔

دوسری چیز عادات ہیں کہ ہر شخص اپنے سوا دوسرے ہر شخص میں کوئی نہ کوئی ایسی عادت سمجھا اور پایا کرتا ہے جو اس کے نزدیک عیب ہوتی ہے۔ اور گویا اُس کے نزدیک اس کے سوا ہر شخص کے اندر کوئی نہ کوئی اخلاقی عیب ضرور ہے اور اپنی کسی عادت کو بھی (لفظوں میں چاہے مان لے مگر دل میں) عیب دار نہیں سمجھا کرتا۔ نہ اس کے چھوڑنے کے درپے ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ آدمی یہ سوچے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اگر کسی ایک آدھ چیز میں دوسرے سے کم دے رکھا ہے تو عادات کی نعمتوں میں اس کو خاص طور سے سب سے بڑھا رکھا ہے۔

تیسری چیز علم ہے کہ ہر شخص اپنے ذاتی حالات اور اندرونی احوال سے اتنا زیادہ واقف اور ان کا جاننے والا ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کے احوال سے اتنا واقف نہیں ہوتا اور ان میں ایسی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں کہ آدمی ہرگز یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کے ان عیوب پر کوئی دوسرا مطلع ہو۔ تو حق تعالیٰ شانہ کا یہ احسان کہ اس کو اپنے احوال کا علم عطا فرمانے کے باوجود دوسروں سے اس کی ستاری فرما رکھی ہے۔ اور اس کی یہ تمنا کہ میرے اس علم کی کسی کو خبر نہ ہو، پوری کر رکھی ہے، کہ ان میں دوسرا کوئی بھی اس کا شریک نہیں، کیا ایسی چیز نہیں ہے جس میں یہ سب سے ممتاز ہے اور اس کا شکر اس کے ذمہ ضروری ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں چیزیں ہر شخص میں ایسی ہیں، جن کے متعلق وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ

وہ چیز اس سے لے کر اس کے بدلہ میں اس کی ضد یا کوئی دوسری چیز دے دی جائے۔ مثلاً انسان ہونا ہے، کوئی نہیں گوارا کرتا اس کو آدمی سے بندر بنادیا جائے۔ مرد ہونا ہے، کوئی نہیں پسند کرتا کہ اس کو مرد سے عورت بنادیا جائے۔ اسی طرح مؤمن ہونا ہے، حافظ قرآن ہونا ہے، عالم ہونا ہے، خوب صورت ہونا ہے، صاحب اولاد ہونا ہے۔ غرض اخلاق میں، صورت میں، سیرت میں، عزیز واقارب میں، اہل وعیال میں، عزت مرتبہ میں ہر شخص کے پاس ایسے خصوصی امور ملیں گے جن کے تبادلہ پر وہ کبھی بھی راضی نہ ہوگا۔ تو کیا پھر یہ بات صحیح نہیں کہ ہر شخص پر حق تعالیٰ شانہ کے ہزاروں ایسے خصوصی انعامات ہیں جو دوسرے کو نصیب نہیں۔ ایسی حالت میں ان سب سے آنکھ بند کرکے، اگر کوئی ایک دو چیزیں دوسرے کے پاس ہیں جو اُس کے پاس نہیں ہیں، اُن میں للچائے اور ناشکری کرے، یہ انتہائی کمینہ پن نہیں ہے؟ اور اگر کسی کے پاس مال ہی زیادہ دیکھتا ہے تو اُن اُمور میں جو اُوپر ذکر کیے گئے غور کرے کہ ان میں سے کتنی چیزیں ایسی ہیں جن میں یہ اُس شخص سے بڑھا ہوا ہے، جس پر رشک یا حسد کر رہا ہے۔ درآنحالیکہ کہ مجموعہ احسانات میں یہ خود اس سے بڑھا ہوا ہے۔ (احیاء)

سمجھ دار کون؟

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَاشِرَ عَشَرَةٍ فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ يَانَبِيَّ اللّٰهِ مَنْ اَكْيَسُ النَّاسِ وَاَحْزَمُ النَّاسِ قَالَ اَكْثَرُهُمْ ذِكْرًا لِلْمَوْتِ وَاَكْثَرُهُمْ اِسْتِعْدَادًا لِلْمَوْتِ اُولٰئِكَ الْاَكْيَاسُ ذَهَبُوْا بِشَرَفِ الدُّنْيَا وَكَرَامَةِ الْاٰخِرَةِ

”حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم دس آدمی جن میں ایک میں بھی تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک انصاری نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ سب سے زیادہ سمجھ دار اور سب سے زیادہ محتاط آدمی کون ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جو لوگ موت کو سب سے زیادہ یاد کرنے والے ہوں اور موت کے لیے سب سے زیادہ تیاری کرنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جو دنیا کی شرافت اور آخرت کا اعزاز لے اُڑے۔“ (طبرانی، ترغیب)

ف: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے موت کو کثرت سے یاد کرنے اور یاد رکھنے کے بارے میں بہت مختلف

عنوانات سے بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں، جن میں سے بعض روایات اس رسالہ میں قریب ہی "امیدوں کے مختصر کرنے" کے ذیل میں گزر چکی ہیں۔ ان میں حضور ﷺ کا حکم بھی مختلف روایات میں گزر چکا ہے کہ لذتوں کے توڑ دینے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔ حضور ﷺ کے اس اہتمام ہی کی وجہ سے اس مضمون کو مستقل بھی ذکر کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ موت کو کثرت سے یاد رکھنا امیدوں کے مختصر ہونے کا بھی ذریعہ ہے، موت کی تیاری کا بھی سبب ہے، دنیا سے بے رغبتی پیدا ہونے کا بھی سبب ہے جو اصل مقصود ہے، مال کو جمع کر کے بے کار چھوڑ جانے سے بھی روکنے والا ہے، آخرت کے لیے ذخیرہ جمع کر لینے میں بھی معین ہے اور گناہوں سے توبہ کرتے رہنے پر بھی اُبھارنے والا ہے۔ دوسروں پر ظلم و ستم اور دوسرے کے حقوق کو ضائع کرنے سے بھی روکنے والا ہے۔

الغرض یہ عمل بہت سے فوائد اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے مشائخ سلوک کا بھی معمول ہے کہ اپنے مریدین میں سے اکثروں کو جن کے مناسب حال ہو، اس کا مراقبہ خاص طور سے تلقین کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک جوان مجلس میں کھڑے ہوئے۔ اور عرض کیا۔ یارسول اللہ! مومنین میں سب سے زیادہ سمجھدار کون ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ موت کا کثرت سے ذکر کرنے والا اور اس کے آنے سے پہلے پہلے اس کے لیے بہترین تیاری کرنے والا (اتحاف)۔ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے قرآن پاک کی آیت: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (انعام:۱۲۵) تلاوت فرمائی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

"حق تعالیٰ شانہ جس کو ہدایت فرمانے کا ارادہ فرماتے ہیں اسلام کے لیے اس کے سینے کو کھول دیتے ہیں۔" (کہ اسلام کے متعلق اس کو شرح صدر ہو جاتا ہے)

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ (اسلام کا) نور جب سینہ میں داخل ہوتا ہے تو سینہ اُس کے لیے کھل جاتا ہے۔ کسی نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! اس کی (کہ اسلام کا نور سینہ میں داخل ہو گیا) کوئی علامت ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دھوکہ کے گھر (دنیا) سے بُعد پیدا ہونا، ہمیشہ رہنے والے گھر (آخرت) کی طرف رجوع اور موت آنے سے پہلے اس کے لیے تیاری۔ (مشکوٰۃ)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ مجھے اس کی زیارت کی اجازت مل گئی۔ تم لوگ قبرستان جایا کرو، اس لیے کہ یہ چیز موت کو یاد دلاتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اس سے عبرت ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ قبرستان جانے سے دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے اور آخرت یاد آتی ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ قبرستان جایا کرو، اس سے تم کو آخرت یاد آئے گی اور مردوں کو غسل دیا کرو کہ یہ (نیکیوں سے) خالی بدن کا علاج ہے اور اس سے بہت بڑی نصیحت حاصل ہوتی ہے اور جنازہ کی نماز میں شرکت کیا کرو شاید اس سے کچھ رنج و غم تم میں پیدا ہو جائے، کہ غمگیں آدمی (جس کو آخرت کا غم ہو) اللہ تعالیٰ کے سایہ میں رہتا ہے اور ہر خیر کا طالب رہتا ہے۔ (ترغیب) ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ بیماروں کی عیادت کیا کرو اور جنازوں کے ساتھ جایا کرو کہ یہ آخرت کو یاد دلاتے ہیں۔ ایک حکیم کسی جنازہ کے ساتھ جا رہے تھے۔ راستہ میں لوگ اُس میت پر افسوس اور رنج کر رہے تھے۔ وہ صاحب فرمانے لگے کہ تم اپنے اوپر رنج اور افسوس کرو تو زیادہ مفید ہے۔ یہ تو چلا گیا۔ اور تین آفتوں سے نجات پا گیا۔ آئندہ ملک الموت کے دیکھنے کا خوف اس کو نہیں رہا۔ موت کی سختی جھیلنے کی اب اس کو نوبت نہیں آئے گی، برے خاتمہ کا خوف ختم ہو گیا (اپنی فکر کرو کہ یہ تینوں مرحلے تمہارے لیے باقی ہیں)۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ایک جنازہ کے ساتھ جا رہے تھے۔ کسی راستہ چلنے والے نے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے؟ فرمانے لگے کہ یہ تیرا جنازہ ہے۔ اور اگر تجھے یہ بات گراں گزرے تو میرا جنازہ ہے (مطلب یہ ہے کہ یہ وقت اپنی موت کے یاد کرنے کا ہے۔ اس وقت فضول بات کی طرف متوجہ ہونا بالکل نامناسب ہے)۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا ارشاد ہے کہ تعجّب اور بہت زیادہ تعجّب ان لوگوں پر ہے جن کو (آخرت کے) سفر کے لیے توشہ تیار کر لینے کا حکم ملا ہوا ہے اور روانگی عنقریب ہونے کا اعلان ہو چکا ہے۔ پھر بھی یہ لوگ (دنیا کے) کھیل میں مشغول ہیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ جب یہ کسی جنازہ کو دیکھتے تو ان کا ایسا حال رنج و غم سے ہوتا جیسا کہ ابھی اپنی ماں کو دفن کر کے آئے ہوں (تنبیہ الغافلین)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک یہودی عورت اُن کے پاس آئی اور (کسی احسان کے بدلہ میں) کہنے لگی کہ اللہ تعالیٰ شانہ تمہیں قبر کے عذاب سے بچائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے پوچھا کیا قبروں میں بھی عذاب ہوتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ بیشک قبروں میں بھی عذاب ہوتا ہے اور اس کے بعد سے (لوگوں کی

تعلیم کے لیے) ہمیشہ حضور ﷺ ہر نماز کے بعد قبر کے عذاب سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ مردوں پر قبر میں ایسا سخت عذاب ہوتا ہے کہ اس کی آواز چوپائے تک سنتے ہیں۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا کہ مجھے یہ ڈر ہے کہ تم (خوف کی وجہ سے) مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے۔ ورنہ میں اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا کرتا کہ تمہیں قبر کے عذاب کی آواز سنادے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اتنا روتے کہ ڈاڑھی مبارک تر ہو جاتی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ، اتنا زیادہ جنت اور جہنم کے ذکر سے بھی نہیں روتے جتنا قبر کے تذکرہ سے روتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے جو اس سے سہولت سے چھوٹ گیا اس کے لیے اس کے بعد کی منزلیں سب آسان ہیں۔ اور جو اس (کے عذاب) میں پھنس گیا۔ اس کے لیے اس کے بعد کی منزلیں اور بھی زیادہ سخت ہیں۔ اور میں نے حضور ﷺ سے یہ بھی سنا ہے کہ میں نے کوئی منظر ایسا نہیں دیکھا کہ قبر کا منظر اس سے زیادہ سخت نہ ہو۔ ایک اور حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا کہ قبر میں روزانہ صبح اور شام دو وقت میت کو اس کا وہ گھر دکھایا جاتا ہے جس میں وہ قیامت کے بعد جائے گا۔ اگر وہ جنت والوں میں ہے تو جنت کا مکان دکھایا جاتا ہے (جس سے اس کو قبر ہی میں فرحت اور سرور حاصل رہتا ہے) اور اگر وہ جہنم والوں میں ہوتا ہے تو جہنم کا مکان دکھایا جاتا ہے (جس سے اس کے رنج و غم فکر و خوف میں اضافہ ہوتا رہتا ہے)۔

مال و متاع کی محبت کا علاج

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ مال کی محبت بہت ہی گھناؤنی چیز ہے تو ہر مسلمان کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس سے بچے اور اپنے دل سے اس کی محبت کو دور کر دے۔ اس کا علاج درج ذیل ہے:

۱۔ موت کو کثرت سے یاد کرے اور یہ سوچے کہ یہ سب سامان ایک دن چھوڑنا ہے، پھر اس میں جی لگانے سے کیا فائدہ، بلکہ جس قدر دل لگے اسی قدر چھوڑتے وقت حسرت ہو گی۔

۲۔ تعلقات زیادہ نہ بڑھائے، ضرورت سے زیادہ سامان و جائیداد وغیرہ جمع نہ کرے، کاروبار، روزگار اور تجارت وغیرہ حد سے زیادہ نہ پھیلائے ان چیزوں کو ضرورت اور آرام تک رکھے۔

۳۔ فضول خرچی نہ کرے اس سے آمدنی کی حرص بڑھتی ہے۔

۴۔ غریبوں میں زیادہ بیٹھا کرے مال کے عاشقوں سے دور رہے، امیروں سے بہت کم ملے کیوں کہ امیروں سے ملنے میں جو چیزیں ان کے پاس ہیں ان کی ہوس پیدا ہو گی۔

۵۔ کسی وقت قبرستان جاکر آخرت کی یاد میں زیادتی کرے۔

٦۔ حرام اور مشتبہ کمائی سے پرہیز کرے اور حلال جو ملے اس میں فقرا و مساکین کا حصہ رکھے اور ان پر خرچ کرے اور مال میں سے جس چیز سے زیادہ لگاؤ ہو اس کو اللہ تعالیٰ کے نام پر خیرات کر دے یا فروخت کر دے۔ان شاء اللہ ان تدابیر پر باقاعدگی کے ساتھ عمل کرنے سے دنیا کی محبت نہ رہے گی۔

......☆......☆......☆......

حبِ جاہ کا بیان

حبِ جاہ اپنی شہرت کی خواہش کرنے کو کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے لیے مسخر ہوں اور اس کا تصرف لوگوں کے دلوں پر جاری ہو، تاکہ لوگ اس کی تعظیم کریں اور اس کے عقیدت مند ہوں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں مال سے زیادہ جاہ کی محبت ہوتی ہے۔ چوں کہ اس مرض میں آدمی اپنی شہرت کا طالب اور خواہش مند ہوتا ہے اور مخلوق میں بڑا بننے کا شوق رکھتا ہے۔ تو یہ نہایت خطرناک مرض ہے، ایسا شخص کسی دوسرے شخص کے نام اور تعریف سے جلتا ہے، حسد کرتا ہے، اور دوسرے شخص کی برائی اور ذلت سن کر دل میں خوش ہوتا ہے۔ اس سے دل میں نفاق پیدا ہوتا ہے اور ایسا شخص ہر وقت پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ غرض حبِ مال کی طرح حبِ جاہ کا مرض بھی نفاق، جھوٹ، ریا، فریب، حسد اور غیبت وغیرہ جیسے عظیم گناہوں کو پیدا کر دیتا ہے، بلکہ اس کے نقصانات اور گناہ حبِ مال کے نقصانات اور گناہوں سے بھی زیادہ ہیں، اور یہ مال کے مقابلہ میں دل پر زیادہ غالب آجاتا ہے۔ ①

اسی بیماری کی وجہ سے آدمی حق بات قبول کرنے سے بھی محروم رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ دو بھیڑیے اگر بکریوں کے ریوڑ میں آپڑیں تو وہ اس قدر تباہ وبرباد کرنے والے نہیں ہیں جس قدر مال اور جاہ کی محبت مسلمان کے دین کو تباہ وبرباد کرتی ہے۔

حبِ جاہ کی علامات

حبِ جاہ اور ریاکاری کی علامات قریب قریب ہیں، اور ریاکاری بھی بسا اوقات حبِ جاہ کی وجہ سے کی جاتی ہے، اس لیے اس کا پورا بیان ریاکاری کے بیان میں دیکھ لیجیے، البتہ حبِ جاہ کی چند نشانیاں

① یاد رہے کہ عزت وآبرو سے رہنا یا اس کی طلب بری چیز نہیں، لیکن بری عزت کی وہ طلب ہے جس سے کوئی دین کے معاملہ میں مداہنت میں پڑ جائے اگر لوگوں کی نظر میں بزرگ بننے کے لیے ریاکاری نہ کرے اور نہ دوسروں کو حقیر اور چھوٹا قرار دے اور نہ غلط ذرائع سے عزت وجاہ بنانے کی کوشش کرے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عزت وجاہ ملتی ہے یا اس عزت وجاہ کو اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرنا مذموم نہیں بلکہ جائز اور مستحسن ہے اسی طرح شہرت کی آرزو اگرچہ درست نہیں لیکن اگر اللہ تعالیٰ خود ہی مشہور فرمادے تو اللہ تعالیٰ ہی

یہاں ذکر کرتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ اپنی تعریف سننے کا خواہش مند ہو گا۔

۲۔ قوتِ ایمان، عبادات، سخاوت، صفائی معاملات اور اخلاق وغیرہ میں جس قدر زور لوگوں کے سامنے لگائے گا اتنی کوشش واحتیاط ایسی جگہ میں نہیں دکھائے گا جہاں پر کوئی نہ ہو یا کوئی اس کو پہچانتا نہ ہو۔

۳۔ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو ان کے صحیح مصرف میں لگانے کے بجائے نمائش ونمود کی جگہوں میں خرچ کرے گا۔

۴۔ دوسروں کی تعریف اور نام سے جلتا ہو گا۔

حبِ جاہ کا علاج

حبِ جاہ اور ریاکاری کا علاج قریب قریب ہے۔ پھر بھی ذیل میں اس کے لیے چند تجاویز لکھ دیتے ہیں تاکہ آسانی رہے۔

۱۔ یہ سوچا جائے کہ اگر ساری دنیا میرے قدموں میں پڑ جائے تو یہ چند روز کے لیے ہے، جن لوگوں میں نام آوری اور تعریف ہو گی نہ وہ رہیں گے اور نہ میں رہوں گا، پھر ایسی بے بنیاد نام آوری پر خوش ہونا نادانی ہے، کل اسی وجہ سے آخرت میں انہی لوگوں بلکہ اول سے آخر تک کے سارے انسانوں کے سامنے رسوائی ہو گی اور سخت عذاب میں مبتلا ہوں گا۔

۲۔ جب کوئی تعریف کرے تو یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ کی ستاری ہے کہ اس نے ظاہری، باطنی اور معنوی تمام نجاستوں کو چھپا رکھا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ستاری ہے کہ اس نے میرے گندے وساوس اور گندے اعمال پر مخلوق کو مطلع نہیں فرمایا ورنہ اگر یہ ستاری نہ ہوتی تو مخلوق نفرت کر کے مجھے پتھر مارتی۔

۳۔ جو کوئی آپ کا عیب بیان کرے تو اس سے دفاع کی کوشش نہ کریں (البتہ اگر کوئی بہتان باندھے تو اس سے دفاع اور اس کی تردید کرنی چاہیے) بلکہ یک گونہ شکر کریں کہ بہت سے عیوب ایسے ہیں کہ اس کو معلوم نہیں اور جو اس نے بیان کیا ہے یہ تو بہت کم ہے۔

سوال اور طمع کا بیان

دنیا کی محبت اور زہد کے متعلق جو بیان پہلے گزر چکا ہے اس سے سوال اور طمع کے نقصانات خود بخود معلوم ہو سکتے ہیں۔ لیکن سوال کی عادت اور طمع دونوں چوں کہ ایسی عادتیں ہیں جو انسان کی صلاحیتوں اور اس کی رہی سہی ہمت کو ختم کر کے اس کو دوسروں کا غلام بنا دیتی ہیں جو کہ بالآخر دنیا و آخرت کی بربادی تک پہنچا دیتی ہے اس لیے ان دونوں پر مستقل طور پر مزید کچھ لکھ دیتا ہوں۔ شاید اس باب میں پہلے بیان کی ہوئی بعض حدیثوں کو ایک بار پھر سامنے لایا جائے، اور یہ اس لیے تا کہ ہمارے اندر سوال و طمع کی گندگی اور بدبو نہ رہے۔

سوال و طمع اور مومن کی شان

انسان کی سعادت و تونگری کا راز خدا کی تقسیم پر راضی رہنے میں پوشیدہ ہے۔ ایک مومن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقسیمِ رزق، عطا اور بخشش پر خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ راضی رہتا ہے۔ یہ اس لیے کہ مسلمان کے پاس جو بھی نعمت ہو وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل و احسان سمجھتا ہے اور جن نعمتوں سے وہ محروم ہو ان کے بارے میں اس کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ علیم و حکیم ذات ہے، جو میرے پاس نہیں ہے وہ مبنی بر حکمتِ خداوندی ہے، وہ خیر ہی خیر ہے، اگر چہ یہ نہ ہونا بظاہر شکل و صورت کے اعتبار سے برا اور مکروہ دکھائی دے رہا ہو۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

"ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کو تم برا سمجھتے ہو اور وہی چیز تمہارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں اچھی لگتی ہو اور وہی چیز تمہارے حق میں بری ہو (کیوں کہ حقیقت تو) اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تم نہیں جانتے۔" (سورۃ البقرۃ)

اس لیے ایک مسلمان کے دل میں مال و دولت اور دنیاوی چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ رزقِ حلال کے حصول میں پوری کوشش کرتا ہے، اور اس محنت و کوشش

کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو اس پر قانع رہتا ہے۔ وہ اپنے سے زیادہ دولت مند اور خوشحال لوگوں کی حالت پر جلتا نہیں، بلکہ اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کیے ہوئے رزق حلال کو صبر وشکر کے ساتھ قبول کرتا ہے، حرام اور مشتبہ ذرائع سے پرہیز کرتا ہے چاہے وسائل کتنے ہی ارزاں اور عام کیوں نہ ہوں، کیوں کہ اس کی خواہش کا رخ دنیا کی ناپائیدار چیزوں سے ہٹ کر آخرت کی ابدی اور لازوال نعمتوں کی طرف ہوتا ہے، وہ سوال وطمع اور لالچ وحرص اور اسراف جیسی بری اور ناپسندیدہ عادات کے بجائے ایثار وقربانی، دوسروں پر خرچ کرنے اور کفایت شعاری جیسی اعلیٰ اور بلند صفات کو اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو زہد وقناعت اور استغنا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

استغنا اور قناعت انہی میں سے ایک خلق ہے، جس کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور اس دنیا میں بھی بلند ہو جاتا ہے اور دل کی بے چینی اور کڑھن کی سخت محنت وتکلیف سے اس کو نجات مل جاتی ہے۔ ایسے لوگ جو تقدیر پر شاکر اور ابتلا پر راضی ہوں ان کے نزدیک امیروں کے محلات، بادشاہوں کے خزانے اور عیش وعشرت میں پلنے والے لوگوں کے ساز وسامان مٹی کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں ہوتے، اور بالعموم یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے موقف پر سب سے زیادہ ڈٹ جانے والے اور باطل سے ٹکرانے والے ہوتے ہیں، اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو صحیح طور پر امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام دے سکتے ہیں۔ ان کی قناعت واستغنا انہیں امراء وبادشاہوں سے بے نیاز کر دیتی ہے، پھر وہ بڑے سے بڑے ظالم بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمۂ حق کہہ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو قناعت کی یہ دولت عطا فرمائے بلاشبہ اس کو بہت بڑی دولت عطا کی۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”کامیاب اور بامراد ہوا وہ بندہ جس کو اسلام نصیب ہوا، اور اس کی روزی بھی بقدرِ گزارہ کے ملی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس قدر روزی پر قانع بھی بنادیا۔“ (مسلم ومشکوٰۃ)

اس میں شک نہیں کہ جس آدمی کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی اور اس کو روزی اور دنیاوی سامان بھی بقدرِ کفایت ملا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس پر صابر وشاکر اور قانع بھی بنادیا، ایسے شخص کی زندگی بہت ہی پرسکون اور خوشگوار گزرے گی۔ اگر کسی کے پاس ڈھیروں مال ودولت ہو لیکن اس میں اور

زیادہ کرنے کی لالچ وحرص ہو اور ہر وقت مال بڑھانے کی فکر اس کو دامن گیر رہتی ہو تو اسے قلبی سکون وطمانیت کبھی نصیب نہ ہوگی، وہ باوجود مال ومتاع کے حقیر ہوگا۔ اس حقیقت کو حضور اقدس ﷺ نے ایک دوسری حدیث شریف میں ارشاد فرمایا ہے کہ "غنٰی" مال ودولت اور اسباب سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اصل غنٰی اور تونگری دل کا غنٰی اور بے نیازی ہے۔ (بخاری ومسلم، مشکوۃ)

الغرض تونگری ومحتاجی اور خوشحالی وبدحالی کا تعلق مال واسباب کی زیادتی اور کمی سے نہیں، بلکہ اس کا تعلق دل سے ہے۔ اگر دل قانع، غنی اور بے نیاز ہے تو آدمی خوشحال رہتا ہے اور اگر دل میں حرص ولالچ فقر وفاقے کا ڈر ہے تو دولت اور ساز وسامان کے ڈھیروں کے باوجود خوشحال وپر سکون اور خوشگوار زندگی سے محروم رہے گا۔ پس اس سے سوال وطمع کی برائی اور مذمت بھی معلوم ہوئی۔ جب ایک شخص مخلوق کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے تو وہ مخلوق کے سامنے اپنے آپ کو رسوا اور ذلیل کرتا ہے، دوسرے لوگ اس کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں، حالاں کہ مسلمان کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل ورسوا نہیں کرتا۔ دوسری خرابی سوال کرنے میں یہ ہوتی ہے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم اور عطا پر راضی نہیں۔ تیسری برائی اس میں یہ ہوتی ہے کہ سوال کرنے والا دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہے۔

دنیا کی حرص ولالچ اور سوال وطمع کی اسلام نے بہت سخت مذمت کی ہے، قرآن وحدیث میں ایسی بری عادتوں پر سخت وعیدیں موجود ہیں، یہاں مختصراً چند احادیث پر اکتفا کیا جاتا ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس لیے لکڑیاں چن چن کر، لکڑی کا گٹھ باندھ کر پشت پر اٹھالائے اور اس کو فروخت کردے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی آبرو یعنی ذلت ورسوائی سے جو مانگنے سے ہوتی ہے اسے بے آبرو ہونے سے بچائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے مانگتا پھرے، کسی کا دل چاہے دے دے اور چاہے انکار کردے۔
(بخاری ومسلم مشکوۃ)

ایک حدیث شریف حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ نقل کرتے ہیں کہ "جس شخص کو فقر وفاقہ کی نوبت آجائے اور وہ اس کو لوگوں کے سامنے پیش کردے، اس کا فاقہ (یعنی احتیاج)

بند نہ ہو گا (یعنی اگر ایک ضرورت کے واسطے بھیک مانگ لی ہے اور وہ صورت کے اعتبار سے پوری بھی ہو گئی تو کل کو اس سے اہم کوئی ضرورت پیش آئے گی، تو احتیاج بدستور باقی رہے گا) اور جو شخص اپنے فقر وفاقے (یعنی احتیاج) کو اللہ تعالیٰ پر پیش کرے (یعنی صرف اسی سے مانگ لے) تو اللہ تعالیٰ جلد اس کو روزی عطا فرماتا ہے خواہ فوراً مل جائے یا کچھ تاخیر سے۔" (ترمذی وغیرہ)

حضرت کبشہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر چند باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:

"جو شخص لوگوں سے مانگنے کا دروازہ کھولے گا حق تعالیٰ شانہ اس پر فقر (یعنی احتیاج) کا دروازہ کھول دیتا ہے۔" (ترمذی مشکوۃ)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"جو شخص مال بڑھانے کے لیے سوال (یعنی بھیک) مانگتا ہے وہ جہنم کے انگارے جمع کر رہا ہے، جس کا دل چاہے تھوڑا مانگ لے یا دل چاہے زیادہ مانگ لے، یعنی اس کی اپنی مرضی ہے کہ جتنے انگارے اپنے لیے جمع کرنا چاہے جمع کر لے۔" (مسلم ومشکوۃ)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص لوگوں سے سوال اس لیے کرتا ہے کہ مال میں زیادتی کرے تو اس کے منہ پر قیامت کے دن زخم ہوں گے اور جہنم کے انگارے یعنی آگ کھا رہا ہو گا، جس کا دل چاہے زیادہ سوال کرے اور جس کا دل چاہے کم کرے یعنی اس کی مرضی کہ جتنے انگارے کھا سکے کھالے۔ (ترمذی مشکوۃ)

ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ آدمی لوگوں سے سوال کرتا رہتا ہے حتی کہ قیامت کے دن اس کے چہرے پر ایک بوٹی (ذراسا) گوشت بھی نہ رہے گا۔ (بخاری ومسلم، مشکوۃ)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی آدم کی نیک بختی میں سے ایک یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر فرمایا ہے اس پر وہ راضی ہو، اور بنی آدم کی بدبختی میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو کچھ مقرر فرمایا ہے وہ اس پر خوش نہ ہو۔

(احمد، ترمذی، مشکوۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ انسان میں سب سے بری خصلت کڑھا دینے والی حرص اور گھبرا دینے والی بزدلی ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: "یارسول اللہ! مجھے مختصر سی نصیحت کیجیے تاکہ میں اس پر مضبوطی سے عمل کرسکوں"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب نماز پڑھو تو ایسی پڑھو کہ عمر کی آخری نماز یہی ہے، اور کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالو جس کی معذرت کرنا پڑے، اور اپنے دل کو پکے طور پر اس چیز سے مایوس کرلو جو دوسروں کے پاس ہے کہ (اس کی طرف ذرا سا بھی تمہیں التفات نہ ہو)"۔ (مشکوٰۃ)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتادیجیے جس سے اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت فرمائے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کرنے لگیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا سے بے رغبتی پیدا کرلو اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے اور لوگوں کے پاس جو کچھ (مال واسباب وغیرہ) ہے اس سے بے رغبتی پیدا کرلو لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔ (ترمذی وابن ماجہ ومشکوٰۃ)

حرص ولالچ بہت بری ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ حرص وطمع سے بچو کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص ولالچ سے تباہ ہوئیں۔ اس (حرص) نے بخل کرنے پر ان کو آمادہ کیا تو انہوں نے بخل اختیار کیا، اسی نے ان کو قطع رحمی پر اکسایا تو انہوں نے قطع رحمی اختیار کی، اس نے ان کو بدکاری پر ابھارا تو انہوں نے بدکاریاں کیں۔ (ابوداؤد)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بات کا ضامن کون ہوتا ہے کہ وہ کسی شخص سے کچھ سوال نہ کیا کرے گا تو میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوتا ہوں، تو انہوں نے عرض کیا کہ میں۔ اس کے بعد وہ کسی سے کوئی بھی چیز نہیں مانگتے تھے۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا اور مجھ سے یہ شرط رکھی کہ دیکھنا کسی سے کچھ سوال نہ کرنا۔ میں نے کہا: قبول ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر تمہارے ہاتھ سے کوڑا گر پڑے

تو اپنا کوڑا بھی نہ مانگنا یہاں تک کہ اترنا اور اس کو خود اٹھالینا۔ (مسند احمد)

ان احادیث میں ایک مومن کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ کسی انسان سے سوال کرنے کا خیال بھی اپنے دل سے نکال ڈالے۔ سوچیے! جس شریعت میں ادنیٰ سے ادنیٰ چیز مانگنے کے لیے ایک رب العزت ہی کا دروازہ بتایا گیا ہو اس میں غیر اللہ سے ایسی ایسی مرادیں مانگنا جن کی پورا کرنے کی ان میں طاقت بھی نہ ہو، کب گوارا ہو سکتا ہے۔

بلاشبہ حرص ولالچ انتہائی بداخلاقی ہے اور یہی حرص ولالچ بہت سی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ اس سے اور کئی بداخلاقیاں پیدا ہوتی ہیں، مثلاً ریاکاری، حسد، بغض وغیرہ جیسی خطرناک روحانی امراض اور برائیاں اس سے پھوٹتی ہیں۔ لوگوں سے سوال وطمع جیسی ذلیل اور رسوا کن افعال اسی حرص ولالچ کے برگ وبار ہوتے ہیں۔ جو شخص جس آدمی سے طمع رکھتا ہے وہ اس کے سامنے چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے اور اس کی غلط اور ناحق باتوں پر صرف چشم پوشی ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی تائید بھی کرتا ہے اور عبادت میں ریا کاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہی طمع ایمان کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ چوں کہ اس کے دل کی لو دنیاوی مال ومتاع یا جاہ وشہرت بڑھانے کی طرف لگی رہتی ہے اس لیے اس کا دل ودماغ اللہ رب العزت (ذوالجلال والاکرام) کے بجائے لوگوں کی طرف جھانکتا ہے جیسا کہ بلی چوہے کی تاک میں بیٹھی رہتی ہے۔ یہی حرص وطمع انسان کو مال ودولت یا شہرت کا بندہ بنا کر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور پھینک دیتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: لُعِنَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَلُعِنَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ ”درہم ودینار (مال ودولت) کا بندہ ملعون اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہے۔“ (ترمذی)

مال ودولت کی بندگی اور پرستش یہی تو ہوتی ہے کہ انسان مال ودولت اور جاہ کی چاہت اور طلب میں ایسا گرفتار ہو جائے کہ اس کے حصول میں اللہ تعالیٰ کے احکامات اور حدود کا پابند نہ ہو، حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر جس طرح بھی حاصل ہو ایسا جھپٹ کرلیتا ہے جیسا کہ بھوکا بازاری کتا گوشت کے ٹکڑے پر گر پڑتا ہے۔

غرض حرص وطمع نہایت خطرناک برائیوں کو جنم دیتی ہے، اس کی وجہ سے معاشرہ میں ایسی گمراہ کن اور تباہ کن خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بالآخر ملکوں اور قوموں کو تباہ کر دیتی ہیں، اس لیے چاہیے کہ اس خطرناک اور تباہ کن مرض سے اپنے دلوں اور سینوں کو پوری طرح حفاظت میں رکھیں۔

سوال کا حکم

۱۔ سوال حرام ہے اور جو مال و دولت بصورتِ سوال حاصل ہوا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ جس شخص نے ایسا مال حاصل کیا ہو اس پر واجب ہے کہ وہ اس مال کو فقرا و مساکین میں بانٹ دے اور اس بانٹنے کو کوئی کمال نہ سمجھے، بلکہ یہ سمجھے کہ جو گندگی لگی ہوئی تھی اس کو دور کیا، جیسا کہ کپڑوں پر گندگی لگ جاتی ہے تو اس کو صاف کرنے میں کوئی آدمی یہ نہیں سمجھتا کہ میں کوئی کارِ خیر کرتا ہوں۔ اگرچہ اس کو پاکیزگی جنابت سے اجر ملتا ہے، لیکن اپنی طرف سے اس کی کوئی ایسی نیت نہیں ہوتی، اس میں بھی ایسا ہی ہے۔

سوال کی صورتیں

بھیک مانگنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی تو صریح الفاظ میں سوال ہوا کرتا ہے اور کبھی صریح عمل سے۔ مثلاً کسی نے مسجد کے باہر چادر بچھا رکھی ہو یا بیٹھا ہوا ہو یا ہاتھ پھیلایا ہو، یا کسی کے در پر جائے اور کچھ نہ کہے لیکن گھر والوں کو تجربہ ہے کہ جب اس وقت میں یہ شخص آتا ہے تو اس کا مقصد بھیک مانگنا ہوتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قول وفعل سے صراحۃً سوال نہیں کیا جاتا، لیکن تعریضاً سوال ہوتا ہے، یعنی اپنی حالت کسی پر اس لیے پیش کی جاتی ہے کہ وہ اس کے حال پر ترس کھا کر اس کو کچھ دے دے۔

مثلاً کوئی کسی مالدار شخص سے یوں کہے کہ مجھ پر بہت سارا قرضہ تھا، ایک لاکھ سے تجاوز تھا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ہی دینے والا ہے، فلاں فلاں مالدار نے اتنی مدد کی، فلاں نے اتنا مال دیا، فلاں نے اتنی رقم دی، اب زیادہ باقی نہیں رہا۔ یا کسی سے کہے کہ صرف دس ہزار بقایا ہے، وہ بھی کہیں سے اللہ تعالیٰ دلوا دے گا؛ تو اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ مالدار بھی کچھ دے۔ یا کوئی شخص کہیں مہمان ہو جائے اور میزبان سے کہے کہ فلاں شخص کے پاس مہمان ہوا اُس نے ایسا اکرام کیا، ایسا کھانا کھلایا، فلاں فلاں چیز ہدیۃً دی، یا بظاہر کوئی دین دار کسی مال والے سے یہ کہے کہ الحمدللہ! ویزہ لگ گیا ہے، عمرہ کی تیاری ہے، رقم کی کچھ کمی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ دے دے گا۔ غرض اسی طرح سوال کی کئی صورتیں بن جاتی ہیں۔

سوال کی جائز صورتیں اور حدود

سوال صرف مجبوری کی حالت میں یا ایسی حاجت میں جو مجبوری کے قریب ہو جائز ہے۔ حاجت یا مجبوری کے تین درجات ہیں:

(۱) اعلیٰ درجہ (۲) درمیانی درجہ (۳) کم درجہ

۱۔ اعلیٰ درجہ سخت مجبوری اور حالت اضطراری کا ہے۔ مثلاً بھوک سے مرض لاحق ہوا جس سے ہلاکت اور مرنے کا اندیشہ ہے، یا ننگا ہے کہ ستر چھپانے کے لیے کوئی چیز نہیں تو ایسے شخص کے لیے سوال کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں واجب ہے، بلکہ بعض شدید حالات میں بن مانگے بھی کچھ لینا جائز ہے جس سے اضطراری حالت ختم ہو جائے۔ یا مثلاً کسی شخص نے کوئی بوجھ وضمان اپنے ذمہ لے لیا ہو، وہ اس پر آپڑے، یا مثلاً کسی شخص کو حادثہ پیش آئے جس سے سارا مال ہلاک ہو جائے، گھر میں آگ لگ جائے یا کوئی آفت اچانک ٹوٹ پڑے جس سے سب کچھ ختم ہو جائے تو ایسے شخص کو جائز ہے کہ اتنی مقدار میں سوال کرے جس سے ضمان ادا ہو جائے اور زندگی کا سہارا ہو سکے، پھر سوال سے رک جائے، اس سے زیادہ سوال کا حق نہیں۔

۲۔ درمیانی درجہ بھی سخت احتیاج کا ہے، لیکن حالتِ اضطراری سے کم ہے مثلاً کوئی شخص بیمار ہے اور دوائی کے لیے رقم نہیں، لیکن مرض ایسا نہیں جو ہلاکت کا باعث بنے اس میں بھی سوال کرنے کی گنجائش ہے لیکن سوال ترک کرنا یہاں بھی بہتر اور اولیٰ ہے۔

۳۔ ادنیٰ درجے کی حالت یہ ہے کہ حاجت زیادہ نہ ہو، مثلاً اس کے پاس روٹی کے دام تو موجود ہیں، لیکن سالن کے دام نہیں یا پھٹے پرانے کپڑے ہیں، وہ ایک جوڑا ایسا بنانا چاہتا ہے کہ باہر جانے کے لیے پہن لیا کرے تاکہ لوگوں پر اس کا فقر اور بوسیدہ کپڑے ظاہر نہ ہوں ایسے شخص کے لیے سوال جائز ہے مگر مکروہ ہے۔ ان کے علاوہ جس شخص کے پاس بقدرِ ضرورت سامان موجود ہو اور وہ سوال کرے تو یہ حرام ہے۔

جہاں جہاں سوال جائز ہے وہاں بھی شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ سوال نہ کرے، مثلاً ننگا ہونے کی وجہ سے سوال کیا تھا، کپڑا مل گیا، ستر ڈھانپ لیا، لباس کی ضرورت نہ رہی تو پھر کپڑے کا سوال

نہ کرے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ سوال اس طرح نہ کریں جس سے اللہ تعالیٰ کی شکایت ٹپکتی ہو۔ تیسری بات سوال کرنے میں کسی کو تنگ نہ کرے اور نہ کسی کو اذیت پہنچائے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ سوال ایسی جگہ کرے جہاں زیادہ ذلت ور سوائی نہ اٹھانی پڑے۔

بھیک مانگنا کیا ہے؟

جو چیز اپنی ملک میں لانے کی غرض سے ذلت اٹھا کر مانگی جائے وہ بھیک اور سوال میں داخل ہے۔ اگر کوئی کسی فقیر کی امداد کے لیے لوگوں سے کہہ دے یا مدرسہ یا مسجد اور جہاد وغیرہ کے لیے چندہ مانگے تو یہ سوال میں داخل نہیں، بلکہ یہ تعاون اور امداد ہے جو مخلوق کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دوست دوسرے دوست سے خوش طبعی سے کوئی چیز مانگ لے یا بیٹا اپنی ماں سے محبت کے طور پر مانگ لے تو یہ سوال میں داخل نہیں، اسی طرح اگر کوئی چیز اپنی ملک میں لینے کے لیے نہیں بلکہ اس سے صرف فائدہ اٹھا کر واپس کر دینے کی غرض سے مانگی جائے تو یہ بھی اس رسوا کن سوال میں داخل نہیں، بلکہ یہ قرض ہے یا ایسی مانگی ہوئی چیز ہے جو پھر اپنے مالک کو واپس کر دینا ہوتا ہے۔ [1]

جس سے مانگا جائے اس کے لیے احکام

یہ جو کچھ لکھا گیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ فقرا اور بھیک مانگنے والوں کو ڈانٹنے اور پیٹنے کا کام شروع کیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سخت مجبوری کی حالت نہ ہو تو سوال سے بچا جائے ورنہ اس کا سوال حرام اور اس کا کمایا ہوا مال بھی حرام۔ اور جس شخص سے سوال کیا جائے اس کے احکام جدا ہیں۔

آج کل کی غفلت

لیکن آج کل ایک عجیب فضا چل پڑی ہے کہ جس شخص پر دوسروں کے جو فرائض اور حقوق عائد ہوتے ہیں ان کی ادائیگی سے تو غفلت برتتا ہے، مگر دوسروں کے ذمہ جو حقوق واجب ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے جو احکام ہیں ان کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔ منبر پر جو باپ کے حقوق کا بیان ہوتا ہے تو باپ یہ

---

[1] البتہ اضطراری حالت میں کہ بھوک وپیاس کی شدت سے مرنے کا خوف ہو بغیر اجازت کے لینا بھی اس قدر جائز ہے جتنی مقدار لیں بھوک اور پیاس کی شدت نہ رہے۔

نہیں سوچتا کہ میرا بھی باپ ہے یا تھا اس کے بھی یہی حقوق ہیں، لیکن وہ اپنے بیٹے سے اپنے حقوق کا طالب ہوتا ہے۔ پھر جب بیٹے کے حقوق کے بیان کا نمبر آتا ہے تو باپ تو بیٹے کے حقوق سے غفلت برتتا ہے لیکن بیٹے کی نظریں اپنے باپ کی تلاش میں رہتی ہیں کہ وہ بھی یہ بیان سنے تاکہ میرے حقوق ادا کرے۔ جب ہر کوئی اپنی ذمہ داری چھوڑ کر دوسروں سے اپنے حقوق مانگتا رہے تو معاشرہ میں بگاڑ اور بے چینی کا ہونا لازمی ہے۔ آج کل معاشرہ میں جو خرابیاں دیکھی جا رہی ہیں اکثر اسی طرز اور طریق کی پیداوار ہیں۔ عرض یہ کرنی تھی کہ یہ ساری وعیدات اور برائیاں تو اس شخص کے لیے ہیں جو بغیر ضرورت کے سوال کرتا ہے، لیکن جس شخص سے مانگا جاتا ہے اس کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ کسی سائل فقیر و مسکین کو نہ جھڑکے، بلکہ اس پر شفقت فرمائے، جو بس میں ہے دے دے، اگر کچھ نہیں دے سکتا تو اس سے نرمی سے بات کر کے اچھی طرح رخصت کر دے۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (یعنی سائل کو مت جھڑکو)۔ (سورۃ الضحیٰ: آیت ۱۰)

جس کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی سوال کرے خواہ مالی ہو یا عملی اس کو نہ جھڑکو۔ اگر سوال پورا کرنے کی قدرت ہے تو پورا کرو بشرطیکہ ناجائز سوال نہ ہو، اور اگر پورا نہیں کر سکتے تو نرمی سے عذر کرو۔ اگر اس کو کچھ دے دیا تو بھی طعن و تشنیع نہ کرو۔ بہر حال سائل کی دل شکنی سے پرہیز کرنا چاہیے البتہ اگر سائل کسی طرح نہ مانے اور بہت تنگ کرتا ہے تو بوقتِ ضرورت جبر بھی جائز ہے۔

صاحبِ مشکوٰۃ نے ترمذی اور نسائی سے ایک لمبی حدیث نقل کی ہے۔۔ اس میں یہ ہے کہ تین آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے، ان میں سے ایک اس شخص کا بھی ذکر آیا ہے کہ ایک آدمی کسی مجمع سے سوال کرے یا کرنے آیا محض اللہ تعالیٰ کے واسطے سوال کرتا ہے، اس کی لوگوں سے کوئی قرابت اور رشتہ داری (وغیرہ) نہ تھی، ایک شخص مجمع سے اُٹھا اور چپکے سے سائل کو کچھ دے دیا جس کی خبر بجز اللہ تعالیٰ کے اور اس سائل کے کسی اور کو نہ ہوئی (تو یہ دینے والا شخص اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے)۔ (مشکوٰۃ)

نیز حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَاِنْ جَآءَ عَلٰی فَرَسٍ یعنی "سائل کے لیے اس کا حق ہے کہ اس کو دیا جائے اگرچہ گھوڑے پر سوار ہو کر

آئے۔"   (احمد، ابوداؤد، مشکوۃ)

مطلب یہ ہے کہ سائل یعنی مانگنے والا ہر صورت میں کچھ دیے جانے کا مستحق ہے، اس کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرنا چاہیے اگرچہ گھوڑے پر سوار ہو کر تمہارے پاس مانگنے آئے، کیوں کہ اگر اس کو سوال کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ اپنے آپ کو سوال کر کے ذلیل وخوار نہ کرتا۔ ضرور اس کی کوئی ضرورت ہو گی، ایسی جس کا آپ کو علم نہیں۔ اس میں مسلمانوں کو حسنِ ظن کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ کسی پر خواہ مخواہ بدگمانی نہ کریں بلکہ لوگوں پر اچھا گمان رکھیں۔

غرض جب تک یقینی طور پر کسی کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ بغیر ضرورت کے سوال کر رہا ہے تو اس کو کسی طرح نہ جھڑکے، محض اس شک وگمان پر کہ یہ سائل پیشہ ور ہو گا یا اس کو بظاہر تندرست دیکھ کر اس سے منہ نہ موڑے، ہو سکتا ہے اس پر بھاری ضمان آیا ہو یا مسافر ہو یا کسی ظالم نے اس کا مال چرایا ہو یا اس پر کوئی اور ایسی مصیبت آئی ہو جس نے اس کو سوال پر مجبور کیا ہو۔ تو جب تک کسی سائل کے بارے میں قطعی طور پر معلوم نہ ہو کہ وہ بغیر ضرورت کے سوال کر رہا ہے اُس وقت تک سوال کرنے والے کو سچا سمجھ کر اس کی مدد و خدمت کریں ورنہ کم از کم اس کی دل آزاری اور دل شکنی سے تو ضرور بچیں، البتہ اگر کسی کے متعلق تحقیق اور یقین ہو جائے کہ اس نے سوال کو پیشہ بنالیا ہے، صحت مند و تندرست بھی ہے اور بغیر ضرورت کے سوال کر رہا ہے تو ایسے سائل کو دینا اور اور اس کو سوال سے نہ روکنا دوسرے لوگوں کو بے کار اور نکما بنا دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کو کچھ دینا اور جو حقیقت میں حاجت مند ہیں، لیکن شرم کے مارے سوال نہیں کرتے اُن کو نہ دینا بڑا ظلم ہے۔

طمع اور ہدیہ میں فرق

طمع کی حقیقت یہ ہے کہ لوگوں سے دل میں کسی ایسی چیز کا طلب گار ہو کہ اگر وہ ان سے مانگی جائے تو اس میں ذلت وشرمندگی اٹھانی پڑے۔ پس اگر کسی کو بہت ہی قریبی دوست کے پاس یا عزیز واقارب کے پاس جانا ہو اور راستہ میں مثلاً چائے اس لیے نہیں پی کہ دوست یا رشتہ دار پلا دے گا تو یہ طمع میں داخل نہیں، کیوں کہ اگر اس دوست ورشتہ دار سے چائے مانگ بھی لے تو اس میں شرمندگی اور رسوائی اٹھانی نہیں پڑے گی، البتہ جہاں اس کے اظہار میں رسوائی وذلت اٹھانی پڑتی ہے یا چیز ایسی ہے کہ

اگر اس کو بظاہر مانگا جائے تو دوست اور رشتہ دار کے سامنے بھی ذلت ورسوائی ہوگی مثلاً بڑی رقم مفت مانگنا یا کوئی اور قیمتی چیز لوگوں سے دل میں طلب کرنا طمع میں داخل ہے۔ بغیر کسی طمع ولالچ کے اگر کسی کو کچھ مل جائے تو اس کے لینے میں مضائقہ نہیں، چناں چہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دے دیا۔ پھر مانگا۔ پھر مجھے دے دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے حکیم! یہ مال سبز وشاداب ہے، جو شخص اس کو بغیر طمع اور نفس کی بے پرواہی سے لے اس کے لیے اس میں برکت ڈالی جاتی ہے اور جو نفس کے طمع کے ساتھ لیتا ہے اس کے واسطے اس میں برکت نہیں ہوگی۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے (جس کو جوع البقر کا مرض لاحق ہو) جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، اوپر کا ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ) نچلے ہاتھ (یعنی پھیلانے والے ہاتھ) سے بہتر ہے۔ (حضرت حکیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کسی کا مال آپ کے بعد کم نہیں کروں گا (یعنی کسی سے سوال نہیں کروں گا) یہاں تک کہ میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ)

حضرت خالد بن علی رضی اللہ عنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جس شخص کو بغیر سوال کے اور بغیر اشرافِ نفس (طمع وحرص) کے اپنے بھائی کی طرف سے کوئی چیز پہنچے تو اسے قبول کرلینا چاہیے اور اس کو رد نہ کرنا چاہیے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزی ہے جو اس کو بھیجی گئی ہے۔

(احمد بن حبان)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ بن مانگے کوئی چیز دلوائے اس کو قبول کرنا چاہیے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو روزی بھیجی گئی ہے۔

(ترغیب: ج۱، ص۵۹۹)

البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ مال حرام نہ ہو۔ اگر وہ مال یقینی طور پر حرام ہے یا اس شخص کی غرض رشوت ہے یا زکوٰۃ کی نیت سے دے رہا ہے اور آپ زکوٰۃ کے مستحق نہیں یا اپنی شہرت یا اپنی نمود کی غرض سے دے رہا ہے یا کسی اور فاسد نیت سے دے رہا ہے تو ایسی صورتوں میں لینا جائز نہیں [1] البتہ اگر محض ہدیہ ہے تو اس کا قبول کرنا سنت ہے۔

---

[1] مثلاً آپ کا اس دینے والے پر کچھ قرض ہے، وہ ہدیہ اس غرض سے دے رہا ہے کہ کچھ وقت قرضہ لینے کا تقاضا نہ کرے، تو یہ سود کے ساتھ رشوت بھی ہے۔ یہی حال حاکم کا ہے۔ اس کا بیان "قاضی کے بیان" میں موجود ہے۔

اگر ہدیہ کی مقدار میں لینے والے پر منت واحسان اور بوجھ ہو تو اس میں سے کچھ مقدار لینے اور کچھ مقدار واپس کر دینے میں بھی مضائقہ نہیں۔

طمع کا علاج

۱۔ اپنی استطاعت کے مطابق خود کام کیا کریں تاکہ دوسروں کی طرف نظر نہ ہو۔

۲۔ جو ضرورت پیش آئے اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگ لیا کریں، دو رکعت نفل صلوٰۃ الحاجت پڑھا کریں۔

۳۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے یوں دعا کرتے رہیں کہ یااللہ! جہاں سے طمع ہو وہاں سے ناامید فرما اور جہاں سے میرا وہم وگمان نہ ہو وہاں سے روزی کا انتظام فرما۔

۴۔ اگر کسی سے طمع ہو جائے کہ وہ کوئی چیز دے دے اور پھر اس نے کچھ دے دیا تو اس کو ایسی جگہ خرچ کریں جہاں سے آپ کی کوئی ضرورت پوری نہ ہو اور نہ آپ کی شہرت ہو، مثلاً کسی اندھے کو خفیہ طور پر دے دیں کہ اس اندھے کو پتہ بھی نہ چلے یا مثلاً کسی چندہ والے صندوق میں ڈال دیں کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔

۵۔ کفایت شعاری سے کام لیں یعنی ہر چیز میں اسراف سے بچیں۔

زہد وقناعت کے فوائد کا خلاصہ

دنیا کی محبت، حرص ولالچ، سوال وطمع اور اس کے برعکس زہد وقناعت، مخلوق سے استغنا اور دنیا سے بے رغبتی کے متعلق تفصیلی بحث آپ کے سامنے آگئی جس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت اور نفسانی خواہشات کی بے راہ روی انسان کے دل وضمیر کو مردہ کر دیتی ہے۔ انسان کے اندر خسیس خصلتیں پیدا کرتی ہے۔ یہی حرص ومحبت تمام برائیوں، بے اطمینانی اور بے چینی کی بنیاد بنتی ہے اور انسان کی دنیا وآخرت کو برباد کر دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ اور آخرت سے محبت اور دنیا سے بے رغبتی، یعنی زہد وقناعت انسان کی اندرونی قوتوں کو جگا کر اس کے اندر عظیم صلاحیتیں پیدا کرتی ہے اور روحانی ترقیوں میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور انسان کی دنیا وآخرت کو سنوارتی ہے۔ اس کی وجہ سے لوگ دنیا وآخرت میں چین وسکون پالیتے ہیں۔ یہی زہد وقناعت ہے جو قائدینِ اسلام کے لیے سخت ضروری بلکہ

شرطِ اول ہے، کیوں کہ یہ صفت نہ ہو تو وہ اسلام اور مسلمانوں کو دنیا میں بیچ ڈالیں گے یا کم از کم مادی قوتوں اور مال و دولت والوں کے سامنے جھکیں گے۔

ہماری اسلامی تاریخ پر نظر دوڑائیں ! اول سے لے کر آج تک جن شخصیات نے بڑے بڑے اصلاحی انقلابات برپا کیے، کفر و شرک کے طوفان اور ظلم و فحاشی کے سیلاب کا رخ موڑ دیا وہ اس زہد و قناعت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، وہ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو حاصل کر چکے تھے، مادی قوتوں، دولت مندوں اور دنیاوی جاہ و منصب رکھنے والوں کا رعب اور ان کی طرف کشش ان کے اندر سے ختم ہو چکی تھی ،اس لیے وہ کسی بھی طاغوتی قوت کے سامنے جھکنے کے بجائے اس کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے تھے اور دنیا میں بڑے بڑے اصلاحی انقلابات لاتے تھے۔ زہد و قناعت کی یہ دولت اور اس طرح کی دوسری اچھی خصلتیں عموماً ان لوگوں کو ملتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر کو اپناتے ہیں اور یہی وہ راہ ہے جس کو سلوک واحسان، تقویٰ اور تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ، جس کے مٹانے اور ختم کرنے کے لیے طاغوتی اور شیطانی قوتیں پوری طرح منظم ہو کر کوششیں کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو زہد و قناعت جیسے اچھے اخلاق و خصلتوں کی دولت سے مالا مال کر کے دنیا و آخرت میں کامیاب کر دے، اور جہاں سے ہمارا وہم و گمان بھی نہ ہو وہاں سے روزی کا انتظام فرمائے۔

زہد و قناعت کے فوائد

آخر میں مختصر طور پر زہد و قناعت کے فوائد کو لکھ دیتے ہیں:

۱۔ زہد و قناعت سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان میں سے پہلی چیز ذہنی یکسوئی ہے۔ دنیا کی چیزوں، دنیا کی راحت و عزت اور لذت سے جتنا زیادہ تعلق ہو گا اتنے ہی زیادہ خیالات منتشر ہوں گے اور یہ تعلق جتنا کم ہو گا اتنے ہی خیالات مجتمع اور یکجا ہوں گے۔

۲۔ خیالات کی یکسوئی جس مسئلہ پر مرکوز ہو گی وہ اس کا حل تلاش کر کے آپ کے سامنے رکھ دے گی۔

۳۔ اس سے روح میں لطافت پیدا ہوتی ہے، انسان جس قدر دنیا کی عزت و منصب اور مال وغیرہ سے دل لگائے رکھتا ہے اور جتنا اس میں مشغول ہوتا ہے اس کی روح میں اسی قدر کثافت پیدا ہوتی ہے، اور جتنا

اس سے اپنے آپ کو دور رکھے گا اتنی ہی اس کی روح پاک و خالص ہو گی۔

۴۔ حقائق غیر مادی اشیا ہوتے ہیں، جو روح دنیا کی الائشوں میں پھنسی ہوئی ہو وہ حقائق کو بے نقاب حالت میں نہیں دیکھ سکتی، اس کا مشاہدہ ہمیشہ دھندلا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے اور اپنی عادتوں اور لذت وغیرہ کے حصول کے معاملہ میں تو نہایت حساس ہوتے ہیں، مگر ایسے معاملات جو اللہ تعالیٰ اور آخرت سے تعلق رکھتے ہیں، جو ان کی ابدی زندگی کو بہتر یا بدتر بنانے والے ہیں ان کو وہ اس طرح نظر انداز کرتے ہیں کہ گویا ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس کے برعکس زہد و قناعت کی وجہ سے روح دنیا کی کثافتوں اور آلائشوں سے دور رہتی ہے اور اس کے نازک اور لطیف احساسات بیدار رہتے ہیں۔ یہی لطیف احساسات اعلیٰ ترین حقائق کا ادراک کرتے ہیں اور بندے پر ابدی زندگی کے حقائق کھول دیتے ہیں۔

۵۔ زہد اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان و یقین کا ایک فطری اظہار ہے۔ جب کوئی شخص اعلیٰ حقیقتوں کو پالیتا ہے تو ادنیٰ حقیقتیں اور دنیا کا منصب و لذت وغیرہ خود بخود اس کی نگاہ میں حقیر بن جاتے ہیں۔ اخروی اور ابدی قدروں کی اہمیت کا احساس دنیوی قدروں کو غیر اہم بنا دیتا ہے اور یہی وہ پیشگی جنت اور اطمینان والی زندگی ہے جو قانع اور زاہد کو اس دنیا میں ملتی ہے اور آخرت کی ابدی جنت کی نعمتوں کا تو اس دنیا میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ نیز زہد ضروریاتِ زندگی میں کمی پیدا کر دیتا ہے اور یہی چیز اطمینان بخش اور بامقصد زندگی پیدا کرتی ہے۔ ہر بامقصد آدمی فطرۃً ایک تضاد میں مبتلا کیا گیا ہے: ایک طرف اس کے جسم و بدن کے تقاضے ہیں جن کی فہرست کی کوئی شمار نہیں اور دوسری طرف اس کا ایک مقصد ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ساری توجہ اس کی طرف لگا دی جائے، اس توجہ کو بالکلیہ ختم نہیں کیا جا سکتا، ایسی صورت میں عقلمندی یہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی میں کمی کر دی جائے۔ ضروریاتِ زندگی کی اس کمی کی وجہ سے آدمی مقصد میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کے قابل بن جاتا ہے اور جس قدر ضروریاتِ زندگی میں کمی ہو گی اسی قدر زیادہ سوز و اخلاص پیدا ہو گا۔ دنیا میں بھی حقیقی معنوں میں زیادہ طاقتور وہی ہوتا ہے جس کی ضروریات مختصر ہوں، جس کی آرزوئیں محدود ہوں، جو لذت و جاہ کا طالب نہ ہو اور یہی اچھی اور اطمینان بخش زندگی ہے۔

اچھی زندگی اس کا نام نہیں کہ آدمی کے پاس زندگی کے سازوسامان کی کثرت اور بہتات ہو، بلکہ اچھی زندگی کا راز قناعت ہے۔ قناعت کی دولت اس کو ملتی ہے جو بقدرِ ضرورت چیز پر راضی اور خوش رہے اور جو شہرت ومنصب سے بے نیاز ہو کر جینا جانتا ہو۔ بقدرِ ضرورت روزی پر مطمئن نہ ہونا حرص ولالچ کی بنا پر ہوتا ہے اور حریص آدمی کو کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوتا، کیوں کہ بقدرِ ضرورت کی تو حد ہے، مگر حرص کی کوئی حد نہیں۔

۷۔ نیز انسان کی خواہشات لامحدود ہیں اور دنیا کی چیزیں محدود، آدمی دنیا کی چیزیں اور لذتیں کتنی ہی زیادہ حاصل کرلے وہ اس کے اطمینان وتسکین کے لیے ہمیشہ ناکافی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانے والا حریص شخص اس دنیا میں اسی طرح پریشان رہتا ہے جتنا کہ کم پانے والا حریص شخص، لہٰذا اس دنیا میں اگر کوئی چیز آدمی کے اطمینان وتسکین کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ زہد وقناعت ہے۔

۸۔ خلاصہ یہ کہ زہد وقناعت آدمی کو دنیا میں غیر ضروری طور پر الجھنے سے بچاتی ہے اور اس طرح وہ اس کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی قوت کو زیادہ سے زیادہ آخرت کے کاموں میں لگا سکے اور یہی چیز ایک طرف آدمی کے لیے دنیا میں پیشگی جنت کا سبب اور دوسری طرف آخرت میں ابدی جنت کا سبب بنتی ہے۔

زہد کے واقعات

نبی کریم ﷺ کا زہد

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میرے رب نے مجھ پر یہ پیش کیا کہ میرے لیے مکہ کے پہاڑوں کو سونے کا بنادیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ! مجھے تو یہ پسند ہے کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں تو دوسرے دن بھوکا رہوں تاکہ جب بھوکا ہوں تو تیری طرف زاری کروں اور تجھے یاد کروں اور جب پیٹ بھروں تو تیرا شکر کروں تیری تعریف کروں۔

ف: یہ اس ذات مقدس کا حال ہے جس کے ہم نام لیوا ہیں اور اس کی اُمت میں ہونے پر فخر ہے۔ جس کی ہر بات ہمارے لیے قابل اتباع ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ لوگ زندگی کیسے بسر کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا اسودین یعنی کھجور اور پانی پر۔ آپ فرماتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات پیوند دار چادر اور موٹے سخت تہ بند میں ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: اِنَّمَا مَثَلِیْ وَمَثَلُ الدُّنْیَا کَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا یعنی "میری اور دنیا کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی درخت کے سائے میں آرام لے پھر اس کو چھوڑ کر چل دے"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنا قصہ سنایا اور فرمایا میں ایک مرتبہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ چٹائی پر تشریف فرما تھے، میں اندر جا کر بیٹھ گیا تو میں نے دیکھا کہ آپ نے صرف لنگی باندھی ہوئی ہے اور اس کے علاوہ جسم پر اور کوئی کپڑا نہیں ہے۔ اس وجہ سے آپ کے جسم اطہر پر چٹائی کے نشانات پڑے ہوئے ہیں اور مٹھی بھر ایک صاع (ساڑھے تین سیر) جَو اور کیکر کے پتے (جو کھال رنگنے کے کام آتے ہیں) ایک کونے میں پڑے ہوئے ہیں اور ایک بغیر رنگی ہوئی کھال لٹکی ہوئی ہے (اتنا کم سامان دیکھ کر) میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا کیوں روتے ہو اے ابن الخطاب؟ میں نے عرض کیا اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں جب کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ چٹائی کے نشانات آپ کے جسم اطہر پر پڑے ہوئے ہیں اور گھر کی کل

کائنات یہ ہے جو مجھے نظر آرہی ہے، ادھر کسریٰ اور قیصر تو پھلوں اور نہروں (دنیا کی فراوانی) میں ہوں اور آپ اللہ کے نبی اور برگزیدہ بندے ہو کر آپ کی یہ حالت۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابن الخطاب! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ ہمارے لیے آخرت ہو اوران کے لیے دنیا۔

(اخرجہ ابن ماجہ باسناد صحیح واخرجہ الحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم)

اور حاکم نے اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اجازت لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں بالا خانے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ ایک بوریے پر لیٹے ہوئے ہیں اور آپ کے جسم مبارک کا کچھ حصہ مٹی پر ہے اور آپ کے سرہانے ایک تکیہ ہے جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی ہے اور آپ کے سرہانے ایک بغیر رنگی ہوئی کھال لٹکی ہوئی ہے اور ایک کونے میں کیکر کے پتے پڑے ہوئے ہیں چناں چہ میں حضور ﷺ کو سلام کر کے بیٹھ گیا اور میں نے عرض کیا آپ اللہ کے نبی اور اس کے خاص بندے (اور آپ کا یہ حال) اور کسریٰ اور قیصر سونے کے تختوں پر اور ریشم ودیباج کے بچھونوں پر ہوں۔ آپ نے فرمایا ان لوگوں کو طیبات اوراچھی چیزیں دنیا میں جلدی دے دی گئی ہیں اور یہ دنیا جلد ختم ہونے والی ہے اور ہمیں بعد میں آخرت میں طیبات اور اچھی چیزیں دی جائیں گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں گئے تو دیکھا کہ حضور ﷺ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے آپ کے پہلو پر چٹائی کے نشانات پڑے ہوئے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! اگر آپ اس سے زیادہ نرم بستر لے لیتے تو اچھا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے اس دنیا سے کیا واسطہ میری اور دنیا کی مثال اس سوار کی سی ہے جو سخت گرم دن میں چلا پھر اس نے تھوڑی دیر ایک درخت کے نیچے آرام کیا پھر اس درخت کو چھوڑ کر چل دیا۔

(حیاۃ الصحابہ حصہ دوم:۵۶ تا ۵۷)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زہد

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے پینے کے لیے پانی مانگا تو آپ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں شہد ملا ہوا پانی پیش کیا گیا۔جب آپ نے

اسے ہاتھ میں لیا تو رونے لگے اور ہچکیاں مار مار کر رونا شروع کر دیا جس سے ہم سمجھے کہ انہیں کچھ ہو گیا ہے لیکن (رعب کی وجہ سے) ہم نے ان سے کچھ نہ پوچھا۔ جب آپ رضی اللہ عنہ چپ ہو گئے تو ہم نے کہا اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ! آپ اتنا زیادہ کیوں روئے؟

انہوں نے فرمایا: (شہد ملا ہوا پانی دیکھ کر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا تھا اس کی وجہ سے رویا تھا اور وہ واقعہ یہ ہے کہ) میں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز کو اپنے سے دور کر رہے ہیں، لیکن مجھے کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ کیا چیز ہے جسے آپ دور کر رہے ہیں، مجھے تو کوئی چیز نظر نہیں آ رہی ؟ آپ نے ارشاد فرمایا: دنیا میری طرف بڑھی تو میں نے اس سے کہا: دور ہو جا۔ تو اس نے کہا: آپ تو مجھے لینے والے نہیں ہیں (یعنی یہ تو مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے نہیں لیں گے، میں ویسے زور لگا رہی ہوں)۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (اس واقعہ کے یاد آنے سے میں رویا تھا) اور شہد ملا ہوا پانی پینا میرے لیے مشکل ہو گیا اور مجھے ڈر لگا کہ اسے پی کر کہیں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ سے ہٹ نہ جاؤں اور دنیا مجھ سے چمٹ نہ جائے۔

(حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم حصہ دوم: ۳۶۰)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زہد

حضرت سالم بن عبد اللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: اللہ کی قسم! ہمیں اس دنیا کی لذتوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ ہمارے کہنے پر لذتوں کے یہ سامان تیار ہو سکتے ہیں جو ان بکروں کے بال صاف کر کے ان کو بھون لیا جائے اور میدے کی عمدہ روٹیاں پکالی جائیں اور ڈول میں کشمش کو پانی ڈال کر اتنی دیر رکھا جائے کہ چکور کی آنکھ جیسے رنگ کا صاف ستھرا مشروب تیار ہو جائے، اور پھر ہم ان تمام چیزوں کو کھا، پی جائیں۔ ہم یہ سب کچھ کر سکتے ہیں، لیکن اس وجہ سے نہیں کرتے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نیکیوں کا بدلہ آخرت میں ملے، یہاں نہ ملے، کیوں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد سن رکھا ہے: اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا ترجمہ: "تم حاصل کر چکے اپنی اچھائیوں کا بدلہ دنیا کی زندگی میں۔" (حیاۃ الصحابہ حصہ دوم: ۳۷۱ تا ۳۷۲)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زمانۂ خلافت میں ایسا اونی جُبہ پہنتے تھے جس میں چمڑے کے پیوند بھی لگے ہوتے تھے اور کندھے پر کوڑا رکھ کر لوگوں کو ادب اور سلیقہ سکھانے کے لیے بازاروں میں چکر لگایا کرتے تھے اور گرے پڑے ٹوٹے ہوئے دھاگے اور رسیاں اور گٹھلیاں زمین سے اٹھا کر لوگوں کے گھروں میں ڈال دیتے تاکہ لوگ انہیں اپنے کام میں لے آئیں۔

حضرت حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں لوگوں میں بیان کرر ہے تھے اور انہوں نے ایک لنگی باندھ رکھی تھی جس میں بارہ پیوند تھے۔

(حیاۃ الصحابہ حصہ دوم:۳۷۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے ایک مرتبہ زمانۂ خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان اوپر نیچے تین پیوند لگا رکھے تھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے گزارہ کے قابل خوراک لیا کرتے تھے، گرمیوں میں ایک جوڑا پہنتے۔ بعض دفعہ ان کی لنگی پھٹ جاتی تو اسے پیوند لگا لیتے لیکن (نیا جوڑا لینے کا) وقت آنے سے پہلے اس کی جگہ بیت المال سے اور لنگی نہ لیتے، اسی سے کام چلاتے رہتے اور جس سال مال زیادہ آتا اس سال ان کا جوڑا پچھلے سال سے اور گھٹیا ہو جاتا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے ان سے اس بارے میں بات کی تو فرمایا میں مسلمانوں کے مال میں سے پہننے کے جوڑے لیتا ہوں اور یہ میری ضرورت کے لیے کافی ہیں۔ حضرت محمد بن ابراہیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطّاب رضی اللہ عنہ روزانہ بیت المال سے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے دو درہم خرچہ لیا کرتے تھے۔

(حیاۃ الصحابہ حصہ دوم:۳۷۶)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا زہد

حضرت عبد الملک بن شدّاد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے جمعہ کے دن حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ کو منبر پر دیکھا کہ ان پر عَدن کی بنی ہوئی موٹی لنگی تھی جس کی قیمت چار یا پانچ درم تھی اور کیروے رنگ کی ایک کوفی چادر تھی۔ حضرت حسن رحمہ اللہ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جو مسجد میں قیلولہ کرتے ہیں تو انہوں نے کہا میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ اپنے زمانۂ خلافت میں ایک دن مسجد میں قیلولہ فرما رہے تھے اور جب وہ سو کر اٹھے تو ان کے جسم پر کنکریوں کے نشان تھے (مسجد میں کنکریاں

بچھی ہوئی تھیں) اور لوگ (ان کی اس سادہ اور بے تکلف زندگی پر حیران ہو کر) کہہ رہے تھے یہ امیر المؤمنین ہیں، یہ امیر المؤمنین ہیں۔ (اخرجہ احمد کمافی صفۃ الصفوۃ:۱۱۶/۱)

حضرت شُرَحْبِیل بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ لوگوں کو خلافت والا عمدہ کھانا کھلاتے اور خود جا کر سرکہ اور تیل یعنی سادہ کھانا کھاتے۔ (حیاۃ الصحابہ حصہ دوم:۳۷۶)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کا زہد

قبیلہ ثقیف کے ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھے عُکبَرا قصبہ کا حاکم بنایا اور عراق کے ان دیہات میں مسلمان نہیں رہا کرتے تھے۔ مجھ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ظہر کے وقت میرے پاس آنا۔ میں آپ کی خدمت میں گیا، مجھے وہاں کوئی روکنے والا دربان نہ ملا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے پاس پیالہ اور پانی کا ایک کوزہ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹا تھیلا منگوایا۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ مجھے امانت دار سمجھتے ہیں اس لیے مجھے اس تھیلے میں سے کوئی قیمتی پتھر نکال کر دیں گے۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس تھیلے میں کیا ہے؟ اس تھیلے پر مہر لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس مہر کو توڑا اور تھیلی کو کھولا تو اس میں ستّو تھے چناں چہ اس میں سے ستو نکال کر پیالے میں ڈالے اور اس میں پانی ڈالا اور خود بھی پیے اور مجھے بھی پلائے۔ میں اتنی سادگی دیکھ کر رہ نہ سکا اور میں نے کہا اے امیر المؤمنین ! آپ عراق میں رہ کر یہ کھا رہے ہیں حالاں کہ عراق میں تو اس سے بہت زیادہ کھانے کی چیزیں ہیں (عراق میں رہ کر صرف ستو کھانا بڑی حیرانگی کی بات ہے) انہوں نے کہا ہاں۔ اللہ کی قسم! میں بخل کی وجہ سے اس پر مہر نہیں لگاتا ہوں بلکہ میں اپنی ضرورت کے مطابق ستو خریدتا ہوں (اور مدینہ سے منگواتا ہوں) ایسے ہی کھلے رہنے دوں تو مجھے ڈر ہے کہ (ادھر ادھر گر نہ جائیں اور اڑ نہ جائیں اور یوں) یہ ختم نہ ہو جائیں تو مجھے عراق کے ستو بنانے پڑیں گے۔ اس وجہ سے میں ان ستوؤں کو اتنا سنبھال کر رکھتا ہوں اور میں اپنے پیٹ میں پاک چیز ہی ڈالنا چاہتا ہوں۔

حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کو دوپہر کا اور رات کا کھانا خوب کھلایا کرتے تھے اور خود صرف وہی چیز کھایا کرتے تھے جو ان کے پاس مدینہ منورہ سے آیا کرتی تھی۔

(اخرجہ ابو نعیم فی الحلیۃ:۸۲/۱)

حضرت عبد اللہ بن شریک رحمۃ اللہ علیہ کے دادا بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مرتبہ فالودہ لایا گیا اور ان کے سامنے رکھا گیا تو فالودے کو مخاطب کر کے فرمایا اے فالودے! تیری خوشبو بہت اچھی ہے اور رنگ بہت خوبصورت ہے اور ذائقہ بہت عمدہ ہے، لیکن مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ مجھے جس چیز کی عادت نہیں ہے میں خود کو اس کا عادی بناؤں۔

(اخرجہ ابونعیم ایضاً: ۸۱/ او اخرجہ ایضاً الامام عبد اللہ بن الامام احمد فی زوائد عن عبد اللہ بن شریک مثلہ کمانی المنتخب: ۵۸/۲)

حضرت زید بن وہب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمارے پاس باہر آئے اور انہوں نے ایک چادر اوڑھی ہوئی تھی اور لنگی باندھی ہوئی تھی جس پر پیوند لگا رکھا تھا۔ کسی نے ان سے اتنے سادہ کپڑے پہننے کے بارے میں کچھ کہا تو فرمایا میں یہ دو سادہ کپڑے اس لیے پہنتا ہوں کہ میں ان کی وجہ سے اکڑ سے بچا رہوں گا اور ان میں نماز بھی بہتر ہوگی اور مؤمن بندے کے لیے یہ سنت یہ بھی ہیں (یا عام مسلمان بھی ایسے سادہ کپڑے پہننے لگ جائیں گے)۔

(اخرجہ ابن المبارک کذا فی المنتخب: ۵۸/۵)

ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ایک موٹی لنگی دیکھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے اسے پانچ درہم میں خریدا ہے، مجھے جو آدمی اس میں ایک درہم نفع دے گا میں اسے اس کے ہاتھ بیچ دوں گا۔ (اخرجہ البیہقی کذا فی المنتخب الکنز: ۵۸/۵)

حضرت مجمع بن سمعان تیمی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لے کر بازار گئے اور فرمایا مجھ سے میری یہ تلوار خریدنے کے لیے کون تیار ہے؟ اگر لنگی خریدنے کے لیے میرے پاس چار درہم ہوتے تو میں یہ تلوار نہ بیچتا۔ (اخرجہ یعقوب بن سفیان کذا فی البدایۃ: ۸/۳)

حضرت صالح بن ابی الاسود رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحب سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ ایک گدھے پر سوار ہیں اور انہوں نے اپنے دونوں پاؤں ایک جانب لٹکا رکھے ہیں اور فرما رہے ہیں میں ہی وہ آدمی ہوں جس نے دنیا کی توہین کر رکھی ہے۔

(اخرجہ ابو القاسم البغوی کذا فی البدایۃ: ۸/۵)

حضرت عبد اللہ بن زُرَیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں عید الاضحی کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی خدمت میں گیا۔ انہوں نے ہمارے سامنے بھوسی اور گوشت کا حریرہ رکھا۔ ہم نے کہا اللہ آپ کو ٹھیک

ٹھاک رکھے اگر آپ ہمیں یہ بطخ کھلاتے تو زیادہ اچھا تھا کیوں کہ اب تو اللہ نے مال بہت دے رکھا ہے۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے ابن زُرَیر! میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ خلیفۂ وقت کے لیے اللہ تعالیٰ کے مال میں سے صرف دو بڑے پیالے لینے حلال ہیں ایک پیالہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے اور دوسرا پیالہ آنے والے لوگوں کے سامنے رکھنے کے لیے۔

آپ رضی اللہ عنہ جب کوفہ تشریف لے گئے تو باوجود اسکے کہ عراق میں انواع واقسام کے کھانے کھائے جاتے تھے، مگر کبھی آپ رضی اللہ عنہ نے مختلف قسم کا کھانا نہ کھایا۔ ایک دن آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے فالودہ پیش ہوا تو فرمایا خوشبودار ہے، خوش رنگ ہے، خوش ذائقہ بھی ہوگا ولکنی اکرہ نفسی ان اعود مالم تعتدولم یاکل یعنی اپنے نفس کو ایسی چیزوں کا عادی بنانا نہیں چاہتا جن کا اب تک عادی نہ تھا۔ یہ کہہ کر کھانے سے انکار فرمادیا۔ (منتخب کنزالعمال:۵/۵۰، احیاء العلوم:۲/۱۳۷)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک بار عاصم نامی ایک شخص کو ڈانٹا کہ تم نے ٹاٹ اور کمبل وغیرہ پہن کر اور لذیذ کھانوں کو چھوڑ کر ایسی سخت زندگی کیوں اختیار کی؟ عاصم نے جواب دیا فما بالك فی خشونة ماكلك وخشونة ملبسك؟ یعنی پھر آپ نے اپنے کھانے کپڑے میں ایسی درشتی وتنگی کیوں اختیار کی ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرا حال تم سے جدا ہے۔ خداوند کریم نے امراو خلفا پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ غریب اور عوام جیسی زندگی گذاریں اور عیش وراحت کی پُر تکلف معاشرت کے ذریعہ خود کو عوام سے ممتاز وبرتر نہ بنالیں۔ (کتاب الاعتصام للشاطبی:۲/۸۸، ایام خلافت راشدہ:۹۱)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا زہد

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ (شاگردوں کے مجمع میں) تشریف رکھتے تھے۔ ان کی بیوی آئیں اور کہنے لگیں کہ تم تو ان کو لیے بیٹھے ہو اور گھر میں آٹے کی ایک چٹکی بھی نہیں ہے۔ وہ فرمانے لگے ارے اللہ کی بندی! ہمارے سامنے ایک نہایت سخت گھاٹی بڑی دشوار گزار آرہی ہے اس سے صرف وہی لوگ نجات پاسکیں گے جو بہت ہلکے پھلکے ہوں گے۔ بیوی یہ بات سن کر راضی خوشی واپس چلی گئیں۔
ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ دنیادار بھی کھاتے ہیں اور ہم بھی کھاتے ہیں۔ وہ بھی کپڑا پہنتے ہیں اور ہم بھی

پہنتے ہیں اور ان کے پاس جو ضرورت سے زائد مال ہے وہ اس کو کام میں تولاتے نہیں، صرف دیکھتے ہیں کہ ہاں یہ مال ہے۔ مال کو دیکھ ہم بھی لیتے ہیں (جو دوسروں کے پاس ہوتا ہے لہٰذا دیکھنے میں تو ہم اور وہ برابر ہیں۔ کام میں وہ بھی نہیں لاتے ہم بھی نہیں لاتے) لیکن ان کو اپنے مال کا حساب دینا پڑے گا اور ہم حساب سے بَری ہیں کہ ہمارے پاس ہے نہیں۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ہمارے بھائی ہمارے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کرتے، ہم سے محبت تو اللہ کے واسطے کرتے ہیں اور دنیا میں ہم سے الگ الگ رہتے ہیں۔ عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ وہ تو اس کی تمنا کریں گے کہ کاش وہ ہم جیسے ہوتے اور ہم اس کی تمنا نہیں کریں گے کہ ہم ان جیسے ہوتے۔

(فضائل صدقات حصہ دوم: ۷۳۱ تا ۷۳۲)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا زہد

ایران کی فتح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو مدائن کا عامل (گورنر) مقرر فرمادیا تھا۔ آپ کسریٰ کے دارالحکومت کے گورنر بن کر پہنچے تو اس شان سے کہ ایک دراز گوش پر سوار تھے، جس کے پالان کے ساتھ تھوڑا سازادِ راہ رکھا ہوا تھا۔ اہل مدائن نے آپ کا استقبال کیا اور پیشکش کی کہ ہم آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے جواب دیا: طعاما آکلہ، وعلف حماری ھذا من تبن ترجمہ: بس میرے لیے یہ کافی ہے کہ مجھے اپنے کھانے کے لیے کھانا مل جائے اور میرے اس دراز گوش کا چارہ۔

عرصہ دراز تک حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اسی سادگی کے ساتھ مدائن کے گورنر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ایک مرتبہ یہاں سے مدینہ طیبہ گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے سے راستے میں چھپ کر بیٹھ گئے، مقصد یہ تھا کہ اگر مدائن سے کچھ مال و دولت لے کر آئے ہوں تو پتا چل جائے۔ لیکن دیکھا کہ وہ جس حال میں گئے تھے، اسی حال میں واپس آگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر انہیں گلے سے لگالیا۔

(جہان دیدہ: ۵۴)

کھانے اور کپڑے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی کفایت شعاری اور سادگی کا بہت اہتمام رکھتے تھے۔ مستدرک حاکم میں روایت ہے کہ جمعہ کے روز منبر پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیکھا گیا۔ جو موٹا تہبند

آپ پہنے ہوئے تھے اس کی قیمت چار پانچ درہم یعنی سوا روپے سے زیادہ نہ تھی۔

(طبقات کبریٰ للشعرانی :۱/۱۷)

امام شافعی رحمہ اللہ کا زُہد

امام شافعی رحمہ اللہ نے طلبِ علم کے لیے ایک طویل سفر کیا ہے جس کا مستقل سفر نامہ ان کے بعض تلامذہ نے بھی ضبط کیا ہے۔ اس سفر کے سلسلہ میں بغداد بھی تشریف لے گئے تھے، آپ فرماتے ہیں کہ میں جس وقت بغداد میں داخل ہوا تو قدم رکھتے ہی ایک غلام میرے ساتھ ہولیا اور نہایت تہذیب ومتانت کے ساتھ مجھ سے پوچھا: آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا "محمد"۔ غلام نے والد کا نام دریافت کیا تو میں نے کہا "ادریس"۔ پھر اس نے نسب دریافت کیا تو میں نے کہا "شافعی"۔ غلام نے یہ سن کر کہا، آپ مطلبی ہیں؟ میں نے کہا "ہاں"۔ غلام نے یہ سب سوال وجواب ایک تختی پر لکھ لیے جو اس کی آستین میں تھی اور اس کے بعد مجھے چھوڑ دیا۔

میں بغداد کی ایک مسجد میں جا کر ٹھہر گیا اور اس فکر میں تھا کہ غلام نے یہ تحقیق کیوں کی اور اس کا اثر کیا مرتب ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب آدھی رات گزر گئی تو مسجد کے دروازہ پر زور سے دستک دی گئی جس سے سب اہلِ مسجد مرعوب ہوگئے۔ دروازہ کھولا گیا تو کچھ لوگ مسجد میں داخل ہوئے اور ایک ایک آدمی کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پھرنے لگے یہاں تک کہ وہ میرے پاس آئے، میں نے کہا، فکر نہ کرو جس کو تم ڈھونڈتے ہو وہ میں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ امیر المؤمنین (ہارون الرشید) نے آپ کو یاد فرمایا ہے میں فوراً بغیر کسی پس وپیش کے اُٹھ کر ساتھ ہولیا۔

میں نے امیر المؤمنین کو دیکھا تو سنت کے موافق سلام کیا۔ امیر المؤمنین نے میرے طرزِ سلام کو پسند کیا اور محسوس کیا کہ درباری لوگ جو تکلفات میں سلام کرتے ہیں وہ خطا پر ہیں، سلام مسنون یہی ہے، مجھے سلام کا جواب دیا اور کہا تزعم انك من بني هاشم (تم یہ زعم رکھتے ہو کہ میں بنی ہاشم میں سے ہوں) میں نے کہا، امیر المؤمنین آپ لفظ زعم استعمال نہ کریں، کیوں کہ یہ لفظ قرآن میں جس جگہ آیا ہے سب جگہ زعمِ باطل کے لیے آیا ہے۔ امیر المؤمنین نے اس قول سے رجوع کر کے تزعم کے بجائے تقول کا لفظ استعمال کیا۔ تب میں نے جواب دیا کہ ہاں۔ امیر المؤمنین نے میرا نسب نامہ پوچھا، میں نے اپنا

پورا نسب نامہ سنا دیا جو حضرت آدم علیہ السلام تک مجھے محفوظ تھا۔

امیر المؤمنین نے کہا: اتنی فصاحت و بلاغت صرف بنی عبد المطلب ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو عہدۂ قضا سپرد کر دوں اور اس کے عوض اپنی تمام سلطنت اور ذاتی جائدادوں کا نصف حصہ آپ کو دے دوں سب پر آپ کا اور میرا حکم قرار دہ شرطوں کے مطابق چلے گا اور حکم کا ماخذ قرآن و حدیث اور اجماعِ امت ہو گا۔

میں نے کہا: امیر المؤمنین! اگر آپ چاہیں کہ اس تمام مال و منال اور سلطنت و حکومت کے عوض میں محکمہ قضا کا صرف اتنا کام کر دیا کروں کہ صبح کو اس کا دروازہ کھول دوں اور شام کو بند کر دوں تو میں قیامت تک اس کے لیے بھی تیار نہ ہوں گا۔

ہارون الرشید یہ جواب سن کر رونے لگے اور کہا کہ اچھا، آپ ہمارا کچھ ہدیہ قبول فرمائیں گے؟ میں نے عرض کیا کہ مضائقہ نہیں، لیکن نقد ہونا چاہیے، وعدے نہ ہوں۔

امیر المؤمنین نے میرے لیے ایک ہزار درہم کا حکم جاری فرمایا اور میں نے اسی مجلس میں اس پر قبضہ کر لیا۔ جب دربار سے واپس آیا تو وہاں کے حشم و خدم نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ اپنے انعام میں سے کچھ ہمیں بھی انعام دیجیے۔ چوں کہ مجھ سے سوال کیا گیا تھا تو میری مروت نے اس سے کم پر قناعت نہ کی کہ جتنے آدمی بھی تھے، سب پر کل مال برابر تقسیم کر لیا اور اس میں ایک حصہ اپنا بھی اسی قدر رکھا جتنا کہ ہر شخص کے حصے میں آیا تھا۔

ف: امت کے امام اور علمائے سلف کے حالات کو پڑھیے اور ان کی للّٰہیت، زہد اور قناعت، امرا کے معاملہ میں خودداری، جس مال میں دین کا خطرہ ہو اس سے اجتناب اور جو حلال طریق سے بغیر ذلت نفس کے ملے اس کی قدر وغیرہ کا سبق لیجیے۔ (کشکول: ۹۵ تا ۹۷)

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کا واقعۂ استغنا

کسی نے اشرفیوں کی دو تھیلیاں ارسال کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ چوں کہ آپ میرے والد کے دوست ہیں اور اب وہ فوت ہو چکے ہیں، لیکن ان کی پاکیزہ کمائی میں سے یہ تھیلیاں ارسال خدمت ہیں آپ ان کو اپنے اخراجات کے لیے قبول فرمالیں، لیکن آپ نے وہ تھیلیاں واپس

کرتے ہوئے پیغام بھیجا کہ تمہارے والد سے میرے تعلقات صرف دین کے لیے تھے نہ کہ دنیا کے لیے اور اس واقعہ کی اطلاع جب آپ کے صاحبزادے کو ہوئی تو انہوں نے عرض کیا میں نادار اور عیالدار ہوں اگر آپ یہ رقم مجھے دے دیتے تو میرے بہت کام نکل سکتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ میں دینی تعلقات کو دنیاوی معاوضہ میں فروخت نہیں کر سکتا البتہ اگر وہ شخص خود تم کو دے دے تو تم خرچ کر سکتے ہو۔

آپ کسی سے کچھ نہیں لیتے تھے اور ایک شخص نے جب آپ کی خدمت میں کوئی تحفہ پیش کیا تو آپ نے قبول نہیں فرمایا اور جب اس شخص نے عرض کیا کہ آپ نے تو کبھی مجھ کو کوئی نصیحت تک نہیں کی جو یہ سمجھ لیا جائے کہ میں اس کا معاوضہ دے رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے دوسرے مسلمان بھائیوں کو تو راستہ دکھایا ہے اور اگر میں تمہارا تحفہ قبول کرلوں تو ہو سکتا ہے کہ میرے قلب میں تمہاری رغبت پیدا ہو جائے اور اسی کا نام دنیا ہے۔ (تذکرۃ الاولیا:۱۱۷)

ایک لنگڑے شخص کا زُہد

محمد بن سہل بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں مکہ مکرمہ کے راستہ میں جارہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک مغربی شخص ایک خچر پر سوار ہے اور اس کے آگے ایک شخص یہ اعلان کرتا جاتا ہے کہ (ایک ہِمیانی کھو گئی) جو شخص ہمیانی کا پتا بتادے اُس کو سو (۱۰۰) اشرفیاں میں اپنے پاس سے دوں گا، اس لیے کہ اس ہمیانی میں امانتیں تھیں (ہمیانی روپیہ اشرفیاں رکھنے کی لمبی تھیلی ہوتی ہے جو کمر سے باندھی جاتی ہے)۔ اس اعلان پر ایک لنگڑا شخص جس کے اوپر بہت پھٹے پرانے کپڑے تھے، اس مغربی کے پاس آیا اور اس سے اس ہمیانی کی علامتیں پوچھیں کہ کیسی تھی؟ مغربی نے اس کی علامتیں بتائیں اور کہا کہ اس میں بہت سے آدمیوں کی امانتیں رکھی ہوئی ہیں۔ لنگڑے نے پوچھا کہ کوئی شخص یہاں ایسا ہے کہ لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ محمد بن سہلؒ نے کہا کہ میں جانتا ہوں۔

وہ لنگڑا ہم تینوں کو اپنے ساتھ الگ ایک طرف کو لے گیا اور ایک ہمیانی نکال کر دکھائی۔ وہ مغربی اس کے اندر کی چیزیں بتاتا رہا کہ دو دانہ فلاں عورت فلاں کی بیٹی کے پانچ سو اشرفی کے بدلہ میں رکھے ہیں اور ایک دانہ (عدد) فلاں شخص کا سو (۱۰۰) اشرفی میں رکھا ہے۔ اسی طرح ایک ایک چیز وہ گنواتا رہا۔ اور میں اس کے اندر رکھی ہوئی چیزوں کو پڑھ کر بتاتا رہا کہ وہ یہ ہے، وہ یہ ہے۔ اس مغربی نے اس ہمیانی کی

سب چیزیں شمار کرا دیں اور وہ سب کی سب اس میں سے پوری نکلیں۔ جب سب صحیح صحیح نکل آیا تو اس لنگڑے نے وہ ہمیانی مغربی کے حوالہ کر دی۔ اس نے اپنے وعدہ کے موافق اپنے پاس سے سو(۱۰۰) دینار (اشرفیاں) نکال کر اس لنگڑے کو دیے۔ اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر اس ہمیانی کی قدر میری نگاہ میں دو مینگنیوں کے برابر بھی ہوتی تو شاید تم اس کو نہ پاسکتے، ایسی چیز پر کیا معاوضہ لوں جس کی قیمت میرے نزدیک دو مینگنیاں بھی نہیں ہیں اور یہ کہہ کر وہ لنگڑا چل دیا اور ان سو(۱۰۰) اشرفیوں کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھا۔ (فضائل صدقات، حصہ دوم:۷۲۸تا۷۲۹)

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں

یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے کہ دنیا کے بغیر گزارہ بھی نہیں ہے، دنیا کے اندر بھی رہنا ہے جب بھوک لگتی ہے تو کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے اور جب پیاس لگتی ہے تو پانی کی ضرورت پیش آتی ہے سر چھپانے اور رہنے کے لیے گھر کی بھی ضرورت ہے کسبِ معاش کی بھی ضرورت ہے، لیکن اب سوال یہ ہے کہ جب یہ سب کام بھی انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان دنیا کے اندر بھی رہے اور دنیا کی ضروریات بھی پوری کرے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دل میں دنیا نہ آئے، دل میں دنیا سے بے رغبتی پائی جائے۔ ان دونوں کا ایک ساتھ جمع ہونا مشکل نظر آتا ہے، یہی وہ کام ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین آکر سکھاتے ہیں کہ کس طرح تم دنیا میں رہو اور دنیا کی محبت کو دل میں جگہ نہ دو۔ ایک حقیقی مسلمان دنیا کے اندر بھی رہے گا، دنیا والوں سے تعلق بھی قائم کرے گا، حقوق بھی ادا کرے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی محبت سے بھی پرہیز کرے گا حضرت مجذوب صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

ے دنیا میں ہوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

یہ کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی دنیا میں رہے، دنیا سے گزرے، دنیا کو برتے، لیکن دنیا کی محبت دل میں نہ آئے؟۔

دنیا کی مثال

اسی بات کو مولانا رومی رحمہ اللہ نے ایک مثال سے سمجھایا ہے اور بڑی پیاری مثال دی ہے، فرماتے ہیں کہ دنیا کے بغیر انسان کا گزارہ بھی نہیں ہے، اس لیے کہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے بے شمار ضرورتیں انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ انسان کی مثال کشتی جیسی ہے اور دنیا کی مثال پانی جیسی ہے، جس طرح پانی کے بغیر کشتی نہیں چل سکتی، اسی طرح انسان کو زندہ رہنے کے لیے دنیا کی ضرورت ہے ،مثلاً انسان کو رہنے کے لیے پیسہ چاہیے، کھانا چاہیے، پانی چاہیے، مکان چاہیے، کپڑا چاہیے؛ ان سب چیزوں کی اس کو ضرورت ہے اور یہ سب چیزیں دنیا ہیں، لیکن جس طرح پانی کشتی کے لیے اس وقت تک فائدہ مند ہے جب تک وہ پانی کشتی کے نیچے، اس کے دائیں، بائیں اور اس کے آگے، پیچھے ہے۔ اس صورت میں وہ پانی اس کشتی کو چلائے گا، لیکن اگر وہ پانی کشتی کے اندر داخل ہو گیا تو وہ کشتی کو ڈبو دے گا، تباہ کر دے گا۔

اسی طرح دنیا کے یہ اسباب اور دنیا کا یہ سامان جب تک تمہارے چاروں طرف ہے تو کوئی ڈر نہیں ہے، اس لیے کہ یہ ساز و سامان تمہاری زندگی کی کشتی کو چلائے گا۔ لیکن جس دن دنیا کا یہ ساز و سامان تمہارے ارد گرد سے ہٹ کر تمہارے دل کی کشتی میں داخل ہو گیا، اس دن تمہیں ڈبو دے گا۔ چناں چہ مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

آب اندر زیر کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

یعنی جب تک پانی کشتی کے ارد گرد ہو تو وہ کشتی کو چلاتا ہے اور دھکا دیتا ہے، لیکن اگر وہ پانی کشتی کے اندر داخل ہو جاتا ہے تو وہ کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔

دل میں صرف ایک کی محبت سما سکتی ہے

لہٰذا دل میں حقیقی محبت یا تو اللہ تعالیٰ کی ہو گی یا دنیا کی ہو گی، دونوں محبتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اسی وجہ سے مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

ے
ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں

ایں خیال است و محال است و جنوں

یعنی دنیا کی محبت بھی دل میں سمائی ہوئی ہو اور اللہ تعالیٰ کی محبت بھی سمائی ہوئی ہو، یہ دونوں باتیں نہیں ہوسکتیں، اس لیے کہ یہ صرف خیال ہے اور محال ہے اور جنون ہے، اس واسطے اگر دل میں دنیا کی محبت سما گئی تو پھر اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں آئے گی۔ جب اللہ کی محبت نہیں ہوگی تو پھر دین کے تمام کام بے روح اور بے حقیقت ہوں گے، ان کے ادا کرنے میں پریشانی، دشواری اور مشقت ہوگی اور صحیح معنی میں وہ دین کے کام انجام نہیں پاسکیں گے۔ بلکہ قدم قدم پر آدمی ٹھوکریں کھائے گا، اس لیے کہا گیا کہ انسان دل میں دنیا کی محبت کو جگہ نہ دے۔ اسی کا نام ''زہد'' ہے اور ''زہد'' کو حاصل کرنا ضروری ہے۔

(اصلاحی خطبات:۱۰۳/۲تا۱۰۴)

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کا زہد

ابتدا میں آپ بلخ کے سلطان اور عظیم المرتبت حکمران تھے۔ ایک مرتبہ آپ محوِ خواب تھے کہ چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی تو آواز دے کر پوچھا کہ چھت پر کون ہے؟ جواب ملا کہ میں ایک شناسا ہوں، اونٹ کی تلاش میں چھت پر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''جی چھت پر اونٹ کس طرح آسکتا ہے؟'' اس آدمی نے جواب دیا: ''بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جامہ اطلس پہن کر عیش و عشرت میں خدا مل جائے۔ یہ سن کر آپ ہیبت زدہ ہوگئے۔

دوسرے دن کہ جس وقت دربار جما ہوا تھا تو ایک بہت ہی ذی حشم شخص دربار میں حاضر ہوا۔ حاضرین پر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ کسی میں کچھ پوچھنے کی سکت باقی نہ رہی۔ وہ شخص تیزی کے ساتھ تخت شاہی کے نزدیک پہنچ کر چاروں طرف کچھ دیکھنے لگا اور جب ابراہیم بن ادہم نے سوال کیا تم کون ہو اور کس کی تلاش میں آئے ہو؟ تو اس نے کہا کہ میں قیام کرنے کی نیت سے آیا تھا، لیکن یہ تو سرائے معلوم ہوتی ہے، اس لیے یہاں قیام ممکن نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ برادرم! یہ سرائے نہیں بلکہ شاہی محل ہے۔ اس نے سوال کیا کہ آپ سے قبل یہاں کون آباد تھا؟ فرمایا کہ میرے باپ دادا۔ غرض اسی طرح کئی پشتوں تک پوچھنے کے بعد اس نے کہا: اور اب آپ کے بعد یہاں کون رہے گا؟ فرمایا: میری

اولادیں۔ اس نے کہا: ذرا تصور فرمایئے کہ جس جگہ اتنے لوگ آکر چلے گئے اور کسی کو ثبات حاصل نہ ہو سکا، وہ جگہ سرائے نہیں تو اور کیا ہے۔

یہ کہہ کر وہ اچانک غائب ہو گیا اور ابراہیم بن ادہم چوں کہ رات ہی کے واقعہ سے بہت مضطرب تھے، اس واقعہ نے اور بھی بے چین کر دیا۔ آپ اس کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے اور ایک جگہ جب ملاقات کے بعد آپ نے ان کا نام دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے خضر کہتے ہیں۔ اسی ادھیڑ بُن میں آپ لشکر سمیت شکار کے لیے روانہ ہوئے لیکن لشکر سے بچھڑ کر جب تنہا رہ گئے تو غیب سے ندا آئی کہ اے ابراہیم! موت سے قبل بیدار ہو جاؤ۔ یہ آواز مسلسل آتی رہی جس سے آپ کی قلبی کیفیت دگرگوں ہوتی چلی گئی، پھر اچانک سامنے ایک ہرن نظر آگیا اور جب آپ نے شکار کرنا چاہا تو وہ بول پڑا: اگر آپ میرا شکار کریں گے تو آپ خود ہی شکار ہو جائیں گے، اور کیا آپ کی تخلیق کا یہی مقصد ہے کہ آپ سیر وشکار کرتے پھریں۔ پھر آپ کی سواری کے زین سے بھی یہی صدا آنے لگی۔ آپ گھبرا کر اس طرح متوجہ الی اللہ ہوئے کہ قلب نورِ باطنی سے منور ہو گیا۔

اس کے بعد آپ تخت وتاج کو خیر باد کہہ کر صحرا بصحرا گریہ وزاری کرتے ہوئے نیشاپور کے قُرب وجوار میں پہنچ کر ایک تاریک اور بھیانک غار میں مکمل نو سال تک عبادت میں مصروف رہے۔ ہر جمعہ کو لکڑیاں جمع کر کے فروخت کر دیتے اور جو کچھ ملتا، آدھا راہِ مولا میں دے دیتے اور باقی ماندہ رقم سے روٹی خرید کر نماز جمعہ ادا کرتے اور پھر ہفتہ بھر کے لیے غار میں چلے جاتے۔ (تذکرۃ الاولیا: ۶۰ تا ۶۱)

امرا اہل دنیا سے اہل اللہ کی ملاقات اور اس کا ادب

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا کے امرا و رؤسا اگر کسی عالم یا ولی سے ملاقات کے لیے آویں تو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کی تعلیم یہ ہے کہ ان سے خشونت کا برتاؤ نہ کریں، اور فرمایا کہ اسی وجہ سے میرا معمول یہ ہے کہ امیر رئیس اگر تہذیب وادب سے رہے تو بہ نسبت عام غربا کے اس کی خاطر زیادہ کی جائے کیوں کہ یہ لوگ اس کے عادی ہوتے ہیں اور بقاعدہ اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ یعنی جس کو دنیا میں جو درجہ ومرتبہ حاصل ہو اس کے مطابق اس سے معاملہ کرو۔

لیکن اگر وہ خود کوئی متکبرانہ معاملہ کریں یا علما کی حقارت کی کوئی چیز ان سے ظاہر ہو تو قطعی پرواہ نہ کی جائے، ان کے عمل کا جواب اس کے مناسب دیا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نہ ان کو ذلیل کرے نہ خود اپنے آپ کو ان کے سامنے ذلیل کرے، اور پھر فرمایا کہ حقیقت میں ذلت یہ ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور اپنی ضرورت وحاجت پیش کرے۔ پھٹے کپڑے، ٹوٹے جوتے، پیوند زدہ لباس کوئی ذلت نہیں۔

(مجالس حکیم الامت:۲۰۹)

حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا زہد

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو شام کا گورنر بنا دیا گیا، اس لیے کہ شام کا اکثر علاقہ انہوں نے ہی فتح کیا تھا۔ اس وقت شام ایک بہت بڑا علاقہ تھا۔ آج اس شام کے علاقے میں چار ممالک ہیں یعنی شام، اردن، فلسطین، لبنان، اور اس وقت یہ چاروں مل کر اسلامی ریاست کا ایک صوبہ تھا اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اس کے گورنر تھے۔ شام کا صوبہ بڑا زرخیز تھا، مال ودولت کی ریل پیل تھی اور روم کا پسندیدہ اور چہیتا علاقہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر سارے عالم اسلام کی کمان کر رہے تھے، چناں چہ وہ ایک مرتبہ معائنہ کے لیے شام کے دورہ پر تشریف لے گئے، شام کے دورہ کے دوران ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ! میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے بھائی کا گھر دیکھوں، جہاں تم رہتے ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ تھا کہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اتنے بڑے صوبے کے گورنر بن گئے ہیں اور یہاں مال ودولت کی ریل پیل ہے اس لیے ان کا گھر دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے کیا کچھ جمع کیا ہے۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین! آپ میرے گھر کو دیکھ کر کیا کریں گے اس لیے کہ جب آپ میرے گھر کو دیکھیں گے تو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اصرار فرمایا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ چناں چہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین کو لے کر چلے، شہر کے اندر سے گزر رہے تھے، جاتے جاتے جب شہر کی آبادی ختم ہو گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کہاں لے جا رہے ہو؟ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بس اب تو قریب ہے۔ چناں چہ پورا دمشق

شہر جو دنیا کے مال واسباب سے جگ مگ کر رہا تھا، گزر گیا تو آخر میں لے جا کر کھجور کے پتوں سے بنا ہوا ایک جھونپڑا دکھایا اور فرمایا: امیر المؤمنین! میں اس میں رہتا ہوں۔ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے تو چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ وہاں سوائے ایک مصلے کے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے ابو عبیدہ! تم اس میں رہتے ہو؟ یہاں تو کوئی ساز وسامان، کوئی برتن، کوئی کھانے پینے اور سونے کا انتظام، کچھ بھی نہیں ہے، تم یہاں کیسے رہتے ہو؟

انہوں نے جواب دیا: امیر المؤمنین! الحمد للہ میری ضرورت کے سارے سامان میسر ہیں۔ یہ مصلّٰی ہے، اس پر نماز پڑھ لیتا ہوں اور رات کو اس پر سو جاتا ہوں، اور پھر اپنا ہاتھ اوپر چھپر کی طرف بڑھایا اور وہاں سے ایک پیالہ نکالا، جو نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ پیالہ نکال کر دکھایا کہ امیر المؤمنین! برتن یہ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب اس برتن کو دیکھا تو اس میں پانی بھرا ہوا تھا اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے بھیگے ہوئے تھے۔ پھر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المؤمنین! میں دن رات تو حکومت کے سرکاری کاموں میں مصروف رہتا ہوں، کھانے وغیرہ کا انتظام کرنے کی فرصت نہیں ہوتی، ایک خاتون میرے لیے دو تین دن کی روٹی ایک وقت میں پکا دیتی ہے، میں اس روٹی کو رکھ لیتا ہوں اور جب وہ سوکھ جاتی ہے تو میں اس کو پانی میں ڈبو دیتا ہوں اور رات کو سوتے وقت کھا لیتا ہوں۔

(سیر اعلام النبلاء:۷/۱)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ حالت دیکھی تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المؤمنین! میں تو آپ سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ میرا مکان دیکھنے کے بعد آپ کو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابو عبیدہ! اس دنیا کی ریل پیل نے ہم سب کو بدل دیا مگر خدا کی قسم تم ویسے ہی ہو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے، اس دنیا نے تم پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ حقیقت میں یہی لوگ اس کے مصداق ہیں کہ

بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں ؎

ساری دنیا آنکھوں کے سامنے ہے، اس کی دلکشیاں بھی سامنے ہیں اور اس کی رعنائیاں بھی سامنے ہیں اور دوسرے لوگ جو دنیا کی ریل پیل میں گھرے ہوئے ہیں وہ سب سامنے ہیں لیکن آنکھوں

میں کوئی جچتا نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ جل جلالہ کی محبت اس طرح دل پر چھائی ہوئی ہے کہ ساری دنیا کے جگ مگ کرتے ہوئے مناظر دھوکہ نہیں دے سکتے، اللہ تعالیٰ کی محبت ہر وقت دل ودماغ پر مسلط اور طاری ہے۔ ہمارے حضرت مجذوب صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جن کے قدموں میں دنیا ذلیل ہو کر آئی لیکن دنیا کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دی۔ درحقیقت یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دنیا کی حقیقت کی طرف متوجہ کیا اور بار بار دنیا کی بے ثباتی کی طرف اور آخرت کی ابدی اور دائمی نعمتوں اور عذابوں کی طرف متوجہ کیا جس سے قرآن اور حدیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

ایک دن مرنا ہے

انسان ذرا سوچے تو سہی یہ دنیا کس وقت تک کی ہے، ایک دن کی، دو دن کی، تین دن کی، کس کو پتا ہے کہ کب تک اس دنیا میں رہوں گا؟ کیا اس کو یقین ہے کہ میں اگلے گھنٹے بلکہ اگلے لمحے زندہ رہوں گا؟ بڑے سے بڑا سائنس دان، بڑے سے بڑا فلسفی، بڑے سے بڑا صاحب اقتدار یہ نہیں بتا سکتا کہ اس دنیا کی زندگی کتنی ہے؟ لیکن اس کے باوجود انسان دنیا کا ساز وسامان اکھٹا کرنے میں لگا ہوا ہے، دن رات دنیا کی خاطر دوڑ دھوپ میں مشغول ہے، صبح سے شام تک اسی کا چکر چل رہا ہے اور جس دن بلاوا آئے گا سب کچھ چھوڑ کر چلا جائے گا، کوئی چیز ساتھ نہیں جائے گی۔

دنیا دھوکے کا سامان ہے

لہٰذا قرآن کریم کی یہ آیت: وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (سورۂ حدید: آیت ۲۰) بتا رہی ہے کہ دنیوی زندگی دھوکے کا سودا ہے، اس دھوکے کے سودے میں اس طرح نہ پڑ جانا کہ وہ تمہیں آخرت سے غافل کر دے۔ اس دنیا سے ضرور گزرو مگر اس سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ اگر یہ بات دل میں اتر جائے تو پھر چاہے تمہاری کوٹھیاں، بنگلے ہوں یا کارخانے، دنیا کا ساز وسامان ہو یا مال ودولت اور بینک بیلنس، لیکن ان کی محبت دل میں نہیں ہے تو پھر زاہد ہو۔ الحمد للہ! پھر تمہیں زہد کی نعمت حاصل ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ خسارے کا سودا اس شخص کا ہے جس نے دنیا میں کمایا تو کچھ بھی نہیں اور قلاش ہے مگر دل میں دنیا کی محبت بھری ہے، تو اس شخص کو زہد حاصل نہیں ہے۔ اس کو زاہد نہیں کہیں گے اس لیے کہ دنیا کی عشق و محبت میں مبتلا ہے اور ایسا شخص بڑے خسارے میں ہے۔

(اصلاحی خطبات:۷/۱۱۷ تا ۱۲۰)

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا زہد

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص نے پانچ سو (۵۰۰) درہم پیش کیے اور عرض کیا: یہ اپنے خُدّام پر تقسیم فرمادیں۔ حضرت نے دریافت فرمایا کہ تمہارے پاس ان کے علاوہ اور بھی کچھ ہے۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت میرے پاس بہت سے دینار (اشرفیاں) ہیں۔ حضرت نے دریافت فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ ان میں اور بھی اضافہ ہو جائے یا نہیں چاہتے؟ اس نے عرض کیا کہ یہ خواہش تو ضرور ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ پھر تو تم ہم سے زیادہ محتاج ہو (اس لیے کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے ہم اس پر اضافہ نہیں چاہتے) اس لیے یہ تم اپنے ہی پاس رکھو۔ یہ کہہ کر وہ درہم واپس کر دیے، قبول نہ فرمائے۔

(فضائل صدقات حصہ دوم:۷۳۱)

ہارون رشید رحمہ اللہ کے بیٹے کا زُہد

ہارون رشید رحمہ اللہ کا ایک بیٹا تھا جس کی عمر تقریباً سولہ سال کی تھی۔ وہ بہت کثرت سے زاہدوں اور بزرگوں کی مجلس میں رہا کرتا تھا اور اکثر قبرستان چلا جاتا۔ وہاں جاکر کہتا کہ تم لوگ ہم سے پہلے دنیا میں تھے، دنیا کے مالک تھے لیکن اس دنیا نے تمہیں نجات نہ دی حتیٰ کہ تم قبروں میں پہنچ گئے۔ کاش! مجھے کسی طرح خبر ہوتی کہ تم پر کیا گزر رہی ہے اور تم سے کیا کیا سوال و جواب ہوئے ہیں اور اکثر یہ شعر پڑھا کرتا۔

تَرُوْعُنِي الْجَنَائِزُ كُلَّ يَوْمٍ   وَيُحْزِنُنِيْ بُكَاءُ النَّائِحَاتِ

ترجمہ: مجھے جنازے ہر دن ڈراتے ہیں اور مرنے والوں پر رونے والیوں کی آوازیں مجھے غمگین رکھتی ہیں۔

ایک دن وہ اپنے باپ (بادشاہ) کی مجلس میں آیا۔ اس کے پاس وزرا، امرا سب جمع تھے اور لڑکے کے بدن پر ایک کپڑا معمولی اور سر پر ایک لنگی بندھی ہوئی تھی۔ اراکینِ سلطنت آپس میں کہنے لگے کہ اس پاگل لڑکے کی حرکتوں نے امیر المؤمنین کو بھی دوسرے بادشاہوں کی نگاہ میں ذلیل کر دیا۔ اگر امیر المؤمنین اس کو تنبیہ کریں تو شاید یہ اپنی اس حالت سے باز آجائے۔ امیر المؤمنین نے یہ بات سن کر اس سے کہا کہ بیٹا تو نے مجھے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل کر رکھا ہے۔ اس نے یہ بات سن کر باپ کو تو کوئی جواب نہیں دیا، لیکن ایک پرندہ وہاں بیٹھا تھا اس کو کہا کہ اس ذات کا واسطہ جس نے تجھے پیدا کیا تو میرے ہاتھ پر آکر بیٹھ جا۔ وہ پرندہ وہاں سے اڑ کر اس کے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر کہا کہ اب اپنی جگہ چلا جا۔ وہ ہاتھ پر سے اڑ کر اپنی جگہ چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے عرض کیا کہ اباجان! اصل میں آپ دنیا سے جو محبت کر رہے ہیں اس نے مجھے رسوا کر رکھا ہے۔ اب میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ آپ سے جدائی اختیار کرلوں۔ یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا اور صرف ایک قرآن شریف اپنے ساتھ لیا۔ چلتے ہوئے ماں نے ایک بہت قیمتی انگوٹھی بھی اس کو دے دی (کہ احتیاج کے وقت اس کو فروخت کر کے کام میں لائے)۔

وہ یہاں سے چل کر بصرہ پہنچ گیا اور مزدوروں میں کام کرنے لگا۔ ہفتہ میں صرف ایک دن شنبہ کو مزدوری کرتا اور آٹھ دن تک وہ مزدوری کے پیسے خرچ کرتا اور آٹھویں دن پھر شنبہ کو مزدوری کرلیتا اور ایک درہم اور ایک دانق (یعنی درہم کا چھٹا حصہ) مزدوری لیتا۔ اس سے کم یا زیادہ نہ لیتا۔ ایک دانق روزانہ خرچ کرتا۔ ابو عامر بصری کہتے ہیں کہ میری ایک دیوار گر گئی تھی۔ اس کو بنوانے کے لیے میں کسی معمار کی تلاش میں نکلا۔ (کسی نے بتایا ہوگا کہ یہ شخص بھی تعمیر کا کام کرتا ہے) میں نے دیکھا کہ نہایت خوبصورت لڑکا بیٹھا ہے، ایک زنبیل پاس رکھی ہے اور قرآن شریف دیکھ کر پڑھ رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ لڑکے مزدوری کرو گے؟ کہنے لگا: کیوں نہیں کریں گے، مزدوری کے لیے ہی تو پیدا ہوئے ہیں۔ آپ بتائیں کیا خدمت مجھ سے لینی ہے؟ میں نے کہا: گارے مٹی (تعمیر) کا کام لینا ہے۔ اس نے کہا کہ ایک درہم اور ایک دانق مزدوری ہوگی اور نماز کے اوقات میں کام نہیں کروں گا، مجھے نماز کے لیے جانا ہوگا۔ میں نے اس کی دونوں شرطیں منظور کرلیں اور اس کو لاکر کام پر لگا دیا۔

مغرب کے وقت جب میں نے دیکھا تو اس نے دس آدمیوں کی بقدر کام کیا۔ میں نے اس کو مزدوری میں دو(۲) درہم دیے۔ اس نے شرط سے زائد لینے سے انکار کر دیا اور ایک درہم، ایک دانق لے کر چلا گیا۔ دوسرے دن میں پھر اس کی تلاش میں نکلا وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ میں نے لوگوں سے تحقیق کی کہ ایسی ایسی صورت کا ایک لڑکا مزدوری کیا کرتا ہے، کسی کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ملے گا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ صرف شنبہ ہی کے دن مزدوری کرتا ہے، اس سے پہلے تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔ مجھے اس کے کام کو دیکھ کر ایسی رغبت ہوئی کہ میں نے آٹھ دن کے لیے اپنی تعمیر بند کر دی اور شنبہ کے دن اس کی تلاش کو نکلا۔ وہ اسی طرح بیٹھا قرآن شریف پڑھتا ہوا ملا۔ میں نے سلام کیا اور مزدوری کرنے کو پوچھا۔ اس نے وہی پہلی دو شرطیں بیان کیں، میں نے منظور کر لیں۔ وہ میرے ساتھ آکر کام میں لگ گیا۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ پچھلے شنبہ کو اس اکیلے نے دس آدمیوں کا کام کس طرح کر لیا۔ اس لیے اس مرتبہ میں نے ایسی طرح چھپ کر کہ وہ مجھے نہ دیکھے، اس کے کام کرنے کا طریقہ دیکھا تو یہ منظر دیکھا کہ وہ ہاتھ میں گارا لے کر دیوار پر ڈالتا ہے اور پتھر اپنے آپ ہی ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اللہ کا ولی ہے اور اللہ کے اولیا کے کاموں کی غیب سے مدد ہوتی ہی ہے۔

جب شام ہوئی تو میں نے اس کو تین درہم دینا چاہے۔ اس نے لینے سے انکار کر دیا کہ میں اتنے درہم کیا کروں گا اور ایک درہم اور ایک دانق لے کر چلا گیا۔ میں نے ایک ہفتہ پھر انتظار کیا اور تیسرے شنبہ کو پھر میں اس کی تلاش میں نکلا مگر وہ مجھے نہ ملا۔ میں نے لوگوں سے تحقیق کی۔ ایک شخص نے بتایا کہ وہ تین دن سے بیمار ہے، فلاں ویراں جنگل میں پڑا ہے۔ میں نے ایک شخص کو اُجرت دے کر اس پر راضی کیا کہ وہ مجھے اس جنگل میں پہنچا دے۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اس جنگل ویراں میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ بے ہوش پڑا ہے، آدھی اینٹ کا ٹکڑا سر کے نیچے رکھا ہوا ہے۔ میں نے اس کو سلام کیا، اس نے جواب نہ دیا۔ میں نے دوسری مرتبہ سلام کیا تو اس نے (آنکھ کھولی اور) مجھے پہچان لیا۔ میں نے جلدی سے اس کا سر اینٹ پر سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس نے سر ہٹا لیا اور چند شعر پڑھے جن میں سے دو یہ ہیں ؎

يَا صَاحِبِي لَا تَغْتَرِرْ بِتَنَعُّمٍ   فَالْعُمْرُ يَنْفَدُ وَالنَّعِيْمُ يَزُوْلُ

وَإِذَا حَمَلْتَ إِلَى الْقُبُوْرِ جَنَازَةً   فَاعْلَمْ بِأَنَّكَ بَعْدَهَا مَحْمُوْلُ

ترجمہ: ''میرے دوست دنیا کی نعمتوں سے دھوکہ میں نہ پڑ۔ عمر ختم ہوتی جارہی ہے اور یہ نعمتیں سب ختم ہو جائیں گی۔ جب تو کوئی جنازہ لے کر قبرستان میں جائے تو یہ سوچتا رہا کر کہ تیرا بھی ایک دن اسی طرح جنازہ اٹھایا جائے گا۔''

اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا: ابو عامر جب میری روح نکل جائے تو مجھے نہلا کر میرے اسی کپڑے میں مجھے کفن دے دینا۔ میں نے کہا: میرے محبوب اس میں کیا حرج ہے کہ میں تیرے کفن کے لیے نئے کپڑے لے آؤں۔ اس نے جواب دیا کہ نئے کپڑوں کے لیے زندہ لوگ زیادہ مستحق ہیں (یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جواب ہے، انہوں نے بھی اپنے وِصال کے وقت یہی فرمائش کی تھی کہ مجھے میری انہی چادروں میں کفن دے دینا، اور جب ان سے نئے کپڑے کی اجازت چاہی گئی تو انہوں نے یہی جواب دیا تھا)۔ لڑکے نے کہا: کفن تو (پرانا ہو یا نیا، بہر حال) بوسیدہ ہو جائے گا، آدمی کے ساتھ تو صرف اس کا عمل ہی رہتا ہے اور یہ میری لنگی اور لوٹا قبر کھودنے والے کو مزدوری میں دے دینا اور یہ انگوٹھی اور قرآن شریف ہارون رشید تک پہنچا دینا اور اس کا خیال رکھنا کہ خود انہیں کے ہاتھ میں دینا اور یہ کہہ دینا کہ ایک پردیسی لڑکے کی یہ میرے پاس امانت ہے اور وہ آپ سے یہ کہہ گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اسی غفلت اور دھوکہ کی حالت میں آپ کی موت آجائے، یہ کہہ کر اس کی روح نکل گئی، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ لڑکا شہزادہ تھا۔

اس کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کے موافق میں نے اس کو دفن کر دیا اور دونوں چیزیں گورکن کو دے دیں اور قرآن پاک اور انگوٹھی لے کر بغداد پہنچا۔ قصر شاہی کے قریب پہنچا تو بادشاہ کی سواری نکل رہی تھی۔ میں ایک اونچی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اول ایک بہت بڑا لشکر نکلا جس میں تقریباً ایک ہزار گھڑسوار تھے، اس کے بعد اسی طرح یکے بعد دیگرے دس لشکر نکلے۔ ہر ایک میں تقریباً ایک ہزار سوار تھے۔ دسویں جتھے میں خود امیر المؤمنین بھی تھے۔ میں نے زور سے آواز دے کر کہا اے امیر المؤمنین! آپ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت، رشتہ داری کا واسطہ، ذرا سا توقف کر لیجیے۔ میری آواز پر انہوں نے مجھے دیکھا تو میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا کہ میرے پاس ایک پردیسی لڑکے کی یہ امانت ہے جس نے مجھے یہ وصیت کی تھی کہ یہ دونوں چیزیں آپ تک پہنچا دوں۔

بادشاہ نے ان کو دیکھ کر (پہچان لیا) تھوڑی دیر سر جھکایا۔ ان کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے اور ایک دربان سے کہا کہ اس آدمی کو اپنے ساتھ رکھو، جب میں واپسی پر بلاؤں تو میرے پاس پہنچا دینا۔ جب وہ باہر سے واپسی پر مکان پر پہنچے تو محل کے پردے گرواکر دربان سے فرمایا: اس شخص کو بلا کر لاؤ اگرچہ وہ میرا غم تازہ ہی کرے گا۔ دربان میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ امیر المؤمنین نے بلایا ہے اور اس کا خیال رکھنا کہ امیر پر صدمہ کا بہت اثر ہے، اگر تم دس باتیں کرنا چاہتے ہو تو پانچ ہی پر اکتفا کرنا۔ یہ کہہ کر وہ مجھے امیر کے پاس لے گیا۔

اس وقت امیر بالکل تنہا بیٹھے تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ میرے قریب آجاؤ۔ میں قریب جا کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگے: تم میرے اس بیٹے کو جانتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں! میں ان کو جانتا ہوں۔ کہنے لگے: وہ کیا کام کرتا تھا؟ میں نے کہا: گارے مٹی کی مزدوری کرتے تھے۔ کہنے لگے: تم نے بھی مزدوری پر کوئی کام اس سے کرایا ہے؟ میں نے کہا: کرایا ہے۔ کہنے لگے: تمہیں اس کا خیال نہ آیا کہ اس کی حضور ﷺ سے قرابت تھی (کہ یہ حضرات حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں)؟ میں نے کہا: امیر المؤمنین! پہلے اللہ جل شانہ سے معذرت چاہتا ہوں، اس کے بعد آپ سے عذر خواہ ہوں، مجھے اس وقت اس کا علم ہی نہ تھا کہ یہ کون ہیں، مجھے ان کے انتقال کے وقت ان کا حال معلوم ہوا۔ کہنے لگے: تم نے اپنے ہاتھ سے اس کو غسل دیا؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ کہنے لگے: اپنا ہاتھ لاؤ۔ میرا ہاتھ لے کر اپنے سینہ پر رکھ دیا اور چند شعر پڑھے۔ جن کا ترجمہ یہ ہے۔

''اے وہ مسافر جس پر میرا دل پگھل رہا ہے اور میری آنکھیں اس پر آنسو بہا رہی ہیں۔ اے وہ شخص جس کا مکان (قبر) دور ہے لیکن اس کا غم میرے قریب ہے۔ بے شک موت ہر اچھے سے اچھے عیش کو مکدّر کر دیتی ہے۔ وہ مسافر ایک چاند کا ٹکڑا تھا (یعنی اس کا چہرہ) جو خالص چاندی کی ٹہنی پر تھا (یعنی اس کے بدن پر) پس چاند کا ٹکڑا بھی قبر میں پہنچ گیا اور چاندی کی ٹہنی بھی قبر میں پہنچ گئی۔''

اس کے بعد ہارون رشید رحمہ اللہ نے بصرہ میں اس کی قبر پر جانے کا ارادہ کیا۔ ابو عامر رحمہ اللہ ساتھ تھے۔ اس کی قبر پر پہنچ کر ہارون رشید رحمہ اللہ نے چند شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے:

''اے وہ مسافر! جو اپنے سفر سے کبھی بھی نہ لوٹے گا، موت نے کم عمری کے ہی زمانہ میں اس کو

جلدی سے اچک لیا۔ اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک! تو میرے لیے اُنس اور دل کا چین تھا، لمبی راتوں میں بھی اور مختصر راتوں میں بھی۔ تو نے موت کا وہ پیالہ پیا ہے جس کو عنقریب تیرا بوڑھا باپ بڑھاپے کی حالت میں پیے گا، بلکہ دنیا کا ہر آدمی اس کو پیے گا چاہے وہ جنگل کا رہنے والا ہو یا شہر کا رہنے والا ہو۔ پس سب تعریفیں اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ کے لیے ہیں جس کی لکھی ہوئی تقدیر کے یہ کرشمے ہیں۔"

ابو عامر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جو رات آئی تو جب میں اپنے وظائف پورے کر کے لیٹا ہی تھا کہ میں نے خواب میں ایک نور کا قُبّہ دیکھا جس کے اوپر اَبر کی طرح نور ہی نور پھیل رہا ہے۔ اس نور کے اَبر میں سے اس لڑکے نے مجھے آواز دے کر کہا: ابو عامر رحمہ اللہ! تمہیں حق تعالیٰ شانہ جزائے خیر عطا فرمائے (تم نے میری تجہیز و تکفین کی اور میری وصیت پوری کی)۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میرے پیارے! تیرا کیا حال گزرا ہے؟ کہنے لگا: میں ایسے مولیٰ کی طرف پہنچا ہوں جو بہت کریم ہے اور مجھ سے بہت راضی ہے۔ مجھے اس مالک نے وہ چیزیں عطا کیں جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں، نہ کسی آدمی کے دل پر ان کا خیال گزرا (یہ ایک مشہور حدیث پاک کا مضمون ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کا پاک ارشاد ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھیں، نہ کان نے سنیں، نہ کسی کے دل پر ان کا خیال گزرا)۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تورات میں لکھا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے ان لوگوں کے لیے جن کے پہلو رات کو خواب گاہوں سے دور رہتے ہیں (یعنی تہجد گزاروں) کے لیے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی آدمی کے دل پر ان کا خیال گزرا، نہ ان کو کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے نہ کوئی نبی رسول جانتا ہے۔ اور یہ مضمون قرآن پاک میں بھی ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ "کسی شخص کو خبر نہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لیے خزانہ غیب میں موجود ہے۔" (سورۂ سجدہ: آیت ۱۷) (در منثور)

اس کے بعد اس لڑکے نے کہا کہ حق تعالیٰ شانہ نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ جو بھی دنیا سے اس طرح نکل آئے جیسا میں نکل آیا اس کے لیے یہی اعزاز اور اکرام ہیں جو میرے لیے ہوئے۔

صاحبِ روض کہتے ہیں کہ یہ سارا قصہ مجھے اور طریقہ سے بھی پہنچا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ کسی شخص نے ہارون رشید سے اس لڑکے کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے بتایا کہ میرے بادشاہ ہونے سے پہلے یہ لڑکا پیدا ہوا تھا، بہت اچھی تربیت پائی تھی۔ قرآن پاک بھی پڑھا تھا اور علوم بھی پڑھے تھے۔ جب میں بادشاہ بن گیا تو یہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میری دنیا سے اس نے کوئی راحت نہ اٹھائی۔ چلتے وقت میں نے ہی اس کی ماں سے کہا تھا کہ اس کو یہ انگوٹھی دے دے۔ اس انگوٹھی کا یاقوت بہت زیادہ قیمتی تھا مگر یہ اس کو بھی کام میں نہ لایا۔ مرتے وقت واپس کر گیا۔ یہ لڑکا اپنی والدہ کا بڑا فرمانبردار تھا۔ (روض)

جس باپ کی دنیاداری سے یہ صاحبزادہ رنجیدہ ہو کر گیا ہے یعنی ہارون رشید رحمہ اللہ، بہت نیک دل بادشاہوں میں ان کا شمار ہے۔ دولت اور ثروت کے ساتھ لغزشیں تو ہو ہی جاتی ہیں، لیکن ان کے دینی کارنامے تاریخ کی کتابوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ بادشاہت کے زمانہ میں سو(۱۰۰) رکعت نفل روزانہ پڑھنے کا معمول مرتے دم تک رہا اور اپنے ذاتی مال سے ایک ہزار درہم روزانہ صدقہ کیا کرتے تھے۔ ایک سال حج کیا کرتے اور ایک سال جہاد میں شرکت کرتے۔ جس سال خود حج کو جاتے اپنے ساتھ سو(۱۰۰) علمائے کرام کو مع ان کے بیٹوں کے حج کو لے جاتے اور جس سال خود حج نہ کرتے، تین سو(۳۰۰) آدمیوں کو ان کے پورے خرچ اور سامان، لباس وغیرہ کے ساتھ حج کو بھیجا کرتے جن کو خرچ بھی بہت وسعت سے دیا جاتا اور لباس بھی عمدہ دیا جاتا۔ ویسے بھی عطایا کی بہت کثرت ان کے یہاں تھی، سوال کرنے والوں کے لیے بھی اور بغیر سوال کے ابتداءً بھی۔

علمائے کرام کا ان کی مجلس میں بہت اعزاز تھا اور ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ابو معاویہ رحمہ اللہ ضَرِیر مشہور محدِّث نابینا نے ایک مرتبہ ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد خود ہارون رشید رحمہ اللہ نے ان کے ہاتھ دھلائے اور یہ کہا کہ علم کے اعزاز میں میں نے دھلائے ہیں۔

ایک مرتبہ ابو معاویہ رحمہ اللہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث، جس میں حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے مناظرہ کا ذکر تھا، بیان کی۔ ایک شخص نے کہہ دیا کہ ان دونوں حضرات کی ملاقات کہاں ہوئی تو بادشاہ کو غصہ آگیا اور کہا: میری تلوار لاؤ، زندیق، بددین اعتراض کرتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر۔ نصیحت کی باتوں پر بہت کثرت سے رونے والے تھے۔

ایک مرتبہ ہارون رشید رحمۃ اللہ علیہ حج کو جا رہے تھے۔ راستہ میں کوفہ میں چند روز قیام کیا۔ جب وہاں سے روانگی کا وقت ہوا تو بہت سے لوگ بادشاہ کی سواری کی سیر کے شوق میں شہر سے باہر جمع ہوگئے۔ بہلول مجنون بھی پہنچ گئے اور راستہ میں ایک کوڑی پر بیٹھ گئے۔ بچے ان کو ہر وقت ستایا ہی کرتے تھے۔ ڈلے مارتے، مذاق کرتے۔ وہ حسب دستور ان کے گرد جمع ہوگئے۔ جب بادشاہ کی سواری قریب آئی تو بچے تو سب ادھر ادھر ہوگئے۔ انہوں نے زور سے آواز دے کر کہا: اے امیر المومنین ،اے امیر المؤمنین! ہارون رشید نے سواری کا پردہ اٹھایا اور کہنے لگے: لبیک یا بہلول، لبیک یا بہلول یعنی "بہلول میں حاضر ہوں، بہلول میں حاضر ہوں"! کہو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: مجھ سے اَیمن نے یہ حدیث بیان کی کہ حضرت قُدامہ رضی اللہ عنہ یہ کہتے ہیں کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حج کو تشریف لے جا رہے تھے تو میں نے منیٰ میں آپ کو ایک اونٹ پر سوار دیکھا۔ جس پر معمولی کجاوا تھا۔ نہ لوگوں کو سامنے سے ہٹانا تھا، نہ ہٹو بچو کا شور تھا۔ امیر المومنین! تیرا ابھی اس سفر میں تواضع سے چلنا تکبر سے چلنے سے بہتر ہے۔

ہارون رشید یہ سن کر رونے لگے۔ پھر کہا: بہلول کچھ اور نصیحت کرو اللہ تعالیٰ شانہ تم پر رحم کرے۔ بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سن کر دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ:

"مان لے، تسلیم کر لے کہ تو ساری دنیا کا بادشاہ بن گیا اور ساری دنیا کی مخلوق تیری مطیع ہوگئی، پھر کیا ہوا، کل کو تو بہر حال تیرا ٹھکانا قبر کا گڑھا ہے۔ ایک ادھر سے مٹی ڈال رہا ہوگا ایک اُدھر سے مٹی ڈالتا ہوگا۔"

اس پر ہارون رشید پھر بہت روئے اور کہنے لگے: بہلول! تم نے بہت اچھی بات کہی، کچھ اور کہو۔ بہلول نے کہا: امیر المؤمنین! جس شخص کو حق تعالیٰ شانہ مال اور جمال عطا کرے اور وہ اپنے مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرے اور اپنے جمال کو گناہوں سے محفوظ رکھے وہ اللہ تعالیٰ کے دیوان میں نیک لوگوں میں لکھا جاتا ہے۔ ہارون رشید نے کہا: تم نے بہت اچھی بات کہی، اس کا صلہ (انعام) ملنا چاہیے۔ بہلول نے کہا: انعام کا روپیہ ان لوگوں کو واپس کر جن سے (ٹیکس وغیرہ کے طور پر) لے رکھا ہے، مجھے تیرے انعام کی ضرورت نہیں۔ ہارون رشید ؒ نے کہا کہ اگر تمہارے ذمہ کسی کا قرض ہو تو میں اس کو ادا کر دوں۔ بہلول ؒ نے کہا: امیر المؤمنین! قرض سے قرض ادا نہیں کیا جاتا (یعنی یہ روپیہ جو تیرے پاس ہے یہ خود دوسروں کا

حق ہے جو تیرے ذمہ ان کا قرض ہے) حق والوں کا حق واپس کرو۔ پہلے اپنا قرضہ ادا کرو، پھر دوسروں کے قرضہ کو پوچھنا۔

ہارون رشید نے کہا: تمہارے لیے کوئی وظیفہ مقرر کردیں جس سے تمہارے کھانے کا انتظام ہوجائے۔ بہلول رحمہ اللہ نے کہا کہ میں اور تم دونوں اللہ تعالیٰ شانہ کے بندے ہیں، یہ محال ہے کہ وہ تمہاری روزی کی تو فکر رکھے اور میری روزی کی فکر نہ فرمائے۔ اس کے بعد ہارون رشید نے سواری کا پردہ گرایا اور آگے چل دیئے۔

ہارون رشید رحمہ اللہ کی مشہور بات ہے کہ نصیحت کے سننے پر بہت کثرت سے رویا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حج کو جارہے تھے توسَعدون رحمہ اللہ مجنوں راستہ میں سامنے آگئے اور چند شعر پڑھے جن کا مطلب یہ تھا کہ:

”مان لو تم ساری دنیا کے بادشاہ بن گئے ہو لیکن کیا آخر موت نہ آئے گی۔ دنیا کو اپنے دشمنوں کے لیے چھوڑدو۔ جو دنیا آج تمہیں خوب ہنسارہی ہے یہ کل کو تمہیں خوب رلائے گی۔“

یہ اشعار سن کر ہارون رشید نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہوکر گرگئے اور اتنے طویل وقت تک بے ہوشی رہی کہ تین نمازیں قضا ہوگئیں۔ (روض) ان کی انگوٹھی کی مہر تھی اَلْعَظْمَۃُ وَالْقُدْرَۃُ لِلّٰہِ ”ہر قسم کی بڑائی اور ہر نوع کی قدرت صرف اللہ جلّ شانہ کے لیے“ یہ مضمون گویا ہر وقت نگاہ کے سامنے رہتا تھا۔ (فضائل صدقات حصہ دوم: ۷۴۹ تا ۷۵۸)

عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا زہد

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ خلافت سے پہلے اچھا لباس اور اچھی خوشبو استعمال کرتے تھے لیکن خلافت کے بعد ان کی حالت کیا ہوئی ان کے متعلق مولانا عبد السلام ندوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ جس وقت بادشاہ نہ تھے، اس وقت سب سے بڑے بادشاہ تھے، اور جس وقت تاجِ خلافت سر پر رکھا تو بالکل راہب ہوگئے۔ خدم وحشم، عطر ولباس اور دوسرے سامانِ آرائش کو ۲۳ ہزار دینار پر فروخت کرکے خدا کی راہ میں دے دیا، چناں چہ جب اصطبل خانوں کے داروغہ آئے اور گھوڑوں اور سائیسوں کا خرچ مانگا تو حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے ان کو

مختلف صوبوں میں بھیج دیا کہ فروخت کر کے ان کی قیمت خدا کی راہ میں دے دی جائے۔ غلاموں کے لیے تنخواہ وغیرہ کا سوال ہوا تو تمام صوبوں کے اندھے، اپاہج اور یتیم جمع کر کے ان غلاموں کو ان پر تقسیم کر دیا اور خود وہ ابراہیم بن ادہم بن گئے جن کا اثر ان کے تمام مظاہرِ زندگی سے نمایاں ہوتا تھا۔

لباس: کپڑا نہایت سادہ اور معمولی درجہ کا پہنتے تھے اور ان میں متعدد پیوند لگے رہتے تھے۔ ایک بار قمیض کے گریبان میں آگے اور پیچھے دونوں طرف پیوند لگے ہوئے تھے۔ نماز جمعہ پڑھا کر بیٹھے تو ایک شخص نے آکر کہا کہ اے امیر المؤمنین! خدا نے آپ کو سب کچھ دیا ہے، کاش آپ عمدہ کپڑے پہنتے۔ یہ سن کر تھوڑی دیر تک گردن جھکالی، پھر سر اٹھا کر کہا: میانہ روی تموّل کی حالت میں اور عفوودر گزر قدرت کی حالت میں بہتر ہے۔ ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے ان کو ایک ایسی قمیض پہنے ہوئے دیکھا جس کے پورے دونوں شانوں کے درمیان پیوند لگا ہوا تھا۔

اکثر اوقات جسم پر صرف ایک کپڑا رہتا تھا اور اسی کو بار بار دھو کر پہنتے تھے۔ میمون کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک چادر چھ ۶ مہینے تک نہیں بدلی، وہی ہر جمعہ کو دھوئی جاتی اور اس پر زعفران کا رنگ دے دیا جاتا تھا۔ ایک روز جمعہ کے دن مسجد کے جانے میں دیر ہوئی، کسی نے تاخیر کی وجہ پوچھی تو بولے کہ غلام کپڑے دھونے کو لے گیا تھا اور اس کے سوا کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا۔

مسلمہ کا بیان ہے کہ میں مرض الموت میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ دیکھا کہ ایک میلی سی پھٹی ہوئی قمیض پہنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ان کی بیوی فاطمہ سے کہا کہ امیر المؤمنین کی قمیض دھوڈالو، دوسرے روز گئے تو بدن پر پھر وہی قمیض نظر آئی، بولے کہ میں نے تم کو قمیض اس لیے دھونے کو کہا کہ لوگ عیادت کو آتے ہیں، بولیں: اس کے سوا ان کے پاس کوئی قمیض ہی نہیں۔

(سیرت عمر بن عبد العزیزؒ:۹۹ تا ۱۰۰)

ایک بار حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ بیمار ہوئے تو کئی دن تک ایک ہی کپڑا آپ کے جسم پر رہا جو میلا ہو گیا تھا۔ آپ کے بعض اقربا نے آپ کی بیوی فاطمہ سے کہا کہ آج امیر المؤمنین کو کچھ افاقہ ہے، کپڑے بدل دو۔ لوگ ملاقات وعیادت کے مشتاق ہیں۔ کپڑے بدل جانے کے بعد ہم ان کو ملاقات کا موقع دے دیں۔ وہ خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر جب دوبارہ کہا گیا تو فرمایا واللہ مالہ غیرہ یعنی خدا کی قسم! دوسرا کپڑا ان کے پاس موجود ہی نہیں۔ (طبقات ابن سعد: ۲۹۷/۵ وسیرت عمر بن عبد العزیزؒ: ۴۸، البدایہ والنہایہ: ۲۱۴/۹)

علامہ شعرانی اپنی طبقات میں لکھتے ہیں: عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی ذاتی آمدنی خلافت سے پہلے پچاس ہزار اشرفی سالانہ تھی، لیکن خلافت کے بعد ان رقموں کو ضعفائے اسلام میں اس طرح خرچ کرنے لگے کہ بجز ایک قمیص کے اور کوئی دوسرا کپڑا آپ کے پاس نہ ہوتا جس کو میلا ہونے تک برابر پہنتے رہتے۔ میلا ہونے پر دھولیتے اور خشک ہونے تک گھر میں ٹھہرے رہتے، کیوں کہ دوسرا کپڑا نہ ہوتا جسے پہن کر باہر آتے۔(طبقات کبریٰ للشعرانی:۲۸/۱) اور یہ کرتہ زیادہ سے زیادہ چار درہم کا ہوتا۔

(البدایہ والنہایہ:۲۰۲/۹ومرآۃ الجنان:۲۱۰۱، ایام خلافت راشدہ:۹۲)

یونس بن شیب جنہوں نے ان کو خلافت سے پہلے اس حالت میں دیکھا تھا کہ توند نکلی ہوئی تھی، ان کا بیان ہے کہ خلافت کے بعد اگر میں گننا چاہتا تو بغیر چھوئے ہوئے ان کی پسلیوں کو گن سکتا تھا۔

غذا: غذا نہایت معمولی کھاتے تھے۔ ایک بار صبح کو گھر سے دیر میں نکلے، اس لیے اہل صحبت کو خیال ہوا کہ کسی پر ناراض تو نہیں ہیں۔ ان کو اس کی اطلاع ہوئی تو بطورِ معذرت کے کہا کہ رات میں نے مسور اور چنے کی دال کھائی، اس لیے نفخ ہو گیا۔ اہل مجلس میں ایک صاحب بولے: اے امیر المومنین! خداوند تعالیٰ تو اپنی کتاب میں کہتا ہے: فَكُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ترجمہ:"ہم نے تم کو جو کچھ دیا ہے ان میں سے بہتر چیزیں کھاؤ۔" بولے: افسوس! تم نے الٹے معنی لیے، اس سے مراد وہ مال ہے جو کسبِ حلال سے حاصل کیا جائے، لذیذ کھانا مراد نہیں۔

محمد بن زبیر الحنظلی کا بیان ہے کہ میں ایک شب ان کے پاس گیا تو دیکھا کہ روٹی کے ٹکڑے زیتون کے تیل کے ساتھ کھا رہے ہیں۔

ایک دن انہوں نے اندر گھر میں ایک شخص کو بلالیا۔ وہ اندر پہنچا تو دیکھا کہ ایک دستر خوان پر ایک طشت رومال سے ڈھکی ہوئی رکھی ہے اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نماز پڑھ رہے ہیں۔ نماز پڑھ چکے تو دستر خوان کو سامنے کھینچ کر کہا: آؤ کھاؤ، کہاں وہ مصر و مدینہ کی زندگی اور کہاں یہ زندگی، یہ کہہ کر رو پڑے اور پھر کچھ نہ کھایا۔

ایک بار ان کے خادم کو دال کھانے کے لیے ملی تو بولا: روز روز دال! اس کی سیدہ نے کہا کہ تمہارے آقا امیر المومنین کی بھی یہی غذا ہے، لیکن یہ معمولی غذا بھی زمانۂ خلافت میں کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز:۹۹تا۱۰۱)

مکان: قصر و محل لازمۂ امارت ہیں، لیکن اُنہوں نے عمر بھر ذاتی حیثیت سے کوئی عمارت تعمیر نہیں کی۔ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت یہی ہے، آپ دنیا سے رخصت ہوئے اور اینٹ کو اینٹ پر اور شہتیر کو شہتیر پر نہیں رکھا، یہاں تک کہ گھر میں بالاخانہ تھا جس کے زینے کی ایک اینٹ ہلتی تھی جس سے اترتے چڑھتے وقت گرنے کا خوف معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن ان کے غلام نے اس کو مٹی سے جوڑ دیا۔ وہ چڑھے تو اس کی حرکت محسوس نہیں ہوئی۔ غلام سے پوچھا تو اس نے واقعہ بیان کیا۔ بولے "مٹی کو اکھیڑ ڈالو، میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر خلیفہ ہوں گا تو ایک اینٹ بھی دوسری اینٹ پر نہ رکھوں گا"۔

گھر میں کسی قسم کا ساز و سامان نہ تھا۔ ایک بار عراق سے ایک عورت آئی اور ان کے گھر میں جا کر دیکھا کہ کسی قسم کا ساز و سامان نہیں ہے، بولی کہ میں اسی ویران گھر سے اپنا گھر آباد کرنے آئی ہوں؟ ان کی بی بی فاطمہ نے کہا: تمہی جیسے لوگوں کی گھر کی آبادی نے اس گھر کو ویران کر رکھا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ آئے اور اس نے اپنی پانچ لڑکیوں کی ناداری بیان کی تو ان میں چار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

اہل وعیال: بی بی سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ان کی بی بی فاطمہ کا بیان ہے کہ خلیفہ ہونے کے بعد ان کو کبھی غسل جنابت کی ضرورت نہیں ہوئی۔ میں نے ایک بار کسی فقیہ کے یہاں کہلا بھیجا کہ امیر المؤمنین جو کر رہے ہیں یہ جائز نہیں ہے، وہ بی بی سے بالکل تعلق نہیں رکھتے۔ انہوں نے ان سے ذکر کیا تو بولے کہ جس کی گردن پر تمام امتِ محمدیہ کا بوجھ ہو اور قیامت کے دن اس کا مواخذہ کیا جائے وہ کیونکر ان تعلقات کو قائم رکھ سکتا ہے؟

لونڈیاں جو تھیں ان کو اختیار دے دیا تھا کہ جن کا جی چاہے آزاد ہو جائیں اور جو رہنا چاہیں وہ رہیں لیکن ان کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

روزانہ خرچ کل دو درہم تھا جس کا بار کبھی بیت المال پر نہیں ڈالا۔ ذاتی آمدنی جو کچھ تھی وہ بھی خلافت کے بعد کم ہو گئی، کیوں کہ اموال مغصوبہ کی واپسی کے سلسلہ میں انہوں نے سب سے پہلے خود اپنی جائیدادیں واپس کیں۔ جس وقت خلیفہ ہوئے تھے ان کی جائداد کا منافع پچاس ہزار دینار تھا لیکن وفات

کے وقت گھٹ کر دو سو دینار رہ گیا۔ ایسی حالت میں اہل و عیال عسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک بار عبداللہ بن زکریا ان کے یہاں گئے اور ان کے اہل و عیال کی تنگدستی کو دیکھ کر ان کا دل بھر آیا۔ بولے: یا امیر المؤمنین! آپ اپنے عمال کو سو سو دینار بلکہ اس سے بھی زیادہ مشاہرہ دیتے ہیں۔ بولے: اگر وہ قرآن وحدیث کے مطابق عمل کریں تو یہ بہت کم ہے، میں ان کو معاش کے جھگڑوں سے بالکل نجات دلانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جب یہ جائز ہے اور جب کہ آپ خود ان سے زیادہ کام کرتے ہیں تو آپ بھی مشاہرہ لیجیے اور اپنے اہل و عیال کو فارغ البال کیجیے کیوں کہ وہ بہت محتاج ہیں۔ بولے کہ تم نے یہ ہماری ہمدردی اور بھلائی کی نیت سے کہا ہے، پھر بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ پر رکھ کر بولے، لیکن یہ گوشت کل کا کل خدا کے مال سے پیدا ہوا ہے اور اب میں خدا کے مال سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔

ایک بار گھر میں ضروریات معاش کے لیے کچھ نہ تھا۔ ان کے غلام مزاحم سخت پریشان ہوئے کہ کیا انتظام کیا جائے۔ مجبوراً ایک شخص سے پانچ دینار قرض لیے۔ یمن کی جائداد کا منافع آیا تو وہ نہایت خوش ہو کر اس کے پاس گئے کہ ابھی قرض ادا کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر گھر میں گئے تو سر پر ہاتھ رکھ کر نکلے اور کہا کہ خدا امیر المؤمنین کو اجر دے، خدا امیر المؤمنین کو اجر دے، اس رقم کو بھی جو ان کی ذاتی رقم تھی بیت المال میں داخل کر دیا۔

ایک بار گھر میں گئے اور بی بی سے کہا کہ ایک درہم ہے میں انگور خریدنا چاہتا ہوں۔ بولیں: نہیں! فرمایا: ایک پیسہ ہو گا؟ انہوں نے غصہ کے لہجہ میں جواب دیا کہ تم امیر المؤمنین ہو کر ایک درہم بلکہ ایک پیسہ کی بھی مقدرت نہیں رکھتے؟ بولے: جہنم کی ہتھکڑیوں سے یہ زیادہ آسان ہے۔

بچوں سے اگرچہ بہت زیادہ محبت رکھتے تھے، لیکن اس محبت کا اظہار کبھی دنیوی زیب وزینت اور عیش و عشرت کی صورت میں نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار انہوں نے اپنی لڑکی امینہ کو نہایت پیار سے پاس بلایا، لیکن وہ نہ آئی، اب ایک آدمی کو بھیج کر بلوایا اور نہ آنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے کہا: میرے پاس کپڑا نہ تھا۔ مزاحم کو حکم دیا کہ فرش کو پھاڑ کر اس کے لیے ایک قمیض تیار کروادو۔ حسن اتفاق سے لڑکی کی پھوپھی ام النبیین نہایت دولت مند تھیں۔ ایک آدمی ان کے پاس گیا اور واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے ایک

تھان کپڑا بھیج دیا اور کہا کہ عمر سے کچھ نہ مانگو۔

ایک بار ان کے صاحبزادے عبد اللہ آئے اور کپڑے مانگے۔ انہوں نے ان کو خیار بن رباح بصری کے پاس بھیج دیا کہ ہمارے کپڑے وہاں رکھے ہوئے ہیں۔ وہ گئے تو خیار نے گاڑھے کپڑے نکال کر سامنے رکھ دیئے اور کہا: جس قدر ضرورت ہو لے لو۔ انہوں نے کہا کہ یہ میری اور میرے خاندان کی پوشش نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ امیر المؤمنین کے یہی کپڑے ہیں جو میرے پاس ہیں۔ عبد اللہ پلٹے اور حضرت عمر بن عبد العزیز سے واقعہ بیان کیا تو بولے کہ اگر لینا چاہو تو میں تمہارے وظیفہ سے سو دینار پیشگی دلوا سکتا ہوں، وہ راضی ہو گئے تو انہوں نے سو اشرفیاں دلوادیں، لیکن جب وظیفہ تقسیم ہوا تو اس کو مجرا لے لیا۔

ان کی اولاد میں اگر کوئی بیش قیمت چیز کا استعمال کرتا تو اس کو بھی منع کرتے۔ ایک بار ان کے صاحبزادے نے انگوٹھی بنوائی اور اس کے لیے ہزار درہم کا نگینہ خریدا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کو معلوم ہوا تو لکھا کہ اس انگوٹھی کو فروخت کر ڈالو اور اس رقم سے ہزار بھوکوں کا پیٹ بھرو اور ایک لوہے کی انگوٹھی خرید کر اس پر یہ عبارت کندہ کرالو "خدا اس شخص پر رحم کرے جس نے اپنی قدر پہچانی۔"

وہ معمولاً عشا کے بعد اپنی لڑکیوں کے یہاں جایا کرتے تھے۔ ایک رات گئے اور لڑکیوں نے آنے کی آہٹ پائی تو ہاتھ سے اپنے منہ بند کر کے دروازے تک آئیں۔ انہوں نے اس کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس شب کے کھانے میں مسور کی دال اور پیاز کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ آپ ان کی ناگوار بو سونگھیں۔ اس پر وہ رو پڑے اور کہا: اے میری لڑکیو! تم کو اس سے کیا فائدہ ہو گا کہ تم طرح طرح کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ دوزخ کی آگ میں جھونک دیا جائے۔ یہ سن کر تمام لڑکیاں چیخ مار کر رو پڑیں۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز:۱۰۱تا۱۰۶)

حرص یا ترقی

مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کے پاس ایک مریض آہ آہ کرتا ہوا آیا، اس کو دردِ شکم کی شکایت تھی۔ مولوی صاحب طبیب بھی تھے۔ آپ نے ایک نسخہ تجویز کر کے اس کو دیا کہ یہ دوا پی لو۔

مریض نے کہا کہ حضرت اگر پیٹ میں دوا پینے کی گنجائش ہوتی تو میں کھانا اور نہ کھاتا۔ اس کے نزدیک بھی درد کا علاج کھانا ہی تھا۔ ایسے ہی آج کل لوگوں نے مرضِ حرص کا علاج الٹا کیا ہے اور یہ بھی وہ لوگ کرتے ہیں جو حرص کو مرض سمجھتے ہیں ورنہ عام طور پر تو اس کو مرض بھی نہیں سمجھتے، چناں چہ آج کل تعلیم یافتہ لوگوں نے حرص کا نام ترقی رکھا ہے اور اس کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں۔

(پسندیدہ واقعات:۶۵تا۶۶)

شیخ سعدی رحمہ اللہ کا واقعہ

شیخ سعدی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک رات مجھے ایک تاجر کے پاس رہنے کا اتفاق ہو گیا جس کے پاس سامانِ تجارت تھا اور بہت سے غلام اور خدمت گار تھے۔ اس نے تمام رات میرا سر کھایا کہ اس وقت میرے پاس اتنا مال ہے، اور میرا فلاں شریک ترکستان میں ہے اور کچھ سامانِ تجارت ہندوستان میں ہے، اور یہ فلاں زمین کی دستاویز ہے اور فلاں سامان کا ایک شخص ضامن ہے۔ کبھی کہتا کہ اسکندریہ جانے کا خیال کر رہا ہوں اور وہاں کی آب و ہوا اچھی ہے، کبھی کہتا کہ وہاں کا دریا خطرناک ہے۔ پھر کہنے لگا: سعدی! مجھے ایک سفر اور درپیش ہے اگر وہ پورا ہو جائے تو پھر بقیہ زندگی قناعت کے ساتھ گوشہ نشین ہو کر گزاروں گا۔ میں نے پوچھا: وہ کون سا سفر ہے۔ کہا: فارس کی گندھک چین میں لے جانا چاہتا ہوں کیوں کہ سنا ہے اس کی وہاں بہت قیمت ہے، اور چینی گلاس روم میں لے جا کر فروخت کروں گا اور دیبائے رومی ہندوستان میں اور فولادِ ہندی حلب میں اور حلبی شیشہ یمن میں اور یمنی چادر فارس میں؛ اس کے بعد میں سفر ترک کر کے ایک دکان میں بیٹھ جاؤں گا۔ اب بھی ترکِ دنیا کا ارادہ نہیں دکان ہی میں بیٹھنے کی نیت ہے۔ غرض اس قسم کا خیالی پلاؤ پکاتا رہا۔ اخیر میں سعدیؒ سے کہا کہ آپ بھی کچھ اپنی دیکھی اور سنی ہوئی باتیں سنائیں۔ سعدی نے جواب دیا: ؎

آں شنید ستی کہ در صحرائے غور | بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشمِ تنگ دنیا دار را | یا قناعت پر کند یا خاکِ گور

ترجمہ: تو نے غور کے جنگل کا قصہ سنا ہو گا کہ ایک تاجر کا سامان سواری سے گر گیا۔ وہ بولا کہ دنیا دار حریص کی آنکھ کو یا تو قناعت بھرتی ہے یا قبر کی مٹی۔

واقعی دنیادار کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی، بس مر کر ہی ختم ہوتی ہے۔ حدیث میں بھی آیا ہے کہ انسان کی حرص کے شکم کو مٹی ہی بھر سکتی ہے:

وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ

اس طولِ امل اور فضول لایعنی خیالات سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ صبح آوے تو شام کی فکر نہ کرو اور شام ہو تو صبح کی فکر نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو اہلِ قبور میں سے شمار کرو یعنی یہ سمجھ لو کہ گویا آج ہی کا تھوڑا سا وقت زندگی کا باقی ہے۔ (پسندیدہ واقعات:۷۶تا۷۷)

شاہ شجاع کرمانی رحمہ اللہ کی لڑکی کا بے مثال زہد

ایک بزرگ شاہ شجاع کرمانی رحمہ اللہ کا واقعہ ہے۔ وہ بھی سلطنت چھوڑ کر درویش بن گئے تھے مگر ان کی عزت وجاہ، ملوک وسلاطین، علما وصلحا میں بہت زیادہ تھی۔ ان کی ایک لڑکی جوان تھی اور یہ چاہتے تھے کہ کسی دین دار آدمی سے اس کا نکاح کر دیں۔ اس زمانہ میں دینداری کی بڑی علامت احسان الصلوٰۃ تھی۔ یعنی نماز کو پورے آداب اور خشوع کے ساتھ اس طرح ادا کرنا کہ گویا خدا کو دیکھ رہا ہے یا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

شاہ شجاع نیک صالح آدمی کی تلاش میں تھے۔ ایک روز مسجد میں ایک نوجوان کو دیکھا کہ اچھی طرح خشوع خضوع سے نماز پڑھ رہا ہے۔ اسی وقت ارادہ کر لیا کہ اس سے نکاح کریں گے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اس کے پاس جا کر سلام کیا اور حال پوچھا کہ کہاں کے رہنے والے ہیں، کیا خاندان ہے۔ معلوم ہوا کہ شریف آدمی ہیں غریب اور مفلس۔

شاہ شجاع نے اس سے پوچھا: آپ کی شادی کہیں ہو گئی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: اجی میں ایک بہت غریب اور مفلس آدمی ہوں مجھے کون اپنی لڑکی دینے لگا ہے۔ انہوں نے کہا: ناامید کیوں ہوتے ہو؟ تم نے کہیں کوئی پیغام بھی دیا ہے؟ اس نے کہا کہ جب مجھے معلوم ہے کہ میرا پیغام رد کیا جائے گا تو کیوں خواہ مخواہ پیغام دے کر رسوا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ اچھا تم اس پر راضی ہو کہ شاہ شجاع کرمانی کی لڑکی کی شادی تم سے ہو جائے۔ نوجوان نے کہا: حضرت! کیوں میرے ساتھ دل لگی کرتے ہیں، کہاں میں اور کہاں شاہ شجاع۔ نام بھی لوں گا تو پٹوں گا۔ اب انہوں نے ظاہر کر دیا کہ میں ہی شاہ شجاع کرمانی ہوں اور اپنی

لڑکی کا عقد تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر بھی نوجوان نے کہا کہ آپ اگر راضی ہیں تو کیا ضروری ہے کہ لڑکی راضی ہو جائے۔ فرمایا کہ میں اس سے دریافت کر چکا ہوں وہ راضی ہے۔ اب تو نوجوان نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میں کہاں اس قابل تھا۔

شاہ شجاع نے اسی وقت نکاح پڑھایا اور اسی وقت کوئی چادر یا برقعہ اوڑھا کر لڑکی کو اس نوجوان کے گھر لے گئے جو ایک شکستہ مکان تھا، کسی سامان کا نام ونشان نہ تھا۔ لڑکی دروازے کے اندر داخل ہوئی تو اپنے والد شاہ شجاع سے کہا کہ ابا جان! آپ نے مجھے کہاں ڈبو دیا ہے۔ نوجوان نے سن کر کہا: دیکھیے! میں آپ سے کہتا تھا کہ لڑکی میری ایسی تنگ دستی کی حالت پر کیسے راضی ہو سکتی ہے۔ اب تو لڑکی خود بولی کہ آپ نے کیا سمجھا ہے کہ میں نے اپنے والد صاحب سے کس چیز کی شکایت کی ہے؟

بات یہ ہے کہ میرے والد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارا نکاح ایک زاہد شخص کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں، میں اس پر راضی ہو گئی۔ مگر جب میں آپ کے گھر میں داخل ہوئی تو ایک گھڑے پر باسی روٹی رکھی ہوئی نظر آئی۔ میں نے اس کو زہد کے خلاف سمجھا کہ روٹی باسی بچا کر رکھی جائے اسی لیے والد صاحب سے شکایت کی مجھ کو کہاں ڈبو دیا، یہ آدمی زاہد نہیں ہے باسی روٹیاں اٹھا کر رکھتا ہے۔ اس نوجوان نے کہا: میرا آج روزہ ہے خیال یہ تھا کہ شام کو افطار کے لیے باسی روٹی اٹھا کر رکھ دوں کہ تکلیف نہ ہو۔ لڑکی نے کہا کہ میرے نزدیک یہی تو زہد و توکل کے خلاف ہے، جس کے لیے روزہ رکھا ہے اس پر اطمینان نہیں کہ وہ افطاری بھی دے گا۔ سبحان اللہ!

فائدہ: اس حکایت سے یہ غرض نہیں ہے کہ عورتوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا جائے لیکن اس کے سننے سے انہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مشاہدہ ہو جائے گا۔ اس میں عقل کام نہیں دیتی، جب باطن کی دولت عطا نہ ہو۔ یہ زمانہ ضعف کا ہے، سالکین کے لیے سہولت بہم پہنچانے کا ہے، بقدر ضرورت سامان کر لینا خلاف زہد نہیں مگر اس اعلیٰ زہد والوں سے کم از کم محبت وعقیدت تو رکھنی چاہیے۔

(پسندیدہ واقعات: ۲۱۵ تا ۲۱۷)

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے کیسے راحت حاصل کی؟

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ جو محدّث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، صوفی بھی ہیں وہ فرماتے ہیں:

میں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ مالداروں کے ساتھ گزارا (خود بھی مالدار تھے)۔ صبح سے شام تک مالداروں کے ساتھ رہتا تھا، لیکن جب تک مالداروں کی صحبت میں رہا، مجھ سے زیادہ غمگیں انسان کوئی نہیں تھا کیوں کہ جہاں جاتا یہ دیکھتا کہ اس کا گھر میرے گھر سے اچھا ہے، اس کی سواری میری سواری سے اچھی ہے، اس کا کپڑا میرے کپڑے سے اچھا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر میرے دل میں کڑھن پیدا ہوتی تھی کہ مجھے تو ملا نہیں اور اس کو مل گیا۔ لیکن بعد میں دنیاوی حیثیت سے جو کم مال والے تھے، ان کی صحبت اختیار کی اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا تو فرماتے ہیں کہ فاستر حتُ یعنی میں راحت میں آگیا، اس واسطے کہ جس کو بھی دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں تو بہت خوشحال ہوں، میرا کھانا بھی اس کے کھانے سے اچھا ہے، میرا کپڑا بھی اس کے کپڑے سے اچھا ہے، میرا گھر بھی اس کے گھر سے اچھا ہے، میری سواری بھی اس کی سواری سے اچھی ہے، اس واسطے میں اب الحمد للہ راحت میں آگیا ہوں۔

(اصلاحی خطبات:۶۸تا۶۹)

ایران کے بادشاہ کا قالین

ایران کے بادشاہ کے بیٹھنے کا جو قالین تھا وہ دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی تھا، وہ بھی مالِ غنیمت میں لایا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ کیا کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔ کسی نے کہا کہ جب باہر کے ملکوں کے سفیر آئیں تو اس کو بچھا کر اس پر تشریف رکھیں۔ کسی نے کہا کہ آپ اس پر بیٹھ کر اجلاس کیا کریں۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ سب کے جذبات دیکھ لیے کہ ان کی نظر میں یہ قالین کتنا عزیز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قینچی منگا کر اس کو کاٹ کر صحابہ میں تقسیم فرما دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں جو قالین کا ٹکڑا آیا وہ چالیس ہزار میں فروخت ہوا تھا۔

یورپی مؤرخین اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ فضول حرکت کی کہ اتنے قیمتی قالین کو بے کار کر دیا۔ حالاں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں کچھ اور ہے جہاں تک دوسروں کی رسائی نہیں۔ ان حضرات کے نزدیک یہ سب چیزیں بے حقیقت تھیں اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عملی طور پر دکھلا دیا۔

زہد کے متفرق واقعات

مالک بن دینار رحمہ اللہ اپنے گھر میں چٹائی، قرآن مجید اور لوٹے کے سوا کوئی چیز نہ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے ان کو ایک نیا آبخورہ دیا۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے وہ آبخورہ ایک دوست کو دیا اور کہنے لگے: اے دوست! یہ تم لے لو، اس نے میرے دل کو فکر میں مبتلا کر دیا ہے کہ کوئی اسے چرا نہ لے۔

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک دفعہ میں اپنے دوست کو ملنے گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں مارے بھوک کے اندر گھسی ہوئی ہیں۔ میں نے دو درہم نکالے اور اسے کہا: یہ لے لو اور ان سے اپنے کھانے کے لیے کچھ خرید لو جس سے تمہیں عبادت کی طاقت ہو جائے۔ اس نے انہیں لینے سے انکار کیا اور کہا: اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ مجھے کچھ کھائے پیے بغیر آج کی رات عبادت کی ہمت دے، اور میں ڈرتا ہوں کہ میں ان کو لے لوں اور وہ میرے پاس رہیں اور میں ان سے کوئی چیز خریدے بغیر مر جاؤں، حالاں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تھی تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے نہ کوئی دینار ملا تھا اور نہ درہم۔

سیدی شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو اپنے لیے ایک مضبوط مکان بنوا رہا تھا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے

أَتَبْنِيْ بَنَاءَ الْخَالِدِيْنَ وَإِنَّمَا مَقَامُكَ فِيْهَا لَوْ عَقَلْتَ قَلِيْلٌ
لَقَدْ كَانَ فِيْ ظِلِّ الْأَرَاكِ كِفَايَةٌ لِمَنْ كَانَ يَوْماً يَقْتَنِيْهِ رَحِيْلٌ

ترجمہ: "کیا تو دائمی رہنے والے کی طرح گھر بنواتا ہے حالاں کہ اگر تو غور کرے تو اس میں تیرا مقام بہت تھوڑا ہے۔ اس شخص کے لیے تو پیلو کے درخت کا سایہ ہی کافی ہے جس نے ایک دن کے بعد کوچ کرنا ہو۔"

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے عبد اللہ کو گوشت کھاتے دیکھا تو پوچھا: یہ کیا ہے؟ کہا: آج گوشت کھانے کو طبیعت چاہ رہی تھی۔ پہلے تو تنبیہ فرمائی پھر ارشاد فرمایا: كفى بالمرء سرفا ان يأكل كل ما اشتهاه یعنی "آدمی کے مسرف وفضول خرچ ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر وہ چیز کھایا کرے جو اس کا جی چاہے"۔ (منتخب کنز العمال: ۴/۴۰۰)

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی سیرت میں لکھتے ہیں وکان رضی اللہ عنہ لا یجمع فی سماطہ بین ادامین یعنی آپ کبھی دستر خوان پر دو قسم کا سالن جمع نہیں ہونے دیتے۔ ایک بار آپ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے پاس بطورِ تحفہ کچھ گوشت کا سالن بھیجا اور اس میں روغن زیتون بھی ڈال دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ دو طرح کا سالن میں نہیں کھایا کرتا۔ مطلب یہ کہ گھی بھی ایک مستقل سالن ہے اور گوشت بھی ایک سالن ہے تو دو سالن کی کیا ضرورت ہے؟

(طبقات کبریٰ للشعرانی جلد اول:۱۶، منتخب کنز العمال جلد ۴:۴۰۴، تاریخ الخلفاء:۹۹، تہذیب الاسماء للنووی : ۲/۶)

ایک بار کسی نے آپ کے پاس تازہ فربہ گوشت اور دودھ کھانے کے لیے پیش کیا۔ فرمایا: ان میں سے ہر ایک مستقل سالن ہے۔ میں دو سالن ایک وقت میں نہیں کھا سکتا۔ یہ کہہ کر آپ نے کھانے سے انکار کر دیا۔ (سیرت عمر لابن الجوزی:۱۱۸)

یہ ساری سخت کوشی، زہد، پرہیز گاری اور قناعت صرف اپنی ذات تک محدود تھی یا پھر اہل و عیال تک۔ لیکن اپنے عاملوں کے لیے آپ اچھی خوارک کا انتظام کرتے تھے۔ علامہ شاطبی رحمہ اللہ اس کی توجیہ میں لکھتے ہیں: ان الحالة التی هو علیها لو كان غیره علیها لهان فی نفوس الناس ولم یحترموه چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک طرف تو خود نمک روٹی پر گزارہ کیا لیکن دوسری طرف عمّال کے لیے روزانہ نصف بکری کا راشن مقرر کیا تھا تا کہ عمال اور حکام کی عزت افزائی ہو اور لوگوں کے قلوب میں ان کی عظمت جاگزیں ہو جائے اور ان کے ذریعہ انتظام مملکت درست و محفوظ رہے۔

(ایام خلافت راشدہ:۸۴تا۸۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معمولی خرچ کے ساتھ سفر حج بھی کیا۔ مکہ سے مدینہ تک آنے جانے میں آپ نے کل سولہ دینار خرچ کیے اور احساس یہی تھا کہ ہم نے اس سفر میں بہت خرچ کیا۔

کھانے اور کپڑے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی کفایت شعاری اور سادگی کا بہت اہتمام رکھتے تھے۔ مستدرک حاکم میں روایت ہے کہ جمعہ کے روز منبر پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیکھا گیا، جو موٹا تہبند آپ پہنے ہوئے تھے اس کی قیمت چار پانچ درہم یعنی سوا روپے سے زیادہ نہ تھی۔

علامہ شعرانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عدن کا بنا ہوا ایک موٹا تہبند آپ کے استعمال میں رہتا جس کی

قیمت چار، پانچ درہم سے زیادہ نہ تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ خلیفہ تھے اور یہی حال کھانے کا تھا۔ لوگوں کو بہترین کھانا کھلاتے اور خود گھر جا کر روز مرہ کا کھانا یعنی روٹی کو سرکہ یا زیتون کے تیل سے کھاتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سادہ زندگی تو مشہور ہی ہے۔ ایک واقعہ علام ابو عبید قاسم ابن سلام نقل کرتے ہیں کہ موسم سرما میں وہ ایک بہت پرانی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہے تھے۔ کسی نے اعتراض کیا۔ فرمایا: بس یہی موٹی اور سادی چادر مجھے میسر ہو سکتی ہے اس کے علاوہ کوئی دوسری چادر میرے گھر میں نہیں۔

علامہ شعرانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کسی نے کہا: آپ کیوں جاڑے سے کانپ رہے ہیں : الا تاخذ کساء من بیت المال بیت المال سے کوئی کمبل کیوں نہیں لے لیتے؟ فرمایا: لاانقص المسلمین من بیت مالھم شیئا لی "یعنی میں اپنے لیے مسلمانوں کے بیت المال سے کسی چیز کو کم نہیں کرتا۔

(خلافت راشدہ:۸۹)

ہمارے لیے نسخۂ اکسیر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عجیب ارشاد فرمایا جو ہمارے لیے نسخۂ اکسیر ہے۔ فرمایا : "دنیا کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھو اور اپنے سے کمتر حیثیت والوں کے ساتھ رہو، ان کی صحبت اختیار کرو اور ان کے حالات کو دیکھو اور دین کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے اونچے آدمی کو دیکھو اور ان کی صحبت اختیار کرو۔"

اس لیے کہ جب دنیا کے معاملے میں اپنے سے کمتر لوگوں کو دیکھو گے تو جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہیں ان نعمتوں کی قدر ہو گی کہ یہ نعمت اس کے پاس نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے دے رکھی ہے اور اس سے قناعت پیدا ہو گی، شکر پیدا ہو گا اور دنیا طلبی کی دوڑ کا جذبہ ختم ہو گا۔ اور دین کے معاملے میں جب اوپر والوں کو دیکھو گے کہ یہ شخص تو دین کے معاملے میں مجھ سے آگے بڑھ گیا تو اس وقت اپنی کمی کا احساس پیدا ہو گا۔

حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کا واقعہ

حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کے بارے میں مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ واقعہ جو آگے لکھوا رہا ہوں میرے سامنے کا تو نہیں مگر میرے عزیز مرحوم نے کئی بار سنایا کہ وہ دہلی کی کسی مسجد میں امام تھے اور چچا جان (مولانا محمد الیاس قدس سرہ) کا ابتدائی دور تھا۔ وہ ایک مرتبہ رمضان میں یہ سمجھ کر کہ چچا جان دِلی کے پیر ہیں، رمضان میں بہت فتوحات ہوتی ہوں گی، وہ ظہر کے بعد عصر کے قریب نظام الدین پہنچے۔ چچا جان نور اللہ مرقدہ کا معمول عصر کے بعد سے مغرب تک ذکر بالجہر کا تھا۔ عین افطار کے وقت خدام سے پوچھتے کہ کوئی چیز افطاری کو ہے؟ جو ماحضر ہوتا خدام پیش کر دیتے اور جو کچھ کھانا ہوتا مغرب کے وقت ہی نوش فرمالیتے، وہی افطاری ہوتی تھی اور وہی افطاری کے بعد کا کھانا۔

جب افطار کا وقت ہو گیا اور چچا جان نے حسب معمول پوچھا کہ لاؤ بھائی! کچھ ہے؟ کسی نے کہا کہ حضرت! کچھ اور تو ہے نہیں کل کے گولر بچے ہوئے ہیں۔ چچا جان نے فرمایا کہ واہ وا، واہ وا، ضرور لاؤ۔ میرے عزیز بھی شریک ہوگئے۔ چچا جان نے چار پانچ گولر کھا کر اور پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا، مغرب کی نماز پڑھائی اور نفلوں کے اندر مشغول ہو گئے۔ عشا کی اذان تک حسب معمول نفلیں پڑھتے رہے، اذان کے قریب فارغ ہو کر تھوڑی دیر لیٹے، پھر عشا اور تراویح بڑے اطمینان سے پڑھائیں۔ وہ غریب عزیز سوچتا ہی رہا کہ کھانے کا نمبر کب کو آئے گا۔ نظام الدین کے رہنے والے طلباء اپنا کھانا خود پکاتے تھے اور پکانے کے بعد ایک ایک، دودو روٹی ان کو تقسیم ہو جاتی تھی، وہ اپنے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کھالیتے تھے۔ چچا جان کو تو کیا احساس ہوا ہو گا مگر ان عزیز نے رات بڑی مشکل سے گزاری۔ سحر کے وقت پھر وہی افطار والا منظر تھا اور وہی گولروں کا لوٹا تھا اور وہی سحری اور وہی شکر۔

(آپ بیتی:۴۵)

......☆......☆......☆......

حسد کا بیان

حسد ایک خطرناک اور تباہ کن روحانی بیماری ہے جس کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی بربادی ہے۔

حسد کے معنیٰ: حسد ایک ایسی ذہنی کیفیّت کا نام ہے جس کی رو سے یہ تمنا کی جاتی ہے کہ دوسرے پر اللہ تعالیٰ کا جو کچھ دینی یا دنیوی فضل و کرم اور انعام ہوا ہے، وہ اس سے چھن کر مجھے مل جائے اور اگر مجھے نہ بھی ملے تو کم از کم اس سے ضرور چھن جائے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو علم و فضل یا مال و دولت اور عزت و شہرت یا صحت یا منصب و اقتدار یا کوئی اور دینی یا دنیوی نعمت دی ہے، اب دوسرے شخص کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ نعمت اس کو کیوں ملی؟ وہ اس نعمت کو دوسرے کے لیے پسند نہیں کرتا اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے، یا اگر مجھے نہیں بھی ملتی تو کم از کم اس کے پاس تو نہ رہے۔ اس لیے جب اُس شخص پر کوئی مصیبت آتی ہے یا اس کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور اگر اس کو نعمت میں ترقی ملتی رہتی ہے تو اس کے دل میں جلن ہوتی ہے کہ یہ کیوں آگے بڑھ رہا ہے۔

غبطہ اور رشک

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ دوسرے کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر صرف اس کی خواہش کرنا حسد نہیں، بلکہ اس کو عربی میں "منافسہ" یا "غبطہ" اور اردو میں رشک کہا جاتا ہے۔ رشک یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت دیکھ کر دل میں یہ خواہش پیدا ہو کہ جس طرح اس شخص پر اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہوا ہے اور اس کو یہ نعمت ملی ہے، ایسی نعمت اللہ تعالیٰ مجھے بھی عطا فرمائے۔

رشک کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف کسی نعمت کے حاصل کرنے کی خواہش اور اس کے حاصل کرنے کی کوشش ہو، لیکن اس کے ساتھ اس کے دل کے کسی گوشے میں بھی یہ تمنا نہ ہو کہ یہ نعمت دوسرے سے چھن کر مجھے ملے۔ یہ رشک کوئی بد اخلاقی نہیں بلکہ دینی اور اُخروی امور میں پسندیدہ ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ آخرت میں جنت کی نعمتیں بیان کر کے فرماتا ہے کہ: وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ

"اور یہ چیز ہے کہ جس کی رغبت کرنے والوں کو رغبت کرنی چاہیے"۔ (سورۃ التطفیف: آیت ۲۶)

مطلب یہ کہ جنت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی طلب میں طالبوں کو سر گرم ہونا چاہیے۔ اس میں ایمان والوں کو تشویق و ترغیب ہے کہ مسلمانوں کو خیر اور آخرت کے امور میں حریص ہونا چاہیے۔ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ " تم مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور ایسی جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کے برابر ہے"۔ (سورۃ الحدید: آیت ۲۱)

اس آیتِ کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کا نصب العین اپنے رب کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہونی چاہیے اور ایمانداروں کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور اس کی جنت کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ دینی امور میں رشک اور مسابقت کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَاحَسَدَ اِلَّا فِیْ اِثْنَتَیْنِ رَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ مَالًا فَسَلَّطَہٗ عَلٰی ھَلَکَتِہٖ فِی الْحَقِّ

وَرَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ الْحِکْمَۃَ فَھُوَ یَقْضِیْ بِھَا وَیُعَلِّمُھَا

"دو اشخاص کے بارے میں حسد کرنا درست ہے؛ ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور پھر اسے راہِ حق میں خرچ کرنے کی توفیق عنایت فرمائی اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت دی تو وہ اس علم و حکمت کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے"۔

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: کتاب العلم)

اس حدیث میں حسد سے مراد وہی غبطہ اور رشک ہے جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

دنیوی امور میں زیادہ رشک نہیں ہونا چاہیے

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ رشک دینی امور، علم و حکمت اور سخاوت وغیرہ میں تو پسندیدہ ہے مگر دنیوی امور میں زیادہ پسندیدہ نہیں۔ اگرچہ دنیوی امور میں بھی رشک حرام و ناجائز تو نہیں لیکن اس کا زیادہ استحضار اور سوچنا پسندیدہ نہیں، کیوں کہ یہی چیز انسان کو بالآخر حدودِ حسد میں داخل کرتی ہے۔

حسد کا حکم: حسد کرنا شریعتِ مطہرہ میں حرام ہے اور اس سے بچنا فرض ہے۔

حسد کے درجات

ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک حسد کے تین درجات ہیں:

۱۔ حسد کا پہلا اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دل میں یہ خواہش ہو کہ ایسی نعمت مجھے حاصل ہو جائے جو دوسرے کو حاصل ہے۔ اب اگر اس کے پاس رہتے ہوئے مجھے مل جائے تو بہت اچھا ہے ورنہ اس سے چھن کر مجھے مل جائے۔ اس صورت میں اس (حاسد) کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کو حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چوں کہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھینی نہ جائے اس کو نہیں مل سکتی، اس لیے اس وقت اُس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے چھن جائے اور اُس کو مل جائے۔ حسد کی یہ صورت بھی ناجائز اور ممنوع ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ " اور تم ایسی چیز کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی"۔

(سورۃالنساء: آیت ۳۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہٖ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں۔

۲۔ حسد کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ دل میں یہ خواہش ہو کہ جو نعمت دوسرے کو ملی ہوئی ہے وہ اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے۔ حسد کا یہ درجہ پہلے درجے کی نسبت زیادہ مذموم ہے کیوں کہ پہلے درجے میں مقصود بالذات نعمت کا حاصل ہونا تھا، دوسرے کا محروم کرنا مقصود نہ تھا۔ اور اس درجہ میں تو پہلے ہی سے یہ خواہش ہے کہ وہ اس نعمت سے محروم ہو جائے اور اس کے بجائے مجھے مل جائے۔ چوں کہ یہاں نعمت کا حصول اور دوسرے کی محرومی دونوں بالذات مقصود ہیں، اس لیے حسد کا یہ درجہ پہلے درجے کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے۔

۳۔ حسد کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ دل میں یہ خواہش ہو کہ جو نعمت دوسرے کو ملی ہوئی ہے، وہ اس سے کسی طرح چھن جائے اور اس نعمت کی وجہ سے جو مقام و اعزاز وغیرہ اس کو حاصل ہوا ہے وہ اس سے محروم ہو جائے۔ پھر چاہے وہ نعمت مجھے ملے یا نہیں۔ یہ حسد کا سب سے زیادہ ذلیل ترین، خبیث ترین اور تباہ کن درجہ ہے، کیوں کہ اس میں اصل مقصود دوسرے کو نعمت سے محروم کرنا ہوتا ہے۔

حسد کے اسباب

ا۔ حسد کا پہلا سبب بغض، کینہ اور دشمنی ہے۔ کسی شخص کے ساتھ دشمنی ہو یا کسی کے لیے دل میں بغض و کینہ پیدا ہو گیا ہو، تو ایک دشمن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس پر اللہ تعالیٰ کا کوئی فضل و احسان ہوتا ہے تو اس کو پسند نہیں کرتا اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح اس سے یہ نعمت چھن جائے۔

۲۔ دوسرا سبب حسب و نسب اور ذاتی فخر کا غلط خیال ہوتا ہے۔ بعض اقوام یا خاندان ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ملک و قوم میں معزز سمجھے جاتے ہیں، ان میں قیادت، سیادت اور سرداری چلی آرہی ہوتی ہے، ایسا خاندان یا قوم عزت، سیادت و سرداری کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھنے لگتی ہے۔ اس لیے جب وہ کسی غیر شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ بلند منصب اور عزت والے مقام پر پہنچ گیا ہے تو یہ منصب و مقام اس خاندان یا قوم کی آنکھوں میں کانٹا بن جاتا ہے۔ وہ اس ترقی اور بلندی کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب و مقام کسی طرح اس سے چھن جائے، جیسا کہ عرصہ دراز سے بنی اسرائیل کے خاندان میں نبوت چلی آرہی تھی۔ بالآخر جب یہ عظیم منصب بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسماعیل علیہ السلام یعنی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مل گئی تو ان کے علما اور لیڈروں کی اکثریت حسد کی آگ میں جل بھن گئی۔ چناں چہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ''کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں اس پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے''۔ (سورۃ النساء: آیت ۵۴)

اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل اور یہود کی دشمنی کا راز بتلایا گیا ہے کہ ان کو مسلمانوں کے ساتھ جو دشمنی اور بغض و کینہ ہے یہ سب کچھ اس حسد کا نتیجہ ہے جو یہ مسلمانوں سے رکھتے ہیں۔ ان کو یہ غم و غصہ ہے کہ نبوت تو ان کے خاندان کا حصہ تھی اور دین کے اجارہ دار تو وہ تھے، دوسرے کسی شخص کو دین کی نمائندگی کیسے مل گئی اور یہ ان کے خاندان سے نکل کر بنی اسماعیل علیہ السلام کے اندر کیسے چلی گئی؟

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَکُمْ مِّنْ بَعْدِ اِیْمَانِکُمْ کُفَّارًا ۚ

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْحَقُّ

”بہت سے اہلِ کتاب دل سے چاہتے ہیں کہ تمہارے مومن ہو جانے کے بعد وہ کسی طرح تم کو کافر (دینِ حق کے منکر) بنادیں اپنے حسد کی وجہ سے، باوجودیکہ حق ان کے سامنے واضح ہو چکا ہے“۔

(سورۃ البقرۃ: آیت ۱۰۹)

مطلب یہ ہے کہ بہت سے اہلِ کتاب اور یہودیوں کی یہ دلی آرزو ہے کہ کسی طرح تم کو اسلام سے پھیر کر پھر کافر بنادیں حالاں کہ ان پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کا دین، ان کی کتاب برحق اور سیدنا محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں، لیکن پھر بھی یہ کرتوت اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے سینوں میں حسد کی آگ سلگتی رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ خود بھی دینِ حق سے محروم ہیں اور دوسروں کے بارے میں بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ بھی اس عظیم نعمت سے محروم ہو جائیں۔

۳۔ حسد کا تیسرا سبب کسی کا کسی کے حلقۂ اثر سے یا اس کی جماعت سے نکل جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کا مطیع و فرمانبردار اور زیرِ اثر، یا کسی جماعت کا کارکن اور اس کے زیرِ اثر ہوتا ہے، اور پھر وہ کسی وقت کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقہ اطاعت اور فرمانبرداری سے نکل جاتا ہے یا اس کی جماعت سے نکل جاتا ہے تو ایسی صورت میں وہ شخص یا جماعت یہی چاہتی ہے کہ کسی طرح اس کا یہ شرف اور اس کی یہ عزت و شہرت ختم ہو جائے۔

۴۔ حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ جس شخص کو لوگ اپنے غلط خیال میں مال یا خاندان کے لحاظ سے معمولی سمجھتے ہیں، اور اس کو کوئی بڑی عزت اور شہرت کا مقام و منصب مل جائے تو لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اس کے اس شرف اور اس مقامِ عزت کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ مقام اس سے چھن جائے، جیسا کہ بنی اسرائیل طالوت کو اپنی قوم میں ایک معمولی آدمی سمجھتے تھے جبکہ ان کے نبی شموئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے طالوت کو ان کا بادشاہ اور سپہ سالار مقرر فرمایا تو انہوں نے ان کے لیے بادشاہت اور سپہ سالاری کو صرف اس بنیاد پر پسند نہیں کیا کہ وہ مال و دولت وغیرہ جیسے دنیوی اسباب کی رو سے معمولی آدمی سمجھے جاتے تھے، چناں چہ انہوں نے کہا کہ: قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ” اس کو ہمارے اوپر بادشاہی کیسے مل سکتی ہے حالاں کہ اس کے مقابلے میں ہم بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں اور اس کو

زیادہ مال و دولت بھی حاصل نہیں"۔ (سورۃ البقرۃ: آیت ۲۴۷)

یہاں طالوت کی بادشاہی پر بنی اسرائیل کا یہی اعتراض تھا کہ وہ چھوٹے خاندان کا آدمی ہے اور اس کے پاس مال و دولت کی فراوانی بھی نہیں، اس لیے ایسے شخص کا ہم پر بادشاہی کرنے کا کوئی حق نہیں بنتا، اس وجہ سے وہ اس نعمت کو اس کے لیے پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے اور بڑے خاندان اور مال و دولت والے کو مل جائے۔

۵۔ حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ دو اشخاص کا مقصد ایک ہی چیز کا حصول ہو۔ اور ان میں سے ایک دیکھے کہ دوسرے کو اس کے حصول میں کامیابی ہو رہی ہے تو وہ اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے، مثلاً: ایک آدمی کی جب دو بیویاں ہوں، تو ہر ایک چاہتی ہے کہ شوہر مجھ سے زیادہ محبت کرے۔ اس لیے اکثر یہی ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی بدخواہ ہوتی ہیں۔ پھر جب کسی ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو دوسری کا حسد اور بڑھ جاتا ہے۔ یہی حال ایک حلقہ میں الیکشن کے دو امیدواروں کا اور ایک ہی گاہک پر دو تاجروں کا اور ایک ہی لڑکے یا لڑکی کے رشتہ کے دو امیدواروں کا ہوتا ہے۔ اسی طرح جو بھی دو اشخاص کسی ایک چیز کو حاصل کرنا چاہتے ہوں تو دونوں کے درمیان حسد پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور سیادت و شہرت کی حد سے بڑھی ہوئی بھوک ہے۔ کسی شخص کو جب کسی میدان میں عزت و شہرت حاصل ہو اور اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ اس عزت و شہرت اور سیادت و سرداری میں اس کا شریک ہو گیا ہے تو یہ بات اس کو سخت گراں گزرتی ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف اور شہرت و سیادت میں دوسرا شخص اس کے ساتھ برابر ہو رہا ہے کسی طرح یہ شرف اور مقامِ عزت اس سے چھن جائے تاکہ اس میدان میں کوئی اس کے برابر نہ رہے، اور اس میدان میں صرف میری ہی سیادت، سرداری، امتیازی حیثیت اور سب سے زیادہ شہرت قائم رہے۔

ایک علاقے کے دو ہم پلہ علماء، دو خوانین، دو سرداروں اور پیروں وغیرہ کے درمیان جو حسد ہوتا ہے وہ اکثر اسی جاہ پرستی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک عالم کسی تاجر سے اور ایک تاجر کسی عالم و پیر وغیرہ سے حسد نہیں کرے گا بلکہ ہر لائن والا اپنی ہی لائن والوں کے ہم پلہ لوگوں سے

حسد کرتا ہے۔

۷۔ حسد کا ساتواں سبب نفس کی خباثت ہے۔ بعض لوگ اپنی فطرت کو اس قدر مسخ کر دیتے ہیں کہ وہ ہر کسی کے بدخواہ ہوتے ہیں۔ جب بھی کسی پر ذلت و رسوائی یا مصیبت کی حالت آجاتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں اور جب بھی کسی کو کوئی نعمت ملی ہوئی دیکھتے ہیں تو انہیں ناگواری ہوتی ہے اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس سے یہ نعمت زائل ہو جائے۔ حسد کی اس قسم میں صرف حاسد کی خباثتِ نفس ہی کام کرتی ہے اور اسی وجہ سے وہ ہر شخص سے حسد کرتا ہے۔

حسد کے اسباب اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔

اسبابِ حسد کا خلاصہ

اگر حسد کے اسباب کو سوچا جائے تو یہ سمٹ کر تین ہو جاتے ہیں:

۱۔ دشمنی اور عداوت۔

۲۔ دنیوی مال و جاہ اور منصب کی محبت۔

۳۔ تکبر کی وجہ سے نفس کا انتہائی درجہ خبیث ہونا۔

ظالم و فاسق سے زوالِ نعمت کی خواہش حسد نہیں

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ جو نعمت مثلاً مال و دولت یا منصب و اقتدار کسی ظالم اور فاسق کو ملے اور وہی نعمت (مال و دولت اور اقتدار وغیرہ) اس کے فسق و ظلم کا باعث بنے تو ایسی نعمت کا زوال چاہنا حسد نہیں، بلکہ یہ دراصل فسق و ظلم کے خاتمہ کا چاہنا ہے کہ ظلم و فسق مٹ جائے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام بالآخر اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فرعون اور اس کے ساتھ ظلم و فسق میں شریک مددگار فرعونیوں کے حق میں بددعا کی۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ" اور موسیٰ (علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے دعا کی کہ اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی

زندگی میں رونق (شان وشوکت) اور مال واسباب دیا ہے، اے ہمارے رب کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں۔ اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو"۔ (سورہ یونس: آیت ۸۸)

مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار! فرعون اور اس کے مددگاروں کو تو نے دنیا کی زیب و زینت، شان وشوکت اور مال واسباب سے مالا مال کر دیا ہے، یہ سب کچھ تو ان کو اس لیے دیا گیا تھا کہ وہ اس کو حق کی خاطر خیر کے کاموں میں خرچ کریں اور ان نعمتوں کی وجہ سے منعم حقیقی اللہ رب العالمین کو پہچانیں اور شکر گزار بندے بنیں، مگر یہ شان و شوکت اور مال واسباب آخر کار شکر گزاری کے بجائے سرکشی اور فساد کا سبب بنے اور انہوں نے ان نعمتوں کو صرف اس لیے استعمال کیا کہ ان کے ذریعے ظلم و فسق پھیلائیں اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے دور کریں اور ان کو راہِ حق سے بھٹکائیں۔ ہمارے پروردگار! ان کو مزید مہلت نہ دے کہ تیری مخلوق کو مزید گمراہ کریں۔

پیغمبر کی بد دعا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کی ترجمان ہوتی ہے

یہاں اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کے پیغمبر کی بد دعا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا اعلان و ترجمان ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام مدت دراز تک فرعون اور اس کے ساتھیوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہے، ان کے سامنے دینی دعوت پیش کرتے رہے اور آسمان وزمین وغیرہ کی قدرتی نشانیاں اور دلائلِ نبوت دکھلاتے رہے، حتیٰ کہ ان کو خود بھی یقین ہو گیا کہ یہ حق ہے اور ان پر حق کا حق ہونا پوری طرح واضح کر دیا، لیکن پھر بھی وہ تکبر اور ضد و عناد کی وجہ سے ظلم سے باز نہیں آئے تو بالآخر وہ فرعون اور اس کی قوم سے مایوس ہو گئے۔

یہی وہ مرحلہ ہے جس کے بعد قومیں تباہ و برباد ہو جاتی تھیں۔ ایسے وقت میں نبی جو بد دعا کرتا ہے وہ عین اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا اعلان ہوتی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی جائے۔ اب چوں کہ ان کے اندر قبولِ حق کی ادنیٰ صلاحیت بھی باقی نہیں رہی ہے اس لیے اس کے بعد بھی اگر وہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر باقی رہیں تو دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کے اندر سے کسی خیر کے پیدا ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جس میں حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ و

السلام نے اپنی قوم کے ظالم اور متکبر لوگوں کے لیے ان الفاظ میں بد دعا کی تھی:

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝

"اور نوح (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) نے دعا کی: اے میرے رب! تو زمین پر (ان) کافروں میں سے کسی کو نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان سے جو بھی پیدا ہو گا وہ بدکار اور سخت (ناشکرا) کافر ہی ہو گا"۔ (سورۃ النوح: آیت ۲۶۔۲۷)

نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بد دعا کب کی؟ اس کا جواب بھی قرآن مجید میں موجود ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝

"اور نوح (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی طرف وحی کی گئی کہ اب تمھاری قوم میں سے ہر گز کوئی ایمان نہیں لائے گا سوائے اس کے کہ جو (اب سے پہلے) ایمان لا چکا ہے، پس تم ان کاموں پر غمگیں نہ ہو جو وہ کر رہے ہیں اور ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق تم کشتی بناؤ اور ظالموں کے حق میں مجھ سے (کوئی) بات نہ کرو، بے شک یہ لوگ غرق ہو کر رہیں گے"۔ (سورہ ہود: آیت ۳۶۔۳۷)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر ایمان لانے اور حق کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی وہ ایمان لا چکے ہیں، اب کوئی ایمان لانے والا باقی نہیں رہا اور وہ جو کرتوت کر رہے ہیں اس سے غمگیں اور دل شکستہ نہ ہو، اب سنتِ الٰہی کے مطابق ان کے فیصلے کا وقت آ چکا ہے اور اب یہ لوگ غرق ہو کر رہیں گے۔

ظلم و فسق مٹانے کی علامات

خلاصہ یہ ہوا کہ جہاں صرف ظلم و فسق کو ہی مٹانا مقصود ہو، کسی کی بدخواہی مدِ نظر نہ ہو، مثلاً ظالم، فاسق حکمران سے اقتدار چھن جانے کی خواہش کرنا، یا ایسے شخص سے مال اور شان و شوکت چھن جانے کی آرزو کرنا جو اپنے مال اور شان و شوکت کا بے جا استعمال کرتا ہو اور اس کے ذریعے لوگوں پر ظلم

ڈھاتا ہو، یا اس کے ذریعے بے حیائی پھیلاتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے دور کرتا ہو اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے دین میں رکاوٹیں ڈالتا رہتا ہو تو ایسے شخص سے مال ودولت، شان و شوکت اور اقتدار وغیرہ کے چھن جانے کی آرزو کرنا حسد نہیں، بلکہ مخلوقِ خدا کی خیر خواہی اور ظلم وفسق کے مٹ جانے کی خواہش ہے، کیوں کہ یہی مال ودولت اور شان وشوکت اس کے ظلم وفسق کا سبب بنا ہوا ہے، جبکہ حسد وہ ہوتا ہے جس میں اپنی خیر خواہی اور دوسرے کی بدخواہی صرف اس لیے مراد ہوتی ہے کہ اس کو جو نعمت حاصل ہے وہ اس سے چھن کر مجھے مل جائے اور اگر مجھے نہ بھی ملے تو نہ ملے، اس سے تو بہر حال چھن جائے۔

حسد اور ظلم وفسق کے مٹ جانے کی خواہش میں فرق یہ ہے کہ ظالم یا فاسق جب توبہ کرلے تو پھر یہ (ظلم وفسق کے مٹ جانے کی خواہش کرنے والا) آدمی اس کے بارے میں زوالِ نعمت کی خواہش سے باز آجاتا ہے اور پھر وہ اس کا خیر خواہ بن جاتا ہے اور حاسد تو آخر تک اس کا بدخواہ ہی رہتا ہے۔

دنیا و آخرت میں حسد کی تباہ کاریاں

قرآن وحدیث نے حسد کو بڑی تخریبی ذہنیت قرار دیا ہے اور یہ ایک ایسی بیماری ہے جو حاسد کی نیکیوں اور اخلاق کو برباد کردیتی ہے اور اس کی زندگی کو بے چینی اور پریشانی کی آگ میں ڈال دیتی ہے۔ حاسد تمام عمر حسرتوں میں گھلتا رہتا ہے اور بعض لوگ اس نفسیاتی بیماری کی وجہ سے سخت مالیخولیا اور بعض جنون کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس سے اجتماعی زندگی میں عداوت، باہمی کشمکش اور فساد پیدا ہوتا ہے۔

پہلا حاسد شیطان اور پہلا قاتل

سب سے پہلے حسد کرنے والا ابلیس (شیطان) ہے۔ اس نے حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ حسد کیا کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو میری موجودگی کے باوجود زمین کا خلیفہ کیوں بنایا گیا؟ وہ ان سے جل گیا لہٰذا وہ اُس وقت سے لے کر قیامت تک تخریبی کاروائیوں میں مصروف رہے گا۔ اسی طرح پہلے ناحق خون کا سبب بھی یہی حسد تھا جس کی بنیاد پر قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ مائدہ: آیت ۲۷ تا ۳۰)

حاسد اپنی نیکیاں محسود کے کھاتے میں ڈالتا رہتا ہے

جس کے دل میں حسد کی آگ سلگتی رہتی ہے وہ اس کے درپے ہوتا ہے کہ جس خوش حال پر اس کو حسد ہے کسی طرح اس کو نقصان پہنچے، وہ بے آبرو ہو جائے، کسی طرح وہ لوگوں میں ذلیل ورسوا ہو جائے، پھر اگر اور بس نہیں چلتا تو اس کی غیبت کر کے ہی اپنے دل کی آگ بجھاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی نیکیاں اپنے محسود کے نامۂ اعمال اور کھاتے میں ڈالتا رہتا ہے اور خود اپنے آپ کو آبروریزی کے بدترین سود اور چغلی کے بدترین عذابِ قبر میں مبتلا کرتا رہتا ہے، اور جہنم کا عذاب تو بہت ہی سخت اور پائیدار ہے۔

حاسد اور تقدیر

حاسد کا یا تو تقدیر پر کامل ایمان نہیں ہوتا، یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تقدیر پر معترض ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کا تو یہ ایمان ہوتا ہے کہ نفع و نقصان، عزت وذلت، کامیابی وناکامی، خیر و شر، اسبابِ راحت و نعمت اور اسبابِ تکلیف و مصیبت اور درد؛ سب کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، اُسی نے اپنے بے انتہا رحم وعدل اور حکمت و قدرت کے تحت ہر چیز کی تقدیر بنائی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے دل میں یہ کہتا ہے کہ فلاں نعمت فلاں کو کیوں ملی، وہ اس سے چھن کر مجھے مل جائے تو یہ شخص یا تو اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر کامل ایمان نہیں رکھتا یا پھر اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کرتا ہے اور یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت اور اس کے عدل ورحم پر ہی اعتراض ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنی ذات وصفات اور اپنی قدرت واختیار پر کامل یقین نصیب فرمائے۔

حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے

حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے، چناں چہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ ”حسد کی بیماری سے سخت پرہیز کرو کیوں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے“۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

حسد کا نیکیوں کو کھا جانے کا مطلب یہی ہے کہ ایک طرف حاسد ہر وقت اپنی نیکیاں محسود کے کھاتے میں ڈالتا رہتا ہے، دوسری طرف یہی حسد آدمی کی ایمانی قوت کو چاٹتا رہتا ہے جس کی وجہ سے بالآخر

خود اس کی اپنی نیکیاں بے روح اور بے نور ہو کر رہ جاتی ہیں۔

حاسد بالآخر ملعون ہو جاتا ہے

حسد کی بیماری کا خاصہ یہ ہے کہ بالآخر حاسد محسود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، اس کے ساتھ مکر وفریب کا رویہ اختیار کرتا ہے اور اس کے لیے جگہ جگہ گڑھے کھودنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔ چناں چہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا اَوْ مَكَرَ بِهٖ "وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو ضرر پہنچائے یا اس کے ساتھ مکر وفریب کرے"۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

حسد دین کا صفایا کرتا ہے

حسد ایک ایسی خطرناک بیماری ہے جو بالآخر دین کا صفایا کر دیتی ہے، چناں چہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دَبَّ اِلَيْكُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمْ اَلْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ " پہلی امتوں کی بیماری تمہاری طرف چلی آرہی ہے، وہ بیماری حسد اور بغض ہے جو مونڈنے والی (صفایا کرنے والی) ہے، میرے اس کہنے کا مطلب (کہ حسد وبغض مونڈنے والی ہے) یہ نہیں ہے کہ یہ بالوں کو مونڈنے والی ہے بلکہ یہ مونڈتی ہے دین کو"۔
(احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بغض اور حسد جیسی بیماریوں سے پاک تھے

یاد رکھیں! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بغض وحسد جیسی بیماریوں سے پاک وصاف تھے، اس حدیث میں مسلمانوں کو اس خطرناک بیماری سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اس حدیث کو نقل کر کے حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ اپنی کتاب "معارف الحدیث" میں لکھتے ہیں کہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق اللہ علیم وخبیر کی یہ شہادت قرآن مجید میں محفوظ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر شفیق اور مہربان ہیں رحماء بینهم۔ دوسری جگہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے خاص کرم نے ان کے دل ملا دیئے ہیں اور وہ پرانے جھگڑوں کو بالکل بھلا کر آپس میں بھائی بھائی ہو گئے ہیں۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا۔ (آل عمران: آیت ۱۰۳)

ایک دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ خاص انعام ہے کہ اُس نے تم پر ایمان لانے والوں کے دل ملا دیے ہیں، اگر تم اس مقصد کے لیے دنیا کی ساری دولت اور سارے خزانے بھی خرچ کر ڈالتے تو بھی ان کے دلوں میں یہ الفت و محبت پیدا نہ کر سکتے۔

(الانفال: آیت ۶۳)

بہر حال قرآن مجید کی ان واضح شہادتوں سے معلوم ہوا کہ جہاں تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعلق ہے، ان کے دل ایک دوسرے کی محبت و الفت سے بھر دیے گئے تھے اور ان میں باہم بغض و حسد کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس لیے اس حدیث دَبَّ اِلَیْکُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَکُمْ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ کا منشاء یہی ہو سکتا ہے کہ بعد کے دوروں میں بغض و حسد کی جو مہلک بیماری مسلمانوں میں آنے والی تھی، رسول اللہ ﷺ پر وہ منکشف ہوئی اور آپ ﷺ نے امت کو اس آنے والی بلا سے خبر دار کیا اور بتلایا کہ بغض و حسد کی جس مہلک بیماری نے اگلی بہت سی امتوں کے دین و ایمان کو برباد کیا ہے، وہ میری امت کی طرف بھی چلی آ رہی ہے۔ لہٰذا اللہ کے بندے ہوشیار رہیں اور اس لعنت سے اپنے دلوں اور سینوں کی حفاظت کی فکر کریں۔ (معارف الحدیث: ج ۲، ص ۲۱۷ تا ۲۱۸)

حسد کا علاج

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ حسد ایک ایسی خطرناک اور مہلک بیماری ہے جس کی وجہ سے انسان کی دنیا، اس کا چین و سکون اور آخرت سب کچھ برباد ہو جاتا ہے، تو آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے علاج میں کسی قسم کی تاخیر نہ کرے اور فوراً اس کے علاج کی طرف متوجہ ہو جائے، کچھ پتا نہیں کہ موت کب آئے گی۔ اگر موت آگئی اور آپ نے اپنا علاج نہیں کیا ہے تو قبر اور آخرت میں کیا کریں گے۔ پھر تو نجات کا کوئی راستہ نہیں کیوں کہ آخرت کی نجات کے لیے صرف یہاں، اسی دنیا سے ہی کچھ نجات و فلاح کا سامان ہو سکتا ہے، موت کے بعد تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا، وہاں تو اپنے ایمان و اخلاق اور کردار و اعمال کے نتائج سامنے آئیں گے۔ نیکوکاروں کے حصہ میں نعمتیں اور بدکاروں کے حصہ میں عذاب اور مصیبتیں آئیں گی۔

حسد کی تباہیوں اور فانی دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی فکر کریں

حسد کا بہت بڑا اور اصل سبب مال و دولت اور عزت و شہرت کا حصول ہو تا ہے۔ جب انسان دنیا کے مال و جاہ کی بے جا محبت میں گرفتار ہو تا ہے تو اس کی وجہ سے وہ تکبر، حسد اور بغض جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، تمام بیماریوں کی جڑ اور اصل یہی دنیا کی محبت ہے۔ اس کو دل سے نکالنے کے لیے دنیا کی بے ثباتی اور عارضی ہونے کو سوچیں کہ دنیا میں چند دن ہی تو رہنا ہے، پھر یہاں سے جانا ہے اور دنیا کی دولت و شہرت اس میں رہ جانی ہیں۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور دنیا کی یہ ساری نعمتیں، راحتیں اور لذتیں وغیرہ یہیں رہ جائیں گی۔ اصل زندگی آخرت کی ہے جو نہ ختم ہونے والی ہے۔ اصل عزت، حقیقی انعامات، نعمتیں، لذات اور بادشاہت وہیں ملے گی اور میں ان دنیوی چیزوں اور نعمتوں پر حسد کر کے آخرت کو برباد کر رہا ہوں۔

حسد میں کیا فائدہ ہے؟

پھر یہ سوچیں کہ آخر حسد میں میرا فائدہ کیا ہے؟ میرے حسد کرنے سے تو محسود کا کچھ نہیں بگڑے گا، اس کو جو نعمت ملی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق ملی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں اس نعمت کی ایک مدت مقرر ہے، پھر اس کے ساتھ حسد و بغض میں مجھے کیا ملے گا، اس میں تو میرا ہی نقصان ہے کہ میں اس کی وجہ سے بے چین ہوں، جلتا رہتا ہوں، بلا وجہ رنج و غم میں مبتلا رہتا ہوں اور میں جس قدر حسد کرتا ہوں، اُس کی غیبت کرتا ہوں یا چغلی کرتا ہوں تو اس کے نامہ اعمال میں اپنی نیکیاں ڈالتا رہتا ہوں۔ اس طرح وہ دنیا و آخرت کے لحاظ سے ترقی کر رہا ہے اور میں لحہ بہ لحہ گرتا رہتا ہوں اور اپنے آپ کو کی ہوئی نیکیوں سے بھی محروم کرتا رہتا ہوں۔

دنیاوی لحاظ سے ہمیشہ کمتر لوگوں کو مدِ نظر رکھو

حسد ناشکری ہے۔ حاسد کو جو کچھ ملا ہو تا ہے اُس پر وہ شاکر و قانع نہیں رہتا اس لیے وہ دوسروں کو دیکھ کر جلتا رہتا ہے، لہٰذا اُسے چاہیے کہ وہ ہمیشہ دنیاوی اعتبار سے اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کو دیکھا کرے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسنِ ظن رکھے کہ وہ میرا خالق ہے، مالک و پروردگار ہے، اس نے

میرے لیے جو کچھ مقدر کیا ہے اسی میں میری خیر اور میرا فائدہ ہے، اور یہی ان شاء اللہ میری آخرت کے لیے مفید ہے۔ اس کا پورا بیان شکر کے باب میں پڑھ لیجیے۔

حسد کے تقاضوں کو پورا نہ کریں

حسد کے علاج کے لیے آپ کو جو فوری اقدام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ حسد کے تقاضوں پر عمل نہ کریں۔ جب کسی کے ساتھ حسد کا جذبہ پیدا ہو تو دل میں حسد کی برائی لے آئیں، فوراً توبہ واستغفار کریں اور سوچیں کہ یہ شیطان کا اشارہ ہے۔ اپنے کسی قول یا فعل اور ادا سے اس حسد کو دوسروں پر ظاہر نہ کریں، یعنی نہ اُس (محسود) کی غیبت کریں، نہ چغلی، نہ اس کی بدخواہی کی کوشش کریں اور نہ اس سے اس نعمت کے چھن جانے کی دعا کریں۔

اگر آپ مذکورہ بالا ہدایات پر عمل کریں گے تو آپ اس حسد کے شر سے بھی بچ جائیں گے اور ان شاء اللہ اس حسد کا گناہ بھی ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: جب شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کام کرنا چاہتے ہو (مثلاً سفر پر جانا ہے) تو اس شگون کی وجہ سے اس کام کو نہ چھوڑو (بلکہ کر گزرو) اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم (یعنی غیبت، چغلی، بدخواہی) پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔

(مصنف عبد الرزاق، دیکھیے فتح الباری، شرح بخاری: کتاب الاداب، باب ما ینہی عن التحاسد، ج ۱۰، ص ۴۹۸)

حسد کے تقاضوں کو پورا کرنے اور نہ کرنے کے لحاظ سے حسد کے درجات

یہاں اس بات کی نشان دہی بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ تقاضوں کو پورا کرنے اور نہ کرنے کے لحاظ سے اس کے تین درجات ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ حسد کے تقاضوں کو قطعاً پورا نہ کیا جائے۔ حسد کی برائی کو سامنے لایا جائے، پھر نادم ہو کر توبہ استغفار کیا جائے۔ اس صورت میں پیدا ہونے والے حسد اور جلن کا گناہ ختم ہو جاتا ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے۔

۲۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ حسد کے ظاہری تقاضوں پر تو عمل نہ کیا جائے، مثلاً نہ اس (محسود) کی غیبت کی جائے اور نہ کسی قسم کی بد خواہی، مگر اس حسد پر ندامت اور توبہ کا خیال نہ ہو اور دل یہی چاہتا ہو کہ اس سے نعمت چھن جائے یا اس پر کوئی آفت آ پڑے، اس کا بھی گناہ ہے۔ اگرچہ اس درجے والا شخص غیبت، چغلی اور بد خواہی کی عملی کوشش سے بچنے کی وجہ سے ان ظالمانہ اور مجرمانہ گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ اس لیے حاسد کو چاہیے کہ وہ اپنے حسد کی برائی کو سامنے لائے اور نادم ہو کر تائب ہو جائے۔

۳۔ حسد کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اندرونی حسد اور جلن کے ساتھ ساتھ حسد کے تقاضوں پر عمل بھی کیا جائے، جیسے: غیبت، چغلی، طعن و تشنیع، اُس (محسود) کو ملی ہوئی نعمت اور خوشحالی کے چھیننے کے لیے عملی کوششیں اور اس کو قتل کرنا وغیرہ۔ ایسی صورت میں حاسد اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق کو تلف کرنے والا بڑا ظالم اور مجرم بن جاتا ہے۔ اس تیسری صورت میں حاسد سے بندوں کی جو حق تلفی ہو چکی ہو اُس کے لیے ضروری ہے کہ بندوں کو اُن کے حقوق واپس کریں یا ان سے معاف کرائیں۔

محسود کی ترقی کے لیے دعائیں کریں

مذکورہ بالا تجاویز کے ساتھ مندرجہ ذیل چند امور کا اہتمام بھی کیا جائے تو ان شاء اللہ دل سے حسد کا مرض ختم ہو جائے گا ورنہ کم از کم حسد کے شر اور گناہ سے حفاظت ہو جائے گی:

۱۔ حسد کے تقاضوں پر قطعاً عمل نہ کریں، جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

۲۔ دوسرا کام یہ کریں کہ محسود کی ترقی کے لیے ہر روز یہ دعا کیا کریں کہ یا اللہ! اس پر آپ نے جو نعمت کی ہے اس میں ترقی اور برکت فرما۔ آپ جب اس طرح دعا کریں گے تو نفس بہت ہی چیخے گا لیکن یہ مجاہدہ ہے، اس کا ثواب بھی آپ کو ملے گا اور آپ کا علاج بھی ہو جائے گا۔ نیز اس دعا کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی یہ دعا کیا کریں کہ یا اللہ! میرے دل میں اُس کی نعمت کی وجہ سے جو حسد اور جلن پیدا ہو رہی ہے اپنے ہی فضل سے اس کو ختم کر دے اور مجھے اپنا صابر و شاکر بندہ بنا دے۔

۳۔ تیسرا کام یہ کریں کہ اپنی مجلسوں میں اس کی تعریف کریں اور اس کی خوبیاں بیان کریں۔ یہ بہت ہی مشکل کام ہے لیکن اس مجاہدہ پر اس کا ثواب آپ کو ملے گا اور علاج بھی ہو گا۔

۴۔ کبھی کبھی اس کو تحفہ وہدیہ بھیجا کریں اور کبھی اس کی دعوت کیا کریں۔

۵۔ جب کسی لمبے سفر پر جانا ہو تو اس سے ملاقات کر کے جائیں اور سفر سے واپسی پر اس کے لیے کوئی تحفہ بھی لیتے آئیں۔

باطنی بیماریوں کے علاج کا آسان طریقہ

باطنی بیماریوں کے علاج کا آسان اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی روحانی طبیب اور کسی صادق تجربہ کار شیخ و صوفی کی طرف رجوع کیا جائے، جس نے باقاعدہ کسی روحانی طبیب اور شیخ سے اپنی اصلاح کی کوشش کی ہو اور پھر انہوں نے اس پر اعتماد کیا ہو کہ وہ دوسروں کا علاج کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تصوف اور اخلاق کی کتابوں میں روحانی بیماریوں کبر، حسد، دنیا کی محبت وغیرہ کے علاج لکھے ہوتے ہیں، لیکن ان کی مثال ہو بہو ایسی ہے جیسے کہ جسمانی طب کی کتابوں میں بیماریوں کے علاج لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ کتابیں ڈاکٹروں اور طبیبوں کے لیے تو مفید ہوتی ہیں، لیکن اگر عوام ان سے استفادہ کرنا شروع کریں تو بیماریاں کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جائیں گی، کیوں کہ عوام تو بیماریوں کو اور بیماریوں کے اسباب کو نہیں جانتے۔ کتاب میں کسی بیماری کے اسباب کو پڑھنا اور چیز ہے اور جب مریض سامنے ہو تو اس کی بیماری کے اسباب معلوم کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ اس لیے لوگ دوائیوں اور طب کی کتابوں سے اپنا علاج نہیں کرتے بلکہ ڈاکٹر اور طبیب کے سامنے بیٹھ کر اپنا علاج کراتے ہیں اور ڈاکٹر ان کی بیماری کا سبب معلوم کرتا ہے، پھر ان کے مطابق اس کے لیے علاج تجویز کرتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو بیمار محسوس کرتا ہے حالاں کہ وہ بیمار نہیں ہوتا، بلکہ اس کو بیماری کا وسوسہ ہوتا ہے، تو پھر وہ اس کے مطابق علاج تجویز کر کے اس کو مطمئن کر دیتا ہے۔ اسی طرح روحانی بیماریوں کا علاج معالجہ بھی ہے۔ صرف کتابوں کے دیکھنے سے آدمی اپنی روحانی اور نفسیاتی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتا، بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی میں نہ تکبر ہوتا ہے، نہ حسد اور نہ ریا وغیرہ۔ لیکن اس کو صرف تکبر، حسد اور ریا وغیرہ کا وسوسہ لگ جاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حقیقی بیماری کے علاج اور بیماری کے وسوسے کے علاج میں بہت زیادہ فرق ہے، البتہ جن لوگوں کو اس شعبے سے کچھ مناسبت ہو، وہ اس میں عملاً وقت لگا چکے ہوں اور کسی درجے میں روحانی طبیب بن چکے ہوں تو وہ ایسی کتابوں سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ اس فن میں ترقی بھی کر سکتے ہیں اور علاج بھی

کر سکتے ہیں۔ لیکن عام لوگ جب خود ہی اپنا علاج شروع کر دیتے ہیں تو وہ بہت کم ہی کامیاب ہوتے ہیں، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ شدید نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میرا خیر خواہانہ مشورہ یہی ہے کہ روحانی بیماریوں کے خاتمے کے لیے کسی روحانی معالج کی طرف رجوع کیا جائے۔

حسد کا عبرتناک انجام

حضرت سیدنا بکر بن عبداللہ المزنی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ بادشاہوں کے درباروں میں جاتا اور ان کے سامنے اچھی اچھی باتیں کرتا۔ بادشاہ خوش ہو کر اسے انعام واکرام سے نوازتے اور اس کی خوب حوصلہ افزائی کرتے۔

ایک مرتبہ وہ ایک بادشاہ کے دربار میں گیا اور اس سے اجازت چاہی کہ میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے اجازت دے دی اور اسے اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا اور کہا: اب جو کہنا چاہتے ہو کہو۔ اس شخص نے کہا: ”محسن کے ساتھ احسان کر اور جو برائی کرے اس کی برائی کا بدلہ اسے خود ہی مل جائے گا“۔ بادشاہ اس کی یہ بات سن کر بہت خوش ہوا اور اسے انعام واکرام سے نوازا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کے ایک درباری کو اس شخص سے حسد ہو گیا اور وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگا کہ اس عام سے شخص کو بادشاہ کے دربار میں اتنی عزت اور اتنا مقام کیوں حاصل ہو گیا۔ بالآخر وہ حسد کی بیماری سے مجبور ہو کر بادشاہ کے پاس گیا اور بڑے خوشامدانہ انداز میں بولا: ”بادشاہ سلامت! ابھی جو شخص آپ کے سامنے گفتگو کر کے گیا ہے، اگرچہ اس نے باتیں اچھی کی ہیں لیکن وہ آپ سے نفرت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بادشاہ کو گندہ دہنی (یعنی منہ سے بدبو آنے) کا مرض ہے“۔

جب بادشاہ نے یہ سنا تو پوچھا: تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ میرے بارے میں ایسا گمان رکھتا ہے؟ وہ حاسد بولا: حضور! اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں آتا تو آپ آزما کر دیکھ لیں، اسے اپنے پاس بلائیں، جب وہ آپ کے قریب آئے گا تو اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لے گا تاکہ اسے آپ کے منہ سے بدبو نہ آئے۔ یہ سن کر بادشاہ نے کہا: تم جاؤ! جب تک میں اس معاملہ کی تحقیق نہ کر لوں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ چناں چہ وہ حاسد دربار شاہی سے چلا آیا اور اس شخص کے پاس پہنچا جس سے وہ حسد کرتا تھا۔ اسے کھانے کی دعوت دی، اس نے حاسد کی دعوت قبول کی اور اس کے ساتھ چل دیا۔

حاسد نے اسے جو کھانا کھلایا اس میں بہت زیادہ لہسن ڈال دیا۔ اب اس شخص کے منہ سے لہسن کی بدبو آنے لگی، بہر حال وہ اپنے گھر آ گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بادشاہ کا قاصد آیا اور اس نے کہا: بادشاہ نے آپ کو ابھی دربار میں بلایا ہے۔ وہ شخص قاصد کے ساتھ دربار میں پہنچا۔ بادشاہ نے اسے اپنے سامنے بٹھایا اور کہا: ہمیں وہی کلمات سناؤ جو تم سنایا کرتے ہو۔ اس شخص نے کہا: ”محسن کے ساتھ احسان کر اور جو برائی کرے گا اسے برائی کا بدلہ خود ہی مل جائے گا۔“

جب اس نے اپنی بات مکمل کر لی تو بادشاہ نے اس سے کہا: ”میرے قریب آؤ۔“ وہ بادشاہ کے قریب گیا تو اس نے فوراً اپنے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ لیا، تاکہ لہسن کی بدبو سے بادشاہ کو تکلیف نہ ہو۔ جب بادشاہ نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنے دل میں کہا کہ اس شخص نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میرے متعلق یہ شخص گمان رکھتا ہے کہ مجھے گندہ دہنی (یعنی منہ سے بدبو آنے) کی بیماری ہے۔ بادشاہ اس شخص کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہو گیا اور بلا تحقیق اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس شخص کو سخت سزا ملنی چاہیے۔ چناں چہ اس نے اپنے گورنر کے نام اس طرح خط لکھا: اے گورنر! جیسے ہی یہ شخص تمہارے پاس پہنچے اسے ذبح کر دینا اور اس کی کھال اتار کر اس میں بھوسا بھر دینا اور اسے ہمارے پاس بھجوا دینا۔ پھر بادشاہ نے خط پر مہر لگائی اور اس شخص کو دیتے ہوئے کہا: یہ خط لے کر فلاں علاقے کے گورنر کے پاس پہنچ جاؤ۔

بادشاہ کی عادت تھی کہ جب بھی وہ کسی کو کوئی بڑا انعام دینا چاہتا تو کسی گورنر کے نام خط لکھتا اور اس شخص کو گورنر کے پاس بھیج دیتا، وہاں اسے خوب انعام واکرام سے نوازا جاتا۔ کبھی بھی بادشاہ نے سزا کے لیے کسی گورنر کو خط نہ لکھا تھا۔ آج پہلی مرتبہ بادشاہ نے کسی کو سزا دینے کے لیے گورنر کے نام خط لکھا ورنہ اس بادشاہ کے بارے میں مشہور تھا کہ جب کسی کو انعام دیتا تو اسے گورنر کے پاس بھیجتا۔

بہر حال یہ شخص خط لے کر دربار شاہی سے نکلا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ اس خط میں میری موت کا حکم ہے۔ یہ شخص خط لے کر گورنر کے پاس جا رہا تھا کہ راستے میں اس کی ملاقات اسی حاسد سے ہو گئی۔ اس نے پوچھا: بھائی! کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا: میں نے بادشاہ کو اپنا کلام سنایا تو اس نے مجھے ایک خط مہر لگا کر دیا اور کہا: فلاں گورنر کے پاس یہ خط لے جاؤ، میں اسی گورنر کے پاس خط لیے جا رہا ہوں۔ حاسد کہنے لگا: بھائی! تو یہ خط مجھے دے دے، میں ہی اسے گورنر تک پہنچا دوں گا۔ چناں چہ اس شریف

آدمی نے خط حاسد کے حوالے کر دیا۔ وہ حاسد خط لے کر خوشی خوشی گورنر کے دربار کی طرف چل دیا۔ وہ یہ سوچ کر بہت خوش ہو رہا تھا کہ اس خط میں بادشاہ نے گورنر کے نام پیغام لکھا ہو گا کہ جو شخص یہ خط لے کر آئے اسے انعام واکرام سے نوازا جائے۔ میری قسمت کتنی اچھی ہے، میں نے اس شخص کو جھانسا دے کر یہ خط لے لیا ہے اب میں مالا مال ہو جاؤں گا۔ وہ حاسد انہیں سوچوں میں مگن بڑی خوشی کے عالم میں جھومتا جھومتا گورنر کے دربار کی جانب جا رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے اور جاتے ہی اسے قتل کر دیا جائے گا۔

بہر حال وہ گورنر کے پاس پہنچا اور بڑے مؤدبانہ انداز میں بادشاہ کا خط گورنر کو دیا۔ گورنر نے جیسے ہی خط پڑھا تو پوچھا: اے شخص! کیا تجھے معلوم ہے کہ اس خط میں بادشاہ نے کیا لکھا ہے؟ اس نے کہا: بادشاہ سلامت نے یہی لکھا ہو گا کہ مجھے انعام واکرام سے نوازا جائے اور میری حاجات کو پورا کیا جائے۔ گورنر نے کہا: اے نادان شخص! بادشاہ نے اس خط میں مجھے حکم دیا ہے کہ جیسے ہی یہ شخص خط لے کر پہنچے، اُسے ذبح کر دینا اور اس کی کھال اتار کر اس میں بھوسا بھر دینا، پھر اس کی لاش میرے پاس بھجوا دینا۔ یہ سن کر اس حاسد کے تو ہوش اُڑ گئے اور وہ کہنے لگا: خدا عزوجل کی قسم! یہ خط میرے بارے میں نہیں لکھا گیا بلکہ یہ تو فلاں شخص کے متعلق ہے، بے شک آپ بادشاہ کے پاس کسی قاصد کو بھیج کر معلوم کر لیں۔

گورنر نے اس کی ایک نہ سنی اور کہا: ہمیں حاجت نہیں کہ ہم بادشاہ سے اس معاملہ کی تصدیق کریں، بادشاہ کی مہر اس خط پر موجود ہے، لہٰذا ہمیں بادشاہ کے حکم پر عمل کرنا ہو گا۔ اتنا کہنے کے بعد اس نے جلاد کو حکم دیا اور اس حاسد شخص کو ذبح کر کے اس کی کھال اتار کر اس میں بھوسا بھر دیا گیا۔ پھر اس کی لاش کو بادشاہ کے دربار میں بھجوا دیا گیا۔ وہ شخص جس سے یہ حسد کیا کرتا تھا حسب معمول بادشاہ کے دربار میں گیا اور بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر وہی الفاظ دہرائے: ''محسن کے ساتھ احسان کر اور جو کوئی برائی کرے گا اسے عنقریب اس کی برائی کا صلہ مل جائے گا۔''

جب بادشاہ نے اس شخص کو صحیح وسالم دیکھا تو اس سے پوچھا: میں نے تجھے جو خط دیا تھا اس کا کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا: میں آپ کا خط لے کر گورنر کے پاس جا رہا تھا کہ مجھے راستے میں فلاں شخص ملا اور اس نے مجھ سے کہا کہ یہ خط مجھے دے دو، چناں چہ میں نے اسے خط دے دیا اور وہ خط لے کر گورنر کے

پاس چلا گیا ہے۔ بادشاہ نے کہا: اس شخص نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا کہ تم میرے متعلق یہ گمان رکھتے ہو کہ میرے منہ سے بدبو آتی ہے، کیا واقعی ایسا ہے؟ اس شخص نے کہا: بادشاہ سلامت! میں نے کبھی بھی آپ کے بارے میں ایسا نہیں سوچا۔ بادشاہ نے پوچھا: جب میں نے تجھے اپنے قریب بلایا تھا تو تُو نے اپنے منہ پر ہاتھ کیوں رکھ لیا تھا؟ اس شخص نے جواب دیا: بادشاہ سلامت! آپ کے دربار میں آنے سے کچھ دیر قبل اس شخص نے میری دعوت کی تھی اور کھانے میں مجھے بہت زیادہ لہسن کھلا دیا تھا جس کی وجہ سے میرا منہ بدبو دار ہو گیا۔ جب آپ نے مجھے اپنے قریب بلایا تو میں نے یہ بات گوارا نہ کی کہ میرے منہ کی بدبو سے بادشاہ سلامت کو تکلیف پہنچے، اسی لیے میں نے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ لیا تھا۔

جب بادشاہ نے یہ سنا تو کہا: اے خوش نصیب شخص! تو نے بالکل ٹھیک کہا، تیری یہ بات بالکل سچی ہے کہ جو کسی کے ساتھ برائی کرتا ہے اسے عنقریب اس کی برائی کا بدلہ مل جائے گا، اس شخص نے تیرے ساتھ برائی کا ارادہ کیا اور تجھے سزا دلوانی چاہی لیکن اسے اپنی برائی کا صلہ خود ہی مل گیا۔ سچ ہے کہ جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود ہی اس میں جا گرتا ہے۔ اے نیک شخص! میرے سامنے بیٹھ اور اپنی اسی بات کو دہرا۔ چناں چہ وہ شخص بادشاہ کے سامنے بیٹھا اور کہنے لگا: محسن کے ساتھ احسان کر اور برائی کرنے والے کو عنقریب اس کی برائی کی سزا خود ہی مل جائے گی۔

(عیون الحکایات: ۲۹۸تا۳۰۱ مترجم لابن الجوزیؒ)

باہمی محبت اور اتفاق واتحاد کے واقعات

ایک ہی نظریہ اور ایک ہی دین والوں کے مابین حسد کے بجائے خیر خواہی اور اتفاق واتحاد، تواضع اور انکساری کی وجہ سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ جہاں کوئی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے وہاں اتفاق واتحاد کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا، اور اتفاق واتحاد میں دراڑ پیدا کرنے کے معاملے میں لوگوں کی چاپلوسیاں بھی بہت زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہیں۔

نیز یہ بھی کہ جب لوگ ایک جماعت کے اکابر کے بارے میں تقابلی انداز میں ایسی باتیں شروع کرتے ہیں جن کی وجہ سے بعض کی بعض پر افضلیت ظاہر ہوتی یا بعض کی تحقیر و تنقیص ہوتی ہے تو اس صورت میں اکابر کی پیروی کرنے والوں کے درمیان سخت بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہر کوئی اس بات کو

ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جس کی پیروی وہ کرتا ہے یا جس کو وہ اپنا امیر یا شیخ و مرشد سمجھتا ہے وہ ہر لحاظ سے سب سے بہتر ہے۔ اسی تکبر واستکبار کے رویہ کی وجہ سے لوگ اپنے اکابر اور اسلاف کو بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرکے ان کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور کبھی ماورائے انسانیت، کبھی ان کے بارے میں اس خبیث عقیدے کا شکار ہوجاتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے مافوق الاسباب اختیارات سے نوازا ہے۔

اگر ان کے اکابر زندہ ہوں تو ان کے سامنے ان کی تعریف میں مبالغہ آرائی کی جاتی ہے اور خود بھی ایک دوسرے کے مخالف ہوکر اپنے اتفاق واتحاد کو برباد کردیتے ہیں۔ مومن چوں کہ غیبت، بدظنی اور تکبر کو زہر قاتل سمجھتا ہے، وہ منکسر المزاج ہوتا ہے اور اس کا دل کتابِ الٰہی کے نور سے منور اور یادِ الٰہی سے آباد ہوتا ہے، اس لیے وہ ان بیماریوں سے پاک ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی کی تعریف کرتا ہے تو ایسے انداز میں نہیں کہ دوسرے نیکوکاروں کی تنقیص اور تحقیر کا پہلو نکل سکے۔ اس کے اندر یادِ الٰہی اس قدر بھری ہوئی ہوتی ہے کہ اس کے اندر نہ کوئی ہوا بھری جاسکتی ہے اور نہ وہ ایسے چاپلوس لوگوں کی باتوں پر کان دھرتا ہے، بلکہ وہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔ اس کے متعلق بھی چند واقعات پڑھ لیجیے:

۱۔ ایک دن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ عصر کی نماز پڑھا کر مسجد سے باہر نکلے۔ راستے میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں، تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے کندھے پر اٹھا کر فرمایا: "میرے ماں باپ تم پر قربان ہوجائیں تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو، علی رضی اللہ عنہ کے مشابہ نہیں ہو"۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یہ فرما رہے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

(دیکھیے بخاری، کتاب: احادیث الانبیا)

۲۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو ان کے جنازے کو مخاطب کرکے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل فرمائے، تم نے اپنے بعد کسی ایسے شخص کو نہیں چھوڑا کہ اس کی طرح عمل کرکے مجھے اللہ تعالیٰ سے ملنا تمہارے جیسے عمل کرکے ملنے سے زیادہ محبوب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! مجھے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ جمع کردے گا، کیوں کہ میں اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے میں اور ابو بکر اور عمر تھے، میں اور ابو بکر اور عمر نے یوں کیا، میں اور ابو بکر اور عمر نکلے۔ (دیکھیے بخاری ومسلم کتاب المناقب)

سو۔ اپنی وفات سے چند روز پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور فرمایا: لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم اپنا خلیفہ نامزد کرو، حالاں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور خلافت کو اور اس چیز کو جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تھا ضائع نہیں کرے گا۔ اگر میری موت جلد آجائے تو مشورہ کرنے کے بعد کسی کو خلیفہ بنالینا، لیکن خلافت ان چھ آدمیوں میں رہے گی جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک راضی رہے، پھر وفات سے کچھ دیر پہلے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان چھ ٦۔ حضرات کو سامنے لائے یعنی حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبد الرحمن بن عوف اور حضرت ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کہ وہ آپس میں مشورہ کریں اور جس کو یہ لوگ خلیفہ بنادیں وہ خلیفہ ہو گا۔

(دیکھیے صحیح بخاری: کتاب الجنائز و صحیح مسلم: کتاب المساجد باب نہی عن اکل ثوما)

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق وہ چھ صحابی خلیفہ کے انتخاب کے لیے جمع ہو گئے تو حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: اس معاملہ میں ہم میں سے تین آدمی باقی تین آدمیوں کے حق میں دست بردار ہو جائیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا: میں حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہوتا ہوں، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہوتا ہوں، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہوتا ہوں۔ پھر حضرت عبد الرحمن نے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے کہا: تم میں سے کون امارت سے دست بردار ہوتا ہے، جو دست بردار ہو گا ہم امارت کا فیصلہ اس کے سپرد کریں گے، اور اس پر اللہ تعالیٰ اور اسلام کے واسطے یہ فرض ہو گا کہ وہ جس کو بہتر سمجھتا ہو، اسے خلیفہ بنادے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر تم چاہو تو میں تم دونوں میں سے ایک کو منتخب کر کے خلیفہ بنادوں۔ کیا تم دونوں اس کام کو میرے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم کو منظور ہے۔ اس کے بعد حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ امیر کے انتخاب کے کام میں مشغول ہو گئے اور مشوروں کے بعد ایک نتیجے پر پہنچ گئے اور سب لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت ہے اور تمہیں اسلام میں قدامت حاصل ہے، اگر میں تم کو خلیفہ

بناؤں تو تم انصاف کرنا اور اگر میں عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بناؤں تو تم ان کی بات سننا اور اطاعت کرنا۔ پھر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر ان سے بھی یہی بات کہی اس کے بعد حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور خطبہ میں انہوں نے یہ فرمایا: اے علی !(رضی اللہ عنہ) میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے، لہٰذا تم میری طرف سے دل میں کچھ خیال نہ کرنا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: میں اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد کے خلفاء کی سنت (اور طرزِ زندگی) پر تم سے بیعت کرتا ہوں۔ پھر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عثمان! اپنا ہاتھ اٹھاؤ، انہوں نے ہاتھ اٹھایا۔ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کی۔ [1] (تفصیل کے لیے دیکھیے بخاری: ابواب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ، کتاب الاحکام)

اس واقعہ میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے خلیفہ بننے کی کچھ امید یا خواہش تھی، لیکن خلافت کی خواہش ہونا اگر صرف اس نیت سے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت سچائی سے کی جائے تو یہ کوئی بری چیز نہیں۔ اس واقعہ میں سب سے اہمیت رکھنے والی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلوص وللّٰہیت کی ہے، امید بھی تھی پھر بھی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اللہ تعالیٰ کے دین سے محبت نے انہیں فوراً اس پر آمادہ کیا کہ نامزد کرنے والی شخصیت حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے بعد فوراً انہوں نے بیعت کی اور نامزدگی کے بعد اور بیعت سے پہلے بیعت کا اعلان بھی کر دیا ایسی صورت میں سب سے پہلے زبانی بیعت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کر دی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس معاملہ میں کوئی حسد نہیں کیا۔

۴۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت محمد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ رسول اللہ کے بعد سب سے افضل شخص کون ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابو بکر رضی اللہ عنہ۔ انہوں نے پوچھا: پھر اس کے بعد کون ہے؟ فرمایا: پھر عمر رضی اللہ عنہ۔ انہوں نے کہا: پھر اس کے بعد آپ ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں کچھ نہیں، میں تو مسلمانوں میں سے ایک شخص ہوں۔

(صحیح بخاری: ابواب مناقب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ)

---

[1] حضرت عبدالرحمن نے سب سے پہلے بیعت اس لیے کی کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو اپنے اور تمام مؤمنین کے امارت کے لیے نامزد کر دیا تھا۔

قرآن مجید کے ارشادات مثلاً رحماء بینھم کہ" آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہیں"
مذکورہ آیت وواقعات سے بھی اور بعد میں آنے والے واقعات سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت رکھنے والے اور ایک دوسرے کی فضیلت اور ایک دوسرے کے خلوص اور نیک اعمال کے معترف تھے لیکن افسوس یہ ہے کہ مسلمان قوم قرآن اور صحیح روایتوں کے باوجود ان جھوٹے قصوں اور جھوٹی تاریخ کو مان رہی ہے جس کو دشمنانِ اسلام نے گھڑ گھڑ کر تاریخِ اسلام میں داخل کر دیا ہے اور تاریخِ اسلامی کو مسخ کر ڈالا ہے۔

مذکورہ بالا واقعات ایک طرف مومن اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اتفاق واتحاد اور محبت کو ثابت کرنے کے لیے اور دوسری طرف ان کی خدا ترسی اور حسد سے پاک ہونے کے لیے کافی شافی ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کی تقابلی انداز میں تعریف کو سخت ناپسند کرتے تھے اور وہ لوگوں کی چاپلوسی کی باتوں میں آنے والے نہ تھے، ان کے دل کتابِ الٰہی کے نور وہدایت سے منور تھے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے معمور اور آباد تھے، اس لیے ان کے اندر ہوا بھرنے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ اپنے منہ پر تعریف اور افضلیت کے سخت مخالف تھے۔

......☆......☆......☆......

توکل کا بیان

وَكَلَ وُكُوْل، سپرد کر دینے، کسی کے بھروسے کام چھوڑ دینے کو کہتے ہیں۔ اسی سے لفظ "توکل" نکلا ہے جس کے لفظی معنی بھروسہ کرنے، یعنی اپنے عجز و بے چارگی کو ظاہر کرنے اور دوسروں پر بھروسہ و اعتماد کرنے کے ہیں، اور اصطلاح میں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے احکامات و ہدایات پر بھروسے اور اعتماد کو توکل کہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام معاملات، اعمال اور احوال میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے، یا باالفاظِ دیگر صرف اللہ تعالیٰ ہی کو وکیل ٹھہرایا جائے۔ وکیل اس شخص کو کہا جاتا ہے جس پر بھروسہ و اعتماد کر کے کام اور معاملہ اس کے سپرد کیا جائے۔ پس توکل کی حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وکیل و کارساز بنایا اور ٹھہرایا جائے اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اسباب و تدبیر وغیرہ کو بروئے کار لا کر نتائج اور معاملہ اس کے سپرد کیا جائے۔

ظاہری اسباب کی حیثیت

توحید کے باب میں یہ تفصیل آچکی ہے کہ کائنات اور آسمان و زمین میں جو کچھ ہوتا ہے اور جس کو جو کچھ ملتا ہے یا نہیں ملتا، اور عزت و ذلت، نفع و نقصان صرف اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے اور یہ سب کچھ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلے سے ہوتا ہے۔ اس لیے ظاہری اسباب کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ نفع و نقصان، عزت و ذلت وغیرہ کے ہم تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کے مقرر کردہ راستے ہیں۔ جس طرح پانی کے نل اور بجلی کے تار ہم تک پانی اور بجلی پہنچانے کے صرف راستے ہیں، پانی و بجلی کی تقسیم میں ان کا اپنا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح کائنات اور تمام دنیا میں جو ہم کو نظر آرہا ہے وہ اسباب کی کار فرمائی نہیں بلکہ اصل کار فرما صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا حکم ہے۔

جس شخص کے دل پر یہ حقیقت کھل گئی ہو وہ اپنے تمام معاملات اور اپنے تمام کاموں میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات و ہدایات پر اعتماد کرے گا۔ ہر کام کے شروع میں اور کرنے کے بعد صرف اُسی سے لو

لگائے گا اور اُس کی نظر صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت و قوت اور اس کے کرم پر ہو گی، اُسی سے امید رکھے گا، اسی سے خوف رکھے گا اور اسی سے دعا کرے گا۔ پس مومن کے اس طرز عمل کا نام توکل ہے۔

ظاہر پرستوں کا عقیدہ

دنیا میں بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مادی ذرائع واسباب ہی حصولِ نتائج کا واحد سبب اور ذریعہ ہے، مثلاً وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی دوا خود شفا دیتی ہے یا مثلاً انسان کی کوشش اور جدوجہد ہی کسی مقصد کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے، حالاں کہ یہ بات بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات تمام اسباب وذرائع موجود ہوتے ہیں لیکن مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ ایک ڈاکٹر کے پاس ایک ہی مرض کے دو مریض جاتے ہیں اور وہ ان دونوں کو ایک ہی قسم کی دوائیں دیتا ہے، لیکن اُن میں سے ایک تندرست ہو جاتا ہے اور دوسرا بیمار رہتا ہے یا مر جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص کئی بار دوا استعمال کرتا ہے لیکن اس کو شفا حاصل نہیں ہوتی بلکہ کبھی الٹا نقصان بھی ہو جاتا ہے۔

ایک کاشت کار زمین کو اچھی طرح کاشت کرتا ہے، بہترین بیج استعمال کرتا ہے، اچھی طرح کھاد ڈالتا ہے اور اسے پوری طرح سیر اب کر دیتا ہے لیکن شدید گرمی، سخت آندھی یا سخت سیلاب آجاتا ہے یا مسلسل بارش ہو جاتی ہے اور اُس کی تمام کوشش، تدبیر اور محنت ومشقت ضائع ہو جاتی ہے۔

کئی بار ایسا ہوا کہ دو فوجوں کے درمیان جنگ میں وہ فوج جیت گئی جو تعداد اور اسلحہ وغیرہ کے لحاظ سے بہت ہی کم تھی اور اس کے مقابلے میں دوسری فوج عددی اکثریت اور اسباب و اسلحہ کی فراوانی کے باوجود ہار گئی۔

اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ محض اسباب و ذرائع اور محنت و تدابیر نتائج کا سبب نہیں، بلکہ نفع ونقصان کا مالک اور نتائج کو پیدا کرنے والا وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے ان تمام اسباب کو پیدا کیا اور جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔ اس لیے ایک مسلمان اور ایمان والے کا اعتماد و بھروسہ، اسباب وذرائع، اپنی کوشش ومحنت اور تدبیر پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی پر ہوتا ہے۔

توکل کے فضائل وفوائد

اللہ تعالیٰ پر اعتماد و بھروسہ وہ چیز ہے جو دنیاو آخرت کی نجات و فلاح کا ذریعہ ہے چناں چہ:

۱۔ جو شخص صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی کفایت کرے گا۔

۲۔ ایک اللہ تعالیٰ کی غلامی اس کو تمام مخلوق واسباب کی محتاجی اور غلامی سے نجات دلائے گی۔

۳۔ چوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے امید نہیں رکھے گا، اس لیے وہ نہ کسی قسم کی دنیاوی حرص ولالچ اور مصیبت میں گرفتار ہوگا اور نہ مخلوق کی کسی چیز کا طمع رکھے گا۔ نہ مخلوق واسباب سے خوف ہوگا اور نہ اس پر ذلت و کمزوری کے داغ دھبے پڑیں گے، بلکہ اس کی پوری زندگی عزت واطمینان اور بے خوف وخطر گزر جاتی ہے، وہ کبھی خودغرضی کا شکار نہیں ہوتا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ اس کو ضائع ہونے سے بچائے گا اور رزق اس کی طرف خود دوڑ کر آئے گا۔

۵۔ کسی قسم کا حرص ولالچ اس کو حق بات کہنے اور حق کام کرنے سے نہیں روکے گا۔

۶۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے گا اور اسے قناعت اور غنائے قلبی کی دولت نصیب فرمائے گا اور مخلوق کی محتاجی سے بچائے گا۔

۷۔ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا۔

۸۔ اس کی محبت کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ بن جائے گا۔

۹۔ چوں کہ اس کا حقیقی محبوب، اس کا کارساز اُس کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے وہ ہر وقت مطمئن رہتا ہے اور جب کوئی ضرورت پیش آجاتی ہے تو دل کی گہرائیوں سے اسے پکارتا ہے، وہ اس کی بگڑی بنالیتا ہے اور اس کی حاجت پوری کرتا ہے، اور اگر کبھی اس کو مانگی ہوئی چیز فوری طور پر نہ ملے تو مطمئن رہتا ہے کہ اگر اس چیز میں میرا فائدہ ہے تو ضرور دے گا ورنہ اس کے بدلے دوسری نعمت عطا فرمائے گا جس میں میری خیر ہوگی۔

۱۰۔ متوکل اپنے توکل کے بقدر دنیاو آخرت کی خوشیوں اور ترقیوں کو پالیتا ہے۔

اب آپ توکل کے فضائل کے متعلق قرآن وحدیث سے بطورِ نمونہ کچھ پڑھ لیجیے:

توکل ایمان اور اسلام کے لیے شرط ہے

حق تعالیٰ شانہٗ نے مسلمانوں کو توکل اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اسے ایمان کے لیے شرط قرار دیا ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ " اور صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھو، اگر تم مومن ہو"۔ (سورۃ المائدہ: آیت ۲۳)

اورایک دوسری جگہ ارشاد ہے: وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۞ " اور موسیٰ نے (اپنی قوم سے) کہا کہ اے میری قوم! اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاچکے ہو تو اسی پر بھروسہ رکھو، اگر تم مسلمان ہو"۔ (سورۂ یونس: آیت ۸۴)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے باربار اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ یعنی "ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔"

(سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۲۲، ۱۶۰)

متوکل اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۞ یعنی اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی "جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے، اس کے واسطے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔"

اسی طرح توکل کی فضیلت پر بہت سی آیاتِ کریمہ قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اب توکل کی فضیلت پر چند احادیثِ شریفہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

متوکل بلاحساب وکتاب جنت میں جائے گا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل اور بھروسہ کرو جیسا کہ اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو تم کو وہ اس طرح روزی پہنچائے گا جس طرح (بغیر زیادہ محنت ومشقت کے سہولت کے ساتھ) پرندوں کو دیتا ہے، وہ صبح کو بھوکے (اپنے گھونسلوں سے) نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث شریف میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب کاموں کی نگرانی کرتا ہے اور اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے اور ایسی جگہ سے روزی پہنچاتا ہے جہاں سے اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو شخص دنیا کی پناہ لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

میری اُمت میں سے ستر ہزار لوگ بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو منتر نہیں کراتے اور نہ بدفالی اور بدشگونی لیتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔

(بخاری و مسلم)

متوکل کے لیے ہر حال میں اللہ ہی کافی ہے

اس حدیث میں جنت میں بے حساب داخل ہونے والوں کی تعداد رسول اللہ ﷺ نے ستر ہزار بتلائی ہے، ایک دوسری حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار اور بھی بلا حساب جنت میں داخل کیے جائیں گے۔ یہ ایک بات پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ستر کی تعداد سے مرادِ اگرچہ خاص عدد ہے، لیکن عربی محاوروں میں اکثر ستر کا لفظ غیر معمولی بہتات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یہاں بھی شاید بہت زیادہ کثرت مراد ہے، واللہ اعلم۔

توکل ہر پریشانی کا علاج ہے

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کا دل ہر قسم کی فکر میں الجھا رہتا ہے، جس کا دل ان تمام افکار کے پیچھے لگا رہتا ہے اللہ تعالیٰ کو اس کی پرواہ نہ ہو گی کہ اس کو کسی (پریشان کن جنگل اور) وادی میں ہلاک کرے اور (اس کے برعکس) جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ساری (پریشانیوں اور) غموں سے بچائے گا۔ (ابن ماجہ)

تفکرات انسان کو پریشان اور سرگرداں رکھتے ہیں، اس کو چین و سکون سے محروم کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ و توکل سے زیادہ کارگر اس کا کوئی علاج نہیں۔

توکل دل کی حالت کا نام ہے

اس بات کو پھر دہرائیں گے کہ توکل دل کی حالتوں میں سے ایک حالت ہے جو ایمان ویقین اور عقیدۂ توحید و تقدیر کا ثمرہ و نتیجہ ہے، کیوں کہ جس شخص کو اس حقیقت پر ایمان و یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ رحمان ورحیم وکریم ذات ہے اور یہ کہ کارخانۂ ہستی میں جو کچھ ہوتا ہے اور جس کو جو کچھ ملتا ہے یا نہیں ملتا سب براہِ راست اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلے سے ہوتا ہے اور ظاہری اسباب کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ چیزوں کو ہم تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کے مقرر کردہ ذرائع اور راستے ہیں۔

جس طرح بجلی جن تاروں کے ذریعے پہنچتی ہے وہ بجلی پہنچانے کے صرف راستے ہیں، یا گھروں میں پانی جن نلوں کے ذریعے پہنچتا ہے وہ پانی پہنچانے کے صرف راستے اور ذرائع ہیں، بجلی اور پانی کی تقسیم میں تاروں اور نلوں کا اپنا کوئی دخل اور حصہ نہیں ہے۔ اسی طرح اس عالم کائنات میں کارفرمائی اسباب کی بالکل نہیں، بلکہ کارفرما اور موثر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا حکم ہے۔ جس شخص کو اس حقیقت اوراللہ تعالیٰ کی حفاظت پر مکمل یقین ہو اس کو جس بات کے متعلق معلوم ہو جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم اور تعلیم ہے تو وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر اس حکم اور تعلیم پر سختی سے عمل کرے گا۔ نیز تمام مقاصد اور کاموں میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرے گا، اسی کی قدرت اور اسی کے کرم پر نظر رکھے گا، اسی سے امید یا خوف اور اسی سے دل اور لولگائے گا اور اسی سے دعا کرے گا۔

توکل کی صورتیں اور شکلیں

عملی طور پر توکل کی بڑی بڑی دو شکلیں اور دو صورتیں بن جاتی ہیں۔ ایک قسم اور صورت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی باتوں، وعدوں اور تعلیمات کے ساتھ اور دوسری قسم کا تعلق اسباب کے اختیار اور ترک کرنے کے ساتھ ہے۔ ان دونوں قسموں اور صورتوں کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

توکل کی پہلی صورت: اللہ تعالیٰ کی باتوں اور وعدوں پر مکمل بھروسہ اور عمل

اللہ تعالیٰ کی باتوں، یعنی اس کی تعلیمات و احکامات اور وعدوں وغیرہ پر مکمل بھروسہ اور عمل کرنا۔ دنیا میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ بادشاہوں وغیرہ کے وعدوں پر اعتماد و بھروسہ کرتے ہیں اور ان وعدوں کی وجہ سے طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، نیز یہ بھی دیکھتے ہیں کہ لوگ حاذق

اور تجربہ کار طبیب وڈاکٹر کی بات پر اعتماد و بھروسہ کرتے ہیں اس لیے اگر وہ سخت کڑوی دوا پینے یا آپریشن کے متعلق کہتا ہے تو اس سختی کو بھی جھیلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر یہی طبیب اورڈاکٹر ان کو مرغوب اور پسندیدہ چیزوں سے منع کرتا ہے تو وہ آسانی سے اپنی مرغوبات اور پسندیدہ چیزوں کو چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ ڈاکٹر کی رہنمائی، تعلیم اور علاج پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہیں، حالاں کہ یہ بات معلوم ہے کہ بعض مرتبہ ماہر سے ماہر، تجربہ کار طبیب اور ڈاکٹر کے بتلائے ہوئے علاج وپرہیز سے بھی بیمار تندرست نہیں ہوتا، بلکہ مرض اور بڑھ جاتا ہے۔

صرف اللہ تعالیٰ ہی ایک ایسی ہستی ہے کہ جو لامحدود خزانوں کی مالک، ہر چیز کے کرنے پر قادر اور مختار کل ہے۔ وہ جو بھی وعدہ کرتا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ وہی فیصلہ کرنے والا ہے، کوئی نہیں جو اس پر اپنا فیصلہ نافذ کر سکے یا اس کے فیصلے میں ردوبدل کر سکے۔ آخر وہی تو ہے جو ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔ طبیب اور ڈاکٹر کی باتوں پر اور اس کے بتلائے ہوئے علاج پر اس وجہ سے اعتماد اور بھروسہ کیا جاتا ہے کہ اس کے علاج سے بعض بیماروں کو اللہ تعالیٰ نے صحت دی ہے تو اللہ رب العالمین، حکیم ذات، جو نہ بھولتا ہے نہ دھوکہ کھاتا ہے، جس کا علم، حکمت اور بادشاہی کائنات کے ذرے ذرے پر محیط ہے، جو ہر چیز کی ابتدا اور انتہا کو خوب جانتا ہے، جو صرف روحانی اور جسمانی بیماریوں کے اسباب اور ان کے علاج کو جاننے والا ہی نہیں، بلکہ بیماری وصحت کے اسباب کو پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ اُسی نے اپنی قدرت سے انسان کو بنایا ہے اور اس کے لیے آسمان وزمین کی چیزیں پیدا کی ہیں، تو وہی ہے جو خوب جانتا ہے کہ انسان کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کس چیز میں ہے اور کون سی چیزیں ہیں جن کو اختیار کیے بغیر ایک انسان کی دنیا و آخرت برباد ہو جاتی ہے۔

ایمان والوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لیے مصیبتیں جھیلیں

یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے، اللہ تعالیٰ کی باتوں، اس کی تعلیم وہدایت اور اس کے وعدوں وغیرہ پر کامل اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے، وہ دنیا کی ہر تکلیف، ہر مصیبت کو برداشت کر کے اللہ تعالیٰ کی تعلیم اور حکم کو پورا کرتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کی پوری جماعت اور ان کی پیروی کرنے والے بہت سے ایمانداروں کو دیکھیے کہ پوری دنیا مل کر ان کو اللہ تعالیٰ کے ایک حکم سے بھی نہ ہٹا سکی اور ان کو اگر اللہ

تعالیٰ کے صرف ایک حکم کے مقابلے میں پوری دنیا کی مال و دولت اور بادشاہی دے دی جاتی یا ان کو سخت سے سخت سزا، یا موت کی بھی دھمکی دی جاتی، تو بھی وہ اللہ تعالیٰ کے صرف ایک حکم کے چھوڑنے یا اس میں ذرہ برابر ترمیم کرنے کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کو سمجھانے کے لیے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

فرض کریں کہ ڈاکٹروں اور طبیبوں کی ایک جماعت نے ایک چیز کے متعلق یوں کہہ دیا کہ اگر اس کو کھایا جائے تو انسان ہزار سال تک زندہ رہ سکتا ہے، لیکن اس بوٹی کا اثر اس قدر تلخ ہے کہ اس کو کھاتے ہی انسان پریشان ہو جاتا ہے اور اس کے جسم پر سخت قسم کی خارش شروع ہو جاتی ہے اور زندگی کے ہر ایک لمحہ کے بعد پریشانی بڑھتی جاتی ہے اور خارش تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے، تو جس شخص کو ڈاکٹروں اور طبیبوں پر کچھ اعتماد ہو کہ یہ ٹھیک بول رہے ہیں اگر پوری دنیا مل کر اس شخص کو مال و دولت کی پیشکش کریں یا اس کو آروں سے چیرنے یا تیل میں جلانے کی دھمکی دیں تو بھی وہ شخص کبھی اس بوٹی کو کھانے کا تصور نہیں کرے گا، کیوں کہ وہ یہی سمجھے گا کہ ہزار سال تک ہر لمحہ کی نئی نئی مصیبت اور نئی نئی موت سے بہتر یہی ہے کہ ایک بار مر جاؤں۔

دوسری مثال یوں سمجھیے کہ دنیا کا کوئی بادشاہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا ہے اور اس نے اپنی رعایا سے جو وعدے کیے ہیں وہ اُن کو حتی الوسع پورا کرتا ہے۔ وہ کسی شخص سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں علاقے میں جاؤ اور وہاں کے ڈاکوؤں کو گرفتار کرو، اگر آپ نے گرفتاری میں پوری کوشش کی تو گرفتار کرنے کی صورت میں آپ کو کروڑوں روپے دیے جائیں گے، اگر آپ کو فوج کی ضرورت پڑی تو فوج بھی بھیج دی جائے گی، اگر زخمی ہوئے تو علاج بھی کیا جائے گا، اگر مارے گئے تو آپ کی اولاد اور اہل و عیال کے لیے لاکھوں روپے کے وظائف مقرر کیے جائیں گے اور ان کو اچھے عہدوں پر فائز کیا جائے گا، ایسی صورت میں وہ جان کی پرواہ کیے بغیر ڈاکوؤں کا تعاقب کرے گا اور سخت سے سخت تکالیف جھیلے گا۔ اگر رعایا اپنی طرح کمزور انسان کے وعدے پر اس قدر اعتماد کر سکتی ہے اور اپنے آپ کو سخت مشقت اور موت کے منہ میں ڈال سکتی ہے تو اللہ تعالیٰ جو ہر قسم کی نعمتوں اور خزانوں کا مالک ہے اور جس کی راہ میں جو قتل کیا جائے اُسے وہ اس دنیا سے اچھی زندگی اور ابدی بادشاہی و سلطنت دے دیتا ہے تو اس کی

باتوں اور وعدوں پر کیونکر بھروسہ نہیں کیا جائے گا، البتہ یہ سعادت صرف ایمانداروں کو حاصل ہے۔

ایمانداروں کو ایک طرف تو اللہ تعالیٰ سے سخت محبت ہوا کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ پوری دنیا اوراس کی نعمتوں کو خیر باد اور محبوب حقیقی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں ہر قسم کی تکلیف پر لبیک کہتے ہیں۔ دوسری طرف ان کو اللہ تعالیٰ کی باتوں اور وعدوں پر اعتماد و بھروسہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی تکلیف اور مصیبت کو خوشی سے برداشت کرلیتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اور اس کا حکم چھوڑنا ایک ایسی بُوٹی اور ایک ایسا زہر ہے جس کو اختیار کرنے اور کھانے کے بعد میری ابدی اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی تباہ وبرباد ہوجائے گی اور میری ہمیشہ کی زندگی کا ہر لحہ نئے نئے اور سخت سے سخت ترین عذاب کی طرف بڑھتا چلا جائے گا، اور اس کا حکم پورا کرنا اور اس کی رہنمائی میں چلنا ہر مصیبت اور ہر تکلیف کو راحت وسکون میں تبدیل کرتا ہے اور انسان کی ہمیشہ کی زندگی ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی نئی نئی اور لذیذ سے لذیذ ترین نعمتوں کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا توکل کی پہلی صورت اور شکل یہی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی باتوں، اُس کی تعلیم اور رہنمائی اور اُس کے وعدوں وغیرہ پر کامل بھروسہ ہو کہ زندگی گزارنے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو تعلیم وہدایت دی ہے، بس وہی حق ہے۔

جن اخلاق، اعمال اور چیزوں کے اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہی برحق ہیں، ان ہی میں انسان کی خیر ہے، اور جن بداخلاقیوں اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے کر ان سے منع فرمایا ہے، وہی چیزیں انسان کی دنیا اور آخرت کی تباہی کا سبب ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ہر بات پوری ہو کر رہے گی۔

توکل کی پہلی صورت کے متعلق قرآن مجید کی چند آیات

اب توکل کی اس پہلی صورت کے متعلق چند آیات کو پڑھ لیجیے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

" اے نبی ﷺ!(حسبِ سابق) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیے اور کافروں و منافقوں کے پیچھے نہ چلیے، بے شک اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے اور آپ اس وحی (اور بات) کی پیروی کرتے رہیے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ کو کی جاتی ہے، یقیناً جو کچھ تم لوگ کرتے رہتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے اچھی طرح باخبر ہے، اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرو، اللہ تعالیٰ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے"۔

(سورۃ الاحزاب: آیت ۱ تا ۳)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ کفار و منافقین کی مخالفانہ و معاندانہ کوششوں، پروپیگنڈوں اور دھمکیوں سے قطعاً بے پرواہو کر اپنے کام میں لگے رہیں اور بتایا گیا کہ کسی مصلحت وغیرہ کی بنا پر ان کی بے جا فرمائشوں اور مکارانہ مشوروں کو نہ مانیں، بلکہ آپ اپنی تعلیمات اور ہدایات پر چلیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتلائی جاتی ہیں کیوں کہ وہ علیم و خبیر اور بڑی حکیم ذات ہے جو حالات کو جاننے والی ہے اور ہر چیز اور ہر کام و عمل کے نتیجے اور انجام کو خوب جانتی ہے اور اس کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ بندوں کی مصلحت اور فائدہ کس چیز اور کس کام میں ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ، اُس کی رہنمائی اور اس کے وعدوں پر توکل اور مکمل بھروسہ کریں اور وہ ہر کام بنانے کو کافی ہے۔

۲۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

" جو لوگ ایمان نہیں لائے، آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تم اپنی جگہ (اور اپنی حالت اور طریقے) پر عمل کرتے رہو، ہم بھی (اپنے طریقہ) پر عمل کرتے رہتے ہیں اور تم بھی (نتائج کے) منتظر رہو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں اور سارے امور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، پس (اے پیغمبر) آپ اس کی بندگی کیجیے اور اس ذات پر، (اُس کی رہنمائی اور وعدوں وغیرہ) پر توکل (اور بھروسہ) رکھیے اور جو کچھ تم کرتے ہو، تمہارا رب اس سے بے خبر نہیں ہے"۔

(سورۃ الھود: آیت ۱۲۱ تا ۱۲۳)

۳۔ وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۝ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝ فَاِنۡ عَصَوۡکَ فَقُلۡ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ وَتَوَکَّلۡ عَلَی الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ۝

" اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایا کریں، اور جو لوگ مومنین (کی جماعت) میں داخل ہو کر تمہاری پیروی اختیار کریں، ان کے لیے (شفقت کے) پروں کو جھکا دیجیے (یعنی ان کے ساتھ شفقت اور تواضع سے پیش آئیں)، پھر اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اس سے میں بیزار ہوں اور اس غالب (زبردست اور) رحیم (ذات) پر توکل کرو"۔

(سورۃ الشعراء: آیت ۲۱۴ تا ۲۱۷)

ان آیات میں بھی دوسرے امور کے ساتھ اس بات کی تعلیم دی جاتی ہے کہ کسی طاقت اور سخت مشکلات کی پروا کیے بغیر اپنا کام کرتے رہو ، اللہ تعالیٰ کے احکامات پر سختی سے جمے رہو، اسی کی رہنمائی و تعلیم اور وعدوں وغیرہ پر بھروسہ کرتے ہو جو غالب ہو کر رہے گا، اس کو دنیا کی کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی۔

۴۔ وَاتۡلُ عَلَیۡہِمۡ نَبَاَ نُوۡحٍ ۘ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ اِنۡ کَانَ کَبُرَ عَلَیۡکُمۡ مَّقَامِیۡ وَتَذۡکِیۡرِیۡ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَعَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَکُمۡ وَشُرَکَآءَکُمۡ ثُمَّ لَا یَکُنۡ اَمۡرُکُمۡ عَلَیۡکُمۡ غُمَّۃً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَیَّ وَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ۝

" (اے پیغمبر) ان کو نوح کا حال سنائیے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! اگر (تمہارے درمیان وعظ و دعوت کے لیے) میرا کھڑا ہونا اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے وعظ و نصیحت کرنا تم پر گراں گزرتا ہے (تو ہوا کرے، مجھے اس کی کچھ بھی پروا نہیں کیوں کہ) میں تو صرف اللہ تعالیٰ (پر، اس کی تعلیم و رہنمائی اور وعدوں) پر بھروسہ رکھتا ہوں لہٰذا تم (میرے خلاف اور میری ضرر رسانی اور مجھے ختم کرنے کے لیے) اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے مل کر اپنی تدبیر (اور متفقہ فیصلہ) کو خوب مضبوط کر لو اور پھر تم پر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے (اور تدبیر و فیصلے کا کوئی پہلو اور کوئی جز نظر سے ہٹنے نہ پائے) پھر میرے ساتھ (جو کچھ کرنا چاہتے ہو) کر گزرو اور مجھ کو (ذرہ بھی) مہلت نہ دو"۔ (سورۃ یونس: آیت ۷۱)

ایک پیغمبر کا اللہ تعالیٰ کی ذات، اُس کی باتوں اور اُس کے وعدوں پر یقین و توکل کو دیکھ لیجیے کہ پوری قوم کو للکار کر اعلان فرماتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور نافرمانی کے خوف کے مقابلے میں کسی کا ڈر نہیں، اُن کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں، اُس کی تعلیمات اوراُس کی نصرت پر اس قدر کامل بھروسہ اوراعتماد ہے کہ پوری دنیا کی طاقتیں اور قوتیں اس کے خلاف جمع ہوجائیں تو اُن کی یہ تدابیر اور قوتیں و طاقتیں پاش پاش ہوں گی اور آخری جیت اُن ہی کی ہوگی، اوریہی ہوا کہ بالآخر نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف پوری قوم غرق ہوگئی اور نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے چند امتیوں کے ساتھ غالب آگئے اور نجات پاگئے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اسی قسم کا مضمون ہے جن میں سے چند آیتوں کو پیش کیا گیاہے۔یہ اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم و رہنمائی اوراس کے کیے ہوئے وعدوں وغیرہ پر مکمل اعتماد و بھروسہ کرکے ان کے مطابق عمل کرنا اللہ تعالیٰ پر توکل کہلاتا ہے اور توکل کی یہی وہ صورت ہے جو توکل کے باب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے علاوہ توکل کی جس قدر اقسام یا صورتیں بیان کی جاتی ہیں، وہ اسی توکل کی شاخیں یا اجزا ہیں، اوریہی وہ توکل ہے جس کو یقین بھی کہا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ پر اوراس کی باتوں اور وعدوں وغیرہ پر مکمل یقین کرنا۔

توکل کی دوسری صورت: اسباب کے بجائے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ

توکل کی دوسری قسم یاصورت یہ ہے کہ آدمی کا بھروسہ اسباب و وسائل اوراپنی قابلیت اور تدبیروں یادوسروں کی نصرت پر نہ ہو، بلکہ ہر معاملہ میں اس کا اعتماد و بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہو۔

اسباب کو اختیار کرنا اور اسباب پر بھروسہ نہ کرنا

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اسباب پر بھروسہ نہ کرنے کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ اسباب و وسائل یا تدبیروں کو بالکل چھوڑ دیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسباب اور تدبیروں کو اختیار کرنے اور بروئے کار لانے کے وقت بھی مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے بھروسہ اسباب و تدابیر کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ پر ہو۔ مثلاً کفر اور باطل سے لڑنے کے لیے ہتھیار اور جسمانی قوت و ہنر حاصل کرتے

وقت یہ خیال ہو کہ میری کوششوں اور تدبیروں سے جنگ کے اسباب و آلات اور قوت وغیرہ حاصل نہ ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ ہی اسباب اور قوت و مہارت دینے والا ہے۔ تو جنگی اسباب ومہارت حاصل کرنے کی کوشش اختیار کرتے وقت اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو، کیوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت نہ ہو تو مضبوط سے مضبوط اسباب و آلات اور چالیں بھی طوفان کے سامنے مکڑی کا جالا بن جاتی ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت شامل ہو جائے تو مکڑی کے جالے جیسے کمزور اسباب بھی دشمن کی عقل کو خراب اور اُس کی قوتوں کو مفلوج کر سکتے ہیں جیسا کہ غارِ ثور میں یہ معاملہ پیش آیا، اور جب ہتھیار وغیرہ حاصل ہو جائیں اور مقابلہ شروع ہو جائے پھر بھی قوت، جنگی چالوں اور ہتھیاروں پر کوئی اعتماد اور بھروسہ نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ ہو کہ یہ تمام اسباب و ذرائع اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں اور وہی ان میں تاثیر، برکت اور قوت ڈال دینے والا اور فتح دینے والا ہے، وہی باطل کے مقابلہ میں ہماری مدد فرمائے گا۔

ایک متوکل شخص قرض بھی مانگتا ہے اور حکومت کے کارندوں سے پاسپورٹ وغیرہ بھی بنواتا ہے لیکن اس کا بھروسہ و اعتماد اپنی کوشش، اپنے منصب یا اپنے تعلقات وغیرہ پر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس وقت بھی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ میرا کام بنانا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگا۔

جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہیے

جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنا چاہیے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لِيَسْأَلْ اَحَدُكُمْ رَبَّهٗ حَاجَتَهٗ كُلَّهَا حَتّٰى يَسْأَلَ شِسْعَ نَعْلِهٖ اِذَا انْقَطَعَ "تم کو چاہیے کہ اپنی تمام حاجات اللہ تعالیٰ سے مانگا کرو یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی جب ٹوٹ جائے (تو وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ سے مانگا کریں) اور ایک روایت ثابت بنانی سے مرسل طور پر ذکر ہے جس میں اتنا اور اضافہ بھی نقل کیا گیا کہ نمک بھی اس سے مانگو"۔ (ترمذی)

دیکھیے! اس حدیث کا یہ مطلب تو نہیں کہ جوتے کا تسمہ جب ٹوٹ جائے تو اس کو موچی سے نہ بنوایا جائے یا خود نہ بنایا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ تسمہ بنانے کے اسباب اختیار کرتے وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگا کریں، تاکہ وہ اس کے بنانے کو آسان بنائے اور اچھے اسباب میسر فرمائے اور اچھی طرح

بن جائے۔ جیسا کہ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ: فَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ اِنْ لَّمْ یُیَسِّرْہُ لَمْ یَتَیَسَّرْ "کیوں کہ اللہ تعالیٰ اگر آسان نہ بنائے تو بے شک (جوتے کا تسمہ بھی) میسر نہ ہو سکے گا"۔

(شعب الایمان)

خلاصہ یہ ہوا کہ ایک متوکل کی نظر اور اس کا بھروسہ و اعتماد ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے، اس لیے وہ ہر حال میں اسی سے ہی مانگتا رہے گا اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے جن اسباب کو حاصل کرنا چاہیے اُن کو حاصل کرنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ ہی سے جائز اسباب مانگے گا اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر، اُسی کے بھروسہ پر کوشش کرے گا اور ناجائز اسباب سے بچنے کی کوشش کرے گا، نیز وہ اسباب کے حصول میں اس قدر مشغول نہ ہو گا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام سے غافل ہو جائے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اسباب عطا فرمائے تو اس کا شکر ادا کرے گا اور برابر اللہ تعالیٰ سے مطلوبہ نتائج مانگتا رہے گا، اور جب مطلوبہ نتائج حاصل ہو جائیں تو پھر فخر و تکبر میں مبتلا ہونے اور اِترانے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے گا اور تواضع اختیار کرے گا۔

یہی تعلیم اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں جگہ جگہ مختلف انداز میں دیتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے: فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۝ "پس تم اللہ تعالیٰ ہی سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف (قیامت میں) لوٹائے جاؤ گے"۔

(سورۃ العنکبوت: آیت ۱۷)

توکل کی دوسری صورت کے متعلق آیاتِ کریمہ اور احادیثِ شریفہ

توکل کی دوسری صورت کو سمجھنے کے بعد اس کے متعلق قرآن مجید کی چند آیات اور رسول اللہ ﷺ کے چند ارشادات پیش کرتے ہیں:

۱۔ نبی کریم ﷺ کو ارشاد کیا جاتا ہے: وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ۝ "آپ ان (صحابہ کرام) سے اپنے امور (یعنی جہاد و غیرہ کاموں) میں مشورہ لیجیے، پھر (مشورہ وغیرہ کے بعد) جب تم نے (کسی بات کا) عزم (یعنی پکا ارادہ) کر لیا تو اللہ تعالیٰ پر توکل (بھروسہ) کر لیجیے، بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کے ساتھ محبت رکھتا ہے"۔

(سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۵۹)

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ تدبیر اور عقل و فکر کے گھوڑے دوڑا کر کوشش کرنے کے بعد جو بات طے ہو جائے، اور جب بات ٹھان لی جائے تو اس پر کاربند ہو کر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں اور اسی پر بھروسہ رکھیں۔

۲۔ حضرت یعقوب علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ و السلام نے اپنے بیٹوں کو مصر بھیجتے وقت جو نصیحت کی، اس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ

" اور (یعقوب نے) کہا: اے میرے بیٹو! ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا، بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا اور تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھی بات اور تقدیر سے میں ذرہ بھی نہیں بچا سکتا۔ حکم (اور فیصلہ) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے نہیں (اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مقابلہ میں کسی کی طاقت اور حکم نہیں چلتا)، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی پر توکل کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے"۔

(سورۃ یوسف: آیت ۶۷)

اس آیتِ کریمہ میں حضرت یعقوب علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ و السلام نے اپنے بیٹوں کو جو نصیحت کی، اس میں اگر ایک طرف اسباب اور تدبیر کو اختیار کیا اور بتایا کہ حکومتِ مصر کے ایک ہی دروازے سے سب کے سب داخل نہ ہونا، تاکہ حکومت وغیرہ کی طرف سے کوئی مصیبت پیش نہ آئے تو دوسری طرف بتایا کہ کائنات میں فیصلہ اور حکم صرف اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے، اس کے حکم اور فیصلہ کے مقابلہ میں تمام تر قوتیں، طاقتیں اور تدبیریں ہیچ ہیں، لہٰذا جو کچھ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور تقدیر میں ہو گا وہی بات پیش آئے گی، اور میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ذرہ برابر بھی نہیں بچا سکتا، البتہ ظاہری اسباب اور تدابیر کو اختیار کرنا چاہیے، مگر بھروسہ اسباب و تدابیر پر نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ پر کرنا چاہیے، اور یہی متوکلین کا شیوہ اور عادت ہے۔

۳۔ نبی کریم ﷺ نے اسباب اور تدبیر کو اختیار کر کے اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کی تعلیم فرمائی۔ چناں چہ حضرت مغیرہ بن ابی قرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت سنا کہ

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنی اونٹنی کو باندھ کر توکل کروں یا اس کو چھوڑ دوں اور توکل کروں (کہ میری اونٹنی مجھے مل جائے گی) تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اِعقِلْهَا وَتَوَكَّلْ یعنی اونٹنی کو باندھ کر توکل کر۔ (ترمذی: ابواب صفۃ القیامۃ)

توکل کے متعلق افراط وتفریط

قرآن کی بہت سی آیات اور نبی کریم ﷺ کی بہت سی احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اسباب و تدابیر کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں، البتہ اسباب و وسائل کو کس حد تک اختیار کرنا چاہیے اور کس حد تک ان میں ڈوبنا چاہیے۔ اس کے متعلق لوگوں میں افراط و تفریط پایا جاتا ہے اور اس کے متعلق علمی طور پر عموماً تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں:

۱۔ ان میں سے ایک قسم کے لوگ تو وہ کفار اور دہریہ وغیرہ ہے جو سرے سے تقدیر و توکل کے قائل ہی نہیں، انہوں نے تو مادی اسباب و وسائل کو ہی خدا بنا رکھا ہے، اس لیے وہ اسباب کو حاصل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے کو اختیار کر لیتے ہیں۔

۲۔ دوسری قسم ایسے لوگوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ تقدیر و توکل کے قائل ہیں لیکن انہوں نے توکل کا مطلب یہ لے لیا ہے کہ سب کسب، محنت و مزدوری اور تدبیروں کو چھوڑ چھاڑ کر سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کیے جائیں اور خود ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ جو قسمت میں ہوگا وہ ہو جائے گا اور ملتا رہے گا۔ اس کے لیے وہ تقدیر اور توکل کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے بعض ارشادات کو بھی پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میری امت سے ستر ہزار لوگ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو منتر نہیں کراتے، بدشگون اور بدفالی نہیں لیتے اور (اپنے تمام امور میں) صرف اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں"۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے وہ یہ مطلب لیتے ہیں کہ ہر قسم کے اسباب اور معاشِ زندگی کا ترک کرنا گویا توکل ہے، حالاں کہ اس سے مراد نفسِ دوا، علاج اور تدبیر کو چھوڑ دینے کی ترغیب نہیں، بلکہ یہاں مراد

جاہلیت کی تمام برائیوں کی بیخ کنی ہے۔ ان میں سے ایک جھاڑ پھونک وغیرہ تھی اور زمانہ جاہلیت میں لوگ اسی جھاڑ پھونک کو دکھ درد، اور بیماری کو ختم کرنے کا ایک آسان طریقہ سمجھتے تھے، یہ منتر اور جھاڑ پھونک بھی عموماً مشرکانہ اور ناجائز ہوتے تھے۔ دوسری برائی ان میں یہ بھی تھی کہ وہ اپنے نفع ونقصان کے لیے پرندوں کے اڑجانے اور آواز وغیرہ سے شگون وفال لیتے تھے، اگر شگون وفال برا نکلتا تو سمجھتے کہ اس کام میں فائدہ نہیں ہوگا یا نقصان ہوگا، اس لیے اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے دونوں برائیوں کی مختلف موقعوں پر مذمت فرمائی ہے، جھاڑ پھونک کے جائز یا ناجائز ہونے کا بیان تو ان شاء اللہ آگے آجائے گا، البتہ بدفالی کی مذمت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پڑھ لیجیے: لَاطِيَرَةَ وَخَيْرُهَا الْفَأْلُ قِيلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْفَأْلُ قَالَ اَلْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ يَسْمَعُهَا اَحَدُكُمْ "بدشگونی (کی کوئی حقیقت) نہیں ہے اور اس سے بہتر تو (اچھی) فال ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ وہ فال کیا چیز ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اچھی بات جس کو تم میں سے کوئی شخص سنے"۔

(بخاری ص ۱۰۷۰ ح ۵۷۵۵ و مسلم ص ۸۷۷ ح ۲۲۲۳)

طیرہ بدشگونی اور بدفالی کو اور فال نیک شگون اور نیک فالی کو کہتے ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بدشگونی اور بدفالی ایک بے حقیقت چیز ہے، اس کا نفع ونقصان سے کوئی تعلق نہیں اور نہ شریعتِ مطہرہ نے اس کو نفع ونقصان حاصل کرنے کا کوئی سبب مقرر فرمایا ہے، لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس لیے بدفالی لے کر اپنے آپ کو خواہ مخواہ خوف، رنج اور ناامیدی میں مبتلا نہ کیا جائے۔ ایک حدیث میں بدشگونی کے متعلق فرمایا گیا کہ بدشگونی اور بدفالی شیطان کا کام ہے۔ (ابوداؤد، مشکوۃ)

ایک حدیث میں بدشگونی اور بدفالی کو شرک کہا گیا ہے۔ (ابوداؤد، ترمذی، مشکوۃ)

جس کا مطلب یہی ہے کہ یہ مشرکین کے طور طریقوں اور ان کی عادات میں سے ہے اور یہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے ناامید کر کے اللہ تعالیٰ پر اس کا توکل ختم کرا دیتا ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ نے بدشگونی اور بدفالی کے وقت تعلیم دے دی کہ اس کی وجہ سے کسی کام یا سفر کو نہ چھوڑیں بلکہ اس موقع پر اگر بتقاضائے بشریت دل ودماغ میں کوئی وہم اور تردد پیدا ہو جائے تو اس وہم وتردد پر قطعاً بھروسہ واعتماد نہ کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ پر یقین وتوکل رکھیں اور اپنے کاموں اور سفر وغیرہ کو جاری رکھیں۔ چناں چہ عروہ

بن عامر (تابعی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بد شگونی اور بد فالی کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اَحْسَنُهَا الْفَالُ وَلَا تَرُدُّ مُسْلِمًا فَاِذَا رَاٰى اَحَدُكُمْ مَايَكْرَهُ فَلْيَقُلِ اَللّٰهُمَّ لَا يَاْتِيْ بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّاٰتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ "اس کی بہترین صورت (اچھی) فال ہے اور (یاد رکھو!) کسی مسلمان کو بد شگونی اور بد فالی (اپنے مقصد و ارادے سے) باز نہ رکھے، اور جب تم میں سے کوئی شخص ایسی چیز کو دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے (یعنی ایسی چیز جس سے بد شگونی اور بد فالی لی جاتی ہے اور جو دل و دماغ میں وہم پیدا کرتی ہے) تو چاہیے کہ یہ دعا پڑھے: اَللّٰهُمَّ لَا يَاْتِيْ بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّاٰتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ "اے اللہ! اچھائیوں کو لانے والا صرف تو ہے اور صرف تو ہی خرابیوں کو دور کرنے والا ہے اور برائی سے بچانا اور نیکی کی قوت و توفیق صرف آپ ہی کی طرف سے ہے"۔ (ابوداؤد مرسلاً، مشکوٰۃ)

نیک فال امید دلاتی ہے اور مستحب ہے

مذکورہ بالا حدیثوں میں نیک فال کو اچھا اور مستحب قرار دیا گیا ہے۔ نیک فال یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسا جملہ سنائی دے جس سے اس کے دل میں اپنے مطلوب و مقصود کو حاصل ہو جانے کی امید پیدا ہو جائے اور اس جملہ کو گویا وہ اپنے حق میں ایک اچھی پیشگوئی سمجھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کام کے لیے باہر نکلتے تو آپ ﷺ کو یہ اچھا معلوم ہوتا کہ کسی کی زبان سے یہ سنیں، "اے راشد"، "اے نجیح"۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

بہر حال نیک فال لینا اچھا اور مستحب ہے اور بد شگونی اور بد فالی لینا مذموم اور ممنوع ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نیک اور اچھی فال دل میں اطمینان اور خوشی پیدا کرتی ہے، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے اچھائی اور بھلائی کی امید آوری ہوتی ہے اور یہ انسان کے عمل و کسب اور نیک ارادوں کے پورا کرنے میں اور زیادہ تقویت دینے والی ہے۔ اس کے برعکس بد فالی دل میں غم و رنج اور ناامیدی پیدا کرتی ہے اور عمل، کسب اور سفر وغیرہ سے روک دیتی ہے۔

غرض یہ کہ جو لوگ ترکِ اسباب کے لیے جنتر منتر اور بد شگونی کے چھوڑنے کو دلیل میں پیش کرتے ہیں، یہ دلیل ان لوگوں کے لیے راست نہیں آسکتی، بلکہ یہاں تو ان اسباب اور تدبیروں کو توکل

کے خلاف بتایا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں اور شریعتِ مطہرہ نے جن کو غلط قرار دیا ہے، نیز ایسے لوگ ترکِ اسباب کے متعلق اس حدیث کو بھی پیش کرتے ہیں جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

"اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایسی روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں"۔

اگر معمولی غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں بھی اسباب و ذرائع کو بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، کیوں کہ پرندے اپنے آشیانوں اور گھونسلوں سے نکلتے ہیں تو پھر ان کے سیر ہونے کا بندوبست کیا جاتا ہے، لہٰذا ترکِ اسباب کا اثبات اس حدیث سے اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ نبی کریم ﷺ یوں فرماتے کہ پرندے صبح و شام خالی پیٹ اپنے آشیانوں میں بیٹھے رہتے ہیں اور سیر ہو جاتے ہیں۔

۳۔ تیسری قسم وہ ہے جو شریعت میں مطلوب ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے کہ اسباب اختیار کیے جائیں، لیکن بھروسہ اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر ہو۔

اسباب نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ بلا مقررہ اسباب کے دوسرے ذرائع سے روزی پہنچا دیتا ہے

اس میں شک نہیں کہ جہاں اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے چلنے پھرنے جیسے اسباب نہیں دیئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ان کی غذا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پہنچا دیتا ہے جیسا کہ پتھروں کے اندر کیڑے یا گھونسلوں میں پرندوں کے بچے، کہ اُن کے لیے اُن کی مائیں روزی لا کر گھونسلوں میں کھلایا کرتی ہیں، لیکن جہاں اللہ تعالیٰ نے اسباب مہیا فرمائے ہیں وہاں اس قدر اسباب کو اختیار کیا جائے گا جس قدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے میسر ہیں۔ تو اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگ ایسا توکل کرنے لگو جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو اللہ تعالیٰ زیادہ محنت و مشقت کے بغیر سہولت کے ساتھ روزی پہنچائے گا، جس طرح پرندوں کو بغیر زیادہ محنت و مشقت کے خوشی اور سہولت کے ساتھ روزی عطا فرماتا ہے۔

غرض یہ کہ اس طرح کی احادیث توکل کے باب میں لا کر ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ جائز اسباب کے چھوڑنے کو توکل کہنا صحیح نہیں، اور نہ یہ بحث و تحقیق کا طریقہ ہے کہ کسی مسئلہ کے متعلق قرآن و حدیث میں سے ایک آدھ آیت اور حدیث لے لی جائے اور اس کے متعلق آئی ہوئی بقیہ تمام

آیات واحادیث کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اب مقررہ اسباب کو اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں، اس کے متعلق دلائل پڑھ لیجیے۔

تدبیر اور اسباب کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں: مزید دلائل

اس مسئلہ کی وضاحت تقدیر کے باب میں بھی کی جاچکی ہے، نیز مذکورہ بالا دو آیات اور ایک حدیث سے بھی یہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ تدابیر اور اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں، لیکن پھر بھی اس کے متعلق چند دلائل اور پیش کرتے ہیں تاکہ یہ مسئلہ ایسا واضح ہو جائے کہ کمزور ذہن والے لوگ بھی اچھی طرح سمجھ جائیں۔

۱۔ اگر عمل و کسب اور تدبیر کا چھوڑنا ہی توکل ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو نہ بھیجتا اور نہ وہ نماز، روزہ، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد، کوشش اور جہاد وغیرہ کی تعلیم دیتے۔

۲۔ نماز اہم ترین عبادت ہے اور اسلام کا عظیم رکن ہے، لیکن اس کے متعلق بھی جنگ وغیرہ کے وقت حکم ہے کہ اگر دشمن کی طرف سے یہ خوف ہو کہ وہ حملہ کریں گے یا تکلیف پہنچائیں گے تو: فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ یعنی چاہیے کہ ان (صحابہ کرام) میں سے ایک حصہ (نماز میں) آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے اپنے ہتھیار لیے رہیں۔

اسی طرح خوف (جنگ) کی نماز کا طریقہ بتلا کر آخر میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح نماز کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ: وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً " (یاد رکھو!) کافروں کی دلی تمنا ہے کہ اگر تمہیں اپنے ہتھیاروں اور سامان سے (ذرہ برابر) غافل پائیں تو یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑیں"۔ (سورۃ النساء: آیت ۱۰۲)

دیکھیے! یہاں خوف و خطرہ کے وقت تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، سب کے سب نماز میں مشغول ہو کر اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، اس کی تعلیم نہیں دی گئی بلکہ فوج کے ایک حصہ کو نگہبانی پر لگائے جانے کا حکم اور نماز میں بھی اپنے اپنے ہتھیار لیے رکھنے کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کی تعلیم دینے والا قرآن مجید خود مسلمان کو ہر طرح کے سامان اور آلاتِ جنگ سے لیس ہونے کی تاکید کر رہا ہے۔ چناں چہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ "اور جہاں تک تمہارے بس میں ہے ان (دشمنانِ اسلام کے مقابلے) کے لیے قوت وطاقت، اور بندھے ہوئے گھوڑوں کو تیار رکھو تاکہ تم ان (جنگی تیاریوں اور سامانِ جنگ) کے ذریعے خوف زدہ کردو اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو اور ان (کھلے دشمنانِ اسلام) کے علاوہ دوسرے (خفیہ) دشمنوں (اور منافقوں) کو جنہیں تم نہیں جانتے (البتہ ان خفیہ دشمنوں کو) اللہ تعالیٰ ان کو جانتا ہے"۔ (سورۃ الانفال: آیت ۶۰)

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو جنگی تیاریوں ، مقدور بھر کوشش و محنت اور جنگی قوت پیدا کرنے کا حکم ہے، تاکہ ان کے ذریعے اسلام کے کھلے اور خفیہ دشمنوں کو مغلوب اور مرعوب کیا جاسکے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھیں کہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جب تک ہر اعتبار سے مکمل قوت اور طاقت یکجانہ ہو جائے اس وقت تک میدان میں نہ جائیں، بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے اور جس قدر بس چلے، اسی قدر قوت وطاقت پیدا کریں اور دشمنانِ اسلام کے مقابلے کے لیے تیار رہیں۔

۳۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں جنگی تیاریوں کا حکم دیا ہے اور خود بھی اپنی حفاظت کے لیے زرہیں اور خود پہنتے تھے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ جہاد کے بیان میں آئے گا۔

۴۔ نمازِ جمعہ کی اذان پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ حکم دیا ہے کہ دنیا کا کاروبار چھوڑ کر خطبہ و نماز میں شامل ہونے کا اہتمام کریں اور نماز ختم ہونے کے بعد ان الفاظ میں اجازت دی ہے:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

" پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔ (سورۃ الجمعہ: آیت ۱۰)

چوں کہ اس سے پہلے کی آیتِ کریمہ میں کاروبار چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے اس لیے اس آیتِ کریمہ میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد زمین میں پھیل جانے اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم (یعنی روزی) تلاش

کرنے اور کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی کہ پورا دن کاروبار بند کرنا ضروری نہیں، البتہ نماز کے وقت کاروبار بند کیا کریں اور نماز کے بعد روزی تلاش کریں، لیکن روزی کی تلاش میں بھی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا کریں۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ" حلال روزی کمانا فرض کے بعد ایک فرض ہے"۔

(مشکوٰۃ ج ا ص ۲۴۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سچائی اور دیانت داری کے ساتھ کاروبار اور تجارت کرنے والے کے متعلق فرمایا کہ وہ قیامت میں نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

۶۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ اَنْ يَّاْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَاِنَّ

نَبِيَّ اللّٰهِ دَاؤدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَاْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهٖ

"کسی نے کبھی اپنے ہاتھ کی روزی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا اور اللہ تعالیٰ کے نبی (حضرت) داؤد (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمائی ہوئی روزی کھاتے تھے"۔

(بخاری ص ۲۷۸ مشکوٰۃ ج ا ص ۲۴۱)

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنی روزی خود صنعت و حرفت کے ذریعے پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے اور بتلایا ہے کہ اپنی روزی اپنے ہاتھوں سے خود پیدا کرنا انبیا علیہم السلام کی سنت میں سے ہے۔

۷۔ دنیا کی ضروریات اور معاملات میں کم ہمتی اور نادانی اختیار کرنا توکل نہیں، بلکہ یہ ایک قسم کی برائی ہے، شریعتِ مطہرہ نے اس کی مذمت فرمائی ہے، چناں چہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدمہ کا فیصلہ فرمایا تو ہارنے والا شخص کہنے لگا حسبی اللہ و نعم الوکیل یعنی مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَلُوْمُ عَلَى الْعَجْزِ وَلٰكِنْ عَلَيْكَ بِالْكَيْسِ فَاِذَا غَلَبَكَ اَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ " اللہ تعالیٰ نادانی

اور کم ہمتی پر ملامت کرتا ہے (یعنی اس کو پسند نہیں کرتا) پس دانائی کو لازم پکڑو (یعنی ہوشیاری اور عقل سے کام لو) اور کوشش و تدبیر میں کم ہمتی نہ کرو، پھر جب کوئی معاملہ تمہارے قابو سے باہر ہو جائے پھر حسبی اللہ ونعم الوکیل کہو"۔ (ابوداؤد ص ۵۷۵، مشکوٰۃ: باب الاقضیہ والشہادت)

۸۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ دَاءً اِلَّا اَنْزَلَ لَہٗ شِفَاءً " اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری نہیں اتاری جس کے لیے شفا نازل نہ کی ہو (یعنی ہر مرض کے ساتھ اس کا علاج بھی پیدا کیا ہے)"۔ (بخاری ص ۱۰۵۹، مشکوٰۃ)

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر بیماری کی دوا ہے، جب دوا بیماری کے موافق ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مریض صحت یاب ہو جاتا ہے"۔ (مسلم، مشکوٰۃ)

اور حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کیا ہم (بیماری میں) دوا اور علاج کیا کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: نَعَمْ یَا عِبَادَ اللّٰہِ! تَدَاوَوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَہٗ شِفَاءً غَیْرَ دَاءٍ وَاحِدٍ اَلْھَرَمُ "ہاں، اے اللہ کے بندو! علاج کیا کرو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی ہے جس کی شفاء مقرر نہ رکھی ہو سوائے ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپا ہے"۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۰۶)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی علاج کرتے تھے، چناں چہ ابو کبشہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر مبارک پر اور اپنے دونوں مونڈھوں کے درمیان سینگی کھنچواتے تھے۔

(ابوداؤد، مشکوٰۃ)

وہ دم جائز ہے جس میں شرکیہ الفاظ نہ ہوں اور ٹھیک مقصد کے لیے ہو

اس طرح بہت سی حدیثیں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو علاج کرنے کا حکم فرمایا بلکہ بعض وقت کوئی علاج خود بھی بتلادیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی علاج کیا کرتے تھے۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ جائز دم، جھاڑ پھونک کی بھی اجازت دیتے تھے بلکہ خود بھی کیا کرتے تھے۔ چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ: اَمَرَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنْ نَسْتَرْقِیَ مِنَ الْعَیْنِ

"نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ ہم نظر بد سے (یعنی نظر بد کے اثر کو دور کرنے کے لیے) دم کرائیں"۔
(بخاری و مسلم، مشکوۃ ج ۲ ص ۲۰۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دم کے ذریعہ نظر بد، ڈنک (یعنی زہریلی چیز جیسے سانپ، بچھو وغیرہ کے ڈنک) اور نملہ (یعنی وہ پھوڑا جو آدمی کے پہلو میں ہوتا ہے) کا علاج کرنے کی اجازت دی ہے۔ (مسلم، مشکوۃ)

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ہر بیماری کے لیے جھاڑ پھونک اور دم کی اجازت دے دی ہے البتہ شرط یہ ہے کہ اس دم میں غیر شرعی اور شرکیہ الفاظ نہ ہوں اور نہ وہ غلط مقصد کے لیے کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت عوف رضی اللہ عنہ بن مالک اشجعی کہتے ہیں کہ ہم زمانہ جاہلیت میں (جھاڑ پھونک کے ذریعہ) منتر پڑھا کرتے تھے تو (اسلام کے بعد) ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ منتروں کے متعلق کیا حکم فرماتے ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا: اَعْرِضُوعَلَّی رُقَاکُمْ لَابَاسَ بِالرُّقٰی مَالَمْ یَکُن فِیہِ شِرکٌ "تم ان منتروں کو پڑھ کر مجھے سناؤ، منتر (دم جھاڑ پھونک) میں کوئی حرج نہیں، جب تک ان میں شرک نہ ہو"۔
(مسلم مشکوۃ ج ۲ ص ۲۰۶)

نبی کریم ﷺ نے صرف دوسروں کو اجازت نہیں دی بلکہ خود بھی دم کرلیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بیمار ہوتے تو معوّذات پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے اور اپنا ہاتھ جہاں تک پہنچتا پھیرتے، پھر جب آپ ﷺ اس بیماری میں مبتلا ہوگئے جس میں آپ ﷺ نے وفات پائی تو میں معوذات پڑھ کر آپ ﷺ پر دم کرتی تھی جیسا کہ آپ ﷺ خود معوّذات پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کرتے تھے اور میں نبی کریم ﷺ کا ہاتھ آپ ﷺ کے بدن پر پھیرا کرتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ جب آپ ﷺ کے گھر والوں میں سے کوئی بیمار ہوتا تو آپ ﷺ معوذات پڑھ کر اس پر دم کیا کرتے تھے۔ (مشکوۃ: کتاب الجنائز)

معوّذات سے مراد قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس سورتیں ہیں۔ بعض علما فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے ساتھ سورۃ الاخلاص بھی مراد ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ چار قل یعنی قل

یا ایھا الکفرون، قل ھو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

بہر حال مذکورہ بالا روایات سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوئی کہ آپ ﷺ نیک مقصد کے لیے خود بھی قرآن مجید کی آیات سے دم کیا کرتے تھے۔

ترکِ اسباب کو توکل کہنا جہالت اور کم ہمتی ہے

بہت سے دلائل میں سے مذکورہ بالا جو دلائل لکھے گئے ہیں، یہ اس بات کو اچھی طرح ثابت کرتے ہیں کہ اسباب و ذرائع اور تدابیر کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں۔ اس لیے جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ روزی کی تلاش کے لیے محنت، مزدوری اور کوشش کرنا یا دوا اور جائز دم کے ساتھ علاج کرنا یا کفار کے مقابلے میں جنگی تیاریاں کرنا اور اپنی حفاظت کے لیے اپنے ساتھ اسلحہ لیے رکھنا وغیرہ چیزیں توکل کو ختم کرتی ہیں یا اس میں رخنہ و خلل ڈالتی ہیں، تو یہ ان کم علمی اور جہالت ہے۔

یہ لوگ گویا ان چیزوں اور اسباب کو معطل، بے کار اور مہمل بنادیتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اپنی حکمت اور قدرت سے بنا رکھا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور دوسری صلاحیتیں دی ہیں اور اُس کے ارد گرد چیزیں اور اسباب بنا کر ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقے سکھلائے ہیں ۔ آخر اسباب و وسائل اور تدابیر کو چھوڑنے (اور اس کو توکل کا نام دینے) کا مطلب اور نتیجہ اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں اور اسباب کی ناقدری اور تحقیر کرتے ہیں اور ان کو بالکل بے کار اور مہمل بنا کر خود اپنے آپ کو اور اپنے ماننے والوں کو اپاہج، لولے، لنگڑے، پست ہمت اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اسباب کو چھوڑنے والے بنالیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے بندوں سے طمع کرنے اور اُن کی طرف دستِ سوال دراز کرنے جیسی بیماریوں میں گرفتار کرلیتے ہیں۔

کسی وجہ سے اسبابِ معاش ترک کرنا قابلِ ملامت نہیں

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ بعض نیک و صالح اور صاحبِ یقین لوگ حصولِ معاش کے ظاہری اسباب کو ترک کردیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ ترکِ اسباب کو توکل سمجھتے ہیں، بلکہ

وہ یاتوغلبہ حال کی وجہ سے اسباب کوترک کر دیتے ہیں یادوسروں کواس کامشاہدہ اور تجربہ کرانے کے لیے یہ رویہ اختیار کرتے ہیں یااس کو ابتدائی حالت میں اس لیے اختیار کیاجاتا ہے کہ اسباب ووسائل یامال ودولت کے ساتھ قلبی تعلق اوران پر اعتماد ختم کیا جاسکے اوراس بات پر کامل یقین حاصل کیا جائے کہ ظاہری کسب وعمل اوراسباب وذرائع اگر اختیار نہ بھی کیے جائیں تب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھاہوا رزق پہنچ ہی جائے گا۔ایسے لوگوں میں سے بعض اسبابِ معاش اختیار کر بھی لیتے ہیں لیکن کسب وعمل میں مشغول ہونے کے وقت بھی ان کے توکل اوراللہ تعالیٰ پر یقین اور بھروسہ میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا۔ ایسے اشخاص کاحال یہ ہوتاہے کہ ان کے سامنے اگر عادت کے مطابق انڈے سے چوزہ نکل آئے یاخلافِ عادت انڈے کے بجائے پتھر سے چوزہ نکل آئے، دونوں صورتوں میں ان کایقین واعتماد یکساں رہتاہے۔

یہ جو کچھ لکھا گیاہے اس سے مقصد صرف اتنا ہے کہ اُن نیک اور صاحبِ یقین لوگوں پر اعتراض بھی درست نہیں جنہوں نے ذرائع معاش کوترک کر دیاہو یاعلاج معالجہ کی طرف زیادہ التفات نہ کرتے ہوں، البتہ اگر کوئی ترکِ اسباب کوتوکل سمجھتاہے یاتوکل کے لیے اسباب کاچھوڑناشرط قرار دیتاہے تو یہ اس کی جہالت ہے، قرآن وسنت سے بے خبری کی علامت ہے اوراللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری اورناشکری ہے۔

اسباب کے متعلق علمی توکل فرض ہے

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ایک مسلمان پر یہ بات فرض ہے کہ وہ اسباب کے متعلق علمی توکل کواختیار کرے۔ وہ یہ کہ ہر کام اور ہر اُمر میں حقیقی متصرف اور حقیقی مختارِ کل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھے اوراپنے آپ کو ہر حال اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ کامحتاج سمجھے اوراسباب کے بجائے اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد و بھروسہ رکھے کہ میرا کام وہی کرے گا اور وہی مجھے فائدہ پہنچائے گا اور ضرر سے بچائے گا۔

اسباب کی بندگی

یہاں تک توان لوگوں کی جہالت کوواضح کیاگیاہے جو علمی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اسباب وتدابیر اختیار کرناتوکل کے خلاف ہے۔ اب ان لوگوں کی حالت سمجھ لیجیے جو مسلمان ہونے بلکہ اپنے آپ کو

متوکل کہنے کے باوجود اسباب کی بندگی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ انہوں نے جب علمی طور پر اس بات کو سمجھ لیا کہ اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں تو وہ اسباب پر اس قدر مطمئن ہو گئے اور اُن پر اس قدر بھروسہ کرنے لگے کہ حقیقت ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر متوکلین کا طرزِ زندگی اختیار کرنے کے بجائے اُن کی زندگی اور معاملات کفار و مشرکین کی طرح ہو گئے اور اُن کی اور غیر مسلموں کی زندگی و معاملات میں کوئی خاص فرق نہیں رہا۔

وہ اپنے مقصد اور مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے ہر جائز اور ناجائز طریقوں اور اسباب کو اختیار کرنے لگے۔ عین نماز کے وقت اُن کی دکان کھلی رہتی ہے اور کاروبار جاری رہتا ہے۔ وہ دنیوی کاروبار میں اس قدر ڈوب گئے کہ حق کی خاطر جان و مال خرچ کرنا ان کو جان و مال کا ضیاع نظر آتا ہے۔ قناعت، سخاوت وغیرہ جو توکل کے ثمرات ہیں (ان کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا) ان کا تو نام ہی نہیں۔ تو آخر یہ اللہ تعالیٰ کے بجائے اسباب و ذرائع پر اعتماد نہیں تو اور کیا ہے، بلکہ آج کل تو عام مسلمانوں کا کافروں کی طرح اس بات پر ایمان راسخ ہو چکا ہے کہ اخلاق اور اچھے کردار کے مقابلے میں مادی اسباب و ذرائع اور مادی طاقت ہی فیصلہ کن چیز ہے اور اس لیے وہ دینی اداروں کی حفاظت و بقا کے لیے حرام و حلال کو جمع کرتے ہیں اور اخلاق، اچھے کردار اور تربیت کے بجائے اپنے شاگردوں، متعلقین اور کارکنوں کا ذہن کچھ اس طرح بناتے ہیں کہ ان کا یقین بن جاتا ہے کہ مادی طاقت اور اسباب سب سے پہلے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی تمام حکومتیں اور تقریباً مسلمانوں کی ہر جماعت، ہر دینی ادارہ اصلاح و تربیت کے بجائے لوگوں سے زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے اور مادی طاقت اپنانے میں گیا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اُس کے احکام اور وعدوں پر بھروسہ اور اعتماد کا جوہر گم ہو گیا ہے۔

مسلمان ملکوں کے حکمران تقریباً سب کے سب مغرب (امریکہ وغیرہ) کے ایجنٹ ہیں۔ اگر اس میں سے کسی کا ذہن اسلامی بھی ہے اور وہ اِسلام کے ساتھ وفادار بھی ہے تو ان کا بھروسہ بھی عددی اکثریت، جنگی پوزیشن، اسلحہ کی پیداوار اور ایٹمی طاقت وغیرہ پر ہے۔ چوں کہ یہ چیزیں بظاہر مغرب میں زیادہ نظر آتی ہیں اس لیے اُن کو دیکھ کر اِن (مسلمان حکمرانوں) کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھروسہ اور اعتماد اور اس کے بتائے ہوئے سیرت و کردار اور اخلاق و عمل سے مغرب کی

مادی طاقت اور اس کی قیادت کو چیلنج کریں۔ اس لیے یہ نیک دل لوگ بھی بس یہی سمجھتے ہیں کہ ہم تاقیامت مغرب کے غلام اور دستِ نگر رہیں گے اور جو جائز و ناجائز حکم اور تہذیب ان کی طرف سے آئے گی، اُس کو اپنے اوپر لاگو کریں گے۔

اگرچہ مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مغرب کے اقتدار اور اس قوت کو زیر کرنے کا سوچتے ہیں اور زبان سے بھی مغرب کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، لیکن ان کی یہ صدا اور چیلنج صرف زبانی حد تک ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہی طریقے اختیار کرتے ہیں جو اسلامی تعلیمات سے ٹکراتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ مغرب سے ذہنی طور پر اس قدر مرعوب اور متاثر ہوتے ہیں کہ اپنی اصطلاحات کو مغرب کی اصطلاحات کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔

بہر حال اسباب اور طاقت کو اوّلیت دینا اور اس کو معیار و میزان بنانا؛ یہ دونوں خرابیاں اور کمزوریاں بھی انہیں اسباب و ذرائع کو سب کچھ جاننے سے پیدا ہوتی ہیں۔ حالاں کہ اسباب و طاقت کو اوّلیت دینا اور اس کو معیار و میزان بنانا وہ طریقۂ فکر اور رویہ ہے جس کو ختم کرنے اور اس کی تردید کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کو اور حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ و السلام نے اپنی قوم اور جابر بادشاہ نمرود کو اور حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ و السلام نے بے سروسامانی کے باوجود فرعون کی طاقت، اقتدار کو چیلنج کیا اور اللہ تعالیٰ کی تعلیمات پر کامل بھروسہ اور اللہ تعالیٰ کی پوری اطاعت کر کے باطل قوتوں کو شکست دی۔ نبی کریم ﷺ نے، بے سروسامانی کی حالت میں جو ہتھیار مہیا ہو سکے، چند تلواروں اور چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ قریش کو شکست دی۔

غرض یہ کہ ایک طرف توکل کے متعلق بعض لوگوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے یہ نظریہ پھیلانا شروع کیا کہ اسباب کا ترک کرنا ہی توکل ہے جس کی وجہ سے امتِ مسلمہ کو اپاہجوں، لنگڑے، لولوں اور دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر زندگی گزارنے والی جماعت بنا دیا گیا، اور دوسری طرف ان کے برعکس بعض لوگوں نے توکل کا کچھ ایسا مفہوم بیان کیا کہ گویا اسباب و ذرائع ہی سب کچھ ہے۔ اس افراط و تفریط کی وجہ سے مسلمانوں کا دین دار طبقہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی تعلیم و ہدایت کو چھوڑ کر بعینہٖ وہی اسباب و تدابیر اختیار کرنے لگا جو غیر مسلم اختیار کرتے ہیں اور جو اسلام کے

اصولوں سے ٹکراتے ہیں۔

لہٰذا اسباب کے چھوڑنے کو توکل کہنا یا اس کے برعکس اسباب میں غلو کرنا، دونوں ہی توکل کے مفہوم میں افراط و تفریط ہے۔ اس سے علمی اور عملی طور پر بچنا ضروری ہے۔

مجھے امید ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ بہت جلد مسلمان ذہنی غلامی سے چھٹکارا حاصل کر کے حق اور سچائی کی راہ کو اختیار کریں گے، وہ اللہ تعالیٰ پر، اُس کی تعلیمات پر اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات پر بھروسہ کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پوری اطاعت کو اختیار کریں گے جس کی وجہ سے وہ ہر باطل (مغرب وغیرہ) کی قوت واقتدار کو چیلنج کر کے شکست دیں گے اور حق اور اسلام کا بول بالا کریں گے۔

کون سا توکل فرض ہے؟

اب اس کے بعد اس بات کو سمجھ لیجیے کہ کون سا توکل فرض ہے اور کون سا واجب ہے، وغیرہ۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی تعلیم و ہدایت اور اس کے وعدوں پر مکمل یقین و بھروسہ رکھنا جیسا کہ اس کا بیان گزر چکا ہے۔

۲۔ اسباب کے متعلق علمی و اعتقادی توکل، کہ اسباب کے بجائے بھروسہ و اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر ہو جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ توکل کی یہ دونوں قسمیں فرض ہیں۔

عملی توکل میں فرض، واجب وغیرہ

عملی لحاظ سے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ و توکل کا تعلق ترکِ اسباب یا اسباب اختیار کرنے کے ساتھ ہے، اس لیے اس کے متعلق اسباب کو قدرِ تفصیل سے سمجھ لیجیے:

۱۔ جو اسباب حرام ہیں جیسے سود، سٹہ، بلا ضرورت سوال، جھوٹ، قَسم سے تجارت چلانا، حرام چیزوں سے فائدہ اٹھانا، مثلاً شرکیہ جھاڑ پھونک کے ذریعہ علاج کرنا یا حرام دواؤں کو بلا شدید ضرورت کے استعمال کرنا، یا پرندوں سے بدفالی و بدشگونی لینا وغیرہ؛ ایسے تمام حرام اسباب چھوڑ کر توکل کرنا فرض ہے اور مکروہ اسباب کو چھوڑ کر توکل کرنا بھی واجب اور ضروری ہے۔

۲۔ وہ اسباب جو حلال ہیں اور ان پر نفع اور فائدہ یقینی نہیں بلکہ شک اور گمان کے درجہ میں ہوتا ہے کہ کبھی ان سے فائدہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں، جیسے بعض قسم کے علاج کے بعد کبھی آدمی صحت یاب ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا، یا جیسے بعض دنیاوی مشقتیں اور محنتیں کہ کبھی ان پر فائدے مرتب ہوتے ہیں اور کبھی نہیں۔ ایسے اسباب کو ترک کرنا قوی ایمان والے کے لیے تو جائز ہے لیکن کمزور ایمان والے کے لیے جائز نہیں، اور اگر کہیں علاج وغیرہ یقین کی صورت اختیار کر لے تو مضبوط ایمان والے کے لیے بھی اس کا ترک کرنا جائز نہیں، بلکہ یہ نفس کی حق تلفی اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اسباب کو غیر مفید بنانا ہے (اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے)۔

۳۔ وہمیہ اسباب جو حلال ہیں یعنی جن پر نفع و فائدہ کا مرتب ہونا صرف وہم ہوتا ہے جیسے بعض لوگ دور کے اسباب صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ شاید کسی وقت کام آئیں، مثلاً کوئی حاکم کی خدمت صرف اس لیے کرتا ہے کہ کل کو خدانخواستہ مجھے کوئی مشکل پیش آئی تو یہ میری مدد کرے گا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے کام مثلاً اسباب میں بہت ہی انہماک اختیار کرنا۔ ایسا طرزِ عمل حریصوں اور طویل امید والوں کا شیوہ ہوتا ہے، اس لیے ایسی حرص، لمبی امیدوں اور ان کے اسباب کو ترک کرنا کامل مومن بننے کے لیے ضروری ہے۔

(اس کا بیان ان شاء اللہ مزید وضاحت کے ساتھ آئے گا۔)

۴۔ وہ اسباب جن کو شریعتِ مطہرہ نے رشد و ہدایت اور آخرت کی نجات و فلاح کے لیے ضروری قرار دیا ہے، اُن کو ترک کرنا بعض اوقات حرام اور گمراہی یا مکروہ ہے، جیسے نماز یا روزہ اس لیے چھوڑ دینا کہ اللہ تعالیٰ بہت ہی مہربان ہے، وہ بخش دے گا، یا سنت کاموں کو چھوڑنا وغیرہ۔ اسے توکل نہیں کہتے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور تعلیم پر بے یقینی اور بے اعتمادی ہے جو کہ بے ایمانی، نافرمانی اور معصیت ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی تعلیم و ہدایت پر عمل کرنا ہی دراصل اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ کرنا ہے۔ پھر جو تعلیم جس قدر ضروری ہے اُسی قدر توکل بھی ضروری ہے۔

۵۔ وہ حلال اسباب جن پر نفع یا ضرر کا مرتب ہونا یقینی ہوتا ہے، جیسے پانی پینے کے بعد پیاس کا کم ہونا، کھانا کھانے کے بعد بھوک کا مٹ جانا یا جھکی ہوئی دیوار کے پاس سے ہٹ جانے کی وجہ سے ضرر سے

بچ جانا۔ ایسے اسباب کو ترک کر کے توکل کرنا جائز نہیں اور نہ شرعاً اسے توکل کہتے ہیں، بلکہ ایسا کرنا اللہ تبارک و تعالیٰ کے دیے ہوئے اسباب و آلات اور صلاحیتوں کو معطل کرنا ہے۔

توکل کا خلاصہ

توکل کی دوسری صورت کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے تمام امور کا وکیل اور اپنی بھلائی و بہتری کا ضامن جان کر صرف اُسی پر، اس کی تعلیمات وہدایات پر اور اس کے وعدوں پر بھروسہ کیا جائے اور اسباب کے حصول اور اختیار کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ٹوٹنے نہ پائے۔ کسبِ معاش اور دفعِ بلا و مصیبت کے جو اسباب و آلات اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں اور اپنے مقاصد اور نتائج کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو قوت و توانائی عطا کی ہے اور جو اسباب و آلات میسر کیے ہیں، اُن سب کو استعمال کیا جائے اور ان قوتوں، وسائل و ذرائع اور کسب و عمل کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ نظامِ کائنات کا سلسلہ اور نعمتوں کے پہنچانے کا ایک ظاہری سبب جانتے ہوئے ان میں زیادہ غلو نہ کیا جائے اور نہ ان میں زیادہ مشغول ہوں، نہ مطلوبہ نتائج و مقاصد کے حصول کے لیے ناجائز اسباب و ذرائع اور تدابیر اختیار کیے جائیں اور نہ ہی اسباب کے حصول اور اختیار کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم توڑا جائے۔

جائز اسباب و تدابیر اور کسب و عمل اختیار کرنے کے بعد اپنے کام اور معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اسی پر بھروسہ رکھیں کہ وہی میرا کام کرے گا، اور یہ بھی یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ان مقررہ اسباب و ذرائع کی پابند نہیں۔ اگر کوئی سبب و ذریعہ اور عمل نہ بھی ہو تب بھی اللہ تعالیٰ مطلوبہ نتائج اور نعمتوں کے پہنچانے پر قادر ہے۔

متوکل اور غیر متوکل میں فرق

سچا مومن بھی عالمِ اسباب میں ساری تدابیر قانونِ فطرت کے مطابق اسی طرح اختیار کرتا ہے جس طرح اہلِ دنیا اور غیر متوکل اختیار کر لیتے ہیں، مگر پھر بھی متوکل اور غیر متوکل میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے، کیوں کہ متوکل کا بھروسہ ان تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے، اس کا پورا یقین ہوتا ہے کہ اُس کی کوئی تدبیر اس وقت تک نہ تو ٹھیک طرح شروع ہو سکتی ہے، نہ چل سکتی ہے اور نہ تکمیل

تک پہنچ سکتی ہے، جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل اوراس کا رحم وکرم شاملِ حال نہ ہو۔ لہٰذا وہ کسی مقصد کے حصول کے لیے نہ تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور نہ وہ اسباب میں اتنا زیادہ منہمک ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات میں کوتاہی اور سستی آئے، اگر اسباب وذرائع مہیا نہ ہوسکیں یا نہ رہیں تو بھی وہ مایوس نہیں ہوتا، کیوں کہ اُسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن کے بجائے دوسرے اسباب کے ذریعے میرے کام چلائے گا اور تمام مطلوبہ نتائج عطا فرمائے گا۔

اس لیے متوکل شخص ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مانگنے والا، اس کے حکم کی تعمیل کے لیے چست اور چاق وچوبند رہنے والا ہوتا ہے، وہ سخی، شجاع اور میدان میں کودپڑنے والا ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی ہر بات اور ہر وعدے پر بھروسہ کرکے پورے دین پر چلنے میں سراسر خیر اوراللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہلاکت اور بربادی کا مشاہدہ کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غیر متوکل کو یہ نعمتیں میسر نہیں ہوتیں، وہ صرف مادی اسباب پر ہی بھروسہ کرتا ہے، اس لیے وہ صرف اسباب کو ہی پوجتا ہے اوراپنے مقصد کے حصول کے لیے حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر اسباب اختیار کرتا رہتا ہے۔ ایسا شخص اسباب مہیا نہ ہوسکنے یا نہ رہنے کی صورت میں مطلوبہ نتائج کے حصول سے مایوس اور ناامید ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے اُس کی زندگی پراگندہ اور پریشان ہوجاتی ہے۔

توکل کے ثمرات اور علامات

ہر چیز اپنی علامت اور اپنے پھل سے پہچانی جاتی ہے، اس لیے توکل کے ثمرات اور علامات لکھ دیتے ہیں تاکہ کوئی اپنے متعلق متوکل ہونے کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہ رہے اور متوکلین کی صفات اپنے اندر لانے کی کوشش کرے۔

۱۔ توکل اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پر آدمی کو کاربند رکھتا ہے۔ اس میں صبر، تقویٰ وغیرہ، تمام تعلیمات اور ہدایات داخل ہیں جن میں سے بعض کا بیان اس کتاب میں گزر چکا ہے اور بعض کا بیان ان شاء اللہ بعد میں آئے گا۔

۲۔ توکل، حرام و ناجائز اور مکروہ، بلکہ نامناسب اسباب و ذرائع کو بروئے کار لانے سے بچاتا ہے، یعنی متوکل ظاہری نفع و نقصان اور لذت کو نہیں دیکھتا بلکہ اُس کی نظر اللہ تعالیٰ کی تعلیم اور ہدایت پر ہوتی ہے، اس لیے وہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرتا ہے۔ اگر اس کو بظاہر کسی چیز میں فائدہ بھی ہو لیکن اُس کا حصول اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو تو وہ اُس کو سراسر نقصان سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے۔

۳۔ توکل سخاوت پیدا کرتا ہے اور بخل سے بچاتا ہے۔

۴۔ توکل شجاعت پیدا کرتا ہے اور بزدلی جیسے امراض سے نجات دیتا ہے۔

۵۔ توکل صبر و قناعت اور مخلوق سے استغناء کی صفت پیدا کرتا ہے اور مخلوق سے سوال، طمع، حرص اور چاپلوسی وغیرہ جیسے امراض اور بے مروت کاموں سے بچاتا ہے۔

توکل کا خلاصہ

اللہ تعالیٰ ہی کو نفع و نقصان، عزت و ذلت، کامیابی و ناکامی اور خیر و شر کا مالک یقین کرتے ہوئے اپنے تمام تر مقاصد، حاجات اور کاموں میں صرف اُسی کی ذات پر بھروسہ رکھنا، اُسی کی قدرت اور اُسی کے رحم و کرم پر نظر رکھنا، اُسی سے لو لگانا، اسی سے خوف و امید رکھنا، اُسی سے دعائیں مانگنا، اُسی کی ہدایات و احکامات پر اعتماد کرتے ہوئے عمل کرنا اور انہی میں نفع و بھلائی اور خیر کا یقین کرنا، اور اللہ تعالیٰ کے قُرب و رضا میں رکاوٹ بننے والے تمام تر اسباب اور کاموں کو خوشی سے چھوڑنا توکل کہلاتا ہے۔

توکل کا اعلیٰ مقام یا رضا بالقضاء

جب بندے کو توکل میں رسوخ اور پختگی حاصل ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو توکل کا اعلیٰ مقام نصیب فرماتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس میں بندہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کی طرف سے پیش آنے والے تمام اچھے اور برے حالات پر دل سے راضی رہتا ہے۔ توکل کے اس اعلیٰ مقام کو اصطلاح میں رضا بالقضاء کہا جاتا ہے۔ تقدیر اور قضائے الٰہی پر راضی رہنا بہت بڑا اور بلند مقام ہے اور اس مقام پر بندے کی دنیوی زندگی ایک طرح سے جنتی زندگی کا نمونہ بن جاتی ہے۔

رضا بالقضا کا مقام اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت کا نتیجہ ہوتا ہے

رضا بالقضا کا یہ مقام اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے ساتھ شدید محبت کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ مقام اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ اور اس کی صفاتِ کمال یعنی رحمن ورحیم، علیم و حکیم، ودود و عظیم اور حمید و کریم وغیرہ ہونے پر پورا پورا ایمان و یقین ہو اور ان کی معرفت حاصل ہو۔ پھر اس معرفت اور اس ایمان و یقین کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت کا اس کے دل میں رچ بس جانا ہے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان کو توکل کا اعلیٰ مقام یعنی رضا بالقضا حاصل ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر بندہ دنیا کی حقیقی راحتوں اور چین و سکون کو پالیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان پر دنیا کی زندگی میں طرح طرح کے حالات آتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر اچھے اور خوشگوار حالات آتے ہیں اور بعض اوقات اس پر ایسے حالات آتے ہیں جو اس کی طبیعت اور چاہت کے خلاف ہوتے ہیں۔ عام انسانوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ مصائب کے وقت گھبراتے ہیں اللہ تعالیٰ سے گلے شکوے کرتے ہیں اور اپنی تقدیر پر راضی نہیں ہوتے، مگر جس بندے پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جاتا ہے اور وہ اُس کو رضا بالقضا کی دولت سے نوازلیتا ہے تو اس پر جو بھی اچھے یا برے حالات آتے ہیں، ان کے بارے میں اس کا پختہ ایمان و یقین ہوتا ہے کہ یہ احوال اللہ تعالیٰ رحمن ورحیم، حکیم و علیم اور کریم ذات کی طرف سے آتے ہیں، وہ میرا مولیٰ و مالک ہے، انہی احوال میں میرے لیے عظیم خیر و بھلائی کے راستے اور صورتیں پیدا فرمائے گا۔

نیز جب بندہ اس بات کو پالیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اسی میں ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور فیصلے پر راضی رہے تو یہ بندہ محتاجی و بیماری، مصیبت، تکلیف، مشقت اور بُرے حالات میں بھی اللہ تعالیٰ سے اسی طرح راضی، خوش اور اُس کا شکر گزار رہتا ہے جس طرح وہ اللہ تعالیٰ سے راحت و عافیت اور خوشگوار حالات میں راضی، خوش اور اُس کا شکر گزار ہوتا ہے۔

رضا بالقضا کا مقام اور قرآن مجید واحادیث

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ ”آپ کہہ دیجیے کہ ہمیں ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا مولیٰ (خیر خواہ اور کارساز) ہے اور اللہ تعالیٰ ہی پر چاہیے کہ مومن بھروسہ رکھیں“۔

(سورۃ التوبہ: آیت ۵۱)

اس آیتِ کریمہ میں مومن کا حال بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر پورا پورا بھروسہ رکھتا ہے اور وہ اس حقیقت کو خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم عبث اور خلافِ حکمت نہیں ہوتا، وہ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو مصیبت میں مبتلا نہیں کرتا۔ وہ تو ہمارا مولیٰ، خیر خواہ اور کارساز ہے، ستر ماؤں سے بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہے۔ اس نے جو کچھ ہمارے لیے لکھ رکھا ہے، اسی میں ہماری دنیا و آخرت کی خیر اور فلاح ہے اور اسی میں ہمارے لیے بہتری ہوگی۔

بلاشبہ سچے مومن کے لیے مصیبت و راحت، تکلیف و آرام اور موت و زندگی دونوں ہی میں خیر ہے۔ اُس کو اگر کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچتی ہے تو اس پر صبر کرتا ہے۔ اس سے اس کی کمزوریوں کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کے اندر پختگی و استقامت پیدا ہوتی ہے اور یہ اس کے اندر انابت الی اللہ اور توبہ کی کیفیت کو بڑھاتی ہے، جبکہ خوشحالی، فتح اور کامرانی وغیرہ جیسے خوشی کے اسباب اُس کے اندر احسان مندی کے جذبات ابھارتے ہیں اور اس سے اُس کے اندر شکر، حقوق العباد کی ادائیگی اور احسان و ایثار کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتا ہے تو غازی ہوتا ہے اور مرتا ہے تو شہید ہوتا ہے۔ بیماریاں اور تکالیف اس کے لیے رفع درجات اور گناہوں کے جھڑنے کا سبب بنتی ہیں ۔ غرض یہ کہ سچے مومن کے لیے اس دنیا میں ناکامی کا سوال ہی نہیں، کیوں کہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو اور یہ رضائے الٰہی اُسے ہر حالت میں، خواہ دکھ ہو یا سکھ، مصیبت ہو یا راحت، ملتی رہتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی اور خوش ہوتا ہے اور عین مصیبت کے وقت بھی وہ اللہ تعالیٰ سے بڑی خیر کا طلب گار اور امیدوار ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۞ ”پس ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے اسی میں (تمہارے لیے) خیر

کثیر رکھ دی ہو"۔ (سورۃ النساء: آیت ۱۹)

جس کو رضا بالقضا کا مقام نصیب ہو جائے، وہ نیک بخت ہے

بلاشبہ جس کو رضا بالقضا کا مقام کسی درجہ میں بھی نصیب ہو جائے، یہ اُس کی نیک بختی کی علامت ہے اور جو شخص تقدیرِ الٰہی پر ناراض ہو اور شکایت کرتا ہے وہ بہت بڑا بدبخت ہوتا ہے۔ ان دونوں کی نیک بختی اور بدبختی کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا:

(حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ): مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ اٰدَمَ رِضَاهُ بِمَاقَضَى اللّٰهُ لَهٗ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ تَرْكُهٗ اِسْتِخَارَةَ اللّٰهِ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ سَخَطُهٗ بِمَاقَضَى اللّٰهُ لَهٗ "آدمی کی نیک بختی اور خوش نصیبی میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس پر راضی رہے اور آدمی کی بدبختی اور بدنصیبی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے خیر و بھلائی مانگنا چھوڑ دے، اور اس کی بدبختی اور بدنصیبی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اُس کے مقدر میں لکھ دیا ہے، وہ اس سے ناراض و ناخوش ہو"۔ (ترمذی، احمد، مشکوۃ)

اس حدیث میں جن باتوں کا ذکر آیا ہے ان کی مختصر تشریح یہ ہے:

۱۔ پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ:

"آدمی کی نیک بختی اور خوش نصیبی میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ اس پر راضی رہے"۔

یہ وہی رضا بالقضا کا مقام ہے، جس کی تفصیل اوپر لکھی گئی ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ آدمی کی بدبختی اور بدنصیبی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے خیر و بھلائی کا مانگنا چھوڑ دے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ خیر و بھلائی کے حصول کے لیے جس طرح دلی تڑپ اور دعا کی ضرورت ہے، اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ خیر و کامیابی کے اسباب یعنی ایمان اور اعمالِ صالحہ کو بھی اختیار کیا جائے۔ تو حدیث کے اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہوا کہ نیک اور خوش نصیب وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا طالب ہو، اُس کی رضا کے کاموں (ایمان اور اعمالِ صالحہ) میں لگا رہے

اور برابر اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی طلب کرتا رہے، اور آدمی کی بڑی بدنصیبی اور بدبختی یہ ہے کہ وہ خیر و بھلائی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے کاموں کو چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی کا طالب نہ رہے۔

ظاہر ہے کہ یہ وہی شخص ہوتا ہے جو نفس پرست، دنیا پرست اور اسباب پرست ہوتا ہے۔ وہ خیر و بھلائی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے بجائے مخلوق اور اسباب میں تلاش کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بجائے اسباب سے خیر و بھلائی کا طالب رہتا ہے۔ بلاشبہ ایسا شخص بہت بڑا بدنصیب ہوتا ہے اور دنیا میں سرگرداں رہتا ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ فرمائی گئی کہ:

”آدمی کی بدبختی اور بدنصیبی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کے لیے مقدر میں لکھ دیا ہے ،وہ اس سے ناراض اور ناخوش ہو“۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتقاد نہیں رکھتا یا تقدیرِ الٰہی پر راضی نہیں ہوتا، وہ بہت بڑا بدنصیب ہوتا ہے، کیوں کہ وہ ذرا ذرا سی مصیبت اور حادثات پر متفکر ہوتا ہے، اُس کا دل اور ذہن منتشر رہتا ہے کہ یہ مصیبت کیوں آگئی، فلاں حادثہ کیسے پیش آیا اور یہ بات اس طرح کیوں نہ ہوئی وغیرہ وغیرہ، اور یہی پراگندگی، بے چینی اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ناراضگی اس کو اپنے مقاصد و معاملات اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت سے یا کم از کم عبادات میں سکون واطمینان سے محروم رکھتی ہے۔ اس طرح یہ بندہ دنیا و آخرت دونوں کے اعتبار سے بے چینی اور بے قراری میں مبتلا اور اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہتا ہے، وہ بہت بڑا خوش نصیب ہوتا ہے۔ اُس کو دنیا میں قلبی سکون، ذہنی فراغت، اطمینان اور دلجمعی کی دولت نصیب ہو جاتی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ کاروبار، معاملات، عبادات اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ کرتا ہے اور اپنی آخرت کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی اور خوش ہوتا ہے۔ اس طرح وہ دنیا و آخرت کی خوشیوں، کامرانیوں اور فلاح و نجات کو پالیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہر حالت میں قضاو قدر پر راضی رہنا بہت ہی اعلیٰ مقام ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اس مقام کو حاصل کرنے کے لیے انتہائی کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی کا اور اس عظیم مقام کا طالب رہے اور اس مقام کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو اسباب مقرر فرمائے ہیں جیسا کہ ان کا بیان گزر چکا ہے، ان کو اپنائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو تقدیرِ الٰہی پر راضی رہنے کی دولت نصیب فرمائے۔ (آمین)

توکل کے واقعات

سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا توکل

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ غزوۂ نجد میں گیا۔ جب حضور ﷺ وہاں سے واپس ہوئے تو دوپہر کے وقت ایک ایسی وادی میں پہنچے جس میں کانٹے دار درخت بہت تھے۔ وہاں حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے آرام کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم درختوں کے سائے میں ادھر ادھر پھیل گئے۔ حضور ﷺ بھی ایک درخت کے سایہ میں آرام فرمانے لگے اور حضور ﷺ نے اپنی تلوار اس درخت پر لٹکادی۔ ہم سب سو گئے کہ اچانک حضور ﷺ نے ہمیں بلایا۔ ہم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ایک دیہاتی آپ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں سویا ہوا تھا، اس نے آکر میری تلوار درخت سے اتاری اور اسے نیام میں سے نکال لیا۔ میں اٹھا تو اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ستی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے کہا: آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے کہا: اللہ۔ اس نے پھر کہا: آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے کہا: اللہ، پھر اس نے تلوار کو نیام میں رکھ دیا اور بیٹھ گیا اور حالاں کہ اس نے حضور ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن حضور ﷺ نے اسے کوئی سزا نہ دی۔

(اخرجہ الشیخان)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ قبیلہ محارب اور غطفان سے نخلہ مقام پر جنگ کر رہے تھے۔ جب ان لوگوں نے مسلمانوں کو غفلت میں دیکھا تو ان میں سے ایک آدمی، جس کا نام غورث بن حارث تھا، وہ آیا اور تلوار لے کر حضور ﷺ کے سر پر کھڑے ہو کر کہنے لگا: آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ! یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے تلوار نیچے گر گئی۔ حضور ﷺ نے تلوار اٹھا کر اس سے پوچھا کہ اب تم کو مجھ سے کون بچائے گا؟ اس نے کہا: آپ تلوار کے بہترین لینے والے بن جایئے یعنی مجھے معاف کر دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس نے کہا: نہیں، البتہ میں آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ کبھی بھی آپ سے نہیں لڑوں گا اور جو لوگ آپ سے لڑیں گے ان کا بھی ساتھ نہیں دوں گا، چناں چہ حضور ﷺ نے اسے چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو جا کر کہا: میں تمہارے پاس ایسے آدمی کے پاس سے آرہا ہوں جو لوگوں

میں سے بہترین ہیں۔ پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آگے نمازِ خوف کا ذکر کیا۔ (عند البیہقی کذا فی البدایہ: ۴/۸۴)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا توکل

حضرت یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک رات حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لے گئے اور وہاں نماز پڑھنے لگے۔ ہم نے وہاں جاکر پہرہ دینا شروع کر دیا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز سے فارغ ہوگئے تو ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: تم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ ہم نے کہا: ہم آپ کا پہرہ دے رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: آسمان والوں سے پہرہ دے رہے ہو یا زمین والوں سے؟ ہم نے کہا: زمین والوں سے۔ انہوں نے فرمایا: زمین پر اس وقت تک کوئی چیز ہو نہیں سکتی جب تک آسمان میں اس کے ہونے کا فیصلہ نہ ہو جائے، اور ہر انسان پر دو فرشتے مقرر ہیں جو ہر بلا کو اُس سے دور کرتے رہتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس کی تقدیر کا لکھا آجائے، اور جب تقدیر کا فیصلہ آجاتا ہے تو یہ دونوں فرشتے اس کے اور تقدیر کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں، اور اللہ کی طرف سے میری حفاظت کا بڑا مضبوط انتظام ہے، جب میری موت کا وقت آجائے گا تو انتظام مجھ سے ہٹ جائے گا، اور آدمی کو ایمان کی حلاوت اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک اس کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ جو کچھ اچھا یا برا اسے پہنچا ہے وہ اس سے خطا کرنے والا نہیں تھا اور جو اس سے خطا کر گیا وہ اسے پہنچنے والا نہیں تھا۔

(اخرجہ ابو داؤد فی القدر وابن عساکر)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کی آخری رات آئی تو انہیں قرار نہیں تھا (کبھی اندر جاتے کبھی باہر)، گھر والوں کو خطرہ محسوس ہوا (کہ ان کے ساتھ کچھ ہو نہ جائے) تو انہوں نے آپس میں چپکے سے مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو باہر نہیں جانا چاہیے، اور انہوں نے یہ بات ان کی خدمت میں خدا کا واسطہ دے کر عرض کی۔ انہوں نے فرمایا: ہر بندے کے ساتھ دو فرشتے مقرر ہیں کہ جب تک تقدیر کے لکھے ہوئے کا وقت نہ آجائے اُس وقت تک وہ ہر بلا اس بندے سے دور کرتے رہتے ہیں، اور جب تقدیر کا وقت آجاتا ہے تو پھر وہ دونوں فرشتے اس کے اور تقدیر کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد تشریف لے گئے جہاں انہیں شہید کر دیا گیا۔

(اخرجہ ابو داؤد فی القدر وابن عساکر ایضا)

حضرت ابو مجلز رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قبیلہ مراد کے ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس نے عرض کیا کہ قبیلہ مراد کے کچھ لوگ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں اس لیے آپ اپنی حفاظت کا انتظام کرلیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر آدمی کے ساتھ دو فرشتے مقرر ہیں جو ہر اس بلا سے اس کی حفاظت کرتے ہیں جو اس کے مقدر میں لکھی ہوئی نہ ہو، اور تقدیر کا جب وقت آجاتا ہے تو یہ فرشتے اس کے اور تقدیر کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں، بے شک مقررہ وقت ایک مضبوط ڈھال ہے۔

حضرت یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ اور دیگر حضرات کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا گیا: ہم آپ کا پہرہ نہ دیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر آدمی کی موت اس کا پہرہ دے رہی ہے۔

حضرت جعفر رحمہ اللہ کے والد حضرت محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دو آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنے جھگڑے کا فیصلہ کروانے آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان دونوں کو لے کر ایک دیوار کے نیچے بیٹھ گئے تو ایک آدمی نے کہا: اے امیر المؤمنین ! یہ دیوار گرنے والی ہے۔ انہوں نے فرمایا: اپنا کام کرو، اللہ ہماری حفاظت کے لیے کافی ہے۔ پھر ان دونوں کی بات سن کر فیصلہ فرمایا اور وہاں سے کھڑے ہوئے، پھر وہ دیوار گر گئی۔

حضرت ابو طیبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرض الوفات میں مبتلا ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ کو کس مرض کی شکایت ہے؟ انہوں نے کہا: اپنے گناہوں کی شکایت ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا چاہتے ہیں؟ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اپنے رب کی رحمت چاہتا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا میں آپ کے لیے طبیب کو نہ بلالاؤں؟ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: طبیب نے ہی (یعنی اللہ ہی نے) تو مجھے بیمار کیا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا میں آپ کے لیے بیت المال میں سے عطیہ نہ مقرر کردوں؟ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ عطیہ آپ کے بعد آپ کی بیٹیوں کو مل جائے گا۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: کیا آپ کو میری بیٹیوں پر فقر کا ڈر ہے؟ میں نے اپنی بیٹیوں کو کہہ رکھا ہے کہ وہ ہر رات سورۂ واقعہ پڑھ لیا

کریں، میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو آدمی ہر رات سورۂ واقعہ پڑھے گا اس پر کبھی فاقہ نہیں آئے گا (لہٰذا عطیہ کی ضرورت نہیں ہے)۔

(حیاۃ الصحابہ: حصہ دوم، ص۷۳۹ تا ۷۴۱)

☆......☆......☆